حمد — عبدالحفیظ خان — 11
نعت — رونق حیات — 11

انٹرویو

خالدانجم — شاہین رشید — 12
دو کا پہاڑہ — سیرین ہمیانی — 16
آواز کی دنیا سے — منہاج علی — 20
مجھ سے ملیے — انیلا کرن — 26

ناول

دستِ کوزہ گر — فوزیہ یاسمین — 252
دردِ دل — نبیلہ عزیز — 32

مکمل ناول

میں ندیا تم ساگر — فرح بخاری — 66
اک پل فیصلے کا — فرحین اظفر — 144

ناولٹ

وہ اک پری ہے — ریحانہ امجد بخاری — 110
بھول — ماہ وش گل — 182
وفا میری ضد — فرحت شوکت — 212

افسانے

مدثر کے ابا — بشریٰ احمد — 58
حسابِ عمر — عنیزہ گل — 138
فسانۂ محبت — نمرہ انور — 127
اعتبارِ ذات — شازیہ جمال نیر — 104
کسک — صائمہ خان — 204

مستقل سلسلے

کرن کرن خوشبو — شعاع عمیر — 271
یادوں کے دریچے سے — بشریٰ محمود — 275
مجھے یہ شعر پسند ہے — شگفتہ سلیمان — 277
مسکراتی کرنیں — ریحانہ امجد بخاری — 279
کرن کا دسترخوان — خالدہ جیلانی — 282
حسن و صحت — ادارہ — 30
نہلے پہ دہلا — ذوالقرنین — 284
نامے میرے نام — مدیرہ کرن — 286

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ---- 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

جولائی 2012
جلد 35 شمارہ 4
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

منیرہ

اداریہ

جولائی کا کرن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
خالقِ کائنات نے ہر شے کو کسی نہ کسی مقصد سے تخلیق کیا ہے اور انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی زندگی کو محض گزارنا ہی کارنامہ نہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ زندگی کو اپنے پسندیدہ انداز میں اس کامیابی اور خوبی کے ساتھ گزاریں کہ آپ کے بعد آنے والے آپ کے نقوشِ پا سے نشانِ منزل پائیں۔ اگر آپ بھی زندگی میں فتح و کامرانی کے آرزومند ہیں اور ایک بامقصد زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ آپ پرعزم ہوں۔ ہمیشہ روشن پہلوؤں پر نظر رکھیں۔ کامیابی خندہ روی سے مشروط ہے۔
زندگی پیچھے کی طرف نہیں چلتی اور نہ ہی گزرے ہوئے دن کے لیے رکتی ہے۔ سفر، مسلسل سفر، انتھک جدوجہد اور محنت زندگی کی راہ کے وہ سنگِ میل ہیں۔ جن کے ذریعے آپ کامیاب زندگی تک پہنچ سکتے ہیں۔
زندگی کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مخلصانہ کوشش کریں اور یاد رکھیں اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہے۔
اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک اور بامقصد زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

اس شمارے میں،

- اداکار "خالد انعم" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ "سبرین ہسبانی" دو کے پہاڑے کے ساتھ،
- "آواز کی دنیا سے" آر جے "منہاج علی عسکری" کی باتیں،
- "مجھ سے ملیے" میں مصنفہ "انیلا کرن" سے ملاقات،
- "دستِ کوزہ گر" فوزیہ یاسمین کا سلسلے وار ناول،
- "دیارِ دل" نبیلہ عزیز کا سلسلے وار ناول،
- "میں ندیا تم ساگر" فرح بخاری کا دلچسپ ناول،
- "اک پل فیصلے کا" فرحین اظفر کا ناول،
- "وفا میری ضد" فرحت شوکت کا ناولٹ،
- "وہ اک پری ہے" ریحانہ امجد بخاری کا دلچسپ ناولٹ،
- "بھول" ماہ وش گل کا ناولٹ،
- بشریٰ احمد، عبیرہ گل، ثمرہ انوار، شازیہ جمال نیئر اور صائمہ خان کے افسانے اور مستقل سلسلے،

مفت،
کرن کتاب "آمدِ رمضان المبارک" ہر شمارے کے ساتھ مفت حاصل کریں۔

حمدِ باری تعالیٰ

ہر وقت کس کی یاد ہے، کس کا خیال ہے
تجھ پر عیاں ہے سب جو مرے دل کا حال ہے

دیوانہ کوئی اس طرح محوِ جمال ہے
دستِ طلب دراز نہ لب پر سوال ہے

محشر بپا نہ کر دے کہیں میرا شوقِ دید
اب انتظارِ یومِ قیامت محال ہے

نازاں ہوں تیری شانِ کریمی پہ اے کریم
عذرِ گناہ پیش کروں کیا مجال ہے

دیتا ہے نیک و بد کو بلا امتیاز رزق
تیری طرح عطا بھی تری بے مثال ہے

یارب گرے نہ آپ کی نظروں سے آدمی
گر کر بلندیوں سے سنبھلنا محال ہے

میں اس لیے حفیظ پرستارِ حسن ہوں
ہر آئینے میں آئینہ گر کا جمال ہے

عبدالحفیظ خان حفیظ

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

جب ان کے روضے کے دیوار و در کو دیکھتے ہیں
تو عکس و آئینہ، آئینہ گر کو دیکھتے ہیں

سفر کو جب بھی نکلتے ہیں ہم مدینے کے
تو خوشبوؤں میں بسی رہ گزر کو دیکھتے ہیں

قدم قدم پہ ہم اس جلوہ گاہِ رحمت میں
نظر کو، نور کو، دل کو، جگر کو دیکھتے ہیں

زمین و آسماں، آقا، خدا، شبِ معراج
رفاقتوں کے ستارے سفر کو دیکھتے ہیں

وہ ایک نور ہے ایسا کہ جس کے آگے ہم
بجھے بجھے شمس و قمر کو دیکھتے ہیں

حضورؐ گھر میں ہمارے کچھ اس طرح آئے
کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں"

فراقِ طیبہ میں یہ حال ہے کہ ہم رونق
شکستہ دل تو کبھی چشمِ تر کو دیکھتے ہیں

رونق حیات

خالد انعم سے ملاقات

شاہین رشید

کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں کہ وہ زندگی میں کتنی ہی کامیابیاں حاصل کرلیں ان کی پہچان ان کا وہ پہلا کام ہی ہوتا ہے جس نے انہیں شہرت دی ہوتی ہے تو خالد انعم ایک کامیاب اداکار، گلوکار اور آر جے ہیں مگر ان کو دیکھتے ہی ان کا گانا "پیرا ہو" کانوں میں گونجنے لگتا ہے۔ ان سے ہوئی گفتگو نذر قارئین ہے۔

★ "کیسے ہیں خالد انعم صاحب؟"

✻ "الحمدللہ۔"

★ "آپ کو مختلف پروگراموں میں، ڈراموں میں دیکھتے رہتے ہیں۔ مگر کبھی آپ کو سُر میں دیکھا نہیں، کیا میوزک سے ناراضی ہے آپ کی؟"

✻ "اسے آپ میری برائی کہہ لیں یا اچھائی۔ میں یکسانیت سے گھبرا جاتا ہوں۔ میوزک کے لیے میں نے کافی کام کیا۔ خود بھی گایا۔ مگر پھر ایک وقت آیا کہ دل چاہا کہ کچھ اور کرنا چاہیے۔ بس تو پھر کچھ اور کرنے کو دل چاہا تو اسے کم کردیا مکمل طور پر چھوڑا نہیں۔"

★ "میوزک چھوڑنے کی چیز کہاں ہے یہ تو روح میں اتر جانے والی چیز ہے؟"

✻ "بالکل ٹھیک کہا آپ نے، اسی لیے تو میں اپنا یہ شوق ریڈیو کے پروگرام میں اپنے سامعین کو خوب صورت میوزک سنوا کر پورا کرلیتا ہوں۔"

★ "آپ کے سننے والے عموماً" کس قسم کی میوزک پسند کرتے ہیں یا پھر آپ اپنی مرضی سے میوزک کا انتخاب کرتے ہیں؟"

✻ "میوزک تو وہ ہی اچھا ہوتا ہے جو کانوں میں رس گھول دے خواہ وہ آج کے زمانے کا ہو یا گزرے زمانے کا۔ ویسے مجھے تو گزرے زمانے کی موسیقی زیادہ متاثر کرتی ہے اور میں اپنے پروگرام میں اس موسیقی کا پورا بیک گراؤنڈ بھی بتاتا ہوں۔"

★ "لوگ کیا رسپانس دیتے ہیں؟"

✻ "بہت اچھا...... فون کالز کے ذریعے جو کہ عموماً" لائیو ہی ہوتی ہیں۔ پھر ای میلز، فیس بک...... تعریف کرنے والے اور پسند کرنے والے اپنا رسپانس کسی نہ کسی طریقے سے دے ہی دیتے ہیں۔"

★ "آپ کو لوگ ٹی وی کے حوالے سے زیادہ جانتے ہیں۔ تو پہلے اس پر بات کرتے ہیں کہ آپ ٹی وی پہ یا شوبز میں کیسے آئے؟"

✻ "میں نے اپنے فنی سفر کا آغاز تھیٹر سے کیا اور وہ بھی اس زمانے کی معروف فنکارہ یاسمین اسماعیل کی وجہ سے اور یاسمین اسماعیل (مرحومہ) سے ملاقات گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں ہوئی تھی جہاں میں اپنے دوستوں کے ساتھ کسی کام سے گیا تھا۔ تو انہوں نے مجھے ایک انگریزی ڈرامے میں اداکاری کی پیشکش کی جو کہ میں نے قبول کرلی۔"

★ "تو کیا وہ آپ کو جانتی تھیں؟"

✻ "جانتی اس طرح تھیں کہ میں اس زمانے میں جنگل وغیرہ گایا کرتا تھا تو اس حوالے سے وہ مجھے جانتی تھیں لیکن جب ملاقات ہوئی تو نا صرف میں نے ان کے ڈراموں میں کام کیا بلکہ ان کے اسٹیج کے لیے بہت سے گانے گائے ــــ اور کمپوز بھی کیے اور انہی کی حوصلہ افزائی سے پھر مزید کام کرنے کو بھی دل چاہتا تھا۔"

★ "کیسے انکشاف ہوا اپنی صلاحیتوں کا؟"

✻ "اپنی صلاحیتوں کا خود کہاں انکشاف ہوتا ہے۔ یہ احساس تو دوسرے ہی دلاتے ہیں۔ میرے اساتذہ اور میرے دوست بتاتے رہتے تھے کہ تم یہ بھی کرسکتے ہو۔ وہ بھی کرسکتے ہو تو بس پھر کرتا چلا گیا اور راہیں کھلتی چلی گئیں۔ میری تربیت میں اگر میرے والدین کا ہاتھ ہے تو میرے اساتذہ کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔"

★ "مگر اب تو زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ اب اساتذہ میں پہلے جیسی محبت کہاں رہی ہے؟"

✻ "اگر اساتذہ پہلے جیسے نہیں ہیں تو طالب علم بھی تو پہلے جیسے نہیں رہے۔ پہلے تو طالب علم اساتذہ کی آواز سے ڈرتے تھے ان کا احترام کرتے تھے، مگر اب ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔"

★ "آپ کے ہم عصر میں کون کون ہیں جنہوں نے بہت شہرت پائی ہو؟"

✻ "میرے ہم عصر میں تقریباً" سارے ہی لوگوں نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی ہے۔ جب میں نے کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لیا جرنلزم ڈیپارٹمنٹ میں تو وہاں مصباح الحق، ساجد حسن، مظہر عباس، عامر محمود اور شازیہ سکندر بھی زیر تعلیم تھے اور سب سے ہماری کافی اچھی ہیلو ہائے ہوگئی تھی۔ آج آپ دیکھیں کہ سب لوگ کتنے اعلا مقام پر ہیں اور پاکستان کے حوالے سے پوری دنیا میں کتنی شہرت ہے سب کی۔"

★ "اس فیلڈ میں آپ پلاننگ کے ساتھ آئے کیا؟"

✻ "نہیں...... میں نے پلاننگ تو کچھ اور کی تھی۔ مگر ملتا وہی ہے جو قسمت میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ مجھے نیوی میں جانے کا شوق تھا اور میٹرک کے بعد میں نے کیڈٹ کالج پٹارو سے انٹر کیا اور نیوی میں جانے کے لیے ISSB کا امتحان بھی پاس کرلیا اور بس منزل

قریب ہی تھی کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا اور یہ میری زندگی کا ایک ایسا حادثہ تھا کہ میرا زندگی سے ہی دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ بس پھر میں نے نیوی میں جانے کا خیال اپنے دل و دماغ سے نکال ہی دیا اور گریجویشن کے بعد جرنلزم ڈیپارٹمنٹ میں کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور ماسٹرز ڈگری حاصل کی۔"

★ "نیوی میں جانا چاہتے تھے مگر جرنلزم میں ماسٹرز کرنا پڑا، قسمت پر یقین تو سو فیصد ہو گیا ہو گا؟"

* "بالکل سو فیصد قسمت پر یقین ہے لیکن چونکہ ہمیں نہیں پتا کہ ہماری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ اس لیے ہمیں تو محنت کرنی ہے اور اس چیز کو پانا ہے جو اللہ نے ہمارے نصیب میں لکھ دی ہے۔"

★ "بات ادھوری رہ گئی تھی صلاحیتوں کے حوالے سے نکھر نے گے — بڑھنے کے مواقع آپ کو کیسے ملے؟"

* "بڑھنے کے مواقع کچھ اس طرح ملے کہ جب تھیٹر میں کام کرنا شروع کیا تو ٹی وی کے کچھ اور لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں ٹینا ثانی، ساحرہ کاظمی اور علی حیدر وغیرہ شامل تھے تو بس پھر تعلقات بنتے گئے اور ہم آگے بڑھتے رہے۔"

★ "ڈراموں میں بھی انہی کے حوالے سے آئے؟"

* "حوالہ آپ اس طرح کہہ سکتی ہیں کہ سب سے بہت اچھی ہیلو ہائے ہو گئی تھی۔ شہزاد خلیل کا اس زمانے میں بہت نام تھا ان کے ڈراموں میں کام کرنا بڑے اعزاز کی بات ہوتی تھی اور جب انہوں نے مجھے اپنے ڈرامہ سیریل "احساس" میں کام کرنے کے لیے کہا تو میں بہت خوش ہوا تھا۔ انہی کے ڈرامے میں میں نے گانا بھی گایا۔ ساحرہ کاظمی، سلطانہ صدیقی کے لیے بہت کام کیا گانے گائے بھی اور کمپوز بھی کیے اس زمانے میں جاوید اللہ دتہ بہت کام کر رہے تھے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔"

★ "بچوں کے لیے بھی تو آپ نے بہت کام کیا؟"

* "بے شک بچوں کے لیے بھی کافی کام کیا ان کے لیے گانے گائے بھی اور کمپوز بھی کیے۔ تو اس فیلڈ میں میں شروع سے ہی بہت ایکٹو ہوں۔"

★ "جس دور کی آپ بات کر رہے ہیں اس زمانے میں میڈیا آمدنی کا اتنا اچھا ذریعہ نہیں تھا۔ آپ کے ساتھ کیا سلسلہ تھا؟"

* "ایڈورٹائزنگ ایجنسی نے ہمیشہ اچھا ہی پے کیا ہے۔ میں نے کالج لائف میں ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے لیے کام شروع کر دیا تھا تو مجھے یاد ہے کہ جب میں نے پہلا جنگل گایا تو مجھے 800 روپے ملے اور یہ بات ہے غالباً 1977ء کی یا 78ء کی اور میرے خیال میں اس دور کے حساب سے بہت مناسب معاوضہ تھا اور مجھے یاد ہے کہ جب میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا تو تقریباً 25 ہزار کما لیتا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے مالی طور پر کبھی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔"

★ "آپ نے شوبز کے ہر شعبے میں قسمت آزمائی کی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو کامیابی دی۔ آپ کو خود کہاں اچھا لگا کام کر کے؟"

* "مجھے؟..... مجھے ہر جگہ کام کر کے اچھا لگا، کیونکہ میں اسی جگہ پر کام کرتا ہوں جہاں مجھے مزا آتا ہے۔ لیکن پھر بھی اگر میں موازنہ کروں تو سچ کہوں گا کہ مجھے تھیٹر میں کام کر کے بہت مزا آیا اور آتا ہے۔ کیونکہ یہ ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں ہم اپنی بات براہ راست کہہ سکتے ہیں اور براہ راست رسپانس حاصل کر لیتے ہیں۔"

★ "کیا تھیٹر آج بھی مقبول ہے؟"

* "بالکل ہے..... اچھا تھیٹر آج بھی مقبول ہے۔ لوگوں کو ہمیشہ اچھی چیز چاہیے ہوتی ہے اور انہیں جہاں چیز ملتی ہے وہ اس کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ تھیٹر کو جاننے اور سمجھنے والے ہمیشہ اچھے تھیٹر کے خواہش مند رہتے ہیں اور جب ہم انہیں اچھا تھیٹر مہیا کرتے ہیں تو وہ شوق سے دیکھتے ہیں۔"

★ "ریڈیو بھی آپ کے شوق کا حصہ رہا اور ہے۔ اس طرف کیسے آئے؟"

* "میرے دوستوں نے مجھے ایف ایم 107 جوائن کرنے کو کہا اور میں نے ایم ایف جوائن کر لیا۔ میوزک ہمیشہ سے میری کمزوری رہی ہے۔ سو مجھے

ایف ایم جوائن کر کے بہت مزا آیا۔"

★ "آپ تو ٹی وی اور تھیٹر سے وابستہ رہے اور ہیں۔ آپ کو ریڈیو میں مشکل تو پیش نہیں آئی ہو گی؟"

* "ایسی بات نہیں۔ جو بھی شعبہ پہلی مرتبہ جوائن کیا جائے وہ مشکل لگتا ہے اور پھر ریڈیو تو ایسا میڈیا ہے کہ سارا کھیل ہی آواز کا ہے۔ آواز سے متاثر کرنا اور تاثرات قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس نے کامیابی دی..... اور ریڈیو آر جے بننے کے لیے بہت ضروری ہے کہ آپ کے پاس ہر طرح کی معلومات ہوں تاکہ آپ اسے اپنے سامعین کے ساتھ شیئر کر سکیں۔"

★ "ہمارے اپنے ملک کی میوزک بہت عمدہ ہے اور ہمارا پڑوسی ملک بھی اس بات کو تسلیم کرتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ایف ایم پہ اپنے میوزک کی بجائے انڈین میوزک کو ترجیح دیتے ہیں؟"

* "جس قدر انہیں تسلیم کرنا چاہیے ہماری میوزک کو ہمارے شعراء کو وہ نہیں کرتے اور ہر چیز میں ہماری نقل کرتے ہیں۔ ہماری میوزک میں تو انہوں نے مادام نور جہاں اور مہدی حسن کے گانوں کی بہت کاپی کی..... اور جہاں تک ہماری بات ہے تو میں تو اپنے پروگرام میں یہی کوشش کرتا ہوں کہ اپنی ہی میوزک کو ترجیح دوں اور دیتا بھی ہوں اور سب کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔"

★ "کچھ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتائیے؟"

* "میں 29 مئی 1960ء کو کراچی میں پیدا ہوا۔ میرے والد کا تعلق مدراس سے جبکہ میری والدہ کا تعلق سیالکوٹ کی کشمیری فیملی سے تھا۔ قیام پاکستان سے قبل والد صاحب انگریز آرمی میں انجینئر کی پوسٹ میں تھے اور قیام پاکستان کے بعد انہوں نے پاک آرمی کو جوائن کر لیا تھا۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں۔ یعنی تین بھائی اور تین بہنیں اور میں اپنے بہن بھائیوں میں آخری نمبر پر ہوں۔ میرے والد جن کا نام محمد عبدالنعم تھا انہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد پاکستان کسٹمز میں جاب کر لی تھی۔"

★ "آخری اولاد تو والدین کو سب سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ آپ بھی لاڈلے رہے ہوں گے؟"

* "بالکل لاڈلا رہا اور ابھی تک اپنے بہن بھائیوں کا لاڈلا ہوں۔ والدین کے انتقال کے میرے بڑے بھائی نے بالکل اس طرح میرا خیال رکھا جس طرح کوئی اپنی اولاد کا رکھتا ہے۔"

★ "تربیت میں والدین کا کتنا ہاتھ رہا؟"

* "والدین ہی کا تو ہاتھ ہوتا ہے جب تک وہ حیات ہوتے ہیں اور میرے والدین نے بھی میری بہت اچھے انداز میں تربیت کی۔ مجھے پڑھنے کا شوق اور مذہب سے لگاؤ اپنے والدین سے ہی ملا۔ میری والدہ قرآن پاک کی تلاوت بہت خوب صورت انداز میں کرتی تھیں تو جب ان کی تلاوت کانوں تک پہنچتی تھی تو بہت اچھا لگتا تھا۔ پھر میں نے بھی کم عمری میں ترجمے کے ساتھ قرآن پاک پڑھا..... اور والدین کی وفات کے بعد بھائی نے بہت ساتھ دیا بلکہ سب بہنوں اور بھائیوں نے بہت پیار محبت دیا۔"

★ "آج کل میڈیا پہ بہت تنقید ہو رہی ہے کہ یہ اپنا کام ٹھیک طور پر نہیں کر رہا آپ کیا کہیں گے اس بارے میں؟"

* "مجھے نیوز میڈیا سے کچھ گلے شکوے ہیں کہ یہ اپنا کام ٹھیک طور پر نہیں کر رہا۔ پاکستان کن شعبوں میں کم ہے۔ کیا برائیاں ہیں انہیں تو بہت نمایاں کیا جاتا ہے اور یہ اچھی بات بھی ہے لیکن کن شعبوں میں وہ ترقی کر رہا ہے یا اس میں کیا اچھائیاں ہیں اس کو کوئی نہیں بتاتا۔ تو اچھائی، برائی دونوں کے بارے میں بتانا چاہیے۔ بہت سے لوگ بہت اچھا کام بھی کر رہے ہیں۔"

★ "زندگی میں کیا کھویا کیا پایا؟"

* "اللہ کا شکر ہے کہ میں نے زندگی میں بہت کچھ پایا ہے اور زندگی میں لوگوں سے بہت کچھ سیکھا ہے اور آج تک سیکھ رہا ہوں۔ مجھے ہمیشہ بہت اچھے لوگوں کا ساتھ ملا سب سے پہلے میرے والدین، میرے اساتذہ، میری بیوی، میرے دوست احباب، میرے ادبی دوست۔ میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔

دو کا پہاڑہ

سبرین ہسبانی

شاہین رشید

1 "اگر آپ کو خود اپنا نام رکھنے کا اختیار ہوتا تو کون سے دو نام رکھتیں؟"
○ "جو میرے والدین نے رکھا ہے وہ مجھے بہت پسند ہے۔ "سبرین" نام مجھے بہت اچھا لگتا ہے اور نک نیم ہے "صبا" اور "صبا" بھی مجھے بہت پسند ہے۔"
2 "آپ کے دو لکی نمبر؟"
○ "10 اور 9۔ دس ستمبر میری ڈیٹ آف برتھ ہے اور چونکہ یہ نواں مہینہ ہے اس لیے مجھے 10 اور 9 پسند ہیں۔"
3 "دو باتیں جو آپ کو دوسروں میں ممتاز کرتی ہیں؟"
○ "سافٹ اسپوکن ہوں اور جیلسی نہیں ہوتی کسی سے، مجھے نرم لہجے میں بات کرنا اچھا لگتا ہے اور جیلسی میں اس لیے نہیں ہوتی کہ سب کو اللہ تعالیٰ اس کی قسمت کے مطابق ہی عطا کرتا ہے۔"
4 "دو تاریخی ادوار جس میں آپ جانا چاہتی ہیں؟"
○ "میں جانا چاہتی ہوں مرزا غالب کے زمانے میں کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ میرے جسم میں پرانی روح ہے اور میں اس زمانے میں تھوڑی سی ان فٹ ہوں اس لیے مجھے پرانے دور میں ہونا چاہیے اور مجھے انگریزوں کا بھی پرانا دور بہت اچھا لگتا ہے ان کی پرانی موویز مجھے بہت متاثر کرتی ہیں ان کے لباس، ان کا رہن سہن اور ان کا فیملی سسٹم جو کہ اب میرے خیال میں ان کے یہاں نہیں رہا۔ بہت اچھا لگتا ہے۔"
5 "کوئی دو افراد جن کے ایس ایم ایس کے جواب آپ فوراً دیتی ہیں؟"
○ "ایس ایم ایس بہت کم کرتی ہوں اور گھر سے کسی کا بھی ایس ایم ایس آئے "فوراً" جواب دیتی ہوں۔"
6 "کوئی دو بری عادتیں جن سے آپ نجات چاہتی ہیں؟"
○ "مجھ میں فیصلہ کی قوت بہت کم ہے اس سے نجات چاہتی ہوں اور کوئی بھی کام مسلسل نہیں کر سکتی۔"
7 "دو جھوٹ جو آپ اکثر بولتی ہیں؟"
○ "جھوٹ نہیں بولتی۔ یہ میری اچھی عادت ہے۔"
8 "اپنے بارے میں کن دو باتوں کو سن کر آپ کو غصہ آجاتا ہے؟"
○ "اکثر میری امی مجھے کہتی ہیں کہ کاش تم میری بڑی بیٹی ہوتیں تو شاید میری پوزیشن کچھ اور ہوتی مجھے اس بات پر غصہ آتا ہے کہ اس میں میرا کیا قصور ہے اور دوسری یہ کہ گھر میں کوئی اونچ نیچ ہو جائے، کوئی لڑائی جھگڑا ہو جائے تو میں خاموش بیٹھی رہتی ہوں اور گھر والے کہتے ہیں کہ یہ تو "دیوار" ہے اس کو کچھ سنائی نہیں دے رہا۔"
9 "حالات حاضرہ کے دو اینکرز جو سفارش سے آئے ہیں آپ کے خیال میں؟"
○ قہقہہ "مسئلہ یہ ہے کہ مجھے نام نہیں آتے۔ شکلیں یاد رہ جاتی ہیں۔ اس لیے آپ کو کیسے بتاؤں کہ کون ہیں۔"
10 "مارننگ شو کے دو بہترین اینکرز؟"
○ "ہمیشہ سے "نادیہ خان" پسند ہیں اور "فرح حسین" جو اے ٹی وی پہ آتی ہیں۔"
11 "دو شخصیات جن پر آپ بھروسہ کر سکتی ہیں؟"
○ "صنم بلوچ میری بہن..... اور میری امی۔"
12 "دو مشہور شخصیات جن کے ساتھ دنیا گھومنا چاہتی ہیں؟"
○ "صنم بلوچ کے ساتھ اور اپنی امی کے ساتھ۔"
13 "دنیا کی دو ایسی شخصیات جن کی قسمت پر آپ کو رشک آتا ہے؟"
○ "شاہ رخ خان۔ اتنا نام پیدا کرنا بغیر کسی کی سپورٹ کے اتنا آگے تک جانا بڑی بات ہے اور امیتابھ بچن۔"
14 "دو تہوار جو اہتمام سے مناتی ہیں؟"
○ "عید اور گھر میں کسی کی برتھ ڈے ہو تو۔"
15 "دن کے چار پہر میں سے کون سے دو پہر اچھے لگتے ہیں؟"
○ "صبح تو اٹھتی نہیں اس لیے بھول ہی گئی ہوں کہ صبح کیسی ہوتی ہے شام کا ٹائم اچھا لگتا ہے اور پھر رات کا۔"
16 "پہلی ملاقات میں کون سے دو جملے لازمی بولتی ہیں؟"
○ "السلام علیکم کیسی/ کیسے ہیں آپ۔"
17 "دو کھانے جن کو کھا کر کبھی بور نہیں ہوتیں؟"
○ "دال چاول اور چاول۔"
18 "دو افراد جن سے معافی مانگنے میں شرم محسوس نہیں کرتیں؟"
○ "اپنے فرینڈز سے اور گھر کے افراد سے۔"
19 "دو خواہشات جو ابھی تک پوری نہیں ہوئیں؟"
○ "گھر بنانے کی خواہش وہ بھی اپنے پیسوں سے اور گاڑی چلانی نہیں آتی۔"
20 "دو پسندیدہ کھلاڑی جن کی وجہ سے کرکٹ دیکھتی ہیں؟"
○ "میں کرکٹ میچ دیکھتی ہی نہیں اس لیے نام بھی نہیں پتا۔"
21 "دو چیزیں جنہیں لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"
○ "فون اور اے ٹی ایم کارڈ۔"
22 "دو الفاظ جو بہت زیادہ استعمال کرتی ہیں؟"
○ "Seriously اور ارے واہ۔"
23 "دو پسندیدہ صحافی؟"
○ "کوئی نہیں۔"
24 "سات دنوں میں سے کون سے دو دن اچھے لگتے ہیں؟"
○ "اتوار جو کہ چھٹی کا دن ہوتا ہے اور پیر کیونکہ کام پہ جانا ہوتا ہے۔"
25 "بارہ مہینوں میں سے کون سے دو مہینے اچھے لگتے ہیں؟"

○ "فروری ..... دسمبر۔"

26 "اپنے گھر میں دو پسندیدہ جگہیں؟"

"میرا اپنا کمرہ اور بس اپنا ہی کمرہ کبھی کبھی ڈرائننگ روم بھی اچھا لگتا ہے۔"

27 "گھر کے دو کام جن کو نہ کرنے سے گھر والوں سے ڈانٹ پڑتی ہے؟"

○ "گھر کے کام نہیں کرتی۔ نوکروں کو لک آفٹر نہ کروں تو امی سے ڈانٹ پڑتی ہے۔"

28 "دو ایسی شخصیات جن پر کسی قسم کا شک نہیں کر سکتیں؟"

○ "صنم بلوچ اور اپنی امی۔"

29 "دو سیاست دان جو ملک کے لیے بوجھ ہیں؟"

○ "سارے بوجھ ہیں۔ آپ دو کی بات نہ کریں۔"

30 "کن دو ممالک کی ترقی سے متاثر ہیں؟"

○ "ملائیشیا اور انڈیا جو کہ ہم سے بہت آگے ہیں۔"

31 "کون سے دو رنگ کے لباس پسند ہیں؟"

○ "کالا اور سفید۔"

32 "اپنے ملک کے دو پسندیدہ شہر؟"

○ "اسلام آباد اور کراچی۔"

33 "اگر ایک دن کے لیے ساری دنیا سو جائے' سوائے آپ کے تو آپ کیا دو چیزیں لیں گی؟"

○ "مطلب چوری کرنا چاہوں گی ..... نہیں کچھ نہیں بلکہ میں بھی سو جاؤں گی۔"

34 "کن دو تاریخی شخصیات سے ملنے کی خواہش ہے؟"

○ "مدر ٹریسا اور نیلسن منڈیلا۔"

35 "لڑکوں کے لیے کوئی دو نصیحتیں؟"

○ "ٹائم ضائع نہ کریں لڑکیوں کے پیچھے اور پڑھائی میں دھیان دیں۔"

36 "سال کے چار موسموں میں سے کون سے دو موسم پسند ہیں؟"

○ "بہار اور بارش۔"

37 "لڑکوں کی دو ناپسندیدہ باتیں یا عادتیں؟"

○ "زیادہ تر لڑکے لڑکیوں کو بلیک میل کرتے ہیں اور وہ لڑکے برے لگتے ہیں جو لڑکیوں کی کمائی پر چلتے ہیں اور جب کوئی بوائے فرینڈ اپنی گرل فرینڈ کو کھانے پہ لے جائے اور بل لڑکی پے کرے تو بہت ہی غلط حرکت ہے۔ میری فرینڈ کے ساتھ ایسا ہوا اور میں نے اس کو کہا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ جوتا اتار کر ماروں اسے شرم نہ آئی تم سے بل پے کراتے ہوئے۔"

38 "صبح اٹھتے ہی کون سے دو کام پہلے کرتی ہیں؟"

○ "پانی پیتی ہوں اور سیل فون چیک کرتی ہوں۔"

39 "دو مرد جنہوں نے آپ کی زندگی بنانے میں اہم رول ادا کیا ہو؟"

○ "کوئی بھی نہیں کہوں گی تو غلط ہو گا۔ میرے دونوں بھائیوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔ اگر وہ منع کرتے یا حوصلہ افزائی نہ کرتے تو ہم کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔"

40 "آپ کے نزدیک دنیا کے دو خوب صورت ترین مرد؟"

○ "اس پر کبھی غور سے سوچا نہیں نہ کسی کو غور سے دیکھا ہے۔"

41 "دو پسندیدہ پروفیشن؟"

○ "ٹیچنگ اگر میں ٹیچر ہوتی تو بہت اچھی ٹیچر ہوتی اور ایکٹنگ' مطلب شوبز کی فیلڈ۔"

42 "دنیا کے دو بہترین سیاست دان آپ کی نظر میں؟"

○ "نیلسن منڈیلا اور ملائشیا کے مہاتیر محمد۔"

43 "دو چیزیں جن پر آپ بہت خرچ کرتی ہیں؟"

○ "پرفیومز اور جوتے' بیگز۔"

44 "اپنے دو ڈرامے جن کو فراموش نہیں کر سکتیں؟"

○ "میری ادھوری محبت اور "ہالی" جو کہ سندھی تھا اور پہلا تھا جس نے شہرت دی۔"

45 "دو کردار جو آپ کرنا چاہتی ہیں؟"

○ "تھر کی عورت کا کردار میں کرنا چاہتی تھی اور "سنجا" میں مجھے موقع ملا۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں۔"

46 "دو قیمتی چیزیں جو آپ خریدنا چاہتی ہیں؟"

○ "گھر اور بس گھر۔"

47 "دو فیصلے جو غلط ثابت ہوئے ہوں؟"

○ "سارے ہی غلط ثابت ہوئے ہیں۔" قہقہہ

48 "کن دو باتوں سے بچنے کی کوشش کرتی ہیں؟"

○ "اسکینڈلائز ہونے سے اور کوشش کرتی ہوں کہ کسی کو مجھ سے کوئی پریشانی نہ ہو۔"

49 "پانچ وقت کی نمازوں میں کون سے دو وقت کی نمازیں لازمی پڑھتی ہیں؟"

○ "مغرب اور عصر کوشش کر رہی ہوں کہ پانچوں وقت کی پڑھوں۔"

50 "دو افراد جن پر بہت خرچ کرتی ہیں؟"

○ "امی پر اور چھوٹی بہن اور اپنے بھانجے پر۔"

51 "دو لوگ جن کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

○ "دو نہیں کوئی نہیں۔"

52 "کن دو لوگوں کی تعریف میں کنجوسی سے کام نہیں لیتیں؟"

○ "میں سب کی تعریف کرتی ہوں اور جن کی بات نہیں پسند آتی ان کی تعریف نہیں کرتی۔"

53 "دو پسندیدہ مشروب؟"

○ "پانی' جب میں پانی پیتی ہوں تو لوگ کہتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ پتا نہیں تم کون سا لذیذ مشروب پی رہی ہو اس وقت ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہم بھی پیئں پانی اور صرف پانی۔"

54 "دھنک کے سات رنگوں میں آپ کے دو پسندیدہ رنگ؟"

○ "رنگ سارے ہی اچھے ہوتے ہیں۔"

55 "آج کے دور کے دو پسندیدہ گلوکار؟"

○ "راحت فتح علی اور سنیدی چوہان۔"

56 "دو باتیں جن سے آپ کا موڈ خراب ہو جاتا ہے؟"

○ "ٹائم پہ کھانا نہ بنا ہوا ہو اور جب وقت پر کام شروع نہ ہو اور بہت زیادہ انتظار کرنا پڑے۔"

57 "شادی کی دو رسمیں جو انجوائے کرتی ہیں؟"

○ "سندھ کی ساری رسمیں پسند ہیں اور سب انجوائے کرتی ہوں۔"

58 "افسردگی میں کن دو لوگوں کے ساتھ دکھ بانٹنا اچھا لگتا ہے؟"

○ "کسی کے ساتھ نہیں کمرہ بند کر کے بیٹھ جاتی ہیں۔"

59 "اپنے لباس میں کن دو باتوں کا خاص خیال رکھتی ہیں؟"

○ "دھلا ہوا ہو اور برابر استری کیا ہوا۔"

60 "کن دو افراد کے ساتھ بارش انجوائے کرتی ہیں؟"

○ "گھر والوں کے ساتھ۔"

61 "کن دو کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"

○ "سارے کیڑوں سے ڈر لگتا ہے۔"

62 "دو ریسٹورنٹ جہاں کھانا کھانا پسند کرتی ہیں؟"

○ "باربی کیو ٹونائیٹ اور کوکل۔"

63 "اپنے ملک کے دو پسندیدہ شاپنگ مال؟"

○ "پارک ٹاور اور فورم۔"

64 "دو چینلز جو آپ شوق سے دیکھتی ہیں؟"

○ "ڈرامہ اور سماء' سما اس لیے دیکھتی ہوں کہ صنم بلوچ مارننگ شو کر رہی ہے۔"

65 "دو تبدیلیاں جو آپ اپنی شخصیت میں لانا چاہتی ہیں؟"

○ "کہ میں فیصلے کر سکوں اور مزید ڈراموں میں کام کروں۔"

66 "کھانے کی ٹیبل پہ کون سی دو چیزیں نہ ہوں تو کھانے کا مزا نہیں آتا؟"

○ "کھانے پینے کی بہت زیادہ شوقین نہیں ہوں۔ بس برابر سالن روٹی ہونی چاہیے۔"

67 "کن دو شخصیات کو اغوا کرنا چاہیں گی اور تاوان میں کیا وصول کریں گی؟"

○ "میرا بس چلے تو سب سیاست دانوں کو اغوا کر کے سب سے پیسے وصول کر کے قومی خزانے کو بھر دوں۔"

☆ ☆

آواز کی دنیا سے

منہاج علی عسکری

شاہین رشید

آواز کی دنیا ایک بہت ہی وسیع دنیا ہے اور جو بھی اس دنیا سے وابستہ ہوتا ہے وہ وہاں وہاں سنا جاتا ہے جہاں جہاں اردو سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ F.M کے آر جے اب اسی طرح مقبول ہیں جس طرح ٹی وی کے لوگ اور پھر آواز کی دنیا سے وابستہ لوگ اب صرف ریڈیو تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ ٹی وی میں بھی اپنا ٹیلنٹ دکھا رہے ہیں۔

منہاج علی عسکری جو کہ ایف ایم 105 سے وابستہ ہیں نا صرف آواز کا جادو جگا رہے ہیں بلکہ آپ انہیں مختلف ڈراموں میں بھی پرفارم کرتا ہوا دیکھ رہے ہوں گے۔ ان سے کچھ گفتگو ہوئی..... جو یقیناً" آپ کو پسند آئے گی۔

★ "کیسے ہیں منہاج علی عسکری صاحب؟"

※ "جی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"

★ "کچھ بتائیں اپنے بارے میں؟"

※ "میرے والد صاحب کا تعلق لکھنؤ سے اور والدہ کا تعلق امروہا سے ہے جبکہ ہمارے آباؤ اجداد کا تعلق ہندوستان سے ہے اور میرا تعلق پاکستان سے ہے کیونکہ میں کراچی میں پیدا ہوا 4 ستمبر 1984ء میری دو بہنیں ہیں اور ایک چھوٹا بھائی ہے۔ میرے والد صاحب حیات نہیں ہیں 2001ء میں ان کا انتقال ہو گیا تھا اور 2001ء سے لے کر اپنے آپ کو بنانے میں، مقام حاصل کرنے میں دن رات ایک کیا ہے اور اللہ کا ساتھ اور والدہ کی دعاؤں سے یہ مقام حاصل کیا ہے۔"

★ "2001ء میں والد کا انتقال ہوا اور آپ 1984ء کی پیدائش ہیں تو آپ تو اس وقت کافی چھوٹے ہوں گے تو کافی جدوجہد میں وقت گزرا ہوگا؟"

※ "جی میں سترہ سال کا تھا جب والد صاحب کا انتقال ہوا۔ ددھیال میں میرا کوئی تھا نہیں۔ میرے ایک تایا تھے جن کا والد سے پہلے انتقال ہو گیا تھا اور نانی اسلام آباد میں تھیں۔ دادا دادی بھی وفات پا چکے تھے۔ جبکہ میرا ننھیال کافی بڑا ہے۔ میری نو خالائیں ہیں۔ ایک ماموں اور نانا نانی بھی حیات تھے۔ ننھیال میں سب نے بہت سپورٹ کیا لیکن میں زیادہ تر اپنے نانا نانی کے ساتھ ہی رہا..... والدہ اگرچہ ہاؤس وائف تھیں لیکن میری تعلیم و تربیت میں ان کا بہت ہاتھ رہا۔"

★ "اور شادی کب ہوئی؟ پسند سے ہوئی؟"

※ "میری شادی کو تقریباً" تین سال ہو گئے ہیں اور میری پسند سے ہوئی، ہماری لو میرج ہے 2002ء میں ثنا سے میری ملاقات ہوئی..... پھر منگنی ہوئی اور پھر شادی اور الحمد للہ ہم بہت اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔"

★ "کہتے ہیں کہ لو میرج کامیاب نہیں ہوتی؟"

※ "الحمد للہ ہماری تو کامیاب ہے۔ ہم ایک دوسرے کو کافی عرصے سے جانتے ہیں اور ہر ایک کا زندگی گزارنے کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ اگر کوئی ایک یا دو لو میرج ناکام ہوئیں تو ضروری نہیں کہ سب ہی ناکام ہوں..... میں بہت سی ایسی فیملیز کو بھی جانتا ہوں جن کی ارینج میرج تھی مگر ناکام ہو گئی۔"

★ "ریڈیو ایف ایم میں کب سے ہیں اور کیسے شوق ہوا آپ کو؟"

※ "کب سے ہوں یہ تو مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں ہے۔ لیکن شوق اس طرح ہوا کہ میرے ایک جاننے والے تھے جو ایک طرح سے ہمارے فیملی فرینڈ تھے وہ ریڈیو پہ کام کرتے تھے..... ایک دن ان سے میری ملاقات ہوئی اور ان سے میں نے ریڈیو کے حوالے سے اپنے آئیڈیاز شیئر کیے تو کہنے لگے کہ تم ریڈیو آجاؤ اور پروگرام منیجر سے اپنے آئیڈیاز شیئر کرو اگر انہیں تمہارے آئیڈیاز پسند آ گئے تو تمہیں پروگرام ملنا شروع ہو جائیں گے.....

مجھے ایف ایم 103 کے پروگرام منیجر سے ملنا تھا۔ مگر پھر بات آئی گئی ہو گئی اور میں بھی اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔ دو ڈھائی مہینے کے بعد مجھے اچانک یہ بات یاد آئی تو میں نے سوچا کہ چلو چلتے ہیں پروگرام منیجر کے پاس..... اس وقت ایف ایم 103 کے پروگرام منیجر شہزاد صاحب تھے میں نے ان کو آئیڈیا دیا ورلڈ میوزک کا اور ورلڈ میوزک میں بھی وہ میوزک جو ہمارے کراچی کی سڑکوں کا میوزک ہے جیسے کوئی بانسری بجا رہا ہے۔ کوئی تان پورہ بجاتا ہوا نظر آتا ہے یا کوئی اک تارہ بجاتا ہوا نظر آتا ہے تو انہیں ریڈیو پہ لے کر آئیں اور ان کا ٹیلنٹ سب کے سامنے لے کر آئیں۔ انہیں یہ آئیڈیا بہت پسند آیا اور اس کے لیے انہوں نے گو ہینڈ دے دیا اور اس میں مجھے خاصی کامیابی حاصل ہوئی..... اور مجھے مزید پروگرام ملنے لگے۔"

★ "اسٹریٹ ٹیلنٹ میں لوگ خود بھی تو آپ کے پاس آنا شروع ہو گئے ہوں گے؟"

※ "نہیں..... ایسا نہیں تھا بلکہ ٹیلنٹ میں خود ڈھونڈ کر لاتا تھا۔ جیسے اگر میں بہادر آباد میں ہوں اور وہاں مجھے کوئی بانسری بجاتا ہوا نظر آتا تھا تو میں اس کو کہہ دیتا تھا کہ بھائی آپ ریڈیو پہ آجائیں..... تو اس طرح میں ٹیلنٹ کو خود ڈھونڈتا تھا۔ پھر جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ مجھے مزید پروگرام ملنے لگے۔ مگر چھ آٹھ مہینے کے بعد کچھ اختلافات کی وجہ سے میں نے ریڈیو چھوڑ دیا..... اور نیشنل اکیڈمی آف پرفارمنگ آرٹ (N.A.P.A) جوائن کر لیا..... میں اپنے خاندان کا واحد فرد تھا کہ جس نے ناپا میں داخلہ لیا کیونکہ ہماری فیملی میں کوئی بھی میڈیا سے وابستہ نہیں تھا اور جب کوئی میڈیا میں نہیں ہوتا تو پھر سب لوگ میڈیا کو برا ہی سمجھتے ہیں۔"

★ "اچھا..... پھر تو آپ کو سب نے روکا ہوگا؟"

※ "بالکل..... لیکن میری خوبی کہہ لیں یا خامی میں کبھی کسی سے ڈرتا نہیں ہوں۔ اسے آپ میری خود غرضی بھی کہہ سکتی ہیں اور میری عقلمندی بھی..... کہ جو میں کرنا چاہتا ہوں میں وہی کرتا ہوں خواہ وہ غلط ہو یا

صحیح۔ اگر وہ صحیح ہے تو میرے لیے اچھا ہو گا اور اگر غلط ہو گا تو میرے لیے تجربہ ہو گا۔ تو میں اپنے فیصلے خود کرنے کا عادی ہوں۔۔۔۔ چونکہ میں بہت کم عمری میں یتیم ہو گیا تھا اس لیے ہمیشہ سے اپنے فیصلے خود کرتا ہوں۔۔۔۔ لیکن جب میں نے "ناپا" میں داخلہ لینا تھا تو میں نے اپنے نانا سے جو کہ ریٹائرڈ ایس ایس پی ہیں اور وہ ہندوستان میں بھی پولیس میں تھے اور انہیں اس فیلڈ سے خاصی دلچسپی تھی تو جب میں نے ان کو ایڈمیشن کا بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ بالکل تم اپنا شوق پورا کرو اور تمہیں اپنا ہر شوق پورا کرنا چاہیے۔

پھر میں نے اپنی والدہ کو بتایا انہوں نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا اور مجھے پوری طرح سپورٹ کیا۔۔۔۔ ناپا میں تین سال پڑھائی کی اور ٹیوشن پڑھا کر اپنا خرچ خود اٹھایا۔۔۔۔ پھر 105 ایف ایم نے مجھے آفر دی کہ آپ ہمارے یہاں سے پروگرام کریں۔۔۔۔ اس وقت مجھ پر کچھ پابندیاں تھیں' ادارے والوں نے بھی منع کیا ہوا تھا کہ آپ کو کہیں کام نہیں کرنا۔ لیکن جب ایف ایم 105 سے آفر آئی تو میں نے اپنے ادارے والوں سے اجازت لی اور ایف ایم 105 کو جوائن کر لیا اور آج تک میں ایف ایم 105 میں ہی ہوں اور ناپا سے میں نے گریجویشن کی۔"

★ "ایف ایم 105 سے آپ کے پروگرام کب کب ہوتے ہیں اور ان کے فارمیٹ کیا ہیں؟"

✻ "میرا ایک پروگرام رات کو دس بجے سے بارہ بجے تک ہوتا ہے اور یہ شو ریڈیو براڈ کاسٹر سے ملاقات کا ہوتا ہے اور یہ پیر کے دن ہوتا ہے اس میں ہم مختلف چینلز کے براڈ کاسٹرز کو مدعو کرتے ہیں۔ یہ ہمارے یہاں بڑی بدقسمتی ہے۔ کہ نہ ٹی وی چینل پہ نہ کسی ریڈیو ایف ایم پہ کسی دوسرے چینل کے لوگوں کو نہیں بلا سکتے اور نہ ہی ان کے بارے میں بات کر سکتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے یہ بات کبھی بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔۔۔۔ اور اسی باؤنڈریز کو میں نے اپنے چینل پہ توڑنے کی کوشش کی ہے اور اس میں ادارے کے لوگوں نے میرا ساتھ دیا۔۔۔۔ اور میں اپنے اس پروگرام میں مختلف ایف ایم کے براڈ کاسٹرز کو مدعو کرتا ہوں۔۔۔۔

دو پروگرام ہے جمعرات اور بدھ کو ہوتے ہیں اس میں ہم سامعین کو معلومات دیتے ہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور ایک شو ہے جو رات کو ایک بجے ہوتا ہے ہفتہ کے دن جس کا نام ہے "لیٹ نائیٹ ہورر شو" Late night Horror show اس میں لوگ اپنے واقعات سناتے ہیں اور جنات کے بارے میں پوری دنیا کے مذاہب میں ذکر ہے اس کے بارے میں بتاتے ہیں اور یوٹیوب پہ جو میٹریل ہوتا ہے۔ جنات پہ جو ریسرچ ہو رہی ہیں اس کے بارے میں بتاتے ہیں اور دو گھنٹے کے اس پروگرام میں میوزک بھی نہیں ہوتا ہے۔ صرف باتیں ہی باتیں ہوتی ہیں۔"

★ "تو اس کو سننے والے لوگوں کی تعداد ہے؟"

✻ "اس کے سننے والے ماشاء اللہ پوری دنیا میں ہیں۔ 50 ملکوں میں یہ سنا جاتا ہے اور کراچی کا تقریباً ہر بندہ یہ پروگرام سنتا ہے۔"

★ "ایف ایم کا جب ٹرینڈ چلا تو سب سے پہلا چینل ایف ایم 100 تھا۔ پھر ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ آج کل آپ کے خیال میں سب سے اچھا ایف ایم کون سا ہے؟"

✻ "کوئی بھی اچھا نہیں ہے۔ سب بے کار ہیں۔۔۔۔ وجہ یہ ہے کہ 80 فیصد چینل انڈین گانے چلاتے ہیں اور 20 فیصد انگریزی گانے چلاتے ہیں۔ پاکستانی ثقافت' پاکستانی گانے اور پاکستان سے متعلق کچھ بھی نہیں ہوتا ان چینلز پر۔"

★ "یعنی آپ کے خیال میں خالصتاً" پاکستانی چینل کوئی بھی نہیں ہے۔ تو پھر آپ نے کچھ کیا اس سلسلے میں اور غلطی پہ کون ہے؟"

✻ "جی ہاں خالصتاً" پاکستانی چینل کوئی بھی نہیں ہے۔ بدقسمتی سے ایف ایم 101 جو کہ ریڈیو پاکستان کا چینل ہے وہ بھی نہیں ہے۔۔۔۔ وہاں بھی انڈین گانے چل رہے ہوتے ہیں۔۔۔۔ اگر کوئی انڈین براڈ کاسٹنگ چینل ہو اور وہاں پاکستانی گانے چل رہے ہوں تو کتنا عجیب لگے گا۔ اس طرح امریکن ریڈیو اسٹیشن ہو اور وہاں پاکستانی گانے چل رہے ہوں۔ کیا ایسا ممکن ہے؟۔۔۔۔ ایسا ممکن نہیں ہے۔ تو جب ریڈیو پاکستان سے انڈین گانے چل رہے ہوں اور پی ٹی وی سے انڈین مووی آ رہی ہو تو کتنا عجیب لگے گا۔۔۔۔

اس میں ہمارے ادارے کی بھی غلطی ہے اور ہمارے سننے والوں کی بھی غلطی ہے۔۔۔۔ ہمارے سننے والے بھی انڈین گانوں کی ہی فرمائش کرتے ہیں۔۔۔۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انڈین میوزک پہ پابندی ہو لیکن ہماری پہلی ترجیح ہماری اپنی میوزک ہونی چاہیے اور خاص طور پر ریڈیو پاکستان سے تو پاکستانی میوزک ہی چلنا چاہیے۔"

★ "موویز تو چلیں ان کی اچھی ہوتی ہی ہیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ میوزک ہماری زیادہ اچھی ہے۔ پھر کیوں ہم انڈین میوزک کو اتنا پسند کرتے ہیں؟"

✻ "پتا ہے مسئلہ کیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ہم سب ہیپو کریٹس ہیں ایک طرف تو ہم کہتے ہیں کہ "شیلا کی جوانی" کا زبردست گانا ہے اور دوسری طرف ہم کہتے ہیں کہ دیتا ملک یہ کیا کر رہی ہے۔ یہ بہت بڑی بحث ہے جو بہت سالوں سے چلی آ رہی ہے۔ اور اس طرح کی بحث ساری دنیا میں ہوتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں اے لیول کر رہا تھا تو اسکول سے تو ہمارے اسکول میں ہر ہفتے ایک ایکٹوٹی ہوتی تھی کہ ہم کسی گراؤنڈ میں جا کر پودا لگاتے تھے یا کہیں جا کر صفائی کرتے تھے یا کہیں جا کر کسی کی مدد کرتے تھے۔ لیکن اب اسکولوں میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے بچے واقف نہیں ان باتوں سے اور نہ ہی والدین ایسا کچھ سکھاتے ہیں۔۔۔۔ ایک طرف تو والد صاحب بچے سے کہتے ہیں کہ بیٹا روڈ پر گندگی نہیں کرنی چاہیے اور دوسری طرف اس کو نصیحت کرتے ہی گاڑی کا شیشہ کھولیں گے اور چیونگم کا ریپر پھینک دیں گے۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم بولتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔"

★ "ریڈیو کے علاوہ کیا کرتے ہیں' میرا مطلب ہے کہ ذریعہ معاش کیا ہے آپ کا؟"

✻ "میں ایک پروفیشنل ایکٹر ہوں میں نے اداکاری سیکھی ہوئی ہے اور میں اداکاری کرتا ہوں میرے پانچ چھ ڈرامے آن ایئر آ چکے ہیں۔۔۔۔ اور آج کل ایک سٹ کام چل رہا ہے "لائٹ آن ہے" اس میں نہ کوئی اسکرپٹ ہوتا ہے نہ ہی ڈائیلاگ ہوتے ہیں نہ ہی ہمیں پتا ہوتا ہے کہ ہم کیا کرنے والے ہیں سب کچھ فی البدیہہ ہوتا ہے۔ گیم شو ٹائپ کا ہوتا ہے اور ہم اس میں گیم کھیلتے ہیں سب کچھ حاضرین کے سامنے ہو رہا ہوتا ہے۔

یہ ہم نے شروع کیا تھا "پی اے سی سی" میں اور

ایک برانڈ کے ساتھ پانچ مختلف چینلز کے لیے کیا "لائیٹ آن ہے" کے نام سے اور اب یہ "جیو" سے آرہا ہے اور ریڈیو تو چل ہی رہا ہے تو یہ فیلڈ ہی میرا ذریعہ معاش ہے۔"

★ "ریڈیو پہ لائیو پروگرام ہی ہوتے ہیں۔ تو کبھی لائیو پروگرام میں کوئی گڑبڑ ہوئی۔ کچھ غلط بول گئے ہوں؟"

✳ "لائیو شو میں دو باتیں ہوتی ہیں Respect کا ایلیمنٹ بھی ہوتا ہے اور ایک Funny ایلیمنٹ ۔۔۔ تو لائیو پروگرام میں کھانسی بھی آجائے تو بہت سارے لوگوں کے لیے فنی مومنٹ ہو جاتا ہے۔ لائیو شو بہت مزے دار ہوتا ہے اور جو لائیو شو کرے پھر اس کو ریکارڈ پروگرام کا مزا نہیں آتا۔۔۔ میرے لیے ریڈیو شو کوئی شو نہیں ہے۔ بلکہ ریڈیو میرے لیے ایک ایسی جگہ ہے جہاں بیٹھ کر میں اپنے ہزاروں دوستوں سے' فیملی ممبرز سے باتیں کر رہا ہوں اور ان سے آئیڈیاز شیئر کر رہا ہوں۔۔۔ ایسے ہی جیسے ڈرائننگ روم میں بیٹھ کر ہم آپس میں بات کرتے ہیں۔"

★ "کم عمری میں والد کے سائے سے محروم ہوئے۔ جدوجہد بھی کی مزاج پہ اثر پڑا؟"

✳ "مزاج اللہ کا شکر ہے ہمیشہ اچھا ہی رہا۔ کسی کو کبھی تکلیف نہیں دی۔ گھر میں فیملی کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ذرا کم ہی ملتا ہے کیونکہ مصروفیات بہت زیادہ ہوتی ہیں۔۔۔ اور گھر میں میں عموماً" خاموش رہتا ہوں اور میرے گھر والوں کو مجھ سے شکایت ہے کہ میں اتنا خاموش کیوں رہتا ہوں۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ میں دن میں تقریباً" اٹھارہ گھنٹے کام کرتا ہوں۔ میں صبح نو بجے گھر سے نکلتا ہوں اور میری واپسی رات کے تین سے چار بجے تک ہوتی ہے۔۔۔ تو زیادہ وقت تو میرا باہر ہی گزرتا ہے۔"

★ "غصے کے تیز ہیں؟"

✳ "میں بہت فرینڈلی انسان ہوں۔ مجھے غصہ نہیں آتا ۔۔۔ کوئی ایسا واقعہ ہو جائے کہ جو میری مرضی کے خلاف ہو تو پھر غصہ آجاتا ہے ورنہ نہیں آتا۔"

★ "زندگی کو کس انداز میں دیکھتے ہیں؟"

✳ "میری زندگی کے کچھ رولز ہیں نہ میں کسی کو جج کرتا ہوں اور نہ ہی میں کسی کو اس بات کی اجازت دیتا ہوں کہ وہ مجھے جج کرے۔ ہمارے ہاں بہت آسانی سے بول دیا جاتا ہے کہ یہ پاگل ہو گیا ہے۔ اس کے پاس بہت پیسہ آگیا ہے۔ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔۔۔ اور ہم بہت اچھے ہیں۔ تو میں اپنی بیوی ثنا اپنی والدہ اور اپنے بھائی سے یہی کہتا ہوں کہ جو آج کا دن ہے وہ ہمارا ہے۔ جو کل تھا وہ بھی ہمارا ہے اور آنے والا کل بھی ہمارا ہی ہو گا۔ لیکن اس کے لیے ندیدے ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ سب کچھ آج ہی مل جائے اور جو کوئی ہمارے لیے ریمارکس دیتا ہے دینے دیں۔ کیونکہ ہم جو ہیں وہ ہمیں زیادہ بہتر طریقے سے پتا ہے۔"

★ "یہ مقام حاصل کرنے کے لیے بہت محنت کی یا کچھ محنت کی؟"

✳ "آج میں اور میری بیگم ثنا جس مقام پر ہیں یہ ہمیں اس فیلڈ میں آتے ہی نہیں ملا ہم دونوں نے محنت کی اور میں نے تو بہت ہی زیادہ محنت اور جدوجہد کی ہے اور ثنا نے لڑکی ہونے کے حساب سے محنت کی ہے اور میں فخر سے کہوں گا کہ میری بیوی بہت ٹیلنٹڈ ہے۔۔۔ تو زندگی کا فلسفہ یہ ہے کہ زندگی بہت سمپل ہے۔ ہم اسے مشکل بنانا چاہیں گے تو یہ مشکل بن جائے گی۔"

★ "اور کچھ کہنا چاہیں گے اس انٹرویو کے حوالے سے؟"

✳ "نہیں کچھ نہیں' آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے انٹرویو کے قابل سمجھا اور میرا تفصیلی انٹرویو کیا۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے ــــــ منہاج علی عسکری سے اجازت چاہی۔

✡ ✡

مجھ سے ملیے

انیلا کرن

(1) تاریخ پیدائش/اسٹار؟
○ "23 جنوری/دلو۔"
(2) "خدا سے تعلق؟"
○ "بہت قریبی اور دوستانہ۔"
(3) "فرصت کا وقت گزارنے کا پسندیدہ طریقہ؟"
○ "باہر گھومنے جانا کوئی اچھی فلم یا ڈرامہ دیکھنا۔"
(4) "کون سی چیز خوشگوار تاثر قائم کرتی ہے؟"
○ "نفاست۔"
(5) "وہ چیز جو موڈ خراب کردے؟"
○ "بلاوجہ کی تنقید اور ایسی گفتگو جو بالکل بے مقصد ہو۔"
(6) "مشکل ترین لمحہ؟"
○ "جب میں نے اپنی پیاری بہن نبیلہ کی وفات کی خبر سنی۔ اس لمحے کا تصور کر کے آج کئی سال بعد بھی خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میرے لیے یہ ایسا نقصان تھا۔ جس کی کبھی بھی تلافی نہیں ہوئی اور نہ ہی ہو سکتی ہے۔"
(7) "بہترین تعریف جو وصول کی؟"
○ "بے شمار ہیں۔ علی کا کہنا کہ تم ایک نعمت ہو اور پارو کا کہنا کہ تمہارا کاٹا پانی نہیں مانگتا اور تم لاحق ہو جانے والی چیز ہو۔"
(8) "وقت ضائع کرنے کا بہترین طریقہ؟"
○ "فیس بک اور موبائل پر بلا ضرورت میسجنگ"
(9) "زندگی کا خوفناک واقعہ؟"
○ "جب ٹرین ایکسیڈنٹ میں میری والدہ کی وفات ہوئی اور میری پھوپھو نے مجھے سوتے سے جگا کر یہ بتایا کہ میری امی اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔"
(10) "بہترین تحفہ میری نظر میں؟"
○ "کچھ بھی ہو مگر خلوص اور محبت سے دیا گیا ہو۔"
(11) "ایسی تاریخی شخصیت جس سے میں ملنا چاہوں؟"
○ "ممتاز محل اور شاہ جہاں۔"
(12) "پسندیدہ ساتھی؟"
○ "زندگی کے ساتھی میرے شوہر علی اشرف۔"
(13) "پسندیدہ ہستی؟"
○ "میرے ابو' وہ بلاشبہ دنیا کے بہترین باپ ہیں۔ جنہوں نے ہم سب بہن بھائیوں کے لیے ہمارے حق اور اپنے فرض سے کہیں زیادہ کیا ہے۔ وہ اتنے اچھے ہیں کہ ان سے زیادہ اچھا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔"
(14) "پسندیدہ پروفیشن؟"
○ "مجھے ایڈمنسٹریشن کا کام پسند ہے۔ شعبہ کوئی بھی ہو۔"
(15) "بہترین کاوش؟"
○ "کبھی روشنی' کبھی تیرگی اور اک چراغ ابھی بجھا نہیں۔"
(16) "پسندیدہ ملکیت؟"
○ "میرے سارے اپنے لوگ۔"
(17) "زندگی کی خواہش؟"
○ "اپنی ساری خامیوں کو دور کر کے ایک اچھی انسان اور اچھی مسلمان بن جاؤں۔"
(18) "پریشان کن لمحہ؟"
○ "میرے لیے وہ لمحہ پریشان کن ہوتا ہے۔ جب میں اپنے سے چھوٹوں میں سے کسی کو پریشان دیکھ لوں۔ تب میں خود ان سے بڑھ کر پریشان ہو جاتی ہوں۔"

(19) "جب موڈ آف ہوتا ہے تو کیا کرتی ہوں؟"
○ "بالکل خاموش ہو کر بیٹھ جاتی ہوں۔ کسی سے بھی بات نہیں کرتی۔"
(20) "کوئی ایسا فرد جس کے سامنے کھڑی نہ رہ سکوں؟"
○ "میرا لالہ وسیم رضا اس کے پاس علم اور زور بیان دونوں کی بہتات ہے۔ اس لیے وہ کسی بھی معاملے میں مجھے لمحوں میں قائل کر لیتا ہے۔"
(21) "فیشن کب مسئلہ بنتا ہے؟"
○ "جب اچانک سے تبدیل ہو جاتا ہے اور ڈھیروں نئے لباس بے کار ہو جاتے ہیں۔"
(22) "انسان کا دل کب ٹوٹتا ہے۔"
○ "جب کسی سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لی جائیں اور وہ پوری نہ ہوں۔"
(23) "کیا چیز جذباتی کر دیتی ہے؟"
○ "مجھے آپ آسانی سے ملکہ جذبات کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ مجھے ہر دوسری چیز جذباتی کر دیتی ہے۔"
(24) "زندگی کا یادگار دن؟"
○ "میری شادی کا دن (3 مارچ 2012)"
(25) "موسیقی میرے نزدیک؟"
○ "روح کی غذا۔"
(26) "پسندیدہ گانا؟"
○ "گانوں میں وقت کے ساتھ پسند بدلتی رہتی ہے۔"
(27) "پسندیدہ فقرہ؟"
○ "اگر تم حالات کو تبدیل نہیں کر سکتے تو بہتر ہے کہ انہیں قبول کر لو۔"
(28) "پسندیدہ کردار؟"
○ "میرے خواب ریزہ ریزہ" کا احسن ایاز اور "سفال گر" کا عمر۔"
(29) "سب سے عزیز اور قیمتی اثاثہ؟"
○ "میرے جیون ساتھی کی محبت اور توجہ۔"
(30) "اچھا اور خوب صورت موسم؟"
○ "بارش کا موسم میری کمزوری ہے۔ سردیوں کی ہو یا گرمیوں کی۔"
(31) "ناقابل فراموش واقعہ؟"
○ "ڈیڑھ سال پہلے ہمارے ہمسائے کا اکلوتا اٹھارہ سال کا بیٹا گھر سے فٹ بال کھیلنے گیا۔ اور گراؤنڈ میں ہی ہارٹ اٹیک سے اس کی ڈیتھ ہو گئی۔ اس کے بارے میں جب بھی سوچتی ہوں دل دکھ سے بھر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کرے اور اس کے گھر والوں کو صبر اور سکون دے۔ اکلوتے بیٹے کی یوں اچانک وفات کے بعد اس کی ماں اور بہنوں کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔"
(32) "پہلی کاوش شائع ہونے پر تاثرات؟"
○ "ناقابل بیان خوشی ہوئی تھی۔"
(33) "وہ رات جو کبھی نہ بھولے گی؟"

○ "انیس اور بیس ستمبر 2003ء کی درمیانی رات جب میری بہن کی ڈیڈ باڈی گھر میں تھی اور میں اس کے پیروں کے پاس بیٹھی بہت بے بسی سے کہہ رہی تھی گڑیا پلیز اٹھ جاؤ نا اس رات کی بے بسی آج پونے نو سال کے بعد بھی میری آنکھوں میں آنسو لے آتی ہے۔"

(34) "میرا خواب؟"

○ "بہت سارا اور بہت اچھا لکھ سکوں۔"

(35) "پسندیدہ مزاج؟"

○ "جس میں گہرائی اور وقار ہو۔ پھکڑپن سے مجھے شدید چڑ ہے۔"

(36) "حسد محسوس کرتی ہوں؟"

○ "بالکل بھی نہیں البتہ نیک اور اچھے لوگوں پر رشک بہت آتا ہے۔"

(37) "خوشبو پسند ہے تو کیوں؟"

○ "بہت پسند ہے اور اس لیے پسند ہے کہ موڈ پر بڑا خوشگوار اثر مرتب کرتی ہے۔"

(38) "پسندیدہ خوشبو؟"

○ "Estee Lauder Sensuous اور White Linen۔"

(39) "آخری کتاب جو میں نے پڑھی ہو؟"

○ "ہما کوکب بخاری کا ناول 'ماہی ماہی کوک دی میں'۔"

(40) "پسندیدہ جگہ؟"

○ "میری زندگی کے پندرہ سال کینٹ ایریاز میں گزرے ہیں اس لیے مجھے شہروں سے زیادہ کینٹ کا ماحول پسند ہے۔"

(41) "وہ جگہ جہاں چھٹی گزارنا پسند کروں؟"

○ "زیادہ چھٹیاں ہوں تو مری یا شمالی علاقہ جات اور اگر ایک ہی ہو تو بس اتنا ہو جائے کہ ڈنر کہیں باہر کیا جائے۔"

(42) "میری قوت ارادی؟"

○ "کافی اچھی ہے۔ جس کام کو کرنے کی ٹھان لوں اسے کر کے ہی چھوڑتی ہوں۔"

(43) "گھر کا پسندیدہ کمرہ؟"

○ "میرا بیڈ روم۔"

(44) "کیا پہننا پسند کرتی ہوں لباس میں؟"

○ "شلوار قمیص مگر جدید اسٹائل کی ہو اس کے علاوہ فراک ایئرلائن اور ٹراؤزر۔"

(45) "پسندیدہ رنگ؟"

○ "سفید' گلابی' کالا۔"

(46) "پسندیدہ مصنف؟"

○ "نسیم حجازی' شکیل عادل زادہ' کاشف زبیر' مریم کے خان اور بشریٰ سعید۔"

(47) "پسندیدہ شاعر؟"

○ "فیض احمد فیض' ابن انشاء' احمد فراز اور جون ایلیا۔"

(48) "ویران سنسان جزیرے پر پہلا کام کیا کروں گی؟"

○ "میں اتنی بہادر نہیں ہوں کہ ویران سنسان جزیرے پر اکیلی پہنچ کر بھی اپنے حواسوں میں ہی رہوں میرا تو خیال ہے کہ اگر ایسا ہوا تو یا تو میں فوت ہو جاؤں گی یا مجھے سکتہ ہو جائے گا اور دونوں صورتوں میں مجھے کرنا تو کچھ بھی نہیں پڑے گا۔"

(49) "خود اپنی بری عادت؟"

○ "کئی ہیں۔ غصہ زیادہ آتا ہے' جلد باز ہوں اور ناراض بہت جلد ہو جاتی ہوں۔"

(50) "کھانے کی پسندیدہ جگہ؟"

○ "Exotica' سلور اسپون اور حمید پیلس۔"

(51) "اگر میں مصنفہ نہ ہوتی تو؟"

○ "لکھنا میرا شوق ہے۔ اگر میں مصنفہ نہ بھی ہوتی تو بھی کسی نہ کسی تخلیقی کام سے ضرور وابستہ ہوتی۔ شاید شاعرہ ہوتی یا مصورہ۔"

(52) "ایک لفظ جو مجھے واضح کرے؟"

○ "پرخلوص۔"

(53) "جنس مخالف کے بارے میں رائے؟"

○ "بیشتر خواتین کی طرح ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں اپنی توانائیاں ضائع نہیں کرتے اور غیبتیں

کرنے کے شوقین نہیں ہوتے۔"

(54) "محبت کے بارے میں خیال؟"

○ "کائنات کی سب سے خوب صورت چیز ہے۔"

(55) "پسندیدہ رشتہ؟"

○ "میاں بیوی کا۔ کیونکہ سب سے قریبی رشتہ یہی ہوتا ہے۔ جس میں ایک دوسرے سے سب کچھ شیئر کیا جا سکتا ہے۔"

(56) "اگر محبت کی تو کیا نتائج نکلیں گے؟"

○ "اگر کسی سے کیا مراد ہے۔ میں اپنے سے وابستہ سبھی لوگوں سے بہت زیادہ محبت کرتی ہوں اور نتیجہ ہمیشہ اچھا ہی نکلتا ہے۔ جب آپ کسی کو محبت دیتے ہیں تو جواب میں آپ کو بھی محبت ملتی ہے۔ جو زندگی کو خوشگوار بناتی ہے۔"

(57) "پسندیدہ لو اسٹوری؟"

○ "ہر وہ لو اسٹوری جس کا انجام اچھا ہو۔"

(58) "کوئی ایسی فلم جو بار بار دیکھنا چاہیں؟"

○ "تھری ایڈیٹس' کبھی خوشی کبھی غم اور دواغ۔"

(59) "چہرے کچھ بتاتے ہیں؟"

○ "بہت کچھ' بس چہروں کو پڑھنے والی نظر ہونی چاہیے۔"

(60) "شاعری کے بارے میں خیال؟"

○ "دل سے نکلے ہوئے لفظ جو سیدھے دل پر اثر کرتے ہیں۔"

(61) "میری جستجو' میری کھوج؟"

○ "کوئی ایسا اسم اعظم مل جائے جو دنیا سے نفرت اور بے گانگی کو مٹا دے اور ہر طرف محبت کا بول بالا کر دے۔"

(62) "بہترین کامیابی؟"

○ "ہر لحاظ سے بہترین جیون ساتھی کا ساتھ اور گزیٹڈ آفیسر کی جاب۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ دونوں چیزیں مجھے میری خواہش سے بھی بڑھ کر ملی ہیں۔"

(63) "وہم کا ازالہ کس طرح کرتی ہوں؟"

○ "دعا کر کے یا صدقہ دے کر۔"

(64) "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

○ "کمپیوٹر اور موبائل فون۔"

(65) "بدترین ایجاد؟"

○ "ہر جان لیوا ہتھیار۔"

(66) "ایسی شخصیت جو شدت سے یاد آتی ہے؟"

○ "میری بہن نبیلہ شریف۔ میں نے زندگی میں اس کی اتنی کمی محسوس کی ہے کہ بیان کرنے کے لیے میرے پاس لفظ نہیں ہیں۔"

(67) "بستر پر جانے سے پہلے کیا جانے والا آخری کام؟"

○ "قرآنی آیات کی تلاوت کرتی ہوں اور پانی پیتی ہوں۔"

(68) "ایک بات جو ہمیشہ یاد رہی؟"

○ "کانٹے بو کر کبھی پھول نہیں کھلتے۔"

(69) "زندگی کا خوب صورت ترین دن؟"

○ "بہت سارے ہیں۔ میری شادی کا دن' وہ دن جب لالہ سویڈن سے واپس آیا اور جس دن میری بھتیجی عائشہ پیدا ہوئی۔"

(70) "قارئین کے لیے پیغام؟"

○ "آپ لوگوں کی محبت ایک قیمتی سرمائے کی طرح ہے۔ آپ کی کی گئی تعریف جہاں سیروں خون بڑھاتی ہے۔ وہیں مثبت انداز سے کی گئی تنقید ہمیں بطور لکھاری اپنی خامیوں کو دور کرنے میں مدد دیتی ہے مگر پلیز تنقید برائے تنقید نہ کیا کریں کیونکہ لکھاری بھی انسان ہوتا ہے اور اس کا بھی دل دکھ سکتا ہے۔"

(71) "کرن کے بارے میں رائے؟"

○ "بہترین ڈائجسٹ ہے۔ اللہ تعالیٰ کرن کو مزید ترقی عطا فرمائے۔ (آمین)"

☆ ☆

حسن و صحت

ادارہ

گرمی میں آپ کا عمل تنفس درست طریقے سے کام نہیں کرتا اور یہ عمل تنفس ہی تو ہے جو آپ کے جسم کو ٹھنڈا اور سرد رکھنے کا ایک قدرتی نظام ہے۔ یہ قدرتی ایئر کنڈیشنر آپ کے جسم میں نصب ہے..... بیرونی ہوا تو خود ہی پہلے سے گرم اور بہت زیادہ مرطوب ہوتی ہے۔ اس میں آپ کے جسم کی فالتو حرارت اور پسینہ جذب کرنے کی صلاحیت کم ہو چکی ہوتی ہے' اس لیے ہمارا جسم گرم ہونا شروع ہو جاتا ہے اور گرمی کی وجہ سے دل سے جلد کی جانب خون کی روانی بڑھ جاتی ہے تاکہ جلد کی حرارت اور گرمی ختم ہو سکے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دل زیادہ تیزی سے دھڑکنے لگتا ہے..... اور چوں کہ آپ کے دل کو معمول سے

زائد از وقت (اوور ٹائم) کام کرنا پڑ جاتا ہے اس لیے تھک جاتا ہے..... اور اس کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ آپ کو پسینہ زیادہ آنے لگتا ہے۔ پسینہ زیادہ آنے سے اگر آپ کے جسم سے معدنیات کا اخراج بڑھ جائے تو آپ کو ایسے عارضے لاحق ہو سکتے ہیں' جو حرارت سے منسوب ہیں۔

لیکن صرف اس وجہ سے کہ سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے اور دن گرم سے گرم تر ہوتے جا رہے ہیں (یا گرمی روز بروز بڑھ رہی ہے) آپ کو تمام وقت گھر یا دفتر میں بند ہو کے نہیں بیٹھے رہنا چاہیے۔

یہاں آپ کو چند مشورے دیے جا رہے ہیں کہ آپ کس طرح اس موسم گرما سے چڑنے کے بجائے لطف اندوز ہو سکتی ہیں اور موسم گرما کے مزے اڑا سکتی ہیں۔

لبوں کے ادویاتی بام : ہونٹوں کو دھوپ کی تمازت سے بچانے کے لیے اور اس کے نقصانات سے محفوظ رکھنے کے لیے آب مزاحم لپ بام' (پانی روک لپ بام) بہترین تریاق ہے۔ اس کی وجہ سے ہونٹ نم رہتے ہیں اور

دھوپ کی شدت اور تمازت سے طویل عرصے تک محفوظ رکھنے کے لیے سود مند بھی ثابت ہوتے ہیں۔ ان میں ـــــ ایسے سکون و تسکین بخش اجزا شامل ہوتے ہیں کہ جو ہونٹوں کو نرم' ملائم اور لچک دار بنائے رکھنے میں معاونت کرتے ہیں۔

گرمی دانوں اور چھالوں کا علاج : دھوپ میں زیادہ وقت گزارنے اور اس کی شدت حدت اور تمازت کی وجہ سے چہرے اور جسم کے دیگر حصوں پر گرمی دانے اور چھالے نکل آتے ہیں۔ اس لیے یہ بہت ضروری بلکہ لازمی ہے کہ آپ کے پاس ایسی کریمیں اور ادویات دستیاب ہوں' جو اس طرح کے غیر متوقع حملوں کا مقابلہ کر سکیں۔ کوئی ایسی دوا منتخب کیجیے کہ جس کا استعمال سہل اور آسان ہو اور وہ چھالوں اور گرمی دانوں کو پھیلنے سے روکتی ہو۔

اور اگر خدانخواستہ دھوپ میں گھومنے پھرنے سے اور شانے کھلے رکھنے سے (یا تغسل آفتابی کی وجہ سے)

آپ خود "دھوپ جلن" (Sun Burn) کی شکار ہو گئی ہیں تو ذیل میں چند آزمودہ نسخے اور ٹوٹکے دیے جا رہے ہیں کہ جن کی مدد سے آپ اس تکلیف دہ اور پریشان کن صورت حال اور بے چینی و بے قراری سے نبٹ سکتی ہیں اور ان عارضوں کا بہادری سے مقابلہ کر سکتی ہیں۔

چند ایسے لوشن ہوتے ہیں جو آپ کے ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ خاص طور سے وہ لوشن جن میں ایلوویرا کے عرقیات (نباتاتی عرق) شامل ہوتے ہیں۔ ایلوویرا پودے میں موجود یہ عرقیات معمولی اور ہلکی خارش اور جلن کو مٹاتے ہیں اور جسم کو سکون بخشتے ہیں۔ اس لیے اس لوشن کو دل کھول کے استعمال کیجیے۔ ۔ جب آپ کی جلد خشک ہونے لگے تو اس کو دوبارہ لگالیں۔ اس لوشن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے اسے پہلے فریج میں رکھ کر ٹھنڈا کر لیں اور پھر اسے لگائیں۔ اس سے آپ کی جلد کو عارضی طور پر ہی ٹھنڈک' راحت اور سکون ملے گا۔

- ڈبے میں بند دودھ کی بالائی کو ٹھنڈا کر کے اس میں تھوڑی سی چینی ملا کے جلد پر ملیے۔
- کچے انڈے کی سفیدی بھی راحت و سکون بخشتی ہے۔
- اگر کسی بھی وجہ سے آپ کو "دھوپ جلن" (Sun Bum) ہو جائے تو کوشش کیجیے کہ آپ سائے میں ہی رہیں اور دھوپ سے جس قدر بھی اجتناب برت سکتی ہوں' برتیں۔
- آپ کا لباس ڈھیلا ڈھالا اور نرم و ملائم ہونا چاہیے کیونکہ اگر آپ کا لباس اس دھوپ جلن یا زخم سے رگڑ کھائے گا' تو آپ کی تکلیف میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

آپ کس طرح کا میک اپ کرتی ہیں

میک اپ جتنا ہلکا ہو' اتنا ہی بہتر ہے۔ تمام ماہرین آرائش و زیبائش حسن یہی مشورہ دیتے ہیں کہ موسم گرما کا میک اپ ہمیشہ بہت ہلکا ہونا چاہیے۔ ہمیشہ ایک اچھی لپ اسٹک استعمال کیجیے۔ دن کے اوقات میں کوئی فاؤنڈیشن کریم مت استعمال کیجیے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے پسینہ آپ کے چہرے کو داغ دار کر دے گا۔ آنکھوں میں آئی لائنر کے معمولی سے پھریرے سے آپ کے چہرے کو عام سا رخ مل جائے گا لیکن یہ بڑا بھرپور' دل آویز اور پروقار ہو گا اور میک اپ اتارتے وقت یا صاف کرتے وقت ہمیشہ عمدہ قسم کا' فیس واش استعمال کیجیے۔

مشروبات : موسم گرما میں آپ کا مزاج گرم و سرد ہو سکتا ہے لیکن موسم گرما کے مشروبات کے بارے میں صرف یہ جان لیجیے کہ جب اور جہاں موقع ملے' کسی مشروب کا ایک گھونٹ بھر لیجیے۔ یوں تو بازار میں اعلا قسم کے ٹھنڈے مشروبات اور سوفٹ ڈرنکس کی بھی کوئی کمی نہیں ہے کہ جن کی بدولت آپ گرمی کو بھگا سکتی ہیں لیکن گرمی کو بھگانے کے لیے روایتی مشروبات کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے..... خواہ وہ ستو کا شربت ہو یا ہلکا میٹھا' ڈاب' (ناریل کا پانی) ہو یا نمکین و میٹھی لسی کا گلاس ہو۔

کیونکہ یہ روایتی اور قدرتی مشروبات صرف پلک جھپکنے میں تیار ہو سکتے ہیں اور ان کی بے شمار اقسام اور ذائقوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ اس لیے یہ مشروبات عوام الناس میں بے حد مقبول ہیں۔ نیز ان کے نوش کرنے کے لیے دن یا رات یا کسی خاص وقت کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ ان کے مقابلے میں مصنوعی مشروبات کو عموماً" شام کو یا رات کو خاص طریقوں اور انداز سے نوش کیا جاتا ہے جبکہ فطری مشروبات کسی خاص طریقے کے پابند نہیں ہیں۔ قدرتی مشروبات میں خوشبو بھی بہت ہلکی ہوتی ہے اس لیے اگر آپ ان کو تیز خوشبو دار بنانا چاہیں تو دیگر خوشبوئیں شامل کر سکتی ہیں مثلاً" سونف' الائچی' پودینہ یا ادرک کی ہوائیاں بھی آپ کے 'ڈاب' (ناریل کے پانی) یا لسی یا فالسے کے شربت یا تربوز کے شربت کو مزید خوشبو دار بنا سکتی ہیں۔

☆ ☆

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں، مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے، اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۲۲
بائیسویں قسط

یہ کیسا مقام تھا اس کی زندگی میں۔
اس کے ایک طرف بتول شاہ کھڑی تھیں اور ایک طرف علیزے آفندی۔
ایک کی طرف دیکھتا تو مر جاتا' ایک کی طرف دیکھتا تو مار دیتا۔
گویا اذیت اس کے دونوں طرف تھی؟ وہ کچھ کہنے اور کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ فی الحال۔۔۔ البتہ ان دونوں کی کیفیات اور تاثرات اس سے بالکل مختلف تھے بتول شاہ کو دیکھتے ہوئے علیزے اجنبی' ناسمجھ اور خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جبکہ علیزے کو دیکھتے ہوئے بتول شاہ کی آنکھیں پتھریلی ہو گئی تھیں۔
ان کے چہرے پہ بائیس سال رقم تھے اور ان بائیس سالوں میں ایسا کچھ تھا جس کا کرب ناک احساس زہر کی طرح ان کی رگ و پے میں سرائیت کر گیا تھا۔ علیزے کی دلکش سی صورت ان کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئی تھی اور ان کی پتھریلی سپاٹ آنکھیں جلنے لگی تھیں اور اس جلن سے ان کی آنکھیں ـــــــ سرخ ہونے کے ساتھ ساتھ نمکین پانیوں سے لبریز ہو چکی تھیں۔ ہاتھوں کی مٹھیاں سختی سے بھینچے' مضبوط قدموں پہ کھڑی وہ صبر و ضبط کے کن مراحل سے گزر رہی تھیں' یہ ان کا اللہ جانتا تھا یا پھر دل آور شاہ۔
لیکن اس سے پہلے کہ ان کے صبر کا پیالہ چھلکتا اور وہ یہاں بائیس سالوں کی اذیت بچھا دیتیں' انہوں نے ایک بار پھر اپنے اندر کے غضب کو کچلا اور قدم واپس موڑ لیے تھے۔ یہاں ٹھہرنا ان کے اختیار سے باہر بھی ہو سکتا تھا' جبکہ وہ اپنے اختیار سے باہر نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ اس لیے ان کا مڑ جانا ہی بہتر تھا۔ لیکن وہ وہاں سے پلٹ کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے لڑکھڑا سی گئیں۔۔۔ وہ گرنے کو تھیں' لیکن بروقت دیوار کا سہارا لیتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔
"اماں۔۔۔" دل آور شاہ نے بے ساختہ تڑپ کے پکارا اور یک دم علیزے کا بازو جھٹک کر ان کے پیچھے لپکا۔
"اماں۔۔۔ پلیز رکیں۔" لیکن وہ علیزے آفندی کی صورت دیکھنے کا عذاب دل پہ لیے بیسمنٹ کی سیڑھیاں چڑھ گئی تھیں اور دل آور کے پہنچنے تک وہ اپنے بیڈ روم میں بند ہو چکی تھیں اور وہ ان کے بیڈ روم تک آ کر بھی بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا۔ اس وقت بتول شاہ پہ کیا گزر رہی تھی وہ سب جانتا تھا۔ اسی لیے وہ دروازے پہ دستک دے کر انہیں مزید تکلیف سے دوچار نہیں کرنا چاہتا تھا اور یوں ہی عجیب تھکے تھکے قدموں سے آ کر لاؤنج کے صوفے پہ ڈھیر ہو گیا۔ وہ بند دروازے کے پار بتول شاہ کے گرنے والے آنسو اپنی روح پہ گرتے ہوئے محسوس کر رہا تھا اور اس کی روح پہ بتول شاہ کے آنسوؤں سے آبلے پڑتے تھے' جن کی تکلیف دل آور شاہ کا رواں رواں تڑپا رہی تھی۔
"گلاب خان۔۔۔ گلاب خان۔" وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے دھاڑا۔
"جی صاحب! حاضر ہوں۔" وہ فوراً سامنے آ کھڑا ہوا۔
"بند کر دو بیسمنٹ کا دروازہ۔۔۔ اور تالا ڈال کے چابی کہیں دور پھینک دو۔" وہ شدت غضب سے کہہ رہا تھا اور گلاب خان کی آنکھیں تحیر سے پھیل گئی تھیں۔ لیکن وہ اس کے غصے اور غضب کے پیش نظر کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ حالانکہ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ چابی کہاں پھینکے؟
لیکن پھر بھی گلاب خان دل میں افسوس لیے بیسمنٹ کا دروازہ بند کرنے چلا آیا تھا اور علیزے کے قید خانے کو ایک بار پھر تالا ڈال دیا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"منصور حسین کے ساتھ اس کا چکر آج سے نہیں بہت پہلے سے چل رہا تھا۔" کومل کے زہر خند لہجے پہ آذر

نے اک جھٹکے سے سر اٹھا کر دیکھا تھا اور کومل کا دل ٹھنڈک سے بھر گیا تھا۔
"کومل۔۔۔!" ثمرو بیگم نے بیٹی کو سرزنش کرنے والے انداز میں دیکھا۔
"سوری ممی۔۔۔! یہ صرف میرے منہ کی بات نہیں ہے۔ اس کا ایک منظر تو عائشہ پھوپھو بھی دیکھ چکی ہیں۔" کومل نے سب کے چونکنے اور دیکھنے پہ بڑے سکون سے عائشہ آفندی کی سمت دیکھا جو بڑی حویلی کی بربادی پہ ماتم کناں سی بیٹھی تھیں اور وقار آفندی کو ملنے والے دکھ اور اذیت پر رو' رو کر آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔
"بتایئے نا پھوپھو۔۔۔! وہ منظر جب مری میں ایک روز فجر کے وقت محترمہ علیزے بی بی کو اپنے ڈرائیور منصور حسین کے بیڈ روم سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ علیزے نے وہ رات منصور حسین کے بیڈ روم میں ہی گزاری تھی۔ کیونکہ ہمیں دیکھ کر وہ گھبرا گئی تھی۔" کومل نے جیسے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن عائشہ آفندی کا ذہن پے در پے ملنے والے جھٹکوں کی وجہ سے ٹھکانے پہ نہیں تھا کہ وہ کومل کی اتنی سنگین اور گھٹیا بات کا مفہوم سمجھتیں یا پھر علیزے کے دفاع میں کچھ بولتیں۔ بلکہ انہوں نے تو شاید اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ اسی لیے چپ کی چپ بیٹھی رہیں اور ان کی چپ پہ آذر کے دماغ کی شریانیں پھٹنے کے قریب ہو گئی تھیں۔ کسی بھی غیرت مند مرد کے لیے ایسی بات سن کر ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ احمد' حماد اور زین وغیرہ کی گردنیں اور نظریں جھک گئی تھیں۔ لیکن ان سب کے درمیان ایک فرد ایسا بھی تھا جس کا دل یہ سب ماننے سے انکاری تھا۔
"علیزے! ایسی نہیں تھی۔" یہ مضبوط لہجہ اور دعوا دانیال کا تھا۔ جس پہ کومل کے ساتھ ساتھ باقی سب نے بھی بیک وقت دانیال کی سمت دیکھا تھا۔
"کوئی کچھ بھی کہے' لیکن میں کہتا ہوں کہ علیزے ایسی نہیں تھی۔ وہ ایسی ہو ہی نہیں سکتی۔۔۔ مجھے علیزے کی پاکیزگی پہ اتنا ہی یقین ہے جتنا اپنے اللہ کے ہونے پہ یقین ہے۔" دانیال مضبوط لب و لہجے میں بولتے ہوئے ان سب کی سوچوں کو ڈانوا ڈول کر گیا تھا۔
"یعنی آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ غلط بیانی سے کام لے رہی ہوں یا پھر علیزے پہ الزام لگا رہی ہوں۔" کومل نے ناگواری سے کہا۔
"کبھی کبھی انسان کی زندگی میں کچھ ایسے لمحات بھی آ جاتے ہیں جو الزام نہ ہوتے ہوئے بھی الزام بن جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے علیزے کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہو؟ ورنہ میری نظر میں تو وہ اب بھی پاک اور صاف ہے' ہر غلطی اور گناہ سے دھلی ہوئی۔" دانیال اب بھی علیزے کے خلاف نہیں اس کے حق میں تھا۔ اس کا یقین دیکھ کر آذر ہونٹ بھینچ کے رخ پھیر گیا۔
"میں علیزے پہ الزام لگا سکتی ہوں' لیکن آپ کی ماں تو علیزے پہ الزام نہیں لگا سکتی نا؟"
"جس روز میری ماں نے علیزے پہ الزام لگایا اس روز سمجھ لیجیے گا کہ انہوں نے انوشہ پہ الزام لگا دیا' کیونکہ ایک ماں اپنی بیٹی پہ کبھی الزام نہیں لگا سکتی۔" کومل کی باتیں دانیال پہ اثر نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ علیزے کے حوالے سے اس کی باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔
"کیا اس طرح کرنے سے حقیقت چھپ جائے گی؟" وہ طنزیہ بولی تھی۔
"تو کیا آپ اس طرح کر کے افسانہ بنا لیں گی؟" جواب دوبدو تھا۔
"آپ اسے غلط کہنے کی بجائے الٹا مجھے غلط کہہ رہے ہیں؟" کومل کے چہرے سے ہلکا غصہ جھلک رہا تھا۔
"کیونکہ وہ غلط ہے یا نہیں ہے' لیکن آپ اسے غلط ثابت کرنے پہ تلی ہوئی ہیں۔ اس لیے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ یہ سب ثابت کر کے کیا ظاہر کرنا چاہتی ہیں؟" دانیال کے سوال پہ کومل سٹپٹا گئی۔ لیکن اپنے محاذ سے

ہٹی نہیں۔

"میں یہ ظاہر کرنا چاہتی ہوں کہ یہ سب کیا دھرا علیزے کا ہے۔ اس کا چکر بہت پہلے سے چل رہا تھا۔ منصور حسین کا یہاں آنا ان دونوں کی ملی بھگت تھی۔ انہوں نے ہم سب کو بے وقوف بنایا تھا۔ آپ کی نظر میں وہ جتنی پاکیزہ اور شفاف ہے، حقیقت میں وہ اتنی پاکیزہ اور شفاف نہیں ہے۔ اس کی پہلے سے ہی منصور حسین کے ساتھ کمٹ منٹ تھی۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ ہم لوگ جب مری میں گھومنے پھرنے کے لیے نکلتے تھے تو علیزے تھکن کا بہانا بنا کر بنگلے پہ ہی رک جاتی تھی اور اس کے ساتھ اس کے نام نہاد ڈرائیور منصور حسین کو بھی بنگلے پہ ہی رکنا پڑتا تھا۔ اب ہمارے پیچھے بنگلے پہ کیا ہوتا تھا؟ یہ ہمیں کب پتا تھا؟ لیکن سچ کہتے ہیں ایسی باتیں چھپی ہوئی نہیں رہتیں... اک نہ اک دن سامنے آجاتی ہیں اور دیکھ لیجیے اب تو سب کے سامنے آگیا ہے سب کچھ... اب تو کوئی شک اور شبہ بھی نہیں رہا...؟ آپ سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے منصور حسین کا ہاتھ پکڑ کے چلی گئی ہے... کیا یہ بھی میرا الزام ہے؟ ہونہہ! یہ کیوں نہیں کہتے کہ آج بڑی حویلی کی بربادی اور رسوائی علیزے بی بی کی بے جا لاڈ اور پیار کا نتیجہ ہے۔ اب اس اکیلی کے کیے کا بھگتان پوری حویلی کو بھگتنا پڑے گا' لوگوں کی باتوں اور انگلیوں کا نشانہ سب کو بننا پڑے گا۔ سب کی نظر جھکے گی' سب کا سر نیچا ہوگا' کیونکہ اس نے سب کی غیرت کا جنازہ نکالا ہے۔ اس لیے ماتم بھی تو سب نے کرنا ہے؟

اپنے آپ کو اور باقی گھر والوں کو محض جھوٹی تسلیاں دینے اور قیافے لگانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہوچکا ہے۔ منہ کالا کر گئی ہے منصور حسین کے ساتھ جو نہ جانے کب سے اس کا عاشق تھا اور اس کے عشق میں بھیس بدل کر بھی آگیا۔" ماحول لوہے کی طرح گرم تھا۔ اس لیے کومل کے الفاظ کی ضربیں سب کے ذہنوں کے کس بل نکال سکتی تھیں۔ سو اس نے یہ ضربیں لگانے میں دل کھول کے نشتر نما الفاظ کا استعمال کیا تھا اور کافی حد تک کامیاب بھی ٹھہری تھی۔

وہاں موجود سننے والے افراد کے ذہن کسی نہ کسی حد تک پراگندہ ہو ہی چکے تھے اور وہ ان سب کو اس حد تک متنفر کر دینا چاہتی تھی کہ وہ سب مل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے علیزے پہ بڑی حویلی کے دروازے بند کر دیتے" اگر کبھی خدانا خواستہ وہ بھولی بھٹکی آ بھی جاتی تو اسے یہاں کوئی بھی قبول نہ کرتا۔ بلکہ اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال دیا جاتا اور اسی مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ سب کے سامنے بڑھ چڑھ کے بول رہی تھی اور اسے اب کسی کا کوئی ڈر بھی نہیں تھا۔ جن کا ڈر تھا وہ اسپتال کے بستر پہ بے ہوش اور لاچار پڑے تھے اور یہ لاچاری اب ڈاکٹرز نے ان کی آئندہ زندگی کا حصہ قرار دے دی تھی۔ وہ اگر ٹھیک ہو بھی جاتے تو بستر سے اٹھ نہیں سکتے تھے۔ ان کا پورا جسم مفلوج ہوچکا تھا۔ وہ بڑی حویلی کو قائم رکھنے والا ایک اہم ستون تھے اور یہ ستون گر چکا تھا۔ زمین بوس ہوچکا تھا اور بڑی حویلی کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوگیا تھا۔ مضبوط دیواروں کی اینٹیں اکھڑ رہی تھیں اور بنیادیں زمین میں دھنسنے کے امکان صاف دکھائی دے رہے تھے اور یہی غم تو آسیہ آفندی کو کھائے جا رہا تھا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں نڈھال اور بے جان سی پڑی روئے جا رہی تھیں۔ عون اور عدید اپنے باپ اور اپنی ماں کی حالت دیکھ کر بے حال ہوچکے تھے۔ ان کے معصوم ذہنوں پہ برا اثر ہوا تھا۔ لیکن یہاں بھلا کس کو پروا تھی کہ کس پہ کیا اثر ہوا ہے؟ حالات کی کروٹ بہت نقصان دہ ثابت ہوئی تھی۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے بھی...

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟" اسرار آفندی نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔ کیونکہ وہاں سب کے چہروں پہ سوچ کے جال بچھے ہوئے تھے۔

"جو بھی ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے۔" دانیال گہری سانس خارج کرتے ہوئے صوفے سے کھڑا ہوگیا۔

"کیا مطلب؟ کیا ہوا ہے؟" وہ پہلے ہی پریشان تھے۔ دانیال کی سنجیدگی پہ تشویش ہونے لگی۔

"کچھ نہیں... ! آپ تیار ہیں تو آئیے چلتے ہیں' کافی ٹائم ہو رہا ہے۔" وہ بات ٹال گیا تھا۔

"آذر! گھر پہ رہے گا؟" انہوں نے صوفے پہ سر جھکا کر بیٹھے آذر کی سمت دیکھا۔

"نہیں! میں بھی چلوں گا۔" بالآخر وہ بھی کھڑا ہوگیا۔ انہوں نے اسپتال جانا تھا۔ وہ لوگ گھر پہ کپڑے چینج کرنے آئے تھے اور اسپتال میں مبارک خان' اظہار آفندی اور جودت کو چھوڑ آئے تھے۔ اس لیے اب واپس اسپتال جا رہے تھے۔ اس وقت رات کے ایک بجے کا وقت تھا جب وہ گھر سے نکل آئے تھے۔

✲ ✲ ✲

صبح ناشتے کی ٹیبل پہ ان دونوں ماں' بیٹے کے درمیان مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

بتول شاہ نے ساری رات بیڈ روم میں بند جلتے ہوئے گزار دی تھی تو سکون میں دل آور شاہ بھی نہیں رہا تھا۔ رات اس کی بھی کانٹوں پہ بسر ہوئی تھی۔ ساری رات ڈرائنگ روم میں ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے اس کے پاؤں کے تلوے بھی جلنے لگے تھے اور لگاتار پھیلنے والے سگریٹوں کے دھوئیں کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس دھوئیں کی کڑواہٹ اس کی آنکھوں میں زہر بن کے اتر رہی تھی اور چہرے پہ شدت کرب کا عالم تھا۔

رات تھی کہ عذاب تھا؟ ٹلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی... اس رات کو بیتنے میں ایک مدت لگ گئی تھی۔ تب جا کے سویرے کا کنارہ نظر آیا تھا اور اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش شروع کی تھی اور اس کوشش میں پہلا کام اس نے نماز پڑھنے کا کیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اس کے اندر بھڑکتے شعلے وضو کے پانی سے ہی سرد ہوں گے۔ ورنہ اس کے اندر کا دہکتا الاؤ اتنی آسانی سے ٹھنڈا پڑ جاتا' یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ اس کے دماغ میں حشر برپا کرتی نفرت زمین پہ پیشانی ٹکا کر اللہ کو کیے جانے والے سجدے سے ہی معدوم ہوگئی تھی اور نماز کے آخری سجدے تک وہ سر سے لے کر پاؤں تک قدرے شانت ہوچکا تھا۔ اشتعال دھیما پڑ گیا تھا اور رگوں میں بپھرے ہوئے لہو میں ہمواری آگئی تھی اور مسجد سے واپس گھر آتے ہوئے وہ رات کے مقابلے میں خاصا پرسکون لگ رہا تھا۔ پیدل چلتے ہوئے گھر میں داخل ہوا تو قدموں میں ایک توازن تھا اور ایسا ہی ایک توازن بتول شاہ کے مزاج میں بھی آچکا تھا۔ وہ رات کی اذیت رات کے ساتھ گزار آئی تھیں۔ اس لیے ان کا چہرہ بھی اس وقت ہر احساس اور ہر تاثر سے عاری تھا۔ وہ نماز پڑھ کے نیچے آئیں تو اتنے میں گل بھی آچکی تھی اور ان کے کہنے پہ فوراً" ہی ناشتا بنانے چلی گئی اور جب دل آور گھر آیا تب تک ناشتا تیار ہوچکا تھا۔ جس پہ اسے تھوڑی حیرانی بھی ہوئی' لیکن ڈائننگ روم میں بیٹھی اخبار پڑھتی بتول شاہ کو دیکھ کر اسے سمجھ آگیا تھا کہ یہ جلدی بتول شاہ کے حکم پہ ہو رہی ہے۔ وہ متوازن قدموں سے چلتا وہیں آگیا۔

"السلام علیکم اماں جان... !" اس کی بھاری آواز پہ انہوں نے آہستگی سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ کیونکہ ان کی توجہ اخبار پہ تھی۔

"وعلیکم السلام... ! جیتے رہو۔" اس کے سلام کا جواب دے کر انہوں نے نظریں دوبارہ اخبار کے صفحے پہ مرکوز کر دی تھیں اور نہ جانے کیوں دل آور مزید کچھ بول ہی نہیں سکا اور گل اتنے میں ناشتا لگا گئی۔ سو ناشتے کے دوران بھی ان میں خاموشی حائل رہی تھی۔

اور جب وہ ناشتا ختم کرچکا تو بتول شاہ فوراً" ہی کرسی دھکیل کر کھڑی ہوگئی تھیں۔

"ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔" بات مختصر تھی' لیکن دل آور چونک گیا تھا۔

"کیوں...؟"

"کیا پوچھنے کی ضرورت ہے؟" ان کے لہجے میں نامحسوس سی تلخی تھی۔

"لیکن اماں....."

"فی الحال مجھے جانے دو' میں پھر آؤں گی۔ اپنی زری سے ملنے.... اس کی خاطر تو میں نے آنا ہی ہے؟" ان کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ وہ انہیں دوبارہ رکنے پہ اصرار نہیں کرسکا تھا چپ رہ گیا۔

اس نے ڈرائیور سے گاڑی تیار کروائی اور انہیں رخصت کرنے کے لیے گیٹ تک آیا۔ گلاب خان' زلفی اور گل ان کی اتنی جلدی واپسی پہ اداس ہوئے تھے۔ لیکن وہ انہیں دوبارہ آنے کا وعدہ دے کر رخصت ہوئی تھیں اور جاتے جاتے گل کی مٹھی میں چند ہزار ہزار کے نیلے نوٹ بھی تھما دیے تھے اور خود اپنی ذات پہ کبھی نہ ختم ہونے والی اذیت اور دکھ کی چادر اوڑھ کر وہاں سے چلی گئی تھیں اور دل آور خود پہ ضبط کیے اندر چلا آیا تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس کے منشی قادر کا فون آگیا۔ وہ بے چارا کام سے بوکھلایا ہوا تھا۔ اس لیے دل آور کو خود آفس جانا پڑا۔

✡ ✡ ✡

آج اس کا موڈ بہت فریش تھا۔

شاید اس لیے کہ آج وہ اپنے بستر سے ایک ارادہ لے کر اٹھی تھی اور یہ ارادہ کچھ ایسا تھا کہ اس کے انگ انگ سے سرشاری سی پھوٹ رہی تھی۔ دل' دماغ میں اک تازگی آن بسی تھی۔ جس کے ہمراہ اس نے شاور لیا تھا۔ نئے کپڑے پہنے تھے۔ پرفیوم اسپرے کیا تھا۔ بال سنوارے تھے۔ کلائیوں میں بریسلٹ اور پاؤں میں ہائی ہیل سینڈل پہننے کے بعد اپنے آپ کو ڈریسنگ ٹیبل کے بڑے سے آئینے میں تنقیدی نگاہ سے دیکھا تھا۔ کمی بیشی کہیں بھی نہیں تھی۔ اسی لیے مطمئن ہو کر گلے میں مفلر ڈالتی ہوئی اپنا بیگ اور سیل فون لے کر بیڈ روم سے نکل آئی اور یوں ہی سیڑھیوں کی سمت بڑھتے اس کا دھیان اپنے بیڈ روم کے ساتھ والے بیڈ روم کی طرف چلا گیا اور بے ساختہ ہی وہ اس بیڈ روم کی طرف آگئی تھی۔ اس نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا تو سامنے ہی بیڈ پہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی مومنہ بی بی نظر آئی۔

"ہیلو! گڈ مارننگ....." مدحیہ کافی فریش انداز سے کہتی ہوئی اندر چلی آئی اور مومنہ بی بی نے چونک کر دیکھا۔

"مدحیہ باجی.....؟" وہ اسے دیکھ کر سیدھی ہو بیٹھی۔

"ارے یار! میں نے کل بھی تمہیں کہا تھا کہ میرے نام کے ساتھ "باجی" وغیرہ کا دم چھلا لگا کر میرے نام کو ونٹی مت کرو' جیسے تم نے اچھی خاصی خوب صورت اور ینگ سی مومنہ کو "بی بی" بنا کے رکھ دیا ہے۔ ویسے ہی مجھے "باجی" بنانا چاہتی ہو؟" مدحیہ نے اسے مصنوعی خفگی سے ٹوکا تھا اور مومنہ بی بی اسے دیکھ کے رہ گئی۔

"دیکھو یار! ظاہر سی بات ہے۔ کیا تمہاری اور میری عمر ہے "باجی یا بی بی" والی؟" اب کے مدحیہ نے ذرا فرینڈلی سا انداز اپنایا اور مومنہ بی بی نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی تھی۔ بات تو اس کی بھی سچ تھی؟ لیکن وہ بے چاری کیا کہہ سکتی تھی؟ ان پڑھ' سیدھے سادھے' دیہاتی ماں' باپ نے اسے بی بی بنا دیا تھا اور وہ بن گئی تھی۔ اس کے تو شناختی کارڈ پہ بھی مومنہ بی بی ہی لکھا ہوا تھا۔ نوے فیصد دیہاتی عورتوں کی طرح وہ بھی بی بی کے زمرے میں آتی تھی اور یہ بی بی اب اس کی پہچان بن چکا تھا۔

"اس میں میرا کیا قصور ہے مدحیہ باجی؟ یہ تو ماں' باپ کے سوچنے کی بات تھی۔ وہ مومنہ بی بی کی بجائے میرا پورا نام مومنہ محمد بخش بھی لکھ سکتے تھے۔ جیسے آپ کا نام مدحیہ حیات ہے۔ لیکن یہ عقل پڑھے لکھے ماں' باپ کو ہوتی ہے۔ ان پڑھ ماں' باپ کو نہیں' جو کسی قسم کا بھی کوئی فارم لکھواتے ہیں تو اس میں خاوند یا باپ کے نام سے زیادہ

بی بی کو اہم بنا دیتے ہیں۔ اس لیے بی بی ہماری مہر بن جاتی ہے۔" مومنہ بی بی کے جواب پہ مدحیہ نے کافی دلچسپی اور حیرانی سے دیکھا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی مدحیہ کے تمام ڈاکومنٹس میں اس کا نام مدحیہ حیات ولد ممتاز حیات لکھا ہوا تھا۔ بی بی کا لفظ تو کہیں بھی نہیں تھا؟

"یعنی گاؤں میں سب لڑکیوں کے ناموں کے ساتھ بی بی ہوتا ہے؟" اس نے تعجب کا اظہار کیا۔

"جی ہاں بالکل..... باپ کا نام ہو نہ ہو بی بی ضرور ہوتا ہے۔ آپ کو گاؤں میں کئی بی بیاں ملیں گی' سکینہ بی بی' کوثر بی بی' رسولہ بی بی' مومنہ بی بی یا پھر صرف بی بی۔" مومنہ بی بی نے مدحیہ کو حیرت اور دلچسپی میں ڈال دیا۔

"ہوں..... امیزنگ..... گویا یہ بی بی والے جراثیم بہت دور' دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ میرے ختم کرنے سے ختم نہیں ہوں گے۔" اس نے پرسوچ سے انداز میں کہا۔

"جی بالکل! بہت مشکل کام ہے۔" مومنہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"خیر! اتنا بھی مشکل نہیں ہے۔ گاؤں کی تمام عورتوں کو نہ سہی' تمہیں تو صرف مومنہ کہا ہی جاسکتا ہے؟"

"ہوں! جیسے آپ کی مرضی باجی۔" مومنہ بی بی نے ہامی بھری تھی۔

"اف! پھر باجی.....؟" مدحیہ جھنجلا گئی تھی۔

"دیکھو! آج سے تم مومنہ اور میں مدحیہ..... نو بی بی..... نو باجی..... او کے.....؟" مدحیہ نے انگلی اٹھا کر جس انداز سے کہا تھا اس پہ مومنہ بی بی بے ساختہ مسکرا اٹھی۔

"جی! او کے۔" اس نے سر ہلایا۔

"ہوں! گڈ گرل....." مدحیہ بھی جواباً" مسکرائی تھی۔

"اور اب یہ بتاؤ کہ میں ذرا باہر جارہی ہوں۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتادو' واپسی پہ لے آؤں گی؟" مدحیہ نے کافی نرمی اور خلوص سے پوچھا تھا اور مومنہ بی بی ان دونوں بہن' بھائی کی اتنی ہمدردی' خدا ترسی' اپنائیت اور وسیع ظرفی پہ کل سے کئی مرتبہ انہیں حیران نظروں سے دیکھ چکی تھی۔ اسے ان کے ماتھے پہ شکن تک نظر نہیں آئی تھی۔ وہ بلا مبالغہ کھلے دل اور کھلے ظرف کے حامل تھے۔

"کیا سوچ رہی ہو مومنہ.....؟" مدحیہ نے اسے چپ ہوتے دیکھ کر ٹہوکا دیا۔

"کچھ نہیں..... ! میں تو بس یہ سوچ رہی ہوں کہ مجھے کس چیز کی ضرورت ہوسکتی ہے بھلا؟" مومنہ بی بی کے لہجے میں اپنی ذات کے لیے ہی تمسخر تھا جو مدحیہ کو اچھا نہیں لگا۔

"کیوں نہیں ہوسکتی بھلا؟ کیا تم لڑکی نہیں ہو؟ کیا تمہاری ضرورتیں نہیں ہیں؟ کیا پہننا اوڑھنا جرم ہے؟ یا پھر تم نے ایک ہی لباس میں عمر گزارنے کا عہد کر رکھا ہے۔" مدحیہ نے خفگی سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن مدحیہ باجی.....! آپ جانتی ہیں کہ اس وقت میری ضرورت یہ چھت ہے۔ یہ چار دیواری ہے اور اس سے بڑھ کے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے مجھے' تن پہ کپڑا بھی ہے اور معدے میں غذا بھی۔ اس لیے گزارہ ہو ہی جائے گا۔ میں خوامخواہ آپ کے اخراجات بڑھاؤں یہ ضروری نہیں ہے۔" مومنہ بی بی کے لہجے میں عاجزی اور بے بسی تھی۔

"ہم نے اپنے اخراجات اور اپنے وسائل دیکھ کر ہی تمہاری ذمہ داری اٹھائی ہے۔ اگر اتنی حیثیت نہ ہوتی تو شاید ہم تمہاری ذمہ داری بھی نہ اٹھاتے؟ اللہ نے کسی کی ذمہ داری اٹھانے کی توفیق دی ہے تو پھر گریز کیسا؟ شاید تمہارے صدقے اللہ ہماری بے سکون زندگی کو سکون بخش دے۔ شاید کسی کے گناہ کو دھوتے دھوتے ہمارے گناہ دھل جائیں؟" مدحیہ کے لہجے میں بولتے بولتے کرب سا اتر آیا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" مومنہ بی بی کو حیرت اور الجھن ہوئی تھی۔

"ہاں! ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آخر ہم بھی تو انسان ہیں۔ گناہ سے پاک کیسے ہو سکتے ہیں؟ لیکن گناہ سے پاک ہونے کی اور گناہ کو دھونے کی کوشش تو کر سکتے ہیں نا؟" مدحیہ کا لہجہ تلخ ہو چکا تھا۔ لیکن پھر فوراً" ہی سر جھٹک دیا۔

"اینی وے! تمہیں اخراجات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ نے بہت نوازا ہے۔ تمہارے استعمال کر لینے سے سب ختم نہیں ہو جائے گا اور ویسے بھی تمہاری ذمہ داری نبیل بھائی نے اٹھائی ہے اور تمہارے اخراجات تمہاری ضرورتیں بھی وہی پوری کریں گے۔ کون سا میں اپنی جیب سے خرچ کروں گی؟ میں نے تو بس ان کو بتانا ہے اور ان سے کیش وصول کرنا ہے۔" اس نے لاپروائی ظاہر کرتے ہوئے کندھے اچکائے تھے اور مومنہ بی بی کے چہرے پہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ کیونکہ مدحیہ کا انداز ہی کچھ ایسا تھا۔

"پھر کیا خیال ہے تمہارا؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"فی الحال کچھ سمجھ نہیں آرہا۔" مومنہ بی بی نے بے چارگی سے کہا تھا۔

"اوکے! ایز یو وش... جب سمجھ میں آجائے تب بتا دینا۔" مدحیہ کہہ کے پلٹ گئی۔

"مدحیہ باجی...!" اس نے پیچھے سے بے ساختہ پکارا تھا اور مدحیہ نے یک دم پلٹ کر اسے جن نظروں سے دیکھا تھا۔ مومنہ بی بی نے فوراً" اپنی زبان دانتوں تلے دبالی تھی۔ وہ پھر باجی کہنے کی غلطی کر بیٹھی تھی۔ حالانکہ تھوڑی دیر پہلے بھی اس نے بات کے دوران اسے باجی کہا تھا۔ لیکن مدحیہ نے غور نہیں کیا تھا۔ مگر اب...

"میں معافی چاہتی ہوں مدحیہ باجی! لیکن سیانے کہتے ہیں کہ امیر اور غریب اتنی جلدی گھل مل نہیں سکتے۔ تھوڑا ٹائم لگتا ہے۔ میں اتنی جلدی نہ تو آپ کے برابر آسکتی ہوں اور نہ ہی آپ کو اپنے برابر لا سکتی ہوں۔ اس لیے تھوڑا برداشت کیجیے' رفتہ رفتہ باجی کہنا چھوڑ دوں گی۔" مومنہ بی بی نے کافی معذرت خواہانہ لہجے میں کہا تھا۔ جس پہ مدحیہ نے مزید بحث میں الجھنے کی بجائے سر جھٹک دیا تھا۔

"اوکے! تم یہ بتاؤ تم نے مجھے آواز کیوں دی ہے؟" مدحیہ نے اس کے روکنے کی وجہ پوچھی تھی۔

"وہ میں نے پوچھنا تھا کہ آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

مومنہ بی بی کے اس سوال پہ نہ جانے کیوں مدحیہ پل بھر کے لیے جھجک سی گئی۔ اسے سمجھ نہ آیا کہ وہ اسے کیا جواب دے؟ کیا کہے کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟

"کیوں تمہیں کوئی کام ہے؟" وہ اس کے سوال کا جواب گول کر گئی تھی۔

"نہیں! بس یہ کہنا تھا کہ جہاں بھی جا رہی ہیں ذرا جلدی واپس آجائیے گا۔"

"کیوں؟ کیا تمہیں یہاں ڈر لگ رہا ہے؟"

"نہیں مدحیہ باجی! ڈر کیسا؟ ڈر تو ان کو ہوتا ہے جن کے پاس کچھ ہو؟ میرے پاس کیا ہے بھلا؟ سب کچھ تو پہلے ہی گنوا چکی ہوں؟ بس اس لیے کہہ رہی تھی کہ تنہا بیٹھے بیٹھے دل گھبرانے لگتا ہے۔ آپ ہوتی ہیں تو دل کو ڈھارس رہتی ہے۔" اس کی بات پہ مدحیہ چند ثانیے کے لیے چپ ہوئی پھر گہری سانس کھینچتے ہوئے سر ہلا دیا۔

"اوکے! جلدی آجاؤں گی' لیکن اگر زیادہ گھبراہٹ ہو تو تم بیڈ روم سے باہر بھی آسکتی ہو۔ مام کے ساتھ بیٹھ کر باتیں بھی کر سکتی ہو۔ گھر کی چار دیواری کے اندر تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم آزاد ہو یہاں۔" مدحیہ نے اسے ریلیکس کرنے کی پوری کوشش کی تھی اور مومنہ بی بی نے تشکر آمیز نظروں سے دیکھا تھا۔

"شکریہ... بہت بہت شکریہ مدحیہ باجی۔"

"اوکے! گڈ بائے۔" وہ کہہ کر باہر نکل آئی تھی۔ لیکن سیڑھیاں اترتے ہوئے فائزہ بیگم سے سامنا ہوا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" وہی ایک فطری سا سوال بار بار اس کے آڑے آرہا تھا۔

"بس ایک کام سے جا رہی ہوں۔" مدحیہ کہہ کر ان کے سامنے ٹھہری نہیں تھی۔ بے شک جو بھی تھا۔ لیکن وہ ایک ماں تھیں اور وہ ماں کی گہری نظروں کے سامنے عیاں نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اسی لیے ذرا کترا کے جواب دیا تھا۔

"مام...! میری واپسی تک مومنہ کا خیال رکھیے گا' میں جلدی آجاؤں گی۔" سیڑھیاں اترنے کے بعد اسے خیال آیا تو اس نے مڑ کر فائزہ بیگم کو تاکید کی تھی۔

"خوش قسمت ہے مومنہ بی بی جس کے خیال تمہیں ستا رہے ہیں۔" فائزہ بیگم نے رشک کا اظہار کیا اور مدحیہ مسکراتی ہوئی کوریڈور عبور کر گئی۔ ابھی اس نے گھر کے گیٹ سے گاڑی نکال کر روڈ پہ ڈالی ہی تھی کہ اس کا سیل فون بج اٹھا تھا۔

"ہیلو..." اس نے بنا دیکھے ہی کال ریسیو کرلی تھی۔

"کیسی ہو...؟" دوسری طرف جیزی تھا۔

"ایک دم فٹ! تم سناؤ' تم کیسے ہو؟" مدحیہ کے لہجے میں بے پناہ بشاشت تھی۔

"کیسا ہونا چاہیے مجھے؟ کیا تمہیں میری کچھ خبر ہے؟ کیا اس کو مہمان نوازی کہتی ہو کہ دوبارہ پلٹ کر خبر بھی نہ لو کسی کی؟" جیزی شکوہ کر رہا تھا۔ مدحیہ تو اسے سچ مچ بھولی ہوئی تھی۔

"سوری یار! ایم ریئلی سوری... ان فیکٹ دو دن پہلے نبیل بھائی کا کسی لڑکی کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اس لیے گھر میں کچھ مصروفیت تھی اور کل دل آور بھائی اپنے گھر آئے ہوئے تھے تو ہم ان سے ملنے چلے گئے۔ تب ہی تم سے ملنے کا ٹائم نہیں ملا۔" وہ ڈرائیو کرتے ہوئے اسے جواب دے رہی تھی۔

"اور اس وقت کہاں جا رہی ہو؟" جیزی کے کہنے پہ مدحیہ چکرا گئی۔

"اف! کیا ہو گیا ہے تم سب کو؟ میں کہیں جانے کے لیے کیا نکلی ہوں کہ شہر کا شہر پیچھے پڑ گیا ہے۔ ہر طرف ایک ہی سوال سنائی دے رہا ہے۔ کہاں جا رہی ہو؟ کہاں جا رہی ہو؟ کہاں جا رہی ہو؟" اس نے جیسے سر پیٹ لیا۔

"تو تم بتا دو کہ تم کہاں جا رہی ہو؟" جیزی سکون سے کہہ رہا تھا اور مدحیہ ٹھہر سی گئی۔

"کسی سے ملنے جا رہی ہوں۔" اب کی بار اس کا بشاشت آمیز لہجہ دھیما پڑ چکا تھا۔

"کس سے ملنے جا رہی ہو؟" یہ سوال جیزی چاہتے ہوئے بھی نہیں پوچھ سکا تھا' کیونکہ مدحیہ کا دھیما لہجہ اسے ٹھٹکا گیا تھا اور وہ یہ سوال پوچھ کر اپنے وہم پہ یقین کی مہر نہیں لگانا چاہتا تھا۔

"ہیلو جیزی!" مدحیہ نے اس کی خاموشی پہ اسے پکارا تو وہ چونک کر متوجہ ہوا۔

"ہوں! سن رہا ہوں۔" اب اس کا لہجہ دھیما ہو چکا تھا۔

"چپ کیوں ہو گئے ہو؟"

"کچھ کہنے کے لیے بھی تو نہیں ہے؟ اینی وے۔ تم جہاں جا رہی ہو' جاؤ' واپسی پہ تم سے بات ہو گی مگر بھولنا مت یہ بھی یاد رکھنا کہ میں منتظر ہوں۔" جیزی نے کہہ کر فون بند کر دیا اور مدحیہ فون کو دیکھ کے رہ گئی تھی کیونکہ جیزی اپنی بات کا مفہوم واضح کر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اوماڑا اے تے ماڑا سہی یار تو ہے
کج دی ہووے او ساڈا پیار تو ہے
کیوں ماہے دا کیوں ڈھولے دا گلہ کراں
میں تاں لکھ واری بسم اللہ کراں...

او بسم اللہ کراں۔۔۔

ورکشاپ کے گرد آلود برآمدے میں لکڑی کے بنچ پہ رکھے کالے رنگ کے ٹوٹے پھوٹے سے ٹیپ ریکارڈر میں فل والیوم سے گونجتی ملکو کی آواز عدیل کے اعصاب پہ ٹینشن کی طرح سوار ہو رہی تھی وہ پہلے ہی کافی بے زار تھا' ملکو کے ان چونچلوں پہ اور بھی کوفت اور بے زاریت ہونے لگی تھی اس نے دو تین بار چھوٹے کو ٹیپ ریکارڈر بند کرنے کے لیے بھی کہا تھا لیکن وہ یہ رسک لینے کو تیار نہیں تھا کیونکہ یہ ٹیپ ریکارڈر سالوں سے بند پڑا تھا اور دو دن پہلے چھوٹے نے اسے کاٹھ کباڑ سے دریافت کر کے اسے دس روپے کا نیا سوچ لگا کر تقریباً "پچاسی جھٹکے دیئے تھے اور تب جا کے وہ اسٹارٹ ہونے پہ آمادہ ہوا تھا اور چھوٹا خوشی سے بھاگتا ہوا جا کر ساتھ والے چائے کے ڈھابے سے یہ کیسٹ اٹھا لایا حالانکہ اس نے جب یہ کیسٹ لا کر ٹیپ ریکارڈر میں فٹ کیا تھا تو ٹیپ ریکارڈر نے ابکائی کرنے والے انداز میں فوراً" وہ کیسٹ باہر اگل دیا تھا کیونکہ ٹیپ ریکارڈر کے کیسٹ ڈالنے والے فریم ٹوٹے ہوئے تھے اس لیے بغیر کسی فریم یا بغیر کسی سہارے کے کیسٹ کا ٹھہرنا مشکل تھا لیکن دوسری طرف ٹھہرانے والا بھی آخر "چھوٹا" تھا۔

اس نے کیسٹ ٹیپ ریکارڈر میں ڈال کے اس کے دائیں بائیں ماچس کی تیلیاں پھنسا دی تھیں اور اوپر سے ٹیپ ریکارڈر پہ ایک زوردار تھپڑ رسید کیا اور تب سے اب تک ملکو گا گا کر ہلکان ہو گیا تھا کیونکہ چھوٹے نے اسے بند کرنے کی زحمت نہیں کی تھی بس جب بجلی آف ہوتی تو اسے ذرا دم لینے کا وقفہ ملتا تھا ورنہ تو نان اسٹاپ چلتا رہتا اور اگر کبھی درمیان میں ٹیپ ریکارڈر اٹکنے لگتا تھا تو چھوٹا اسے تھپڑ مار کے پھر سے اس میں پھریری سے بھر دیتا اور اس پہ ستم کہ ٹیپ ریکارڈر کا والیوم بھی کم نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس کا والیوم والا بٹن ہی غائب تھا اور اس کا یہ اعصاب شکن مشغلہ عدیل کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا لیکن پھر بھی وہ ضبط کیے اپنے کام میں مصروف رہا تھا تاکہ اس کے کچھ سخت سست بولنے پہ کوئی بدمزگی پیدا نہ ہو' لیکن چھوٹا تھا کہ باز ہی نہیں آ رہا تھا۔

اساں تاں چن کے یار بنایا شوقاں دا

ہورے کیہڑا امل لگدا اے اپناں لوکاں دا؟

چھوٹے نے شاید عدیل کو زچ کرنے کا پورا پورا پروگرام بنا رکھا تھا کیونکہ اب وہ خود بھی ساتھ ساتھ گانا شروع ہو چکا تھا جس پر عدیل کو اور بھی تاؤ آ رہا تھا۔

"دیکھ چھوٹے۔۔۔! یہ ہاتھ میں پکڑا ہوا رنچ تمہارے سر پہ دے ماروں گا اس لیے بہتر ہے کہ شرافت سے اپنا اور اس کا منہ بند کرو' ورنہ تم دونوں کو اٹھا کر باہر پھینک آؤں گا۔" عدیل کی برداشت جواب دے چکی تھی اس نے خونخوار نظروں کے ساتھ چھوٹے کو اور اس کے دریافت شدہ دھکا اسٹارٹ ٹیپ ریکارڈر کو بیک وقت دیکھا تھا۔

"استاد! تم تو یوں غصہ کر رہے ہو جیسے ملکو تمہیں چھیڑ رہا ہو۔" چھوٹے نے چوٹ کی تھی جس پہ عدیل تلملا گیا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"ارے استاد! مطلب والی باتیں ہمیں نہیں آتیں ہم تو بغیر مطلب والی بات کرتے ہیں۔ ویسے استاد! آپس کی بات ہے یہ جو یار ہوتے ہیں یہ ماڑے کیوں ہوتے ہیں؟" چھوٹے نے آخر میں معصومیت سے سوال داغ دیا اور عدیل نے اسے گھور کے دیکھا۔

"تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"اللہ کی قسم استاد! میں بھی وہی چاہتا ہوں جو تم چاہتے ہو لیکن کیا کریں؟ رنگ میں بھنگ تو وہ ولایت والا (جبزی) ڈال گیا تھا جب بھی یاد آتا ہے کھوپڑی گرم ہو جاتی ہے اچھا بھلا استاد کا کام سیدھا ہو رہا تھا لیکن وہ نہ

جانے کہاں سے بیچ میں آگیا لیکن استاد کوئی بات نہیں تیری ٹانگ میں اگر دم ہوا تو وہ میڈم ضرور آئے گی کیونکہ یہ تو ایک فطری سی بات ہے کہ جس طرح دیسی کو ولایتی میں بڑی کشش ہوتی ہے اسی طرح ولایتی کو بھی دیسی میں بڑی کشش محسوس ہوتی ہے' خصوصاً" ولایتی عورت تو دیسی مرد کی طرف کھنچی چلی آتی ہے' اور تم بھی ماشاءاللہ دیسی مرد ہو' مشرقی مرد ہر لحاظ سے مکمل' کشش سے مالا مال' ممکن ہی نہیں کہ وہ ولایتی میڈم تمہارے سحر سے بچ نکلے۔"
چھوٹے کی بات پہ عدیل نے ناگواری سے سر جھٹکا۔
"میرے دل میں اس کا خیال تک نہیں ہے تمہیں خوامخواہ ایشو بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے کام سے کام رکھا کرو۔"
"ہونہہ استاد! تمہارے دل میں اس کا خیال تک نہیں ہے تو پھر دماغ میں یہ گرمی کس لیے ہے؟ جو تم ہم پہ نکال رہے ہو۔" چھوٹے کا انداز معنی خیز سا تھا۔
"تمہارے کرتوت ہی ایسے ہوتے ہیں کہ خوامخواہ دماغ گرم ہونے لگتا ہے۔"
"میرے کرتوت یا پھر۔؟" چھوٹے نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور عدیل نے سمجھتے ہوئے یکدم اسے مارنے کے لیے رینچ گھمایا تھا اچانک ورکشاپ کے احاطے میں ایک گاڑی جھٹکے سے آن رکی۔ سلور کلر کی چمچماتی ہوئی یہ گاڑی عدیل کے لیے اجنبی نہیں تھی اس کا ہاتھ یکدم نیچے پہلو میں آگرا تھا۔
"مرد پہ دیسی شراب اور عورت پہ دیسی مرد بڑا اثر کرتے ہیں استاد۔ آزمائش شرط ہے۔" چھوٹا اس کے قریب سرگوشی سے کہتا ہوا پاس سے گزر کر ورکشاپ کی پچھلی سائیڈ پہ چلا گیا جہاں جیدی اور سلو کسی گاڑی کی مرمت میں مصروف تھے۔ وہ گاڑی سے اتر کر اس کے قریب آگئی۔
"ہیلو۔!" آواز تھی یا مٹھاس جس کا احساس عدیل کو روح تک محسوس ہوا تھا۔
"السلام علیکم۔" اس نے بھی کافی ٹھہرے ہوئے لہجے میں سلام کیا تھا۔
"کیسے ہیں آپ؟" اس وقت وہ احساسات اور جذبات سے گندھی ہوئی ایک نارمل لڑکی نظر آرہی تھی جس کے وجود میں بھرا کتنا غصہ اس لمحے کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ سر سے پاؤں تک تسخیر پہ آمادہ تھی اور اس لمحے عدیل کو اس کی ذات کے آئینے میں اپنے آپ کے سوا اور کوئی نظر نہیں آیا تھا اسے اس کے وجود میں اپنا آپ دکھائی دے رہا تھا' وہ اس وقت اس کے سامنے کھڑی "مدحیہ حیات" نہیں بلکہ "عدیل عمر" لگ رہی تھی شاید اسی لیے کہ عدیل عمر کے سامنے آنے کے لیے اسے مدحیہ حیات کو پیچھے چھوڑ کے آنا پڑا تھا شاید اپنے اسی بستر میں جہاں سے وہ عدیل عمر سے ملنے کا ارادہ لے کر اٹھی تھی اور اب اس کے سامنے کھڑی وہ مدحیہ "مدحیہ" ہی نہیں لگ رہی تھی جس کو دیکھ کر عدیل عمر کا دل بھی اپنی جگہ سے اس کی سمت ہمکنے لگا تھا اور اس نے ہاتھ میں پکڑا رینچ ایک سائیڈ پہ ڈال دیا۔
"میں ٹھیک ہوں! آپ سنائیں کیسی ہیں؟" عدیل کا دل اس کے لہجے پہ حاوی ہو رہا تھا' آنچ دے رہا تھا۔
"میں آپ کے سامنے ہوں۔ اب آپ فیصلہ کریں کہ میں کیسی ہوں؟" وہ آج پہلی بار دل کی رضا سے آئی تھی اس لیے سب کچھ دل کی رضا پہ چھوڑ رکھا تھا صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کی چھوٹ پہ دل اپنی رضا سے کیا کیا کرتا ہے؟ کیا گل کھلاتا ہے؟ کون سا چاند چڑھاتا ہے؟ کہاں تک جاتا ہے؟ کتنا بھٹکتا ہے اور کتنا سنبھلتا ہے؟ یہی جاننے کے لیے اس نے دل کو خاصی ڈھیل دے رکھی تھی اور وہ عدیل عمر کے حضور آن پہنچا تھا کسی سدھائے ہوئے بے زبان جانور کی طرح۔۔۔!
"آپ اپنے فیصلے دوسروں پر بھی چھوڑتی ہیں؟" عدیل کا سوال دلچسپی لیے ہوئے تھا۔
"اکثر نہیں' کبھی کبھی۔" وہ بھی خوشگواریت سے بولی۔
"کبھی کبھی کیوں؟"
"کیونکہ دل کبھی کبھی موج و مستی پہ آمادہ ہوتا ہے۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔
"یعنی آپ اس وقت موج و مستی پہ آمادہ ہیں؟" عدیل کے معنی خیز لہجے پہ مدحیہ بری طرح چونکی تھی وہ اس کی بات کو ذو معنی پیراہن دے چکا تھا۔
"نن نہیں۔۔۔! ایسی بات نہیں ہے۔" مدحیہ جیسی شعلہ صفت لڑکی کا یوں گڑبڑا جانا عدیل کو لطف دے گیا تھا اس کے دماغ کی گرمی دور ہو گئی تھی۔
"تو پھر کیسی بات ہے؟ کس موج میں ہیں آپ؟ اور کس مستی کی بات کر رہی ہیں؟" اس کے رنگ' اس کے انداز دیکھ کے عدیل خود مستی میں آگیا تھا۔ اور مدحیہ نظریں چرا گئی۔
"کیا بیٹھنے کو نہیں کہیں گے؟" اس نے عدیل کی بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔
"ارے کیوں نہیں۔! سو بسم اللہ' سر آنکھوں پہ' آیئے' بیٹھیے۔" عدیل نے چونکتے ہوئے فوراً" پلاسٹک کی کرسی کھینچ کر اس کے سامنے رکھ دی اور دوسری کرسی اپنے لیے کھینچ لایا۔
"ارے بے فکر رہیں! کرسی گندی نہیں ہے بس حالات اور ماحول نے اسے بدوضع اور بے رنگ بنا دیا ہے۔" عدیل نے اسے تسلی دی تھی اور مدحیہ خجل ہوتی ہوئی بیٹھ گئی۔
"اب بتایئے! کیا لیں گی آپ؟" وہ عین اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور مدحیہ کو یوں اس کے روبرو بیٹھنے پہ جھجک سی ہو رہی تھی۔
"نہیں! کچھ نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔
"کیا ناشتا کر کے آئی ہیں؟"
"نہیں۔"
"ارے! تو پھر انکار کس لیے ہے؟ یہاں ناشتا کریں گرما گرم حلوہ پوری' چنے اور لسی کے ساتھ دماغ کی خشکی دور ہو جائے گی۔" عدیل نے اسے ناشتے پہ اصرار کیا تھا۔
"نہیں! اتنا ہیوی ناشتا میں نہیں کر سکتی۔" وہ اتنا بھاری بھرکم ناشتا کرنے پہ تیار نہیں تھی۔
"اتنا بھی ہیوی نہیں ہے' بس آپ کو نام سن کر ایسا لگ رہا ہے اس نرم گرم سے موسم میں یہ ناشتا بہت گرمائش دیتا ہے۔" عدیل کا اصرار ہنوز تھا۔
"ایم سوری! اتنا ہیوی ناشتا تو نہیں لیکن چائے لے سکتی ہوں۔" اس نے چائے پہ رضامندی ظاہر کی تھی اور مجبوراً" عدیل کو اپنے اصرار سے ہٹنا پڑا۔
"او کے! ابھی منگواتا ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے گردن موڑ کر سلو کو آواز دی تھی۔
"سلو۔! اوئے سلو۔" اس نے بلند آواز سے پکارا۔
"جی استاد؟" سلو فوراً" ہاتھ جھاڑتا ہوا حاضر ہوا تھا۔
"دو کپ چائے پکڑ و ڈھابے سے۔" اس نے اشارہ کیا تھا۔
"استاد! سلام تو کر لینے دیں۔ سلام میڈم! کیسی ہیں آپ؟" سلو نے عدیل کو خفگی سے کہا تھا اور ساتھ ہی مدحیہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔
"وعلیکم السلام! ٹھیک ہوں' اللہ کا شکر ہے۔" مدحیہ نے آہستگی سے کہا اور اس کے انگلش لب و لہجے میں "اللہ کا شکر" ادا کرنا بہت اچھا لگا تھا۔
"چلیں شکر ہے' اللہ اپنا کرم ہی رکھے' آپ بیٹھیں میں ابھی چائے لے کر آتا ہوں۔" سلو خوشدلی سے کہتا ہوا

چلا گیا۔ عدیل کو پتا تھا کہ وہ تینوں لوفر اسے بہت تنگ کریں گے اسی لیے تو اس نے بڑے لوفر "چھوٹے" کو نہیں بلایا تھا جو صرف نام کا چھوٹا تھا' کام کا نہیں' کام تو اس کے بڑے بڑے تھے' خصوصاً" اس کی عقل بہت بڑی تھی' کافی دور کی سوچ رکھتا تھا۔ اور اس کا ادراک عدیل کو کافی اچھی طرح سے ہو چکا تھا۔

"اور سنائیں کیسے آنا ہوا آپ کا؟ میرے لائق کوئی خدمت۔" عدیل دوبارہ سے اس کی سمت متوجہ ہو چکا تھا اور مدحیہ کو اس وقت کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے؟ اور کیا بتائے کہ وہ یہاں کیوں آئی ہے؟ کیونکہ اس کے پاس کوئی وجہ ہی نہیں تھی یہاں آنے کی۔

"وہ دراصل میں نے آپ کے گھر جانا تھا' آپ کے فادر کی خیریت معلوم کرنے کے لیے لیکن مجھے آپ کے گھر کا پتا نہیں تھا اس لیے یہاں آنا پڑا ہے۔" مدحیہ کو بروقت ایک بہانا سوجھ ہی گیا تھا اور عدیل اس کا یہ گریز فوراً" ہی سمجھ گیا۔

"اوہ اچھا اچھا۔! تو آپ ابا جی کی عیادت کے لیے یہاں آئی ہیں؟" اس نے اپنی ذو معنی سی مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے دور سے آتے سلو پہ نظریں جما دیں تاکہ مدحیہ سے نظروں کا تصادم نہ ہو۔

"آپ مجھے گھر کا پتا بتا دیں' میں چلی جاؤں گی۔" وہ بھی بات کرتے ہوئے کافی جھجکی اور کترائی کترائی سی لگ رہی تھی اپنے سابقہ شعلہ جوالہ انداز سے قطعی مختلف نظر آ رہی تھی۔

"ارے نہیں نہیں! جب تک میں آپ کو اپنے گھر لے کر نہیں جاؤں گا آپ کیسے جائیں گی بھلا؟ آپ کے ساتھ میرا ہونا ضروری ہے۔" عدیل کے جواب پہ اس نے بے ساختہ پلکیں اٹھا کر دیکھا اور عدیل اس کی گہری سیاہ آنکھوں کے وار سے گھائل ہو کے رہ گیا تھا اس کی آنکھوں کی دھار بہت تیز تھی۔

"استاد! چائے۔" سلو آنکھوں کی آنکھوں تک رسائی کا یہ منظر دیکھ چکا تھا اسی لیے گلا کھنکار کے متوجہ کیا۔

"ہوں! لاؤ دو ادھر۔" عدیل نے نظروں کا دامن چھڑا کر سلو کے ہاتھ سے دونوں کپ تھام لیے تھے۔

"میں جاؤں استاد؟"

"ہوں! جاؤ۔" عدیل نے سلو سے نظر ملائے بغیر کہا تھا۔

"ٹھیک ہے استاد! کر لو موجاں۔" سلو آہ بھر کے کہتا ہوا واپس چلا گیا اور اس کی یہ سرگوشی نما آہ سن کر عدیل مسکراہٹ دبا گیا۔

"یہ لیجیے چائے۔" اس نے کپ مدحیہ کی سمت بڑھا دیا تھا۔

"تھینکس۔" مدحیہ نے دودھیا ہاتھ بڑھاتے ہوئے چائے کا وہ چھوٹا سا کپ تھام لیا اور عدیل اس کے ہاتھ کی خوبصورتی دیکھ کے رہ گیا۔ دودھ کی طرح سفید' ملائم اور گداز ہاتھ عدیل کی نظروں کو بھٹکا گئے تھے۔

"ہوں! اچھی چائے ہے اور اسٹرانگ بھی۔" مدحیہ نے چائے کا سپ لینے کے فوراً" بعد تعریف کی تھی۔

"اتنی زیادہ محنت اور تھکن کے بعد اسٹرانگ چیزیں ہی ہماری ترجیح ہوتی ہیں جو تھکے ہارے جسم سے ساری تھکن نچوڑ دیتی ہیں اور دل و دماغ ہلکے پھلکے ہو جاتے ہیں۔" عدیل نے بھی چائے کا سپ لیا۔

"آپ اتنی محنت کیوں کرتے ہیں؟" مدحیہ کے ذہن میں اٹکا ہوا سوال باہر آیا تھا۔

"کیونکہ میں اپنے گھر کا واحد کفیل ہوں' پانچ بہنوں کا بھائی اور ماں باپ کا ایک ہی بیٹا ہوں۔ اس لیے محنت تو مجھ پہ فرض ہے۔" وہ لاپروائی ظاہر کر رہا تھا۔

"لیکن آپ کوئی اور کام بھی تو کر سکتے ہیں؟" وہ فوراً" بولی۔

"بہت کوشش کی تھی کرنے کی' یہاں تک کہ خودکشی بھی' لیکن اللہ کو خودکشی کرنا پسند نہیں ہے اس لیے اس نے مجھے خودکشی کے کام سے ہٹا کر یہاں بھیج دیا' شاید اسے میرے لیے یہی پسند تھا۔" اس نے کندھے جھٹکے تھے۔

"لیکن یہ کام آپ کو سوٹ نہیں کرتا۔" وہ بے ساختگی سے بولی تھی۔

"ہمیں زندگی میں بہت سے کام ایسے کرنے پڑتے ہیں جو ہمیں سوٹ نہیں کرتے' جیسے آپ یہی دیکھ لیں کہ آپ کا یہاں آنا سوٹ نہیں کرتا' لیکن پھر بھی آپ کو آنا پڑا ہے کیونکہ آپ کے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا بالکل اسی طرح میرے پاس بھی یہاں آنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔" عدیل کے لہجے میں ہلکی تلخی کی آمیزش تھی۔

"لیکن کام کا کوئی اسٹینڈرڈ تو ہونا چاہیے؟"

"دیکھیے میڈم! ایسی بات وہی بندہ سوچ سکتا ہے جو ہر لحاظ سے آزاد ہو' بے فکر ہو' حالات اور مشکلات میں پھنسا ہوا آدمی یہ سب نہیں سوچ سکتا اس کی عقل اور شعور تو مسائل سے ہی مفلوج ہو چکے ہوتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ مجبوری معیار نہیں دیکھتی۔ مجبوری یہ نہیں سوچتی کہ کیا معیاری ہے؟ اور کیا غیر معیاری ہے؟ مجبوری کہتی ہے کرو۔ وہ سب کرو جو تمہارے اختیار میں ہے۔ چاہے وہ معیاری ہے یا غیر معیاری' اچھا ہے یا برا حلال ہے یا حرام؟ بس تم نے کرنا ہے کیونکہ میرا نام مجبوری ہے اور محبت کی طرح مجبوری بھی اندھی ہوتی ہے کچھ بھی نہیں دیکھتی' مقام' مرتبہ' معیار بھی نہیں دیکھتی سب کروا لیتی ہے بلکہ وہ کام بھی کرواتی ہے جو کام انسان سے کبھی محبت بھی نہیں کروا پاتی اس لیے اور دیگر مجبوروں کی طرح میں بھی اس مجبوری کے ہاتھوں مجبور ہوں وہ سب کرنے کے لیے جو شاید میرے معیار کا نہیں ہے۔" عدیل کے تفصیلی اور تلخ سے جواب پہ مدحیہ چپ چاپ سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس کے لفظ لفظ میں سچائی اور چبھن تھی وہ اب کچھ کہتی بھی تو کیا کہتی۔؟

"خیر! چھوڑیں اس بات کو۔ آپ کو ایک بات بتاتا ہوں۔" عدیل نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ اور چائے کا سپ لیتے ہوئے مدحیہ کو کچھ بولتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔

"کیا...؟" مدحیہ نے بھی چائے کا سپ لیتے ہوئے بے ساختہ پوچھا۔

"آپ اس وقت بہت "اپنی" سی لگ رہی ہیں۔" عدیل اظہار کیے بنا نہیں رہ سکا اور مدحیہ نے یکدم پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا وہ مسکرا رہا تھا اس کی مسکراہٹ میں کئی رنگ تھے کئی معنی تھے ——— وہ نظر جھکانے پہ مجبور ہو گئی۔ عدیل اس کی حرکت پہ قہقہہ لگاتا' اگر اسے مدحیہ کا ڈر نہ ہوتا وہ کسی بھی وقت اپنا ٹمپرو لوز کر سکتی تھی اسی لیے وہ سنبھل گیا اور اپنا قہقہہ دبا گیا اور ہمیشہ اعتماد سے بات کرنے والی انتہائی بولڈ سی مدحیہ نہ جانے کیوں اس لمحے نروس ہو گئی تھی۔

"او کے۔! میں اب چلتی ہوں۔" وہ چائے کا خالی کپ رکھتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"آئندہ کی امید بھی رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟" وہ بلا ارادہ پوچھ بیٹھا۔

"کیا آئندہ بھی آنا چاہیے؟"

"یہ سوال تو آپ کو اپنے آپ سے کرنا چاہیے۔"

"لیکن! میں یہ سوال آپ سے کر رہی ہوں۔" وہ عدیل پہ نظریں جما چکی تھی۔

"کیا میرے جواب کی اہمیت ہے آپ کی نظر میں؟"

"ہے تو پوچھ رہی ہوں نا۔"

"تھینک یو۔! پھر میں تو کہوں گا آپ کا جب بھی دل چاہے آپ آئیں میرے گھر سے دل تک تمام دروازے کھلے ہوئے ملیں گے آپ کو۔" اس نے خوشدلی سے بازو پھیلا کر کہا۔

"وجہ؟ اتنی عنایت کس لیے؟" وہ اسے کھوجنا چاہتی تھی۔

"آتی جاتی رہیں گی تو وجہ بھی پتا چل جائے گی۔" وہ مسکراہٹ چھپا نہیں سکا۔

"اوکے! گڈ بائے۔" وہ کہہ کے پلٹ گئی اور اپنے گلاسز بالوں میں اٹکا لیے تھے اور گاڑی کے قریب جا کر دوبارہ پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا اور پھر وہ گاڑی بیک کرتے ہوئے روڈ تک لے گئی۔ عدیل اسے دور تک دیکھتا رہا جیسے ہی اس کی گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہوئی وہ واپس پلٹا تھا لیکن یکدم گڑبڑا گیا کیونکہ وہ تینوں عین اس کے پیچھے کھڑے تھے اور عدیل کو گھور رہے تھے وہ جان بوجھ کر بال سہلاتا ہوا کترا کے ان کے پاس سے گنگناتا ہوا گزر کر آگے بڑھ گیا۔

کیوں ماہیے دا کیوں ڈھولے دا گلہ کراں
او میں تاں لکھ واری بسم اللہ کراں.....

"استاد۔" اس کے گنگنانے پہ چھوٹا یکدم چیخ اٹھا اور خونخوار انداز میں اس کی سمت لپکا تھا اور جواباً" وہ اپنا بچاؤ کرتے ہوئے قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

☼ ☼ ☼

"پلیز بھابھی۔! ایک منٹ' میں کچھ بھول گئی ہوں۔" زری گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہوئے یکدم رک گئی۔ عبداللہ سارا سامان گاڑیوں میں رکھوا رہا تھا دو گھنٹے بعد ان کی فلائٹ تھی۔

"کیا بھول گئی ہو؟" نگارش بھی ٹھٹک کے رک گئی۔

"جائے نماز۔" زری نے کہتے ہوئے قدم واپس موڑ لیے۔

"جائے نماز.....؟" نگارش کو حیرت ہوئی تھی۔

"ہاں بھابھی! میری جائے نماز جس پہ میں نماز پڑھتی ہوں۔"

"لیکن زری! جائے نماز تو پاکستان سے بھی مل جائے گی؟"

"یہ جائے نماز کہیں سے بھی نہیں ملے گی بھابھی۔" زری گھر کے کوریڈور میں داخل ہو چکی تھی۔

"کیا مطلب؟" نگارش کو بھلا کیا پتا تھا۔

"مطلب آکر بتاتی ہوں۔" زری بغیر رکے اور بغیر پیچھے پلٹے کہتی ہوئی کوریڈور عبور کر گئی اور نگارش وہیں دہلیز میں کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

"نگارش! کھڑی کیوں ہو؟ گاڑی میں بیٹھو۔" گاڑی کے قریب کھڑے عبداللہ نے آواز دی۔

"وہ زری آجائے تو....." نگارش بات ادھوری چھوڑتے ہوئے چپ ہو گئی۔

"کیوں؟ زری کہاں گئی ہے؟" عبداللہ بھی زری کی غیر موجودگی پہ چونکا۔

"اندر گئی ہے کچھ بھول گئی تھی شاید۔"

"اسی لیے میں نے تم لوگوں سے کہا بھی تھا کہ سب کچھ دوبارہ چیک کر لینا تاکہ بعد میں مسئلہ نہ ہو۔" عبداللہ خفگی سے کہتا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سامان والی گاڑی اس نے خود ڈرائیو کرنی تھی اور جس گاڑی میں زری اور نگارش نے جانا تھا وہ گاڑی نگارش کے بھائی نے ڈرائیو کرنا تھی۔

"آپی! آپ بیٹھیں تب تک وہ بھی آجاتی ہیں۔" شیراز (نگارش کا بھائی) نے آگے بڑھ کے نگارش کو بیٹھنے کا کہا۔ لیکن نگارش کو بے چینی ہو رہی تھی کہ کہیں زری دیر نہ لگا دے اور وقت کی کمی کی وجہ سے عبداللہ غصہ نہ کر بیٹھے۔ اسی لیے وہ وہیں کی وہیں کھڑی رہی تھی۔

"لیجیے بھابھی! میں آگئی۔" زری تیزی سے قدم اٹھاتی گھر سے باہر نکل آئی تھی اور تب جا کے نگارش کا سانس بحال ہوا تھا۔ اور دونوں نے قدم گاڑی کی سمت بڑھا دیے تھے شیراز ان کے پیچھے گھر کا دروازہ لاک کیا اور آکر گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

"اب بتاؤ ایسا کیا ہے اس جائے نماز میں کہ عین ٹائم پہ تمہاری جان اٹک گئی تھی؟" گاڑی مین روڈ پہ آتے ہی نگارش کا سوال بھی سامنے آگیا۔

"اس جائے نماز میں میری زندگی کا قیمتی اثاثہ ہے۔" زری نے نیلے رنگ کی دبیز رو والی ویلوٹ کی مخملی جائے نماز پہ بڑی عقیدت — اور محبت سے ہاتھ پھیرا۔

"کیسا اثاثہ؟" نگارش کے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

"آج سے تین سال پہلے اسی جائے نماز پہ اس نے (دل آور شاہ) نماز پڑھی تھی' آپ کو یاد ہو گا عبداللہ بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا' کافی چوٹیں آئی تھیں اور اس دن وہ اور نبیل ہمارے گھر ہی ٹھہر گئے تھے' آپ دوسرے بیڈ روم میں تھیں' جلدی سو گئی تھیں لیکن میں جاگ رہی تھی وہ' عبداللہ بھائی اور نبیل کے ساتھ باتیں کر رہا تھا' اس کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی تو میں کیسے سو سکتی تھی بھلا؟ اور جب ان کی باتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو وہ اٹھ کر باہر نکل آیا' وہ نماز پڑھنا چاہتا تھا اور جائے نماز ڈھونڈ رہا تھا' اس نے پہلی بار کوئی چیز مانگی تھی اور وہ تھی جائے نماز۔ وہ وضو کر کے آیا تھا اور میں نے اسے اپنی جائے نماز دی' تب اس نے اس جائے نماز پہ عشاء کی نماز پڑھی تھی' اللہ کو سجدہ کیا تھا' وہ اللہ کے حضور جھکا تھا اور میرا دل اس کے حضور جھک گیا تھا' اس وقت ان لمحات میں مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جائے نماز بچھا کے نہیں۔ بلکہ میرے دل کو بچھا کے میرے دل پہ قدم جما کے کھڑا اپنے رب کو سجدہ کر رہا ہے' دل میرا تھا۔ قدم اس کے تھے۔ اور سجدہ اللہ کا تھا۔ کتنی خوش قسمتی کی بات ہے ناوہ میرے دل پہ کھڑا اللہ کو سجدہ کر رہا تھا اور تب سے اب تک اس کے قدم میرے دل پہ ہیں' میرا دل نیچے ہے اور اس کے قدم اوپر۔ وہ جب جب قدم اٹھا کے چلتا ہے میرا دل تب تب نیچے ہی نیچے دبتا چلا جاتا ہے' اس جائے نماز میں اور میرے دل میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ اس کا رنگ نیلا ہے اور میرے دل کا رنگ سرخ۔" زری انتہائی مدہم' دھیمی اور سحر انگیز آواز میں بولتی ہوئی نگارش کو ششدر سا کر چکی تھی نگارش کے دل و دماغ سے دھواں نکل گیا تھا۔ یہ عشق اور جنوں کی کون سی منزل تھی جہاں پہ زری جا پہنچی تھی؟ اور اس منزل پہ پہنچنے کے بعد حاصل کیا تھا؟ ایک اور مسافت؟ یا ایک اور منزل.....؟ نگارش کا دل اس سوچ سے ہی دہل گیا تھا اسے جھرجھری سی آگئی تھی۔

"یا اللہ! اس پگلی پہ اپنا رحم فرمانا۔" اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔

"آپ میرا اثاثہ پوچھتی ہیں کیا یہ اثاثہ کم ہے کہ اس جائے نماز پہ اس کے سجدے کا لمس ہے' اس کی پیشانی کا غرور ہے اس میں۔ میرے ہزاروں سجدے اور اس کا ایک سجدہ ہے اس جائے نماز میں' اس سے بڑھ کر میرا اثاثہ اور کیا ہو سکتا ہے بھلا؟ اور میں اسے ہی یہاں بھول جاتی؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟" زری نے بڑی محبت' بڑی چاہ اور بڑے جذب سے کہتے ہوئے اس جائے نماز کو اپنے ہاتھ میں پکڑے بیگ میں رکھ دیا۔

"یہ بیگ ایئرپورٹ پہ جا کر میں نے اپنے اٹیچی میں رکھنا ہے تاکہ محفوظ رہے۔" وہ پہلے سے ارادہ باندھ رہی تھی اور نگارش کو یاد آرہا تھا کہ زری نے یہ جائے نماز کبھی کسی کو نہیں دی تھی اس پہ صرف وہ خود نماز پڑھتی تھی اور آئندہ بھی اس نے اسی میں نماز پڑھنا تھی اسی لیے تو وہ ساتھ لے کر جا رہی تھی۔

آدھے' پون گھنٹے میں وہ لوگ ایئرپورٹ پہنچے تھے' نگارش کے پیرنٹس اور بہن بھائی پہلے سے وہاں موجود تھے بس شیراز ان کے ساتھ تھا' نگارش پہلی بار پاکستان جا رہی تھی اس لیے وہ سب ہی سی آف کرنے آئے تھے' فلائٹ میں ٹائم کم رہ گیا تھا اس لیے عبداللہ اور شیراز کو کافی بھاگ دوڑ کرنا پڑی تھی سامان کلیئر کروا کے خود بھی ان ہونا تھا اس لیے کافی جلدی مچی ہوئی تھی اور سب کچھ اوکے ہوتے ہی وہ سب مل کر ایئرپورٹ کے اندرونی حصے کی سمت بڑھ گئے تھے' زری بار بار انگلینڈ کی فضاؤں میں دیکھ رہی تھی' انگلینڈ اس کی محبت کی جائے پیدائش تھی' وہ

انگلینڈ کو کیسے بھول سکتی تھی بھلا؟ اور یونہی آنکھوں میں آنسو لیے وہ نگارش کا ہاتھ تھامے جہاز کا زینہ طے کر گئی لیکن اپنی سیٹ کے پیچھے والی سیٹ پہ نظر پڑتے ہی وہ جم سی گئی۔ ملک اسد اللہ بھی اسی فلائٹ سے واپس پاکستان جا رہے تھے' زری کو دیکھ کر ان کے چہرے پہ کرختگی آگئی تھی اور رخ پھیر لیا تھا۔

٭ ٭ ٭

وہ اپنے اسٹڈی روم میں بیٹھا ایک اہم کیس اسٹڈی کر رہا تھا جب اسٹڈی روم کے دروازے پہ کسی نے ناک کیا۔

"کم ان۔" اس نے اپنے سامنے پھیلی فائل کو بند کرتے ہوئے اجازت دی اور اس کی طرف سے اجازت ملتے ہی گلاب خان دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا تھا۔

"سلام صاحب۔" گلاب خان نے کافی ٹھہرے ہوئے لہجے میں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ آؤ۔" دل آور اپنی توجہ اس پہ مرکوز کر چکا تھا۔

"صاحب! آپ سے کچھ کہنا تھا' اگر آپ غصہ نہ کریں تو۔" گلاب خان کا لہجہ اور انداز بے حد سنجیدہ تھا اور دل آور شاہ کا ڈر بھی تھا۔ اس نے گلاب خان کو حیرت سے دیکھا تھا۔

"تمہیں پتا ہے گلاب خان جائز بات پہ میں غصہ نہیں کرتا۔" اس نے گلاب خان کو آگاہ کیا۔

"صاحب! یہ بات بھی جائز بات ہی ہے۔"

"تو پھر بے فکر ہو کر کہو۔ کیا کہنا ہے؟" اس نے اپنا پین بند کر کے کتاب کے درمیان رکھتے ہوئے کتاب بھی بند کر دی تھی۔

"صاحب! میرا اس بات سے کوئی تعلق تو نہیں ہے اور نہ ہی مجھے کوئی حق ہے کہ میں آپ کے کام میں مداخلت کروں' لیکن صاحب اللہ کا بندہ ہوں' انسان ہوں اور انسان کے دماغ میں خیال آتے دیر نہیں لگتی' اچھے برے سب خیال آتے ہیں' خیال آتا ہے تو احساس جاگتا ہے اور میرے دل و دماغ میں بھی یہ احساس جاگ رہا ہے کہ وہ لڑکی جسے آپ نے بیسمنٹ میں بند کر رکھا ہے وہ اگر بھوک پیاس سے مر گئی تو اللہ میری پکڑ ضرور کرے گا اور میرا ضمیر بوجھ تلے دب جائے گا کیونکہ وہ لڑکی آپ کی گناہ گار اور مجرم سہی' آپ کی اس سے نفرت اور دشمنی سہی' لیکن میری تو نہیں ہے نا؟ میں تو اس کے لیے کچھ کر سکتا تھا نا؟ کیونکہ اس کے قید خانے کی چابی میری جیب میں ہے۔ میں اس کے لیے اس قید خانے کا دروازہ نہیں کھول سکتا کیونکہ مجھے آپ کا ڈر ہے اور جب مجھے آپ کا اتنا ڈر ہے تو کیا اللہ کا ڈر نہیں ہے؟ آپ مجھ سے پوچھ گچھ کر سکتے ہیں تو اللہ بھی کر سکتا ہے۔ کیونکہ میں آپ کا نوکر اور اس کا بندہ ہوں' اس لیے آپ بتائیں کہ میں کیا کروں؟ میں نہ تو آپ سے چھپ کے کچھ کر سکتا ہوں اور نہ ہی اس کی ذات سے چھپ سکتا ہوں' اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں' بڑی مشکل میں ہوں' برے خیال آ رہے ہیں۔" گلاب خان سر جھکائے کھڑا وہ سب کہہ چکا تھا جو وہ دو دن سے کہنا چاہ رہا تھا مگر کہہ نہیں پا رہا تھا۔ دل آور اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ بالکل خاموش! چند ثانیے وہ خاموش رہنے کے بعد گہری سانس کھینچتا ہوا اٹھا اور اپنے اسٹڈی روم کی دیوار گیر کھڑکی کے تمام پردے ہٹا دیے تھے اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھول کر باہر دیکھنے لگا' باہر سیاہ اندھیرا تھا۔ اتنا سیاہ جتنا دل آور شاہ کے اندر تھا۔

"سگریٹ اور لائٹر دو۔" اس کی بھاری ـــــ آواز سپاٹ تھی۔

"جی صاحب!" گلاب خان نے فوراً" آگے بڑھ کے اس کی رائٹنگ ٹیبل پہ رکھا سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اٹھایا اور اسے پیش کر دیا۔ دل آور نے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور پھر اسے لائٹر کا شعلہ دکھا دیا۔ اور ایک

گہرا کش لیتے ہوئے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر دوبارہ گلاب خان کی سمت بڑھا دیا تھا اور گلاب خان ان کو واپس ٹیبل پہ رکھتے ہوئے دوبارہ اپنی سابقہ جگہ پہ جا کھڑا ہوا تھا۔

"تو تم اب مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اب کی بار تو دل آور کے لہجے میں بھی دھواں تھا۔

"اجازت! صاحب صرف اجازت۔" وہ فوراً" بولا تھا۔

"کس چیز کی اجازت؟"

"صاحب! اس لڑکی کو روٹی پانی دینے کی اجازت۔"

"صرف روٹی پانی؟"

"جی صاحب! صرف روٹی پانی۔" گلاب خان نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اگر کل کو تمہیں اس کی کسی اور ضرورت کا خیال آ گیا تو؟" دل آور نے سگریٹ کا گل جھاڑتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ اس کی نظریں گلاب خان کی بجائے اپنے ہاتھ کی انگلیوں میں دبے سگریٹ پہ تھیں۔

"صاحب! روٹی اور کپڑے کے سوا انسان کی اور کوئی بڑی ضرورت نہیں ہوتی ہر چیز کے بغیر گزارہ ہو جاتا ہے لیکن ان دو چیزوں کے بغیر نہیں ہو سکتا' فی الحال اس لڑکی کو ان دونوں چیزوں میں سے روٹی کی ضرورت ہے۔" گلاب خان کافی سوچ سمجھ کے بول رہا تھا۔

"ہوں! ٹھیک ہے' جاؤ تم اور دے دو اسے روٹی پانی' شاید تم اللہ کی پکڑ سے بچ جاؤ' اگر میری ایک اجازت سے تمہارا ضمیر سرخرو ہوتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اس نے گلاب خان کی اٹکی ہوئی سانس بحال کر دی تھی گلاب خان کے کہے کا مان رکھ لیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے صاحب کا بہت وفادار اور تابعدار ملازم تھا کیونکہ وہ اسے بھی پروٹوکول دیتا تھا' ملازم کو ملازم سمجھ کے دھتکارتا نہیں تھا۔

"بہت بہت شکریہ صاحب! بہت زیادہ شکریہ' آپ کا یہ احسان ہے مجھ پہ۔" گلاب خان دل سے مشکور ہوا تھا۔

"میرا کوئی احسان نہیں ہے! لیکن گلاب خان تمہیں کیا پتا؟ اس لڑکی پہ جو بیت رہی ہے تم صرف وہ دیکھ سکتے ہو' لیکن جو مجھ پہ بیت چکی ہے وہ تمہیں کبھی نظر نہیں آئے گی' تمہیں کبھی خیال نہیں آئے گا اور نہ ہی کبھی احساس جاگے گا۔ تمہیں صرف یہ لگے گا کہ تمہارا صاحب ظالم ہے اور یہ لڑکی مظلوم ہے۔ شاید یہ لڑکی مظلوم ہی ہو۔ لیکن اس کی بدقسمتی یہ ہے کہ وقار آفندی کی بیٹی ہے ایک ظالم انسان کی بیٹی مظلوم کیسے ہو سکتی ہے؟ میں اس پہ ترس کھانا بھی چاہوں تو نہیں کھا سکتا گلاب خان کیونکہ اس کی رگوں میں اس کے ذلیل باپ کا خون ہے۔ جس سے مجھے اتنی نفرت ہے کہ دل چاہتا ہے اب بھی اسپتال جا کر اسپتال کے بستر پہ اس کے مفلوج اور معذور جسم کو بھی اپنے ریوالور کی گولیوں سے چھلنی کر کے رکھ دوں۔ اک ریت کے ذرے جتنا بھی ترس نہ کھاؤں اس پہ اور ایسی عبرت ناک موت دوں کہ ہر زمانے میں مثال دی جائے۔" دل آور شاہ کا غضب اس کے لہجے میں بول رہا تھا اور گلاب خان بے یقین اور حیرت زدہ سا کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا وہ جواباً" کچھ کہہ ہی نہیں سکا تھا اور پھر ذرا توقف سے ٹھٹکا اور وہاں سے باہر نکل آیا تھا۔

٭ ٭ ٭

"پانی۔۔۔ پانی۔۔۔ پاپا۔۔۔ مما۔۔۔ پانی۔۔۔ مم۔۔۔ مجھے۔۔۔ پانی۔۔۔ ڈ۔۔۔ ڈرا۔۔۔ پیو۔۔۔ پیپ۔۔۔ پانی۔۔۔" گلاب خان بیسمنٹ کا دروازہ کھول کے نیچے آیا تو اسے وہ لڑکی فرش پہ اوندھے منہ گری ہوئی نظر آئی اور اس کی حالت نیم بے ہوشی کی سی تھی کیونکہ اس کی آنکھیں بند اور یوں اوندھے منہ گرے ہونے کے باوجود اس کے منہ سے یہ کمزور' نڈھال اور نقاہت زدہ سے الفاظ نکل رہے تھے اس کی پیاس اور پانی کی طلب اتنی شدید تھی کہ وہ بے ہوش ہو کر بھی بے ہوش

نہیں ہو پا رہی تھی اس کی زبان پہ ایک ہی فریاد تھی۔ پانی اور صرف پانی۔!

اور اس کی یہ حالت اور اس کی پیاس کا یہ عالم دیکھ کر گلاب خان کانپ کے رہ گیا۔ اس کا دل مٹھی میں آ گیا' ذات کا پٹھان تھا' خالص پٹھان' اس لیے اس کے خمیر میں نرمی اور سختی کا تناسب برابر پایا جاتا تھا اور اس وقت اس کی ذات پہ نرمی اور خوف خدا کا سایہ تنا ہوا تھا اس کے دل کی عجیب سی حالت تھی۔

"بی بی جی۔۔۔! بی بی جی۔۔۔! آنکھیں کھولیں بی بی جی۔۔۔ میں پانی لے کر آیا ہوں آپ کے لیے۔" گلاب خان دوزانو اس کے قریب نیچے فرش پہ بیٹھ گیا اور نیم بے ہوش پڑی علیزے کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی قبر میں دبی ہوئی ہے اور کوئی اسے قبر سے باہر کھڑا آوازیں دے رہا ہے۔ جس کی بہت مدھم سی آواز اس کی سماعتوں تک بمشکل پہنچ رہی تھی اس کا چہرہ فرش پہ تھا اس کے چہرے کی ایک سائیڈ فرش سے جڑی ہوئی یوں جیسے اس کے چہرے کا ایک حصہ اور فرش کی سطح آپس میں پیوست ہو چکے ہوں اور فرش کی ساری ٹھنڈک اس کے چہرے میں منتقل ہو چکی تھی جس کی وجہ سے اس کے چہرے کی رنگت برف کی طرح سرد اور ہونٹ نیلے ہو رہے تھے اور وہی نیلے ہونٹ پیاس کی شدت سے لرز رہے تھے۔

"پانی۔۔۔ بابا۔۔۔ پانی۔۔۔ مم۔۔۔ مجھے۔۔۔ پانی۔۔۔ د۔۔۔ دو۔۔۔" اس کے منہ سے نامحسوس سی آواز نکل رہی تھی جو بمشکل سنی جا سکتی تھی۔

"بی بی جی! میں پانی لے کر آیا ہوں نا آپ کے لیے۔ آپ اٹھیں پانی پی لیں۔" گلاب خان نے دوبارہ کہا تھا لیکن اس میں کچھ کہنے سننے کی سکت ہوتی تو وہ جواب دیتی نا اور خود سے اٹھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کا جسم نقاہت سے بے جان ہو چکا تھا اور اتنی طاقت نہیں تھی کہ اس فرش سے کروٹ بدل کر سیدھی ہو جاتی۔

"گلاب خان! لگتا ہے کہ کبھی کبھی ہی عقل سے کام لیتے ہو؟ کیا تمہیں لگتا ہے کہ یہ خود اٹھ سکتی ہیں؟" گلاب خان کے قریب ہی گل کی آواز سنائی دی تھی اور گلاب خان چونک گیا۔

"تم یہاں؟"

"ہاں! میں یہاں۔"

"لیکن! تم یہاں کیوں آئی ہو۔ صاحب غصہ کریں گے۔" اس نے گل کو خفگی سے گھورا تھا۔

"میں بس یہ دیکھنے آئی تھی کہ یہ بی بی جی زندہ ہیں یا مر گئیں؟"

"اللہ معافی دے! یہ کیا بول رہی ہو؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" گلاب خان نے جھرجھری سی لی۔

"کچھ نہیں ہوا مجھے لاؤ میں انہیں اٹھاتی ہوں۔" گل سر جھٹک کر آگے بڑھی اور پھر نیچے بیٹھ کر علیزے کو مضبوطی سے سہارا دے کر سیدھا کیا تھا اور ایک ہی پوزیشن میں اتنے گھنٹے پڑے رہنے کے بعد جسم کو حرکت ملی تو وہ تکلیف سے کراہ اٹھی تھی اس کو سیدھا کر کے دیکھا تو اس کے چہرے کا زاویہ ٹیڑھا ہوا لگ رہا تھا۔ گل نے اپنے دوپٹے سے اس کی پیشانی رخسار اور ہونٹ صاف کیے تھے جن پہ فرش کی گرد جم گئی تھی۔

"پ۔۔۔ پانی۔۔۔!" اس کی ہونٹوں کی جنبش پہ گل نے گلاب خان کو دیکھا تھا۔

"گلاب خان! ان کی حالت تو بہت خراب ہے؟" گل نے کافی تشویش سے کہا تھا۔

"جو کچھ بھی کرنا ہے یہیں کرنا ہے' ڈاکٹر کی امید مت رکھو' اتنی اجازت نہیں ہے ان کے لیے۔" گلاب خان اپنی بیوی کی بات کا مطلب سمجھ چکا تھا۔

"یہاں پہ کیا ہو سکتا ہے بھلا؟" گل مایوس ہوئی تھی۔

"کوشش کریں تو سب ہو سکتا ہے' تم فوراً جاؤ اور ان کے لیے چائے بنا کر لاؤ' چائے کی گرمائش سے یہ قدرے ہوش میں آ جائیں گی لیکن ٹھہرو۔ پہلے انہیں یہ پانی پلا دو۔" گلاب خان نے جگ سے پانی انڈیل کر گلاس گل کو تھما دیا تھا۔

"بی بی جی۔۔۔! ذرا آسرا لیں اور یہ پانی پی لیں۔" اس نے علیزے کو ذرا سا سہارا دے کر اونچا کیا اور گلاس اس کے منہ سے لگا دیا تھا' علیزے کو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگا ہوا ہے۔ گل نے خود ہی اس کے منہ میں پانی ڈالا تھا اور چند گھونٹ اسے پانی پلانے کے بعد اس کا چہرہ اور اس کے بازو سہلانے لگی تھی اس کے جسم کو تھوڑا تھوڑا دبا کر گرمائش میں لانے کی کوشش کی تھی۔

"گلاب خان! ان کے لیے بستر کا ہونا بھی بہت ضروری ہے یوں ٹھنڈے فرش پہ تو ٹھنڈ سے ہی مر جائیں گی۔" گل کو ہر چیز کا خیال آ رہا تھا۔ "میں بھی کچھ یہی سوچ رہا تھا۔"

"سوچو مت! کرو' جاؤ لے کر آؤ۔" گل کافی اتاؤلی ہو رہی تھی۔

"لیکن گل وہ صاحب؟"

"ارے! صاحب کچھ نہیں کہیں گے اگر کہا بھی تو تم میرا بتا دینا' مجھ پہ غصہ نہیں کریں گے وہ۔" گل نے اسے سمجھایا اور گلاب خان پریشانی سے سر ہلاتے ہوئے اٹھ کر چلا گیا۔ پھر اس نے نیچے بچھانے کے لیے فوم کا گدا اور سنگل کمبل لا کر دیا تھا اور گل نے بڑی دقت سے علیزے کو فرش سے گھسیٹ کے گدے پر لٹایا تھا اور اوپر کمبل اوڑھا دیا تھا۔

"تم یہاں بیٹھو میں ان کے لیے دودھ گرم کر کے لاتی ہوں' بعد میں چائے کے ساتھ انڈے بوائل کر کے لے آؤں گی تب تک یہ ہوش میں آ جائیں گی۔" گل کہتی ہوئی گلاب خان کو وہاں بٹھا کر چلی گئی تھی اور گلاب خان اس لڑکی کی بدقسمتی پہ سوچ رہا تھا وہ کتنے بڑے گھر کی بیٹی تھی' کتنی امیر تھی' کتنی لاڈلی تھی لیکن پھر بھی بدقسمت تھی' اپنے باپ کا بویا کاٹ رہی تھی' اتنی آسائشوں میں زندگی گزارتے ہوئے اسے کیا پتا تھا اسے آگے جا کر اپنے باپ کے کیے کا بھگتان بھی بھگتنا ہے؟ اسے کیا خبر تھی کہ جو آسائشات اور مراعات اسے اس کے باپ نے دے رکھی ہیں وہ اس کے باپ کی وجہ سے ہی چھن جائیں گی؟ وہ مخملی بیڈ سے زمین کی سخت سطح پر آ جائے گی اس کا نرم و نازک وجود زمین کی سختی سہہ نہیں پائے گا بلکہ اس کے لیے عذاب بن جائے گا۔ اور اس پہ یہ عذاب دیکھ کر گلاب خان کو بہت دکھ اور افسوس ہو رہا تھا۔

"گلاب خان!" گل کی آواز پہ وہ بری طرح چونکا تھا۔ وہ چھوٹی سی ٹرے لیے کھڑی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟ بی بی جی کو دیکھو۔ وہ ہوش میں آ رہی ہیں شاید۔" اس نے گلاب خان کو متوجہ کیا۔

"ہاں' ہاں! تم ان کو یہ دودھ پلاؤ' ٹھیک ہو جائیں گی یہ۔" اس نے فوراً کہا تھا اور گل دوبارہ علیزے کے پاس بیٹھ گئی۔ پھر اس نے چمچے کے ساتھ آہستہ آہستہ اس کے منہ میں دودھ ڈالنا شروع کیا تھا دودھ نیم گرم تھا جس کی تراوٹ سے علیزے کے سن ہوئے حواس واپس آنے لگے تھے اور لگاتار دو گھنٹے کی دیکھ بھال کے بعد وہ مکمل ہوش میں آ چکی تھی۔ اب اسے خوراک کی ضرورت تھی کیونکہ معدہ خالی تھا۔

"آج زلفی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے میں نے اس کے لیے دال چاول بنائے تھے آپ کو اگر بھوک لگی ہے تو آپ کے لیے لے آؤں؟" گل نے اسے تکیے کے سہارے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بٹھاتے ہوئے استفسار کیا تھا اور کھانے کے لیے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے علیزے کے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا اٹک گیا دو تین دن پہلے اس نے دل آویز شاہ کی طرف سے بھیجا ہوا کھانا ٹھکرا دیا تھا اور کھانا سے منہ موڑ کر کبھی نہ کھانا کھانے کا عزم کیا تھا لیکن آج وہ اس نوبت اس حال کو پہنچ چکی تھی کہ کھانے کے سوا اور کسی چیز کی طلب یا ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

آج وہ کھانے کے لیے ترس رہی تھی' وہ جو بھی لے آتے وہ کھانے کے لیے تیار تھی' کیونکہ پیٹ کا دوزخ اگر

بھرا نہ جائے تو بڑے بڑوں کو شکست خوردہ ' نڈھال ' کمزور اور بے جان کر ڈالتا ہے اور وہ تو تھی ہی نازک اندام سی موم کی گڑیا جس نے کبھی ایک منٹ بھی بھوک برداشت نہیں کی تھی جس کے ایک اشارے پہ رجو کھانے کے تمام لوازمات اور تمام ذائقے ٹیبل پہ سجا دیتی تھی ' ایک وقت کے کھانے میں کئی ڈشز تیار ہوتی تھیں اور وہ محض برائے نام کھانا کھاتی تھی لیکن آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خوب پیٹ بھر کے کھانا کھائے اور اس کے بے جان جسم میں پھر سے طاقت اور توانائی آجائے کیونکہ وہ پیٹ کے دوزخ کا یہ عذاب سہار نہیں پا رہی تھی ' ایک ایسا عذاب جو لوگوں سے قتل کروا لیتا تھا ' چوری اور ڈاکے پہ مجبور کر ڈالتا تھا ' صرف اس لیے کہ پیٹ کا یہ دوزخ خالی نہ رہے ' نہ انسان کا اپنا ' نہ انسان کے اپنوں کا۔ پیٹ کی آگ ایسی آگ تھی کہ انسان ہر آگ میں کودنے کے لیے تیار ہو جاتا تھا کیونکہ بھوک اللہ نے ایک ایسی چیز بنائی ہے جس کے سامنے طاقت ور اور کمزور انسان یکساں نڈھال ہو جاتے تھے جس کو سہنا کسی بھی ذی روح کے بس میں نہیں تھا اس میں اتنی طاقت تھی کہ انسان کی انا ' غیرت ' عزت ' غرور اور آن سب کچھ ڈھیر ہو سکتا تھا یہاں تک کہ انسان خود بھی۔۔۔!

"لیجیے بی بی جی۔۔۔! کھانا کھا لیجیے۔" گل نے کھانے کی ٹرے لا کر اس کے سامنے نیچے فرش پہ ہی رکھ دی تھی اور علیزے نے چونک کر زمین پہ رکھی ٹرے اور ٹرے میں رکھے دال چاول کی پلیٹ دیکھی تھی اور علیزے کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا سا پڑ گیا۔ گل نے پلیٹ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دی تھی اور علیزے نے اپنی کم مائیگی کے باوجود بڑے بے صبرے سے انداز میں چاول کھانا شروع کر دیے تھے لیکن اس کے ہاتھ لرز رہے تھے اس سے چمچہ نہیں پکڑا جا رہا تھا ' ہاتھ میں پکڑی پلیٹ بھی لرز رہی تھی بلکہ یہاں تک اس کے حلق نوالہ بھی نیچے نہیں اتر رہا تھا مگر وہ پھر بھی پلیٹ تھوڑی دیر کے لیے رکھ دینے پر آمادہ نہیں تھی یوں جیسے اس سے یہ کھانا بھی چھن جائے گا اور پھر تین چار نوالے کھانے کے بعد جب اس کی ہمت جواب دے گئی تو اس نے تھک کے پلیٹ واپس نیچے فرش پر رکھ دی اور لرزتے کانپتے وجود کے ساتھ وہ بے ساختہ اپنے حال اپنی کیفیت پہ رو پڑی اور کھانا چھوڑ کر اپنے چہرے پہ ہاتھ رکھے وہ یوں بلک بلک کر روئی تھی کہ گل اور گلاب خان کے دل بھی کانپ گئے۔ گل کافی دیر اسے تسلی اور دلاسے دیتی رہی لیکن علیزے کی ہچکیاں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے کئی خیال رلا رہے تھے جن میں یہ خیال سرفہرست تھا کہ وہ وقار آفندی کی بیٹی ہو کر کھانا کھانے کے لیے ترس رہی ہے؟ اس کے پاپا کو پتا چلے گا تو وہ مر جائیں گے۔ ان کی علیزے بھوکی تھی۔ ان کے لیے یہ احساس مر جانے کے برابر تھا۔۔۔! علیزے نہ جانے کتنی دیر تک یونہی روتی رہی اور پھر بہت بعد میں گل اور گلاب خان اسے تسلی دے کر چلے گئے تھے البتہ جاتے جاتے کھانا اور پانی وغیرہ پاس رکھ گئے تھے جس کو دیکھ کر علیزے کی آنکھیں پھر سے پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ اتنی آسائشوں کے بعد غریبی کا یہ وقت کاٹنا بے انتہا مشکل تھا۔ اس کا رونا بلکنا بجا تھا۔۔۔

☼ ☼ ☼

وہ فجر کی نماز پڑھ کے واپس گھر آیا تو بل ڈوگ نے اسے دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیا تھا۔

اس نے ٹھٹک کر دیکھا تھا بل ڈوگ اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا اتنے دن ہو گئے تھے اس نے بل ڈوگ پہ کوئی توجہ نہیں دی تھی اور یہی سوچ کر وہ اس کی جانب آگیا اور بل ڈوگ اسے دیکھ کر بڑے لاڈ سے دم ہلانے لگا تھا۔ اس کے ادھر ادھر ٹہلنے کی چال بھی بدل گئی تھی۔

"کیسے ہو شیرو؟" اس نے بل ڈوگ کے قریب آکر اسے سہلایا تھا! در اس کی کھسیائی ہوئی سی غرغراہٹ سنائی دینے لگی گویا وہ اس موٹے سنگل سے آزاد ہونا چاہتا تھا کہ دل آور نے آگے بڑھ کر دیوار میں نصب کھونٹے سے اس کی سنگل کھول دیا تھا۔ اور بل ڈوگ خوشی کے اظہار کے طور پہ لان کے ایک سرے سے بھاگتا ہوا دوسرے سرے تک چلا گیا۔

"صاحب۔! بل ڈوگ پہ جب آپ توجہ دیتے ہیں تو اس کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہتا۔" زلفی مسکرا کر کہتا ہوا قریب آگیا اتنے دنوں سے زلفی ہی بل ڈوگ کی دیکھ بھال کر رہا تھا لیکن اتنے دنوں میں اس نے ایک بار بھی بل ڈوگ کو اتنا خوش نہیں دیکھا تھا جتنا اس وقت دیکھ رہا تھا۔

"اسے مجھ سے پیار ہی بہت ہے 'اسی لیے تو اسے انگلینڈ سے اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا۔" دل آور مسکرایا تھا۔

"حالانکہ آپ کو انگلینڈ سے اسے لانے کی بجائے ایک میم لانی چاہیے تھی۔" زلفی کی بات پہ دل آور قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

"میم اس لیے لے کر نہیں آیا کہ شاید میم اتنی وفادار نہ ہوتی جتنا یہ وفادار ہے۔ وہ دوبارہ واپس جانے کی ضد کرتی ' شور کرتی ' ہنگامہ کرتی جبکہ اس نے ہمیشہ میرے ساتھ رہنے کی ضد کرنی ہے اس ملک کا ہر سرد و گرم اس نے میرے ساتھ ہی سہنا ہے اور میری ذرا سی توجہ پہ یوں خوشی کا اظہار کرتا ہے کہ جیسے پہلے کبھی خوش ہی نہ ہوا ہو۔" دل آور کی دلیل پہ زلفی خوب متاثر ہوا تھا۔

"صاحب۔! آپ کی تو کیا ہی بات ہے۔ اسی لیے تو کبھی کبھی بڑا دل چاہتا ہے کہ کاش میں "دل آور شاہ ہوتا؟" زلفی کی خواہش سن کر اس کا فلک شگاف قہقہہ گونجا تھا جس پہ قریب آتا گلاب خان کافی حیران ہوا تھا۔

"یعنی تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ کاش میں "زلف خان" ہوتا؟" دل آور نے ہنستے ہوئے دلچسپی سے زلفی سے کہا تھا۔

"صاحب۔! میں نے یہ تو نہیں کہا؟" وہ کھسیانا ہوا تھا۔

"تو پھر اور کیا کہا ہے یار؟! اگر تم دل آور شاہ ہوتے تو ظاہر سی بات ہے کہ پھر میں زلف خان ہوتا۔ زلف خان نہ ہوتا تو گلاب خان ہوتا۔ لیکن جو بھی ہوتا یار لیکن دل آور شاہ نہ ہوتا۔ دل آور شاہ ہونے میں بڑی اذیت ہے۔ تم نہیں جانتے۔" کہتے کہتے دل آور کا لہجہ بجھ گیا اس کی زبان پہ تلخی آگئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ یہ تلخی بڑھتی اس کے سیل فون پہ وائبریشن ہونے لگی۔

"گلاب خان! بل ڈوگ کے لیے دودھ لے کر آؤ اس کا بریک فاسٹ دو اسے۔" دل آور نے اسے ہدایت دیتے ہوئے کال ریسیو کر لی تھی زلفی بھی وہاں سے چپ چاپ پلٹ گیا۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام! گڈ مارننگ۔" دوسری طرف کی آواز نبیل کی تھی۔

"صبح بخیر۔" دل آور کا انداز سنجیدہ تھا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" نبیل نے کافی فریش لہجے میں پوچھا۔

"کیوں؟ کیا ہونا چاہیے؟" دل آور نے الٹا اس سے سوال کر ڈالا تھا۔

"بے چینی۔" نبیل کی آواز بھی کچھ مضطرب اور بے چین ہی لگ رہی تھی۔

"بے چینی؟ مطلب؟" دل آور سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"یار! کیا تمہیں نہیں پتا کہ آج عبداللہ آرہا ہے؟" نبیل خفگی سے جھنجلایا تھا اور دل آور کو ہر چیز سمجھ میں آگئی تھی۔

"او اچھا! عبداللہ۔" اس نے لفظ کو کافی لمبا کھینچا تھا۔

"ہاں یار عبداللہ۔ کیا تمہیں نہیں یاد تھا؟" نبیل کو حیرت ہوئی تھی۔

"یاد تھا۔! لیکن بے چینی نہیں تھی۔" دل آور سکون سے بولا۔

"کیوں نہیں تھی؟"

"کیونکہ تمہیں جو ہے۔" دل آور کے جواب پہ نبیل ٹھٹک گیا۔

"کیا تمہارا دوست نہیں ہے؟"

"صرف دوست ہے نا۔" اس کا ہر جواب الٹا تھا۔

"تو میرا اور کیا ہے؟"

"یہ تو تمہیں پتا ہونا چاہیے جسے بے چینی ہو رہی ہے۔"

"اف! میں نے غلط کیا صبح صبح تمہیں فون کر کے۔" نبیل زچ ہو گیا۔

"تو تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم اتنی صبح صبح فون کر کے مجھ سے میری بے چینی پوچھو؟ ویسے اگر میں نے تمہیں اپنی بے چینی بتا دی تو تمہاری ساری بے چینی ختم ہو جائے گی۔" دل آور کا لہجہ مبہم تھا نبیل کے کچھ پلے نہیں پڑا تھا۔

"اچھا خیر! یہ بتاؤ کہ ان کو ریسیو کرنے کے لیے گھر سے کب نکلنا ہے؟" نبیل نے اگلا سوال کیا۔

"نو بجے۔"

"ارے کیوں؟ نو بجے کیوں؟ آٹھ بجے نکلتے ہیں نو بجے لیٹ ہو جائیں گے۔" نبیل کو جلدی اور بے چینی ایک ساتھ لاحق ہوئی تھیں۔

"کیوں ایئرپورٹ پر جا کر میں نے پروازوں کی گنتی کرنی ہے۔ جو آٹھ بجے ہی پہنچ جاؤں؟ ہاں اگر تمہیں اتنی جلدی اور اتنی بے چینی ہے تو تم جا سکتے ہو میں بعد میں آ جاؤں گا۔" دل آور کے جواب پہ نبیل بے چارہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا لیکن اندر ہی اندر اس پہ تلملا بھی رہا تھا مگر افسوس کہ کر کچھ نہیں سکتا تھا۔

"او کے! نو بجے ہی چلیں گے۔" اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

"گڈ! جلدی عقل آ گئی تمہیں۔" دل آور مسکرا کے بولا تھا۔

"دل آور ے! تو بڑا ذلیل ہے اللہ کرے کہ تیرا حال بھی کبھی میرے جیسا ہو۔"

"کیوں؟ تمہارے حال کو کیا ہوا ہے؟ کوئی خاص وجہ؟" اس کے انجان بن کے کہے جانے والے سوال پہ نبیل گڑبڑا گیا۔

"نن نہیں! کچھ نہیں ہوا بس ایسے ہی۔" نبیل ٹال گیا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر! اللہ حافظ۔" دل آور نے بات سمیٹی تھی۔

"او کے! گڈ بائے۔" نبیل نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا لیکن اندر راہداری کی سمت بڑھتے ہوئے دل آور نبیل کو ہی سوچ رہا تھا کیونکہ نبیل اس کو سوچ رہا تھا جو دل آور کو سوچ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے
وہ بت ہے یا خدا دیکھا نہ جائے
یہ آج کن نظروں سے تو نے دیکھا
کہ تیرا دیکھنا' دیکھا نہ جائے

زری کی نگاہیں تھیں اور دل آور شاہ مجسم تھا۔ یہ حقیقت تھی یا افسانہ تھا؟ دو عالم تھے جو زری کی نگاہوں میں ایک ہو کر ٹھہر گئے تھے' پوری کائنات پر اسم محبت پھونک دیا گیا تھا۔ پوری کائنات اس اسم کے طلسم میں جکڑی تھی جو جہاں تھا وہ وہیں رہ گیا تھا جہازوں کی پروازیں جہاں تھیں وہیں ساکت ہو گئی تھیں' ایئرپورٹ پہ آنے جانے والے ہزاروں مسافر اپنی اپنی جگہ پر منجمد ہو چکے تھے' ایئرہوسٹس' پائلٹ اور دیگر عملہ جامد ہو گئے تھے تمام ذی نفس اپنی سانسیں روک چکے تھے کیونکہ زری کا عشق ان سب کو اس وقت ایسے حال میں ہی تصور کر رہا تھا۔ گویا وہ وہاں اکیلی تھی اور اس کے سامنے وہ بھی اکیلا کھڑا تھا باقی ساری دنیا پتھر کی ہو گئی تھی۔ انسانوں سے مجسموں میں تبدیل ہو گئی تھی اور مجسموں کے سامنے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی دنیا سے بے نیاز ہو کر اسے دیکھتے ہوئے سیراب بھی ہو سکتی تھی حالانکہ وہ یہ بھول گئی تھی کہ پوری کائنات حالت حرکت میں ہے سوائے اس کے۔

وہ دوسروں کو پتھر کے مجسمے تصور کر رہی تھی حالانکہ خود اس وقت پتھر ہوئی کھڑی تھی۔ اس کا عشق دل آور شاہ کو اپنی آنکھوں سے چوم رہا تھا اس کی آنکھوں نے اس کے اک اک نقش پہ بوسہ دیا تھا اس کے پاؤں پہ' اس کے ہاتھوں پہ' اس کے ماتھے پہ' اس کے چہرے پہ' اس کے بالوں پہ' اک اک نقش کو چوم کر دل میں اتار لیا تھا اور دل کی دھڑکنیں جہاں تیز ہوئی تھیں وہیں انہیں اک قرار آ گیا تھا' رگ و پے میں طمانیت اتر گئی تھی۔ وہ اس کے سامنے تھا' اس کی نظروں میں تھا' آنکھوں میں بسا ہوا تھا' دل میں دھڑک رہا تھا' ایسے عالم میں زری کو اور کیا چاہیے تھا؟

اس کی محبت' اس کا عشق' اس کی چاہ بس ایک ہی تھی... دل آور شاہ... اور یہ دل آور شاہ...!

"السلام علیکم...!" وہ عین اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ زری جو پتھر بنی کھڑی تھی اس کی آواز پہ' اس کے گھمبیر لہجے پہ' اس کے انداز پہ یکدم چیخ کے پتھریلے حواسوں سے ہوش میں آئی تھی اور اسے دیکھنے کے بعد اس کے دل کی حالت نازک تھی کیونکہ دل آور شاہ اس کے سامنے اس کے قریب کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا...!!!

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ کریں)

☼ ☼

بشریٰ احمد

مدثر کے ابا

"رات بڑی مدت بعد مجھے مدثر کے ابا نظر آئے۔" جہاں آرا بیگم نے ناشتے کی میز پر ہر افراد خانہ کو مخاطب کیا تھا۔ حوریہ کا نوالہ حلق میں اٹکنے لگا۔

مرحوم سسر جب بھی ساس محترمہ کے خواب میں آتے ان لوگوں کے کام میں کوئی نہ کوئی رخنہ ضرور ڈال کر جاتے۔ اس نے میز کے گرد بیٹھے لوگوں پر نگاہ ڈالی۔ اس کے بڑے جیٹھ مدثر' شوہر مزمل اور چھوٹا دیور مصور تینوں بڑی عقیدت سے ماں کو تک رہے تھے کہ وہ آگے کیا ارشاد فرماتی ہیں۔ جبکہ اس کی جیٹھانی ناعمہ کے چہرے پر چھائی بے چارگی واضح نظر آرہی تھی۔ وہ بھی حوریہ والے خدشات کا شکار تھی۔

"کیا کہہ رہے تھے ابا؟" مصور نے اشتیاق سے پوچھا۔ سب جانتے تھے کہ ابا جب بھی اماں کے خواب میں آتے کوئی نہ کوئی اہم پیغام بیگم کے ذریعہ اولاد کو ضرور پہنچاتے تھے۔ تینوں بیٹے مرحوم باپ کی محبت میں سرشار' والدہ محترمہ کے خواب پر آنکھ بند کرکے اعتبار کرتے ہوئے اپنی بیویوں کا خون خوب ہی جلاتے تھے۔

حوریہ اور مزمل کی شادی کو ڈیڑھ برس ہونے کو آرہا تھا۔ شادی کے ابتدائی دن اسے حسین خواب کی مانند لگتے تھے۔ مزمل بہت پیار کرنے اور خیال رکھنے والا شوہر ثابت ہوا تھا۔ دونوں گھرانوں میں دور پرے کی رشتہ داری تھی۔ کسی شادی میں جہاں آرا بیگم کی نگاہ حوریہ پر پڑی۔ انہوں نے اسی فنکشن میں اپنے منجھلے بیٹے مزمل کے لیے حوریہ کے والدین سے اس کا رشتہ مانگ لیا۔ حوریہ اچھی پرکشش لڑکی تھی۔ جہاں آرا بیگم کا بیٹا مزمل بھی مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔ انہیں اس کے لیے خوب صورت مگر متوسط گھرانے کی سیدھی سادی لڑکی درکار تھی۔ حوریہ اسی لیے ان کا نگاہ انتخاب ٹھہری۔ اس کے ابا ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھے۔ پانچ بہن بھائیوں میں حوریہ کا نمبر تیسرا تھا۔ ایک بڑی بہن اور بھائی شادی شدہ تھے۔ حوریہ کے والدین بھی آج کل حوریہ کا مناسب بر ڈھونڈنے کی تگ ودو میں تھے۔ جہاں آرا بیگم نے حوریہ کا ہاتھ مانگا تو مانو ان کے دل کی مراد بر آئی۔ سوچ بچار کی رسمی مہلت لینے کے بعد انہوں نے ہاں کردی۔

مزمل برسرروزگار تھا۔ شریف تھا اور جاذب نظر شخصیت کا مالک' انہیں اس کے علاوہ اور کیا چاہیے تھا۔ یوں چند مہینوں کے اندر حوریہ دلہن بن کر پیا نگر سدھار گئی۔

شروع شروع میں اسے سسرال کا ماحول بالکل اپنے گھر جیسا لگا۔ ناعمہ اس کی جیٹھانی جو عمر میں اس سے بمشکل ہی ڈیڑھ' دو برس بڑی ہوگی۔ اس سے بہت جلد بہناپا اور دوستی کا رشتہ قائم ہوگیا۔ چھوٹا دیور مصور اسے اپنے چھوٹے بھائی علی کی طرح لگتا۔ شوخ اور شرارتی۔ جہاں آرا بیگم بھی شفقت سے پیش آتیں۔ رہا مزمل تو اس سے تو پہلے دن سے ہی دل کا رشتہ قائم ہوگیا تھا۔ خوشیوں بھرے اس نئے سفر کے آغاز کو حسین تر بنانے کے لیے مزمل نے ہنی مون کے لیے شمالی علاقہ جات جانے کا پروگرام بنایا۔ اس نے آفس میں مزید چھٹیوں کے لیے اپلائی کردیا۔ حوریہ نے ناعمہ کو شرمگیں مسکراہٹ کے ساتھ مزمل کے ارادے سے آگاہ کیا۔ ناعمہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ حوریہ نے الجھ کر اسے دیکھا۔ وہ اس کی معنی خیز ہنسی ۔ کا مطلب سمجھ نہ پائی تھی اور یہی بات اس نے ناعمہ سے پوچھ بھی ڈالی۔

"حوریہ ڈیئر! میری دلی خواہش ہے کہ ہنی مون پر جانے کا تمہارا اور مزمل کا ارادہ پایہ تکمیل کو پہنچے۔ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ مدثر کے ابا تمہیں اتنی آسانی سے ہنی مون پر جانے دیں گے۔"

"مدثر کے ابا؟" اس نے اچنبھے سے ناعمہ کو دیکھا۔

"جی ہاں میرے مدثر اور تمہارے مزمل کے ابا۔ ہمارے مرحوم سسر صاحب۔" ناعمہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں کچھ سمجھی نہیں بھابھی۔" حوریہ واقعی الجھ گئی تھی۔

"شروع شروع میں تو میں بھی کچھ نہ سمجھی تھی۔ مگر آہستہ آہستہ سب سمجھ آگیا۔ افسوس صرف اس بات کا ہوتا ہے کہ ہمارے میاں صاحبان کو یہ سب سمجھ نہیں آتا۔ تینوں بیٹے ماں کی ہر بات کو سچ اور حرف آخر جانتے ہیں۔" ناعمہ کا لہجہ اس بار بہت بوجھل تھا۔ وہ اس بار بھی اسے ناسمجھی سے تکتی رہ گئی۔ ناعمہ کی نگاہ اس کے چہرے پڑی تو مسکراتے ہوئے اس کی ٹھوڑی

چھوئی۔

"میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا یا الجھانا نہیں ہے۔ تم اور مزمل اماں سے اجازت لے لو۔ اللہ کرے کہ وہ خوش دلی سے تمہاری اس بے ضرر سی خواہش کو پورا ہونے دیں۔ لیکن مجھے اماں کی نیچر کا اندازہ ہو چکا ہے۔ شادی کے اخراجات کے بعد انہیں ہنی مون وغیرہ کا خرچہ سراسر اضافی لگتا ہے۔ وہ اسے صرف نئے شادی شدہ جوڑوں کا چونچلا قرار دیتی ہیں۔"

"مگر ہم ان سے اجازت لے چکے ہیں اور اماں نے اجازت دے بھی دی ہے۔" حوریہ نے قدرے جوش سے بتایا۔

"وہ تو اجازت دے ہی دیتی ہیں۔ اصل میں تو مدثر کے ابا آڑے آتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔" ناعمہ بھابھی جانے آج کیسی باتیں کر رہی تھیں۔ مزمل نے اسے آواز دے کر کسی کام سے بلایا تو حوریہ ناعمہ کی باتوں پر غور و فکر کرتی وہاں سے ہٹ گئی اور اگلی صبح ناعمہ کی ساری باتیں سیاق و سباق سمیت اس کی سمجھ میں آچکی تھیں۔

"کل مدثر کے ابا خواب میں نظر آئے۔ بہت الجھے ہوئے اور پریشان لگ رہے تھے۔" ناشتا سارا خاندان اکٹھے بیٹھ کر کرتا تھا۔ جہاں آرا بیگم کی بات پر سب نے ہی سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ مرحوم شوہر کا ذکر کرتے ہوئے وہ بہت دل گرفتہ اور ملول سی دکھائی دے رہی تھیں۔ حوریہ بھی قدرے حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ شادی کے بعد پہلی بار وہ اپنے سسر کا ذکر سن رہی تھی۔ اسے پہلے سے ہی علم تھا کہ مزمل کے والد دس، گیارہ سال پہلے اچانک حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے انتقال کر گئے تھے۔ اس نے پورے گھر میں ان کی کوئی تصویر تک لگی نہ دیکھی تھی۔ اس نے خود ہی قیاس لگا لیا تھا کہ سب گھر والوں کے لیے وہ ایک بھولی بسری یاد بن گئے ہوں گے۔ لیکن آج جہاں آرا بیگم کے ذکر چھیڑنے پر جس طرح ان کے تینوں بیٹے بے تابی سے ماں کو تکنے لگے تھے کہ وہ پورا خواب سنائیں حوریہ کو بیٹوں کی مرحوم باپ سے محبت کا اندازہ ہو گیا اور یہ بات اسے اچھی لگی تھی۔ اس نے بھی دلچسپی سے ساس کو دیکھا۔ جانے انہوں نے رات کیا خواب دیکھا تھا اور یہی بات مدثر بھائی نے پوچھ لی۔

"کیا کہہ رہے تھے ابا؟"

"کہنا کیا تھا بیٹے! بس صحن میں پریشانی سے ٹہل رہے تھے۔ سفید لباس پہنا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے جی۔ پریشان لگ رہے ہیں۔ الٹا مجھے ڈانٹنے لگے۔ کہنے لگے کیسی ماں ہو، اولاد کی صحت، سلامتی سے تمہیں غرض ہی نہیں۔ ملک کے حالات سنگین ہیں اور اپنے جگر کے ٹکڑوں کو گھر کی عافیت بھری فضا سے نکال کر باہر بھیج رہی ہو۔ میں نے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ پیٹھ موڑ کر چل دیے۔ یوں تو کبھی خفا نہ ہوتے تھے بیٹا۔" جہاں آرا بیگم نے دوپٹے کے پلو سے نادیدہ آنسو پونچھے تھے۔

"ابا ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے اماں۔ مزمل یار تم اپنا ہنی مون کا پروگرام کینسل کیوں نہیں کر دیتے۔" مدثر نے مزمل کو مخاطب کیا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں بھیا۔ ابا کا اشارہ ضرور ہماری طرف ہی تھا۔" مزمل نے جھٹ ان کی بات سے اتفاق کیا تھا۔ جہاں آرا بیگم نے مطمئن ہو کر بیٹوں کو دیکھا اور رہی حوریہ تو وہ آنکھیں پھاڑے میاں کو تک رہی تھی۔ رات ہی تو کتنے ارمانوں سے وہ اپنا ہنی مون ٹرپ ڈسکس کر رہے تھے اور صرف ایک خواب پر انہوں نے یکلخت پروگرام ہی ملتوی کر دیا۔ اسی لمحے اس کی نگاہ ناعمہ پر پڑی جو بڑی جتاتی ہوئی نگاہوں سے اسے تک رہی تھی اور حوریہ کو اس کی کل والی باتیں یاد آگئیں۔ چند لمحوں میں اسے ساری بات سمجھ آگئی تھی اور بعد میں جب ناعمہ اور وہ تنہائی میں اکٹھے ہوئے تو ناعمہ نے اسے ایسے بیسیوں واقعات سنائے جن میں مرحوم سسر جہاں آرا بیگم کے خوابوں میں آکر بہت سے پروگرام تلپٹ کرنے کا سبب بنے تھے۔

"اور مزے کی بات بتاؤں حوریہ، ابا کو عالم بالا میں

بھی دنیا کے واقعات کی پوری خبر رہتی ہے۔ لگتا ہے انہوں نے جنت میں بھی اخبار لگوا رکھا ہے۔" ناعمہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ حوریہ کے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ کچھ عرصہ لگا تھا۔ پھر وہ بھی اپنی زندگی میں "سسر مرحوم" کے دخل کی عادی ہو گئی۔ جس کام سے یا جس بات سے جہاں آرا بیگم کو انہیں روکنا مقصود ہو تا وہ مرحوم شوہر کو درمیان میں لا کر بات منوا لیتیں۔ مزمل نے آفس میں کمیٹی ڈال رکھی تھی۔ اس نے حوریہ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ کمیٹی کھلنے پر اسے گولڈ کا لاکٹ سیٹ بنوا کر دے گا۔ جہیز، بری میں سونے کے سیٹ تو تھے۔ مگر عام روٹین میں پہننے کے لیے کوئی لاکٹ، چین نہ تھی۔ اس نے اپنے ذہن میں ڈیزائن تک سوچ لیا تھا۔ مگر ادھر مزمل کی کمیٹی کھلی، ادھر جہاں آرا بیگم کو خواب میں "مدثر کے ابا" نظر آگئے۔ وہ اپنی بیٹی، داماد کے حوالے سے پریشان تھے جنہیں کاروبار میں خسارے کا سامنا تھا۔ انہوں نے بیوی کے "خواب" میں آکر بیٹوں کو پیغام بھجوایا کہ وہ اپنی اکلوتی بڑی اور شادی شدہ بہن کے اس آڑے وقت میں مالی مدد کریں۔ سو مزمل نے فوراً" کمیٹی کی رقم اماں کو تھما دی کہ وہ صفیہ آپا کو دے دیں۔ بے شک صفیہ آپا نے بعد میں قسطوں کی صورت میں اس قرض کی ادائیگی کر دی۔ مگر وہ پیسے روزمرہ کے خرچوں کی ہی نذر ہو گئے۔ نہ دوبارہ رقم جڑ پائی، نہ حوریہ کا لاکٹ سیٹ بن سکا۔ وہ اور ناعمہ اماں کے حربے کو سمجھ چکی تھیں۔ لیکن اماں کے تینوں بیٹے ماں کی بات پر جھٹ اعتبار کر لیتے۔ وہ دونوں کڑھنے کے سوا کچھ نہ کر سکتیں۔

اب بھی ایسا ہی معاملہ درپیش تھا۔ مصور اور مزمل دونوں بھائیوں نے نوکریوں کے ساتھ ساتھ چھوٹا موٹا پارٹ ٹائم بزنس شروع کیا تھا۔ اللہ نے کام میں برکت ڈالی، خوب منافع ہوا تھا۔ اب دونوں بھائیوں کی خواہش تھی کہ وہ اس منافع میں مزید جمع پونجی ملا کر ایک رہائشی پلاٹ خرید لیں۔ پلاٹ ان کی نظروں میں تھا۔ اسی علاقے میں کارنر کا پلاٹ بہت مناسب قیمت پر مل رہا تھا۔ شاید مالک کی کوئی مجبوری تھی۔ وہ فوری سودا چاہتا تھا۔ ناعمہ اور حوریہ بھی بہت خوش تھیں۔ موجودہ مکان ان کی ضروریات کے حوالے سے بہت چھوٹا پڑنے لگا تھا۔ مدثر، مزمل کے والد نے وہ اپنی فیملی کے حساب سے تعمیر کروایا تھا۔ مگر اب جب دونوں بیٹے شادی شدہ ہو چکے تھے اور تیسرے کی شادی بھی یقیناً" کچھ عرصے بعد ہو جانی تھی سو یہ مکان سب کی ضروریات کے حوالے سے نہایت ناکافی تھا۔ فی الوقت پلاٹ خریدنے کے پیسے تو اکٹھے ہو گئے تھے۔ تعمیر کا مرحلہ تو بعد میں آنا تھا۔ خوش آئند بات یہ تھی کہ جہاں آرا بیگم کو بھی اس امر پر قطعی کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ بھی بیٹوں کے ہمراہ جا کر خوش خوش پلاٹ دیکھ آئیں۔

حوریہ اور ناعمہ مطمئن اور خوش تھیں کہ مستقبل میں سر چھپانے کو اچھا ٹھکانہ میسر آجائے گا۔ لیکن پھر ایک دن صفیہ آپا چلی آئیں۔ صفیہ آپا جہاں آرا بیگم کی پہلوٹھی کی اولاد تھیں۔ طویل عرصے تک انہیں اکلوتی اولاد ہونے کا شرف حاصل رہا تھا کہ ان کے بعد جہاں آرا بیگم کے چار بچے کسی طبی پیچیدگی کا شکار ہو کر پیدائش کے بعد جانبر نہ ہو پائے تھے۔ سالوں حکیموں، ڈاکٹروں کا علاج کروایا۔ پھر اللہ نے یکے بعد دیگرے تین تندرست بیٹوں سے نوازا تھا۔ صفیہ باجی کی شادی بھی خاصی کم عمری میں ہو گئی تھی اور اب تو ان کی بڑی بیٹی شادی کے قابل ہو گئی تھی۔ جہاں آرا بیگم کی کوشش سے نواسی کا رشتہ اچھی جگہ طے پا گیا۔ پہلے پہل تو دونوں فریق اس بات پر راضی تھے کہ شمع کم از کم بی اے تک تعلیم مکمل کرے گی۔ اس سے پہلے شادی کا ذکر نہیں چھیڑیں گے۔ لیکن لڑکے کی ماں کو انجانا کا ہلکا سا اٹیک کیا ہوا ان کی طرف سے جلد شادی کا شور مچ گیا۔ آج بھی بوکھلائی ہوئی سی صفیہ آپا اسی بارے میں ماں سے مشورہ کرنے آن پہنچی تھیں۔ ناعمہ اور حوریہ کے سامنے تو وہ شمع کی کم عمری کو بنیاد بنا کر ماں

سے فکر مندی کا اظہار کر رہی تھیں۔ مگر جیسے ہی دونوں بھابھیاں ان کی تواضع کا سامان کرنے کمرے سے نکلیں انہوں نے اپنی اصل پریشانی سے آگاہ کیا۔

"سارا مسئلہ پیسوں کا ہے اماں۔ اکلوتی بیٹی ہے شمع میری۔ میری خواہش ہے کہ اس کا جہیز ایسا ہو کہ دنیا رشک کرے۔ زیور تو میں نے پہلے وقتوں میں بنوالیا تھا۔ لیکن فرنیچر' کراکری' الیکٹرونکس کا سامان' رفیع کے پاس تو اس وقت صرف اتنا ہے کہ ضرورت کا سامان ہی بمشکل اکٹھا ہو پائے گا۔ اگر آپ مزمل' مدثر سے میری مجبوری بیان کردیں تو ہوسکتا ہے کہ اس آڑے وقت میں وہ بہن کے کام آئیں۔ پلاٹ کا کیا ہے' وہ بعد میں لے لیا جائے گا۔ ادھار تو میں رکھتی نہیں' پائی پائی لوٹا دوں گی۔" صفیہ آپا' جہاں آرا بیگم سے مخاطب تھیں اور حوریہ "آپا کے لیے چائے کی ٹرے اٹھائے باہر کھڑی تھی۔ وہ اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ ایک استہزائیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ کتنی خود غرضی کا مظاہرہ کررہی تھیں صفیہ آپا' اپنی بیٹی کے شان دار جہیز کے لیے چھوٹے بھائیوں کی جمع پونجی استعمال میں لانا چاہ رہی تھیں۔ اپنے بیوی بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے' انہیں سر چھپانے کا معقول ٹھکانہ فراہم کرنے کا جو قدم وہ اٹھانے جارہے تھے صفیہ باجی انہیں اس سے روکنا چاہ رہی تھیں اور بھلے سے وہ بعد میں پائی پائی چکا دیتیں۔ مگر وہ پائی پائی کی صورت میں ہی چکاتیں' ان کا ماضی کا ریکارڈ گواہ تھا کہ یکمشت بڑی رقم بطور قرضہ لے کر وہ اتنی چھوٹی قسطوں میں قرضہ اتارتیں کہ قرض دینے والا مجموعی طور پر خسارے میں رہتا۔ حوریہ جانتی تھی کہ اکلوتی بیٹی اور اکلوتی ہی نواسی کی محبت میں مجبور ہو کر جہاں آرا بیگم بیٹوں کی جمع پونجی ٹھکانے لگانے سے دریغ نہیں کریں گی۔

بے بسی کے احساس سے اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔ اس نے ناعمہ کو بھی اس بات سے لاعلم ہی رکھا۔ وہ بے چاری ابھی خوش تھی۔ حوریہ اس کی خوشی ملیامیٹ نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ بے چاری نے ایک' دو دن مزید خوش رہ لینا تھا۔ پھر تو مدثر بھائی کے ابا نے اماں کے خواب میں نظر آہی جانا تھا۔

اگلی صبح کا ہی ذکر تھا حسب معمول سب ناشتے کی میز پر جمع تھے۔ حوریہ دزدیدہ نگاہوں سے اماں کو تک رہی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ انہیں رات کو ہی مدثر کے ابا نظر نہ آگئے ہوں اور اس کا خدشہ بالکل درست ثابت ہوا۔ ناشتے سے فراغت کے بعد چائے کے سپ لیتے ہوئے اماں نے بات کا آغاز کیا تھا۔

"رات بیٹا بڑا عجیب سا خواب نظر آیا۔" وہ جیسے کسی ٹرانس میں بولنا شروع ہوتی تھیں اور ان کے بیٹے ایک دم سے ہی ان کی جانب متوجہ ہوجاتے۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اتنے میں ہی حوریہ کا ہاتھ بے دھیانی میں چائے کے کپ سے ٹکرایا اور گرم گرم چائے اس کا ہاتھ جلا گئی اس نے ذرا زیادہ ہی آہ و بکا کا مظاہرہ کیا۔

مزمل فوراً" اس کا ہاتھ پکڑے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اسے بیڈ روم میں لے گیا اور پھر بہت احتیاط سے اس کے ہاتھ پر مرہم رکھا تھا۔ حوریہ نے محبت کرنے والے شوہر کو نظر بھر کر دیکھا۔ دل میں خدا کا شکر بھی ادا کیا۔ مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کا محبت کرنے والا شوہر ایک انتہائی فرماں بردار بیٹا بھی ہے۔ وہ اپنی ماں کے خلاف ایک بھی لفظ سننے کا روادار نہ ہوگا۔ حوریہ ایسی کوئی بات کرکے شوہر کی نگاہوں میں اپنا مقام نہیں کھونا چاہتی تھی۔ سو چپ رہنے پر مجبور تھی۔ آج تو اس نے ڈائننگ ٹیبل کا "کورم" توڑ کر اماں کو اپنا خواب نہیں سنانے دیا تھا۔ مگر وہ روز' روز اپنا ہاتھ جلا نہیں سکتی تھی۔ اسے بخوبی علم تھا کہ اگلی صبح اماں اپنا خواب سنا کر ہی دم لیں گی۔

سارا دن وہ بے بسی کی کیفیت میں گھری گھر کے کام نبٹاتی رہی' بلکہ آج تو اس نے دھیان بٹانے کے لیے خود کو قصداً" گھر کے غیر ضروری کاموں میں الجھا لیا تھا اور اسٹور روم کی صفائی کرتے ہوئے تصویروں کا ایک لفافہ اس کے ہاتھ آن لگا۔ مدثر بھائی اور مزمل' مصور کی بچپن اور لڑکپن کی تصویریں تھیں۔ پرانی تصویریں جو کسی البم کی زینت بننے کے بجائے بڑے سے لفافے میں بے ترتیبی سے پڑی تھیں اور ان ہی تصویروں کے بیچ میں سے ایک پاسپورٹ سائز تصویر پھسل کر نیچے گری۔ حوریہ نے اٹھا کر تصویر کو غور سے دیکھا۔ گندمی رنگت' سرمئی رعب چھلکاتی آنکھیں' گھنی مونچھیں' مشت بھر داڑھی اور نقوش میں سب سے چھوٹے مصور کی بے تحاشا جھلک' یہ یقیناً" اس کے سسر مرحوم کی تصویر تھی جو غالباً" پاسپورٹ وغیرہ بنوانے کی غرض سے ہی کھنچوائی گئی تھی۔ کیونکہ اس نے آج سے پہلے ان کی کوئی تصویر نہ دیکھی تھی۔ ایک بار مزمل سے پوچھا بھی تو اس نے بتایا کہ ابا فوٹو بنوانے کے خلاف تھے۔ سو مرحوم سسر سے ان لوگوں کا زبانی کلامی ہی تعارف تھا۔ آج اسے تصویر دیکھنے کو ملی تو اس نے بہت دھیان لگا کر تصویر دیکھی۔ گویا ان کے نقش بھی ازبر کرنا چاہ رہی ہو اور پھر تصویر دوبارہ لفافے میں گھسا کر لفافہ چیزوں کے ڈھیر کے نیچے دبا دیا۔ صفائی کا باقی کام اس نے آئندہ پر ڈال دیا اور بہت ہلکی پھلکی ہو کر اسٹور سے نکلی تھی۔ اگلی صبح کا ذکر تھا۔

چھٹی کا دن تھا۔ سب ایک بھرپور ناشتے سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ جب اچانک ہی حوریہ نے سب کو مخاطب کیا۔ انداز بالکل جہاں آرا بیگم والا تھا۔ کچھ کھویا کھویا سا۔

"رات ایک عجیب سا خواب دیکھا میں نے۔ میں برآمدے کی سیڑھیوں پر پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں' اتنے میں فضا میں عجیب بھینی بھینی سی خوشبو پھیل جاتی ہے۔ میں نے آہٹ پر پیچھے مڑ کر دیکھا تو سفید لباس میں ایک نورانی چہرے والی شخصیت میرے پیچھے کھڑی تھی۔" حوریہ دھیرے دھیرے خواب کی جزئیات سنانے لگی۔ سب انتہائی توجہ سے اسے سن رہے تھے۔

"تیکھی ناک' سرمئی آنکھیں اور چہرے کے نقش تو یوں سمجھیں بالکل اپنے مصور جیسے تھے۔" حوریہ

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآنِ حکیم کی مقدس آیات اور احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں

نے بالکل تصویر کے مطابق خاکہ کھینچ دیا تھا۔

”ابا تھے وہ تو سو فیصد ابا۔“ سب سے پہلے مدثر بھائی اچھلے تھے۔

”اور نہیں تو کیا ابا ہی ہوں گے۔ اماں، ابا واقعی مجھ میں ملتے تھے۔ مجھے تو آج تک یہ بات کسی نے بتائی نہیں۔“ مصور بھی اشتیاق سے ماں سے پوچھ رہا تھا۔

”پھر بتاؤ نا ابا نے کیا کہا؟“ مزمل نے بے تابی سے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔

”وہی تو سمجھ نہیں آیا، کچھ عجیب سی ہی بات کر رہے تھے وہ۔ میں نے پہلے سے ان سے پوچھا کون، تو ہنس کر کہنے لگے بیٹا مجھے اپنا باپ سمجھو۔ پھر میرے برابر آن بیٹھے۔ چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور کہا واقعی میرا بنایا ہوا گھر بچوں کے لیے چھوٹا پڑ گیا ہے۔ کچھ دیر سوچتے رہے میں بھی خاموشی سے ان کو دیکھتی رہی۔ پھر کہنے لگے ٹھیک ہے۔ دلہن خیر سے نئے آشیانے کی بنیاد رکھو اور دیکھو خبردار میرے بیٹوں کی حق حلال کی کمائی کو کسی اور مقصد کے لیے خرچ نہ ہونے دینا چاہیے، کسی قریبی رشتہ دار کی خفگی کا اندیشہ ہی کیوں نہ ہو اور یہ بات اپنی اماں کو بھی سمجھا دینا، بس میں نا سمجھی سے انہیں تکتی رہی اور اتنے میں میری آنکھ بھی کھل گئی۔“

”میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اگر وہ واقعی ابا تھے تو ان کی باتوں کا مقصد کیا تھا۔“ حوریہ نے الجھ کر حاضرین کو مخاطب کیا۔

”تو تمہیں اب بھی شک ہے کہ وہ ابا تھے۔“ مزمل ذرا برا مان کر بولا۔

”وہ سو فیصد ابا ہی تھے بھابھی جان۔ ورنہ خود بتائیں آپ نے کبھی ابا کو دیکھا تک نہیں اور آپ نے نقشہ کھینچا ہے وہ سو فیصد ہمارے ابا کا ہی ہے۔“
نے بھی بھائی کی تائید کی۔

”لیکن وہ کہنا کیا چاہ رہے تھے۔“ حوریہ نے انکھیوں سے ساس کو دیکھا جو ہکا بکا ہو کر ساری با
سن رہی تھیں۔

”ظاہر ہے وہ یہی پیغام دے رہے تھے کہ نیا پلا
فی الفور خرید لو اور جو رشتہ دار حسد ظاہر کریں یا بات بنائیں ان کی قطعی پروا نہ کرو۔“ مدثر بھائی نے دانست میں ابا کی بات کی تشریح کی۔

”ہاں ہو سکتا ہے، یہی کہنا چاہ رہے ہوں۔“
نے تسلیم کر لیا۔

”بس مزمل اب مزید دیر نہیں کرنی۔ شیخ صا
سے فوراً ساری تفصیلات طے کرو۔“ مدثر بھائی مزمل کو مخاطب کیا۔

”آپ کیوں چپ ہیں اماں! آپ بھی بولیں۔“ مزمل کو ماں کی خاموشی کا خیال آیا تو ان انہیں مخاطب کیا۔

”میں کیا بولوں، جو تم مناسب سمجھو کرو۔“
آرا بیگم ابھی تک کچھ حیران پریشان تھیں۔

”اماں کو ابا یاد آرہے ہوں گے، ہے نا اماں۔“
نے ان کی کھوئی کھوئی کیفیت سے نتیجہ اخذ کیا۔
آرا بیگم نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا اور چند
کے اندر اندر مدثر، مزمل نے پلاٹ تو خرید لیا
سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ جہا
بیگم کو آئندہ کبھی ”مدثر کے ابا“ خواب میں
آئے۔

☆

فرح بخاری

میں آیا تم سا گر

جو میرے درد کو سینے میں چھپا لیتا تھا
آج جب درد ہوا مجھ کو بہت یاد آیا

رات بڑے دنوں بعد اس نے امی کو خواب میں دیکھا۔ انہوں نے میر کو کچھ دیا تھا۔ لیکن بہت سوچنے پر بھی اس کو یاد نہیں آیا کہ امی نے اسے کیا دیا۔ لیکن یہ طے تھا کہ آج کا دن بہت اچھا گزرنے والا تھا۔ کیونکہ جب بھی اسے امی خواب میں دکھائی دیتیں، اگلا دن اس کے لیے اپنے دامن میں کچھ بہت خاص اور یادگار

مکمل ناول

لے کر آتا تھا۔

گاؤں جانے والی بس نے اسے تقریباً" ڈھائی گھنٹے بعد منزل پہ پہنچانا تھا۔ میر حسن نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر کھڑکی کے پار دیکھا۔ صبح سویرے کی مدھم روشنی اور ہلکی دھند میں بھیگے کھیتوں کو دیکھ کر نہایت سکون محسوس ہوا۔ اسے محض دو ماہ پہلے ہی اپنی بی ایڈ پوسٹ ملی تھی، گاؤں اس کے شہر سے کافی دور تھا، آنے اور جانے کا سفر ملا کر پانچ ساڑھے پانچ گھنٹے ہو جاتے تھے، جس وجہ سے اسے پورا ہفتہ گاؤں میں ہی رہنا پڑتا۔ اس کے علاوہ تین اور ٹیچرز بھی شہر سے جاتے تھے اور وہیں رہتے تھے۔ البتہ باقی چھ اساتذہ میں سے دو لوکل تھے اور چار آس پاس کی تحصیلوں سے آتے تھے جو روزانہ ڈیوٹی کے بعد گھروں کو لوٹ جاتے تھے۔

یہاں کام کرتے میر کو ایک مہینے سے کچھ اوپر ہو گیا تھا۔ اسکول اور گاؤں کا ماحول اسے بہت پسند آیا تھا۔ کچھ اس کی طبیعت بھی بچپن سے قدرتی ماحول کی طرف راغب تھی۔ دیہاتی زندگی میں اس نے ہمیشہ چارم محسوس کیا تھا۔ البتہ قریب سے جاننے اور رہنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ بلکہ تدریس کو بطور پیشہ اپنانا خالص اس کی اپنی خواہش تھی۔ بچپن میں جب کلاس ٹیچرز بچوں سے ان کے مستقبل کے بارے سوال کرتے تو تقریباً" سبھی بچے ڈاکٹر، انجینئر کی خواہش ظاہر کرتے اور صرف اسی کا جواب ہوتا اور اسے حیرت ہوتی کہ بچے اس کا جواب سن کر تھے۔ اور میر سوچ میں پڑ جاتا کہ تاریخ تو ہمیں یہ ہے کہ بڑے بڑے بادشاہ بھی اپنے استاد کی تعظیم کھڑے ہوتے تھے۔ پھر کیوں سب اس کے جواب ہنستے تھے۔ البتہ سوال کرنے والے اساتذہ نے ہمیشہ شفقت سے ہاتھ پھیر کر اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

سفر کا اختتام ہوا اور بس اسے آبادی کی شروع میں سڑک کنارے اتار کر آگے بڑھ گئی، کیونکہ شارٹ کٹ تھا۔ وہ کھیتوں کے راستوں پر قدم اسکول کی طرف رواں دواں تھا۔ یہ خوب صورت علاقہ اپنے اندر کئی حسین رنگ لیے ہوئے سنگلاخ پہاڑ بھی تھے اور ہرے بھرے کھیت دھول اڑاتی مٹی بھی تھی اور پتھریلے راستے بھی معاملہ یہاں کے قبائل اور خاندانوں کا تھا۔ یہاں مہاجر تھے۔ یعنی باہر کے علاقوں سے ہوئے جو اب برسوں سے یہاں رچ بس کر بن گئے تھے، زیادہ آبادی لوکل دیہاتیوں کی جو بولی بولتے تھے اور گاؤں کے بڑے زمیندار مخدوم تھے۔ یہاں ان کی بڑی عزت اور مقام تھا، ان کے گھرانے سے گاؤں والے نا صرف عقیدت رکھتے تھے بلکہ ان کی یہاں مانی بھی بہت جاتی تھی۔

مہینے بھر میں ہی میر حسن نے یہاں کے بارے میں کچھ جان اور سمجھ لیا تھا۔ پردے کے معاملے میں یہ علاقہ کسی ایک رواج کا پابند نظر نہیں آتا تھا، کھیتوں میں کام کرتی عورتیں محض ایک دوپٹہ یا چادر اوڑھے ہوتی تھیں۔ پٹھان عورتیں البتہ بہت سخت پردہ کرتی تھیں جو عموماً" سفید ٹوپی والے برقعے کی صورت میں نظر آتا تھا اور مقامی عورتوں میں بعض فینسی سفید ٹوپی والے برقعے کی صورت میں نظر آتی تھیں۔

کبھی کبھار کچے راستوں پر آتے جاتے اسکول جاتی لڑکیوں سے بھی واسطہ پڑ جاتا، کیونکہ ان کا اسکول کھیتوں کے راستے میں پڑتا تھا۔ لیکن میر حسن نے کبھی اس بات پر خصوصی توجہ دینا مناسب نہیں جانا تھا۔ ویسے بھی وہ فطرتاً" نہایت شرمیلا اور محتاط طبیعت کا تھا۔ طالب علمی کے دور میں بھی پورا دھیان

پڑھائی کی طرف دیا۔ لیکن زندگی میں ہمیشہ سب کچھ عادت اور فطرت کے مطابق کہاں ہوتا ہے۔ اس دن بھی جو کچھ پیش آیا' ایسی سچویشن سے اس سے قبل کبھی میر حسن کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔

پچھلی رات یہاں بارش ہوئی تھی' جس کی وجہ سے کھیتوں کی پگڈنڈیاں ابھی تک پھسلن زدہ تھیں۔ میر نے دور تک جاتی پگڈنڈی کو نظروں سے جانچا اور اس پر مزید سفر جاری رکھنے کا ارادہ موقوف کرتے متبادل راستے کی تلاش میں اطراف کا جائزہ لیا۔ لڑکیوں کے اسکول کا راستہ بھی اگرچہ کچا تھا' لیکن پگڈنڈی کی نسبت کافی چوڑا تھا' اس لیے پھسلن کا خطرہ نہیں تھا۔ میر حسن نے دائیں طرف کا رخ کیا اور کیچڑ سے بچتا بچاتا جلد ہی اس چوڑے راستے پر پہنچ گیا۔ لڑکیوں کے اسکول کی دیوار پر لٹکتی بوگن ویلیا دیکھ کر اچانک ہی اسے اپنا خواب یاد آگیا۔ اسی نے اسے رات پھولوں سے بھری چنگیر دی تھی۔ خواب کے یوں اچانک یاد آنے پر میر نے بے پناہ خوشی محسوس کی' چنگیر میں کئی گلابی پھول تھے اور شاید ایک سرخ بھی..... وہ اسی خیال میں کھویا آگے بڑھتا جارہا تھا' جب اچانک ہی آگے نا صرف چوڑا راستہ ختم ہوگیا بلکہ ایک بڑا سا خشک نالہ آگیا جو آج بارش کی وجہ سے نسبتاً" کیچڑ زدہ تھا۔ چھلانگ لگا کر پار جانا ناممکن تھا' کیونکہ نالے کی چوڑائی کافی زیادہ تھی۔ عام دنوں میں یقیناً" لوگ اس میں اتر کر دوسری طرف جایا کرتے ہوں گے' لیکن اس کو تو عین بارش کے بعد اس سے واسطہ پڑا تھا۔

"ایسی صورت حال کے لیے یہاں ایک لکڑی کا تختہ رکھ دینا چاہیے تھا یا کم از کم نالے میں تھوڑی سی خشک مٹی ڈالنی چاہیے تھی۔" وہ ہونٹوں پہ انگلی بجاتے ہوئے سوچ ہی رہا تھا جب نالے کی دوسری طرف عین اس کے سامنے تین لڑکیاں آن پہنچیں۔ میر نے بے ساختہ نظر اٹھائی۔ ایک لڑکی سفید برقعے میں تھی اور دو لڑکیاں کالی چادروں میں' انہوں نے چہرے بھی نہیں ڈھانپے ہوئے تھے۔ میر حسن تھوڑا سا سائیڈ پر ہوگیا۔ وہ لڑکیاں چادریں سمیٹ کر سنبھل کر پیر رکھتی نالے میں اتریں۔ زیادہ کیچڑ والی جگہ چھلانگ لگا کر دوسری سمت کی اونچائی پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگیں' ان کی دیکھا دیکھی میر کا بھی حوصلہ ہوا اور اس نے بھی پائنچے چڑھا کر نیچے رکھا۔ اور عین جب وہ نالے کے سینٹر میں تھا' ایک لڑکی کی زوردار چیخ بلند ہوئی۔

"سانپ..." میر نے گھبرا کر ادھر دیکھا۔ لڑ[illegible] سے محض پانچ' چھ قدم دور کالے رنگ کا بازو بھر سانپ جھاڑیوں میں لپکا۔ لڑکیاں پورا زور لگا رہی اوپر جانے کے لیے' لیکن پیر بار بار پھسل جاتا' اوپر انہوں نے اسکول بیگ بھی لٹکائے ہوئے تھے۔ [illegible] وقت ضائع کیے فوراً" آگے بڑھا اور سفید برقعے والی لڑکی کا بازو پکڑ کر پیٹھ پہ دھکا دیا۔ وہ جیسے ہی اوپر پہنچی حسن نے اسی طریقے سے دوسری لڑکی کو اوپر [illegible] تیسری لڑکی نے خود ہی ہاتھ آگے کردیا' جسے پکڑ کر نے اسے بھی اوپر دھکیلا' لیکن اسی دوران سانپ میں سرعت سے لہراتا جھاڑی سے نکل کر ا[illegible] طرف بڑھا' میر کی جب تک اس پر نظر پڑی وہ قریب آچکا تھا' اس سے پہلے کہ میر کچھ سوچتا آخری لڑکی نے مضبوطی سے میر کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچ لیا اور ٹھیک اسی وقت سانپ وہاں پہنچا دو سیکنڈ پہلے میر کے قدم تھے۔

"اوہ..." ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے [illegible] نے سانپ سے نظر ہٹا کر سامنے توجہ کی... اور بو[illegible] دو قدم پیچھے ہٹا' کیونکہ اس آخری لڑکی کے ہاتھ کو [illegible] نے بے دھیانی میں اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ میر [illegible] فوراً" اس کا ہاتھ چھوڑا اور پلٹ کر نالے میں قدم [illegible] اور لمبی جست لگا کر دوسری طرف پہنچ گیا۔ مارے شرمندگی کے دوبارہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ پیشانی سے تر تھی اور دل کی دھڑکن قابو سے باہر' [illegible] قدموں سے اسکول پہنچا۔

اسکول کی روٹین یہ تھی کہ دن کا وقت تو پڑھا[illegible] میں مصروف گزرتا' چھٹی کے بعد ظہر کی نماز اور د[illegible] کے کھانے کے بعد ٹیچرز گھنٹہ بھر آرام کرتے تھے۔

عصر کی نماز کے بعد ٹیوشن کے لڑکے آنا شروع ہوجاتے..... بچوں کو ٹیوشن سر مختیار اور سر بشیر ہی پڑھاتے تھے۔ میر نے پہلے دن ہی اس کام سے معذرت کرلی تھی' کیونکہ وہ خود پرائیویٹ ایم اے انگلش کی تیاری میں مصروف تھا۔ بڑی مشکل سے نوٹس جمع کیے تھے۔ یہاں گھر کی نسبت پڑھنا آسان تھا' اس لیے اسکول کے بعد کا وقت وہ اپنی پڑھائی کو دیتا تھا۔

"استاد صاحب اس شور میں کیسے پڑھ لیتے ہیں؟" رحمان چاچا نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھا تو میر حسن مسکرایا۔

"بس چاچا... گزارہ ہوجاتا ہے۔ ویسے بھی دو گھنٹے کی بات ہے' پھر تو بچے چلے جائیں گے؟"

"ہاں صاحب... لیکن پڑھنے کے لیے سب سے اچھا ٹائم تو یہی ہوتا ہے' جو ان کے شور کی نذر ہوجاتا ہے' اس کے بعد تو مغرب کی اذان' شام کا کھانا اور گپ شپ میں ہی وقت نکل جاتا ہے' میری مانیں تو ایک آرام کی جگہ ہے..... جہاں کوئی شور شرابا نہیں ہوتا۔"

"کہاں.....؟" میر حسن نے دلچسپی سے چاچا کو دیکھا۔

"آئیں..... میں دکھاتا ہوں' پسند آئے تو آج سے ہی شروع کردیں۔" چاچا نے باہر قدم بڑھائے تو میر نے فوراً" پیش قدمی کی۔ اسکول سے نکل کر چاچا بائیں طرف اسکول کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ آگے دیوار کے خاتمے پر راستہ پھر بائیں مڑ گیا۔ یہ اسکول کی بیک سائیڈ تھی۔ یہاں سوائے رحمان چاچا کے گھر اور دور تک پھیلے کھیتوں کے کچھ نہیں تھا۔ میر کو یہ تو پہلے دن سے معلوم تھا کہ چاچا کا گھر اسکول کے پیچھے ہے' لیکن کبھی آنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ یہاں دیوار کے ساتھ بڑا سا پیپل کا پیڑ تھا' جس کے اردگرد قریب تین فٹ اونچا مٹی کا ٹیلہ سا بنا ہوا تھا۔

"یہ جگہ میں نے ہی بنائی ہے' کیونکہ شام کو اکثر کوئی یار دوست نکل آتا ہے تو بیٹھ کر چائے شائے پی لیتے ہیں۔"

"ارے واہ چاچا' یہ تو بہت ہی آئیڈیل جگہ ہے۔ اب تو مجھے آپ سے یہ شکوہ ہے کہ آپ نے اتنی دیر سے کیوں بتایا' مجھے پتا ہوتا تو پہلے دن سے ہی یہاں آکر پڑھائی کرتا۔"

"بس صاحب..... شروع میں اگلے کے مزاج کا پتا نہیں ہوتا' کوئی کوئی لوگ اونچے مزاج کے بھی ہوتے ہیں نا' ایسی جگہ پر بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔" چاچا نے ہنستے ہوئے وضاحت کی۔

"پر آپ کو میں جان گیا ہوں صاحب' آپ بہت سادہ طبیعت کے ہیں۔"

"شکریہ چاچا..... ویسے یہ جگہ صرف اچھی ہی نہیں بلکہ میرے لیے آئیڈیل بھی ہے۔" دور تک پھیلی ہریالی' خاموشی اور سکون کو میر نے اپنے لیے جیسے نعمت تصور کیا۔

"اچھا صاحب' آپ یہیں بیٹھیں' میں آپ کی کتابیں اور چائے ادھر ہی لے آتا ہوں۔" چاچا خوشی سے پھولے نہیں سمائے اور فوراً" واپسی کے لیے پلٹ گئے۔

اپریل کی ٹھنڈی خوشگوار ہوا اپنے پھیپھڑوں میں بھرتے ہوئے میر نے پل بھر کو پلکیں بند کیں تو چھم سے دو چمکیلی براؤن آنکھیں تصور میں اتر آئیں۔ میر نے بے ساختہ اپنی آنکھیں کھولیں۔ ایسا اس کے ساتھ صبح سے ہو رہا تھا۔ وہ گہری نظر پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہی تھی اور وہ بھی ہر بار خود کو تسلی کے انداز میں یہی باور کرا رہا تھا کہ واقعہ تازہ ہے' اس لیے دماغ سے نکل نہیں رہا اور آہستہ آہستہ خود ہی محو ہوجائے گا۔

چاچا کتابیں اور چائے لے آئے تو میر نے ان سے پوچھا۔

"کیا یہاں کوئی لکڑی کا کام کرنے والا ہے۔"

میر چاہتا تھا اس خشک نالے کی گزرگاہ پر ایک لکڑی کا تختہ رکھوائے' تاکہ آنے جانے والوں کو آئندہ نالے میں اترنا نہ پڑے۔ چاچا نے جواب دیا۔

"وسیم' جماعت کے منظور کا بڑا بھائی لکڑی کا کام کرتا ہے۔" چاچا اس وقت منظور کے بھائی کو وہیں بلا

لائے۔ میر نے اسے تختہ بنانے کی ضروری ہدایات دیں اور وہ دو دن کا وقت مانگ کر واپس چلا گیا۔
منظور کے بھائی نے تختہ تیار کرلیا تو میر حسن دو لڑکوں اور چاچا کے ساتھ خود وہاں جاکر تختے کو سیٹ کروا آیا۔ لڑکوں نے کافی مہارت سے کیچڑ کی مدد سے تختہ وہاں جمایا تاکہ کوئی اٹھا کر لے نہ جائے۔ اسکول کے ٹیچر اور پرنسپل صاحب کو پتا چلا تو انہوں نے میر کو خوب سراہا، جسے سن کر وہ خاصا شرمندہ ہوگیا، کیونکہ اس کے نزدیک کام واقعی بہت معمولی تھا۔
پیپل کے سائے تلے پڑھائی کرتے اسے پانچواں روز تھا۔ آج اس کا دیر تک زور و شور سے پڑھنے کا ارادہ تھا۔ کیونکہ اگلے روز چھٹی کے فورا" بعد گھر کے لیے روانہ ہونا تھا اور پھر پیر کی صبح واپس آنا تھا۔ اسے وہاں بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ چاچا کے گھر سے ان کا بیٹا حشمت اپنے بیٹے کو گود میں اٹھائے باہر آیا، پیچھے غالبا" اس کی بیوی تھی۔ میر کو سلام کرکے وہ پاس سے گزر گیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اسے چاچا کے گھر کی دیوار پر دھپ سے کچھ گرنے کی آواز آئی۔ میر نے چونک کر سر اٹھایا۔ اندر سے کسی نے دیوار پر گیلا کھیس نما کچھ پھینکا تھا۔ اور دو ہی منٹ میں دیوار پر ایک چہرہ نمودار ہوا ماتھے پہ آئے گیلے بالوں کو پیچھے کرتی وہ کھیس کو ترتیب سے دیوار پر پھیلانے میں مگن تھی۔ چند گز کے فاصلے پر درخت کے نیچے کوئی بیٹھا ہے، اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی، نہ ہی اس نے ادھر ادھر دیکھنے کی زحمت کی تھی۔ میر حسن البتہ حیرت زدہ سا ایک ٹک اسے دیکھے جارہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حواسوں پر چھا جانے والی دو خوب صورت آنکھیں اس کے اتنے قریب رہتی تھیں۔

گرمی شوق نظارہ کا اثر تو دیکھو
گل کھلے جاتے ہیں وہ سایہ در تو دیکھو

وہ تو وہ ہیں تمہیں ہوجائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم میرا محبوب نظر تو دیکھو

"کیا وہ چاچا کی بیٹی ہے؟؟" میر ابھی حیرت سے اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ اچانک اس کی بھی نظر میر پر پڑی۔ کچھ دیر وہ بھی حیرت کا بت بنی بس دیکھتی ہی رہی۔ پھر ایک دم جیسے ہوش میں آئی اور فورا" نیچے اتر گئی۔ پڑھائی کی طرف اب کس کا دھیان رہا تھا۔ میر کتنی ہی دیر بلاوجہ وہاں بیٹھا رہا۔ مغرب کی اذان ہوئی تو کتابیں سمیٹ کر اسکول واپس آگیا۔ کھانے کا پہلا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے ہاتھ رک گیا۔
"کیا کھانا اس نے بنایا ہوگا؟ کیا مصیبت ہے۔" خود ہی اپنی سوچ پر جھینپ گیا۔ ان کے لیے کھانا رحمان چاچا کے گھر سے بن کر آتا تھا۔ جس کے لیے اساتذہ مل ملا کر الگ سے پے منٹ کرتے تھے۔ رات کو بستر پر لیٹا تب بھی اسی کا تصور سوچ پر غالب تھا۔ چمکتی ہوئی سنہری پیشانی۔۔۔ بکھری بکھری چند لٹیں۔۔۔ حیرت بھری شوخ نظر۔۔۔ میر نے سر کے نیچے بازو ٹکا کر تاروں بھرے آسمان کو مسکرا کر دیکھا۔ اور اک محبت کی گزری طویل رات۔۔۔ جانے صبح کب ہو، میر نے ایک کروٹ بدلی۔

مہرباں تیری نظر، تیری ادائیں قاتل
تجھ کو کس نام سے اے دوست پکارا جائے

☆ ☆ ☆

"بازار چلوگے میر۔۔۔؟" سر مختیار نے جوتے پہنتے ہوئے اسے دیکھا۔
"کون سے بازار؟" میر حسن رجسٹر پر جھکا تھا، سر نہیں اٹھایا۔
"ارے بھائی۔۔۔ میں اور سر بشیر یہیں گاؤں کے بازار تک جارہے ہیں۔ پرنسپل صاحب کو آج ہی واپس جانا ہے۔ پہلے انہیں اڈے تک چھوڑیں گے اور پھر بازار سے چھوٹا موٹا سامان لے کر واپس آجائیں گے۔"
"نہیں۔ مجھے تو کچھ خاص نہیں لینا، آپ لوگ جائیں۔" ان سے باتیں کرتا وہ خود بھی گیٹ تک آگیا۔ اسکول مکمل طور پر بچوں سے خالی ہوچکا تھا۔ رحمان چاچا بھی شاید گھر چلے گئے تھے۔ میر حسن وہیں

گیٹ پہ رک کر ان سب کو جاتا دیکھتا رہا۔ دائیں طرف نظر گھمائی تو اسکول کی بچیاں دور کھیتوں میں پھیلی نظر آئیں۔ یقیناً" ان کے اسکول کی بھی اب چھٹی ہوئی تھی۔ میر نے سینے پہ ہاتھ باندھ کر گیٹ سے ٹیک لگائی۔ اسی دم سامنے درختوں کے جھنڈ سے دو لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ ایک لڑکی آگے سے دوسرے راستے کو مڑ گئی اور کالی چادر میں ملبوس وہ سیدھی ادھر کو آنے لگی۔ میر کا دل عجیب ترنگ میں دھڑکا۔ وہ بھی اسے دیکھ چکی تھی۔ اس نے بالکل میر حسن کے آگے سے گزر کر جانا تھا، اس لیے کافی نروس سی تھی۔ میر نے بہت کوشش کی کہ اندر چلا جائے، لیکن پیر جیسے کسی نے جکڑ لیے تھے۔ ایک انچ بھی اپنی جگہ سے ہلا نہیں گیا۔ وہ کبھی سر کی چادر ٹھیک کرتی، کبھی کندھے پہ دھرے بیگ کو سیٹ کرتی۔ کبھی نظر جھکاتی، کبھی آدھی اوپر اٹھاتی، شاید وہ بھی خود کو دیکھنے سے روک رہی تھی، لیکن اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکی تھی اور بالکل قریب سے گزرتے ہوئے گھبرائی گھبرائی نظر بس لحظے بھر کو اس کی طرف اٹھائی اور پھر تیز تیز چلتی آگے بڑھ گئی۔ میر نے اسے دور تک جاتے دیکھا، اب وہ اپنے گھر کی طرف مڑ گئی تھی۔

کچھ کہہ رہی ہیں آپ کے سینے کی دھڑکنیں
میری سنیں تو دل کا کہا مان جائیے

میر بھی مسکراتے ہوئے اسکول کے اندر چلا گیا

☆ ☆ ☆

اسکول کی چھٹی ہوئی تو میر چاچا کو دیکھتا ہوا دروازے تک آیا۔ چاچا کی عادت تھی کہ ٹیچرز کا ضروری سامان چھٹی کے فورا" بعد بازار سے لے آتے تھے اور پھر دو، تین گھنٹے کے لیے گھر آرام کرنے چلے جاتے تھے۔ میر نے کچھ ضروری چیزیں منگوانی تھیں۔ اس نے چاچا کے گھر کا دروازہ بجایا تو حشمت کا بڑا لڑکا باہر آیا اور اس نے بتایا کہ دادا ابھی سائیکل لے کر بازار گئے ہیں۔
"اوہ۔۔۔" میر واپسی کے لیے پلٹا تو اسی وقت "وہ" اسکول کی دیوار کے ساتھ ساتھ آتی دکھائی دی۔ میر پر نظر پڑی تو بے ساختہ ٹھٹک کر رک گئی، پھر اچانک خیال آنے پر دوبارہ چلنا شروع کردیا۔ درخت کے نیچے دونوں نے ایک دوسرے کو کراس کیا۔ میر نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے گھبرا کر نظر جھکالی۔ اسکول کی طرف مڑتے ہوئے میر نے ایک بار پیچھے دیکھا تو وہ اپنے دروازے میں کھڑی میر کو دیکھ رہی تھی۔ میر کو ہنسی آگئی۔ درخت سے یہاں تک کا سفر اگر بیس، پچیس قدم تھا تو درخت سے چاچا کا گھر بمشکل دس، بارہ قدم کے فاصلے پر تھا، یعنی اس کو تب تک گھر کے اندر چلے جانا چاہیے تھا۔ اس کا مطلب تھا وہ صرف میر کو دیکھنے کی خاطر وہاں رک گئی تھی۔ وہ مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔
اگلے ہفتے جب وہ گاؤں واپس آیا تو معلوم ہوا کہ زمیندار کے بیٹے رجب کی شادی ہے، تمام اساتذہ کو بھی بلایا تھا۔
"جانا ضروری ہے؟؟" میر نے قدرے بے زاری سے سر بشیر کو دیکھا۔
"ہاں۔۔۔ یہ لوگ استادوں کی بہت عزت کرتے ہیں اور ہماری عدم دلچسپی ان کو بلاوجہ ہماری طرف سے بدگمان کردیتی ہے۔ پرنسپل صاحب خصوصی ہدایت کر گئے تھے کہ رجب کی شادی میں شرکت کرنی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ خود بھی کل آجائیں۔ ان کے مخدوم صاحب سے بہت اچھے تعلقات ہیں اور تمہیں تو ہم ویسے بھی ضرور ساتھ لے جاتے۔ ایک تو یہاں نئے ہو، دوسرے جب سے آئے ہو اسکول میں پڑے ہو۔ اتنا خوب صورت علاقہ ہے۔ ذرا گھومو پھرو۔" سر مختیار نے قائل کرنے والے انداز میں کہا تو میر حسن نے سر ہلادیا۔
اگلے روز اسے پتا چلا کہ شام کو انہوں نے رحمان چاچا اور ان کی فیملی کے ساتھ شادی پہ جانا ہے کیونکہ زمیندار صاحب کا گھر گاؤں کے دوسرے سرے پہ تھا اور چاچا نے کہا تھا کہ رات کو ان علاقوں میں اکٹھے نکلنے میں ہی بہتری ہوتی ہے۔
وہ لوگ تیار ہوکر باہر نکلے تو چاچا کے گھر والے بھی آن پہنچے۔ میر حسن نے ایک اڑتی پڑتی نظر اس پر ڈالی تو

وہ جو اسی کی طرف دیکھ رہی تھی گھبرا کر دوسرے طرف دیکھنے لگی۔ میر باقی ٹیچرز کے ساتھ آگے چلنے لگا۔ چاچا ٹارچ سنبھالے سب سے آگے رہنمائی کر رہے تھے جبکہ حشمت پیچھے اپنے گھر کی خواتین کے ساتھ چل رہا تھا۔ میر کو آج پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ گاؤں کافی بڑا تھا۔ زمیندار صاحب کے ہاں خوب ڈھول شہنائیاں پیٹی جا رہی تھیں۔ وہ لوگ مردانے میں آگئے اور عورتیں اندر چلی گئیں۔ کھانے پینے کے بعد — سر بشیر نے مخدوم صاحب سے اجازت لی۔ رحمان چاچا نے کہا کہ وہ اور حشمت ابھی زمیندار صاحب کے پاس رکیں گے۔ اس لیے وہ لوگ ان کی عورتوں اور بچوں کو ساتھ لیتے جائیں۔ چاچا نے ان کو زنانے سے بلوالیا۔ تھوڑی ہی دیر میں حشمت کی بیوی اس کے دو بچے اور وہ باہر آگئی۔

سر مختیار اور سر بشیر ٹارچ لیے آگے چلنے لگے۔ میر کے موبائل میں بھی ٹارچ تھی۔ اس لیے سر بشیر نے اسے سب سے آخر میں رہنے کو کہا' تاکہ پیچھے بھی روشنی رہے۔

میر نظریں جھکائے خواتین کے پیچھے آگیا۔ سب احتیاط سے قدم جماتے گھر کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ میر نے محسوس کیا کہ وہ جان بوجھ کر سب سے آخر میں رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بلاوجہ باقیوں کی نسبت سست ہو جاتی اور یوں نسبتاً" میر کے قریب ہو جاتی' بہت بار آپس میں نظریں بھی ملیں۔ وہ ہلکے سبز سوٹ کے ساتھ براؤن کڑھائی والی چادر پہنے ہوئے تھی۔ شادی کی مناسبت سے ہلکا میک اپ بھی کیا ہوا تھا۔ کہیں کہیں جب روشنی والی جگہ آتی تو میر اسے دیکھنے کا موقع نکال لیتا۔ اس کے کھلے ہوئے رنگ کی وجہ سے آنکھوں میں کاجل کی گہری لکیر بہت نمایاں اور خوب صورت لگ رہی تھی۔

سر بشیر اور سر مختیار سب سے آگے چلتے ہوئے باتوں میں مگن تھے۔ حشمت کی بیوی اپنے بڑے لڑکے کو دائیں اور چھوٹے کو بائیں ہاتھ سے پکڑے بیچ میں چل رہی تھی۔ بس وہی دو تھے جو کبھی ہم قدم تو کبھی تھوڑا سا آگے پیچھے چلتے ایک دوسرے کی موجودگی سے سرشار تھے۔ آج میر کو پوری طرح اس کے جذبات سے آگاہی ہوگئی تھی۔ یقیناً "سانپ والے واقعے نے دونوں کی زندگی میں ایک جیسی ہلچل پیدا کی تھی۔ میر کو وہ سب اس کی آنکھوں میں دکھائی دے رہا تھا جو وہ خود اس کے لیے اپنے دل میں محسوس کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گھر قریب آنے تک ان کے بیچ بنا ایک بھی لفظ بولے ہم آہنگی کا رشتہ مزید مضبوط ہوگیا۔ تب ہی خشک تالے پر میر کے رکھوائے گئے تختے پر سے گزرتے ہوئے پہلی بار اس نے شرمائی شرمائی مسکراہٹ سے میر کی طرف دیکھا' جس کے جواب میں وہ بھی مسکرا دیا۔

اس رات دیر تک میر کو نیند نہیں آئی۔ بے چینی سے کروٹیں لیتے وہ ایک ہی بات سوچے جا رہا تھا کہ خود کو لاپروائی سے محبت کی موجوں کے حوالے کر دینا مناسب نہیں' اس طرح کہیں وہ اپنی اور کسی "معصوم" کی رسوائی کا باعث نہ بن جائے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ دشت جنوں میں پڑنے والا پہلا قدم دشت بلا تک جاتا ہے۔ جیسے سمندر کی گہرائی کا اندازہ اس کے کنارے سے ہو جاتا ہے۔ وہ بھی ان چمکیلی آنکھوں کی سحر خیزی میں اتر چکا تھا۔ لیکن خود کو باور کرانا اب بھی نہایت مشکل لگ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

تکیوں میں منہ چھپا کر بے آواز رونا تو بچپن سے ناز کی عادت بن چکا تھا اور چار برس پہلے جب اماں نے دنیا سے منہ موڑا تب تو من چاہی زندگی جینے کی رہی سہی آس بھی دم توڑ گئی تھی' اس نے تو آئینہ دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ کہیں اپنی بے پناہ خوب صورتی اسے کوئی اونچے خواب نہ دکھانے لگے۔ جب سہیلیاں اسے اپنی بھابھی بنانے کی خواہش ظاہر کرتیں تو بے ساختہ وہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھنے لگتی' جہاں پیدائش کے دن سے ایک ہی تحریر لکھ دی گئی تھی' اب سے پہلے صرف ایک بار اپنے نصیب سے لڑی تھی' جب بر سول پہلے اسکول جانے کی بات بابا سے منوائی تھی۔ پھر بھی دو سال لالہ کی ضد کی بھینٹ چڑھ گئے اور وہ اپنی ہم عمروں سے دو سال پیچھے رہ گئی۔ لیکن اب کی بار تو ناز نے ایک آہ بھر کر آنکھیں بند کیں۔ جن میں چند دنوں سے صرف ایک ہی صورت بس گئی تھی میر صاحب کی گہری کالی آنکھیں جب اسے اپنائیت سے دیکھتیں تو ناز کا باغی دل ہر جنگ کا سامنا کرنے کے لیے جیسے خود اس کے اپنے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور گھنی تراشیدہ مونچھوں تلے آشنائی سے مسکراتے گلابی ہونٹ جیسے برسوں کی پہچان کا تاثر لیے ہوتے تھے' کیا محبت اتنی خوبصورت ہوتی ہے؟ بنا اس کیفیت سے گزرے وہ کبھی اس حسن کا تصور نہ کر پاتی... ناز اپنی دائیں ہتھیلی پر نظریں جمائے تصور میں کھو سی گئی۔ جب سے میر نے اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھا تھا اس کے دھڑکتے دل کو وہ تب سے اپنی پور پور میں محسوس کرتی تھی۔

ان جھیل سی گہری آنکھوں میں
ایک شام کبھی آباد تو ہو
پھر چاہے عمر سمندر کی
ہر موج پریشاں ہو جائے
پھر چاہے آنکھ دریچے سے
ہر خواب گریزاں ہو جائے
پھر چاہے پھول سے چہرے کا
ہر درد نمایاں ہو جائے
اس جھیل کنارے پل دو پل
وہ روپ نگر ایجاد تو ہو....

"کیا میں میر صاحب کو سب بتا دوں....؟" ایک خیال کے آتے ہی ناز اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"وہ مجھ سے ہمدردی رکھتے ہوں گے تو شاید کوئی مدد کردیں... لیکن...." وہ پریشانی میں انگلیاں چٹخانے لگی۔

"نہیں بتا کر کہیں ان کے لیے کوئی مصیبت نہ کھڑی کردوں... پر بتا دینے کا فائدہ انہیں بھی تو ہوگا۔ وہ میرے بارے میں جان جائیں گے تو ہم ایک دوسرے سے دور ہو سکیں گے' ورنہ یہ روز کا آمنا سامنا مجھے ہر بات بھلانے پر مجبور کردے گا۔" اس نے فیصلہ کر کے کچھ اطمینان محسوس کیا۔

میر پانچ بجے کتابیں لیے درخت کے نیچے آکر بیٹھا تو کچھ ہی دیر بعد چاچا چائے کی ٹرے لیے اپنے گھر سے نکلے۔ میر کو اس کا کپ دیا اور خود آگے بڑھ گئے' ان کے جانے کے چند منٹ بعد ہی دروازے کے پیچھے ہلکی سی آہٹ ہوئی' میر نے چونک کر ادھر دیکھا تو وہ دروازے میں کھڑی تھی۔ میر سے نظریں ملیں تو اس نے کچھ گھبراتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا' جس میں ایک لفافہ تھا شاید... میر تھوڑا جھجک کر اٹھا کیونکہ آس پاس اور تو کوئی نہیں تھا۔ میر کو اٹھتے دیکھ کر اس نے لفافہ دروازے کے سامنے نیچے زمین پر رکھ دیا اور خود اندر چلی گئی۔ اب تو شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ میر کو ہی لفافہ دینا چاہتی تھی۔ میر لفافہ اٹھا کر واپس اپنی جگہ پر آیا۔ پورے دو صفحات پر مشتمل وہ خاصی تفصیلی تحریر تھی' میر نے الجھے دماغ کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔

السلام علیکم استاد صاحب

صاحب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ہمارا آپس میں کوئی رشتہ ہے نہ تعلق' پھر میں آپ کو خط کیوں لکھ رہی ہوں۔ اس گستاخی کے لیے آپ سے معافی چاہتی ہوں۔ لیکن جو باتیں میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں' وہ میں کسی اور کو نہیں بتا سکتی۔ میرا دل کہتا ہے شاید آپ میری کوئی مدد کر سکیں گے۔ آپ سے پہلے میں نے اپنے اسکول کی ایک استانی سے مدد مانگی تھی لیکن میری بد قسمتی کہ ان کا تبادلہ ہوگیا اور وہ یہاں سے چلی گئیں۔ صاحب آپ کو یہاں آئے بہت کم وقت ہوا ہے لیکن بابا کہتے ہیں میر صاحب جیسا نیک انسان انہوں نے پہلے نہیں دیکھا۔ دوسرے میں خود بھی آپ کو دیکھ چکی ہوں۔ اس دن آپ نے ہمیں سانپ سے بچایا اور بعد میں ہمارے اسکول کا راستہ بھی ٹھیک کروایا۔

صاحب دراصل بات یہ ہے کہ ہمارے گاؤں میں جو پیر نعمت شاہ کا مزار ہے نا... پہلے اس کی خدمت گاری ہمارے خاندان کے پاس تھی۔ میرے دادا پیر بابا

کی مزار کے متولی تھے ایک بار انہیں خواب میں حکم ملا کہ اپنی بیٹی یعنی میری بوا کو پیربابا کی خدمت میں ساری عمر کنوارا رکھا جائے۔ دادا ابا نے خواب کو پیربابا کا اشارہ سمجھا اور پورے گاؤں میں اعلان کردیا کہ ان کی بیٹی ساری عمر کنواری رہے گی اور مزار کی دیکھ بھال کرے گی۔ جس وقت دادا ابا نے یہ اعلان کیا گلشن بوا بہت چھوٹی تھیں۔ وہ بہت خوبصورت تھیں۔ لیکن ہمیشہ بہت چپ اور اداس رہتی تھیں۔ ان کی کچھ سہیلیاں پاس کے گاؤں میں رہتی تھیں وہ جب بھی بوا سے ملنے آتیں ان کے دل میں شادی کا خیال ڈالتیں۔ پھر ایک دن گلشن بوا اغوا ہوگئیں اور بہت دن بعد پتا چلا کہ وہ ساتھ والے گاؤں میں ہیں اور ان کی شادی اپنی سہیلی کے بھائی سے ہوگئی ہے۔ دادا ابا سب کو یہی کہتے تھے کہ ان کی بچی کے ساتھ زبردستی ہوئی ہے لیکن اندر سے وہ جانتے تھے بوا کی اپنی مرضی اس میں شامل تھی، گاؤں والوں نے ہم پر بہت باتیں بنائیں اور ہمارے خاندان سے مزار کی خدمت لے لی گئی۔

یہ سارا قصہ میرے پیدا ہونے سے دو سال پہلے کا ہے۔ مزار سے متصل ہمارا ذاتی مکان بھی ہم سے لے کر نئے متولیوں کو دے دیا گیا۔ تب سے یہی جھگڑا چلا آرہا ہے کہ مزار کی خدمت کا ذمہ ہمیں واپس کیا جائے۔ جب میں پیدا ہوئی تو میرے دادا نے فیصلہ کیا کہ مجھے گلشن کی جگہ مزار کی خدمت گار بنایا جائے گا۔ تاکہ ہمارا مکان بھی ہمیں واپس مل جائے۔ پھر دادا ابا تو فوت ہوگئے لیکن میرے بارے میں کیا فیصلہ آج بھی برقرار ہے۔

صاحب میں نے بہت ضد کرکے اسکول میں داخلہ لیا تھا ورنہ حشمت لالہ میری پڑھائی کے سخت خلاف تھے۔ کیونکہ ان کو جلد از جلد مکان واپس چاہیے تھا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ بس چودہ' پندرہ سال کی ہوتے ہی مجھے مزار کی خدمت گار بنا دیا جائے لیکن میری اماں کو مجھے پڑھانے کا بہت شوق تھا اس لیے انہوں نے حشمت کی ایک نہیں سنی۔ ان کی تو یہ بھی خواہش تھی کہ ایک دن میں پڑھ لکھ کر اپنے اسکول میں استانی لگوں۔

صاحب میں اپنی کلاس میں سب سے لائق ہوں ہر سال اول آئی ہوں۔ اس لیے بابا کا دل بھی یہی چاہتا ہے کہ میں میٹرک کرلوں۔ لیکن صاحب جب سے میں دسویں جماعت میں آئی ہوں لالہ روز بابا سے کہتے ہیں کہ اس کو اسکول بھیجنا بند کردیں اور پیربابا کے مزار پر بٹھا آئیں تاکہ ہمارا مکان ہمیں واپس مل جائے۔

صاحب مجھے لگتا ہے اگر کوئی آپ جیسا پڑھا لکھا آدمی بابا اور لالہ کو سمجھائے تو شاید میری زندگی تباہ ہونے سے بچ جائے مجھے یہ تو نہیں پتا کہ آپ میری کس طرح مدد کرسکتے ہیں لیکن میرا دل چاہا کہ آپ کو اپنے حالات بتاؤں۔ استاد جی! اگر بابا' لالہ کی بات مان گئے تو میں اپنی جان دے دوں گی کیونکہ میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں۔"

والسلام۔ ناز بتول

میر نے خط تہہ کرکے چاچا کے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ اب وہاں نہیں تھی۔ میر نے ایک گہرا سانس لیا اور وہیں کچے راستے پر ٹہلنا شروع کردیا۔ جن حالات کا ذکر ناز نے اپنے خط میں کیا تھا اگر کسی اور لڑکی کے ساتھ پیش آئے ہوتے جس سے دلی تعلق نہ ہو تب بھی انسانیت کے ناتے اس کی مدد کرنا فرض بن جاتا اور وہ تو کچھ دنوں سے دل کے بھی بہت قریب آگئی تھی۔ میر کا اس کے لیے تکلیف محسوس کرنا فطری تھا۔ پھر اس کا سادہ انداز تحریر... کتنے سیدھے اور سچے لفظ تھے۔ عموماً" خط کے نام سے ذہن میں ایک عجب روایتی تاثر آتا ہے' میر کو بھی کچھ ایسا ہی لگا تھا۔ لیکن ناز کے خط نے اس کے لیے دل میں مقام اور بھی بلند کردیا تھا... وہ اس سے مدد مانگ رہی تھی۔ شاید اسے کسی قابل سمجھ کر اور اب امی کے خواب کی گرہ بھی کچھ کچھ کھلنے لگی تھی۔

جانے اس کو جواب کب اور کیسے دینا ہے۔ خط میں بھی کچھ لکھا نہیں تھا۔ میر نے جواب کو اگلی سہ پہر تک چھوڑتے ہوئے کتابیں سمیٹیں اور اسکول آگیا۔ خط کا جواب اس نے رات کو ہی لکھ لیا تھا۔ اگلی سہ پہر جب وہ پیڑ کے نیچے آکر بیٹھا تو کچھ ہی دیر بعد ناز دروازے پر آگئی۔ میر نے خود ہی آرام سے جاکر اس کے ہاتھ میں خط دے دیا کیونکہ رحمان چاچا اس کے سامنے ہی سائیکل لے کر بازار کے لیے نکلے تھے۔

"بہت شکریہ کہ تم نے مجھے بھروسے کے قابل سمجھا۔ تم بالکل بے فکر رہو میں چاچا سے بہت سوچ سمجھ کر اس موضوع پر بات کروں گا۔ ان کو تم پر کسی قسم کا شبہ نہیں ہوگا۔ اور امید ہے کہ انہیں قائل بھی کرلوں گا۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم واقعی بہت لائق اور ذہین ہو۔ تمہیں آگے پڑھنے کا پورا حق ہے۔ اپنی سچی نیت اور اللہ کی مدد پر یقین رکھو۔ جان دینے کی باتیں وہ کرتے ہیں جو اللہ کی رحمت سے مایوس ہوں۔ اللہ سے اپنے کہے کی معافی مانگو اور اپنے لیے خیر طلب کرو۔ البتہ ایک بات مجھے ضرور جاننی ہے۔ چاہے ایک لائن میں اس کا جواب دے دو۔ کیا واقعی تم نے صرف اس لیے اپنے حالات مجھے بتائے کہ میں پڑھا لکھا ہوں اور تمہارے بابا مجھے اچھا سمجھتے ہیں...؟"

میر نے احتیاطاً" سلام و القاب سے اجتناب کیا تھا۔ دس منٹ بعد ہی ناز نے دروازے میں واپس آکر جواب اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

"صاحب جی... وجہ تو مجھے بھی معلوم ہے اور آپ کو بھی... لیکن میں آپ کی برابری کرنے کے لائق نہیں' آپ بہت بڑے ہیں۔ صاحب اگر میرے بابا مجھے مزار کا پابند نہ کریں اور پڑھتے رہنے کی اجازت دے دیں تو بدلے میں ان کا ہر حکم مان لوں گی' کوئی اور بڑا خواب دیکھنے کا میرا حوصلہ نہیں ہے۔"

میر اس کی ذہانت کا ایک بار پھر قائل ہوگیا۔ وہ اس کی بات بڑی آسانی سے سمجھ گئی تھی اور جواب بھی بہت واضح تھا۔ اگرچہ تھوڑا مایوس کن تھا۔ وہ مسکرا کر کمرے میں آگیا۔

خار بھیجے ہیں مجھے اس نے تو حیرت سی ہوئی
کوئی چاہت بھری سوغات بھی ہوسکتی تھی
سب سے وابستہ میری ذات کو کرنے والے
مجھ سے وابستہ تیری ذات بھی ہوسکتی تھی

☼ ☼ ☼

"یہ ساری زمین آپ کی ہے چاچا...؟" میر نے اگلے ہی دن بات کرنے کا موقع نکال لیا۔ چاچا اسے چائے دینے آئے تو میر نے انہیں اپنے پاس ہی بٹھالیا۔

"نہیں استاد صاحب۔ بس یہ سامنے کا دو ایکڑ رقبہ ٹھیکے پر لیا ہوا ہے۔"

"اور حشمت کی دکان کیسی چلتی ہے؟" حشمت کی بازار میں پرچون کی دکان تھی۔

"بس صاحب! اپنے بال بچوں کا اچھا گزارہ کرلیتا ہے۔"

"گھر آپ کا اپنا ہے چاچا...؟" میر نے لہجے کو سرسری بنایا۔

"یہ گھر تو کرائے کا ہے صاحب۔ لیکن اپنا ایک ذاتی مکان بھی ہے یہاں۔" چاچا آہستہ آہستہ کھل تو رہے تھے۔ میر نے مزید بات بڑھائی۔

"ذاتی مکان کے ہوتے ہوئے کرائے کے مکان میں کیوں رہتے ہیں چاچا؟"

"بس صاحب۔ کچھ لڑائی جھگڑے کا معاملہ تھا جس وجہ سے وہ گھر تو چلا گیا لیکن زمیندار صاحب نے مہربانی کی' اسکول کی چوکیداری تو میں شروع سے کررہا تھا پر رہتا اپنے ذاتی مکان میں تھا۔ پھر جب اپنا گھر چلا گیا تو زمیندار صاحب نے اسکول کے ساتھ ملی ہوئی اپنی زمین پر کرائے کا گھر بنوا دیا رہنے کے لیے اور زمین بھی ٹھیکے پر کاشت کے لیے دے دی۔"

"تو عدالت کے ذریعے اپنا حق واپس لے لیں۔"

"عدالت نہیں جاسکتے صاحب۔ گھر کی باتیں لوگوں کی زبان پر آجاتی ہیں۔"

"میں کچھ مدد کرسکتا ہوں...؟ کس کا قبضہ ہے گھر پر' معاملہ کیا ہے؟" اب کی بار میر نے کھل کر پوچھنا مناسب سمجھا اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ چاچا نے اسے اپنی بہن والا سارا واقعہ سنا ڈالا۔

"تو پھر گھر واپس کیسے ملے گا؟"

"پنچائیت کہتی ہے میں اپنی بیٹی کو عمر بھر کے لیے مزار کی خدمت پر بٹھا دوں تو گھر واپس مل جائے گا کیونکہ میرا باپ مرنے سے پہلے یہی فیصلہ سنا کر گیا تھا۔ یعنی پھر ساری زندگی اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔ لیکن بہرحال آخری فیصلہ تو ہمیں ہی کرنا ہے۔"

"او... تو پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"بس صاحب۔ اسی سوچ بچار میں ہوں کہ کیا کروں۔ حشمت تو کہتا ہے ایک دن بھی انتظار نہ کروں۔"

"لیکن چاچا! یہ تو ظلم ہے اور یہ رسم بھی سمجھ سے باہر ہے۔ بھلا ایک ایسا بزرگ جس کے مزار پر لوگ اس عقیدت سے آتے ہیں کہ وہ اللہ کا نیک بندہ تھا اور ہم گنہگاروں کی نسبت اللہ کے زیادہ قریب تھا وہ بھلا ایسا غیر انسانی اور غیر اخلاقی حکم کیسے دے سکتا ہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں چاچا...؟" میر نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو انہوں نے محض سر ہلا دیا۔

"چاچا... ہم سب نے پلٹ کر اس رب کی طرف جانا ہے۔ جس نے یہ دنیا فنا کے لیے بنائی ہے وہ کیسے پسند کرے گا کہ مٹی گارے کے مکان کے لیے ایک جیتے جاگتے انسان کو قربان کر دیا جائے۔ ہم سے اپنی اولاد کے بارے میں بھی سوال کیا جائے گا چاچا... کیا آپ اللہ کے سامنے سرخرو نہیں ہونا چاہتے؟ یہ ظلم مت کریں اور حشمت کو بھی سمجھائیں۔" میر نے انہیں سمجھانے کی اپنی سی پہلی کوشش کی۔ چاچا کا فوری ردعمل بھی کچھ کچھ مثبت ہی نظر آیا۔ وہ چائے کے برتن لے کر اندر چلے گئے اور میر نے آسمان کی طرف دیکھ کر ان کی مزید ہدایت کی دعا کی۔

اگلے روز ڈیوٹی کے بعد وہ گھر چلا گیا۔ پیر کے دن پھر صبح سویرے وہ تھا اور اسکول کا سفر' اس نے سوچ لیا تھا کہ ناز کے معاملے کو آئندہ صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر دیکھے گا اور چاچا کو بھی اس سلسلے میں سمجھاتا رہے گا۔ ناز شاید ٹھیک ہی کہہ رہی تھی اگر اس کے دو بنیادی مسائل حل ہو جاتے ہیں تو یہی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ میر خود بھی پہلے دن سے اپنے آپ کو یہی سمجھا رہا تھا کہ نوکری والی جگہ پر اپنا دامن ایسی باتوں سے بچا کر رکھنا چاہیے' ناز کے خط نے ثابت قدمی کو مزید تقویت دی۔

مئی کے مہینے میں شدید گرمی پڑی تو اس نے پیڑ تلے بیٹھنا بھی چھوڑ دیا۔ ناز سے صرف دو مرتبہ آتے جاتے سامنا ہوا۔ اسکولوں میں گرمی کی چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ میر نے رحمان چاچا کو تسلی سے پاس بٹھا کر ایک مرتبہ پھر سمجھایا' وہ نہیں چاہتا تھا کہ تین مہینوں کے دوران اس کی غیر موجودگی میں ایسا کچھ ہو جائے جس کے لیے وہ کبھی خود کو معاف نہ کر سکے۔ کیونکہ ایک بار کھلی پنچائیت میں ناز کا فیصلہ ہو جاتا تو پھر اس کو تبدیل کرنا تقریباً" ناممکن ہو جاتا' لیکن صرف چاچا کو کہہ دینا کافی نہیں تھا۔ چاچا اس کے سمجھانے پر قائل تو یقیناً" ہو گئے تھے لیکن کسی دباؤ میں آکر بدل بھی سکتے تھے۔ میر کسی طرح ناز سے رابطہ کرنا چاہتا تھا لیکن کوئی طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا۔

چھٹیوں میں صرف دو روز رہ گئے تھے۔ میر نے چھوٹا سا خط پہلے ہی لکھ رکھا تھا۔ شام کو ہلکی سی ہوا چلی تو وہ پیڑ کے نیچے آکر بیٹھ گیا۔ تب تک ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ بس وقت گزاری کے لیے کتاب پڑھنے لگا۔ کوئی آدھا گھنٹہ گزرا کہ حشمت کا چھوٹا بیٹا کھیلتا ہوا وہاں آیا۔

"اوئے بچے... ادھر آؤ۔" میر نے بلایا تو وہ گھبرا کر رک گیا۔

"جاؤ ذرا اندر سے ٹھنڈے پانی کا گلاس لے آؤ... اور سنو... کہنا کہ سر میر مانگ رہے ہیں... بتاؤ۔ کیا کہو گے...؟"

"سر میٹر مانگ رہے ہیں..." اس نے پتلی سی معصوم آواز نکالی تو میر نے بمشکل اپنی ہنسی کنٹرول کی۔

"ٹھیک ہے شاباش جاؤ۔"

کچھ ہی دیر بعد وہ پانی لے آیا اور اس کے پیچھے ناز بھی دروازے میں آئی۔ میر کا آئیڈیا کام کر گیا تھا۔ وہ یقیناً" سمجھ گئی تھی کہ میر باہر پیڑ کے نیچے ہے۔ نظر ملنے پر میر نے ہاتھ میں پکڑا خط ناز کو دکھایا اور پانی پی کر خط

رول کر کے گلاس میں ڈال دیا۔ ناز نے بچے سے گلاس لے کر اسے اندر بھگا دیا۔ میر نے خط میں اپنا موبائل نمبر ناز کو دیا تھا اور لکھا تھا کہ اگر چھٹیوں کے دوران اسے کوئی مسئلہ درپیش آئے تو اس سے کسی طرح رابطہ کر لے۔

☼ ☼ ☼

یہ جولائی کا اینڈ چل رہا تھا۔ جون کا پورا مہینہ تو امتحانوں کی نذر ہو گیا تھا۔ جولائی کے آغاز میں وہ دو ہفتے کے لیے دوستوں کے ساتھ مردان کی سیر کو چلا گیا تھا۔ باقی کے دن یوں تو گھر میں سکون سے گزر رہے تھے۔ جس میں کبھی کبھار دوسری امی اور بہنیں سائرہ اور نیلم اپنی بے رخی کا پتھر گرا دیتیں... اور سکون عارضی طور پر بے سکونی میں بدل جاتا۔ لیکن خیر اس روٹین کا وہ گزشتہ اٹھارہ برسوں سے عادی تھا۔ وہ سات سال کا تھا جب اس کی امی دنیا سے چلی گئیں۔ اور ایک سال بعد جب ابا نے دوسری شادی کی تو میر نے پہلے دن سے انہیں بھی امی ہی کہا' عارفہ پھپھو نے اسے پاس بٹھا کر پیار سے یہی سمجھایا تھا کہ وہ اپنے رویے سے نئے رشتوں میں فاصلہ پیدا نہ کرے... میر نے اپنی عمر اور سمجھ کے مطابق حتی الامکان پہلے نئی امی اور آنے والے سالوں میں دو بہنوں سے اپنائیت پیدا کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ لیکن گزرے اٹھارہ سالوں میں ان سب نے مل کر فاصلے کو خود ہی اتنا کھینچ ڈالا تھا کہ اب قریب آنے کی کسی بھی کوشش کا رنگ لانا تقریباً" ناممکن تھا۔ جولائی کا آخری ہفتہ چل رہا تھا جب ایک دن اچانک ناز کا فون آگیا۔ فوری طور پر میر بہت پریشان ہو گیا کہ شاید کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔ لیکن ناز نے تسلی دی کہ وہ اپنی دوست یاسمین کے ہاں آئی ہوئی ہے اور اس کے موبائل سے صرف خیر خیریت جاننے کے لیے فون کر دیا تھا۔

"او۔ اچھا... میں خود بھی کچھ روز سے یہی سوچ رہا تھا کہ چاچا کو فون کر لوں تاکہ حال احوال کے بہانے تمہارے حالات جان سکوں۔"

"اس دن حشمت لالہ نے بابا کو بہت مجبور کیا کہ پنچائیت بلوا کر اس معاملے کو نبٹا لیں۔ لیکن مجھے لگتا ہے بابا پر آپ کی باتوں کا کافی اثر ہوا ہے کیونکہ وہ لالہ کو اللہ' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خوف دلا رہے تھے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ امید ہے وہ آگے بھی تمہارا ساتھ دیتے رہیں گے۔"

"آ۔ آپ... اسکول کھلنے پر ہی گاؤں آئیں گے؟" ناز نے بہت جھجک کر سوال کیا۔

"ہاں لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔ درمیان میں کسی دن آنے کا کوئی موقع بھی نہیں بن رہا۔"

"وہ... بابا کہہ رہے تھے کہ اگست میں اسکول کو نیا فرنیچر ملنے والا ہے۔"

"اچھا...؟ ہو سکتا ہے کیونکہ میرا کسی سے رابطہ نہیں ہوا۔ پرنسپل صاحب سے پوچھوں گا۔"

"تو پھر آپ گاؤں آئیں گے؟" اس کے انداز میں واضح اصرار تھا' میر کو ہنسی آگئی۔

"تم کیا کہتی ہو... آؤں؟" میر نے الٹا اسی سے سوال کر دیا تو جواباً" خاموشی چھا گئی۔ میر نے گلا کھنکھارا۔

"چلی گئیں کیا...؟"

"اگر آپ کا دل کرتا ہے تو آجائیں۔" اس نے نہایت دھیمی آواز میں بمشکل اتنا کہا۔

"دل کی آواز سننے سے تو تم نے منع کر دیا تھا۔" میر نے پہلی بار شرارت کی۔

"آپ اتنا کہنا مانتے ہیں سب کا...؟" بڑا بے ساختہ سوال تھا۔ میر کا قہقہہ نکل گیا۔

"ہاں... عادت تو ہے۔ کوشش کروں گا آئندہ نہ مانا کروں۔ تم کیا کہتی ہو۔" میر نے کچھ جاننے کے انداز میں استفسار کیا تو وہ جھینپ گئی۔

"مجھے نہیں پتا... میں اب فون بند کرتی ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے... بہرحال کوئی کام نکلا تو میں گاؤں آنے کی ضرور کوشش کروں گا۔" "اپنا خیال رکھنا۔"

میر نے ناز سے بات ختم کرنے کے فوراً بعد ہی پرنسپل صاحب کا نمبر ملایا۔ انہوں نے بتایا کہ دو اگست کو نیا فرنیچر اسکول جانا ہے اور انہوں نے سر ہدایت اور سر شفیق کو گاؤں فون کرکے فرنیچر وصول کرنے کا کہہ دیا ہے۔ میر حسن نے جب اپنی خدمات پیش کیں تو پرنسپل صاحب بہت خوش ہوئے اور اسے بھی دو اگست کو مدد کے لیے دفتر بلالیا۔

دو اگست کو سامان کے ساتھ میر خود بھی گاؤں آگیا۔ رحمان چاچا اور سر ہدایت اسکول میں ہی ان کا انتظار کررہے تھے۔ سر شفیق البتہ کسی کام کے سلسلے میں پشاور گئے ہوئے تھے۔ سر ہدایت نے سامان آف لوڈ کروانے کے لیے بہت سارے بڑے لڑکوں کو بھی بلالیا اور گھنٹے بھر میں ہی سارا سامان ٹرک سے اتار لیا گیا۔ ٹرک ڈرائیور کو میر نے واپس بھیج دیا اور سارا فرنیچر اندر کمروں میں بحفاظت رکھوادیا کیونکہ موسم کے تیور کافی خراب لگ رہے تھے۔ سر ہدایت نے اسے کہا تھا کہ ڈرائیور کے ساتھ وہ بھی واپس چلا جائے اور باقی کام وہ خود کروالیں گے لیکن میر حسن نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ دوبارہ طویل سفر کرنے سے اس کی طبیعت خراب ہوجاتی ہے اس لیے شام کو یا اگلی صبح واپس جائے گا۔ کام ختم ہونے کے بعد سر ہدایت نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی لیکن چاچا نے یہ کہہ کر روک لیا کہ میر کے کھانے کا اہتمام انہوں نے کرلیا ہے سو سر ہدایت بھی چلے گئے۔ میر کا کمرا چاچا نے اسکول کے جمعدار سے صاف کروالیا تھا۔ اس لیے کھانے کے بعد وہ کچھ گھنٹوں کے لیے سوگیا۔ پانچ بجے چاچا چائے لے کر آئے تو وہ اٹھ گیا باہر کافی تیز آندھی چلنے لگی تھی۔

"میں تو کہتا ہوں صاحب آج نہ جائیں، شہر کے لیے آخری بس چھ بجے نکلتی ہے اب اتنی آندھی میں اڈے تک کیسے جائیں گے؟"

"جی چاچا۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ اب صبح ہی نکلوں گا۔"

چاچا چلے گئے تو میر لائبریری میں آگیا۔ بہت ساری اپنے کام کی کتابیں بھی نکالیں اور الماریوں وغیرہ کی سیٹنگ کرکے لائبریری کو اچھا خاصا ترتیب دے ڈالا۔ چاچا رات کا کھانا دے کر گئے تبھی تیز بارش شروع ہوگئی۔ شام سے ہی بجلیاں چمک رہی تھیں۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ میر برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر بارش کا نظارہ کرنے لگا۔ طبیعت عجیب اداس اور بوجھل سی تھی۔ شاید ناز کو دیکھ لینے کی خواہش پوری نہیں ہوسکی تھی اس لیے... اوپر سے بارش اور تنہائی ماحول کو مزید گمبھیر کرنے کا باعث بن رہے تھے۔ نیند بھی جلدی نہیں آئی تھی کیونکہ دوپہر کو کافی آرام کرلیا تھا۔ اس نے ٹی وی آن کرکے ماحول کی خاموشی توڑی اور ایک شاعری کی کتاب کا مطالعہ کرنے لگا۔ بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا اب بہت ہلکی ٹپ ٹپ لگی تھی۔ موبائل کی گھنٹی نے میر کو چونکا دیا۔ کال چاچا کے نمبر سے تھی۔ میر نے گلا کھنکھار کر ہیلو کیا۔

"میں... ناز..." نہایت دھیمی سرگوشی تھی لیکن میر کے حواسوں پر تو بجلی بن کر گری۔

"ناز تم... کیا بات ہے..."

"آپ ابھی باہر آجائیں۔" اس نے کہہ کر فون کاٹ دیا۔ میر نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی ساڑھے بارہ وہ جلدی سے اٹھ کر باہر آیا۔ بہت آہستگی سے بنا آواز کیے گیٹ کھولا، باہر آکر آس پاس دیکھا، وہ دائیں طرف دیوار کے قریب کھڑی تھی، رات اگرچہ بہت تاریک تھی لیکن وہ ایک دوسرے کا چہرہ باآسانی دیکھ پارہے تھے۔

"کیا بات ہے ناز، یہاں کیسے...؟"

"وہ... گھر میں سب سو رہے تھے تو..." اس نے آہستہ سے کہہ کر سر جھکایا۔

"وہ تو ٹھیک ہے... لیکن اس وقت، اس طرح..." میر کی حیرت کسی طور کم نہیں ہورہی تھی۔ ایسے نامناسب وقت میں... اگر کوئی دیکھ لے تو...؟ میر نے پریشانی سے اطراف کا جائزہ لے کر اس کی طرف دیکھا تو وہ رو رہی تھی۔

"کیا ہوا ناز... رونے کیوں لگیں۔" میر نے نرمی سے پوچھا تو اس نے سر اٹھا کر میر کی آنکھوں میں دیکھا۔

"آ... آپ میری خاطر میرے کہنے پر گاؤں آئے۔ اور اب واپس بھی نہیں گئے اور میں گھر میں چھپ کر بیٹھ گئی... آپ کو اتنی تکلیف دی اور...؟" وہ پھر رونے لگی تو میر اس کشیدہ صورت حال میں بھی مسکرا دیا... اس کے بے ربط جملے کا مفہوم وہ آسانی سے سمجھ گیا تھا جگہ اور وقت بھلے نہایت ناموزوں تھے لیکن اظہار بہت حسین اور برمحل تھا۔ میر نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا اور انگوٹھے کی مدد سے اس کے آنسو صاف کیے۔

"تمہارے لیے اٹھائی 'تکلیف' تکلیف نہیں لگتی... اور ہاں تمہیں بنا دیکھے چلے جانا تو مجھے منظور تھا لیکن کوئی ایسی بے احتیاطی ہرگز منظور نہیں تھی جو تمہارے دامن پر داغ لگا دے۔ تمہیں بھی یہ قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ میرے لیے دکھ مت اٹھاؤ ناز..."

"مجھے خود نہیں پتا... میں نے اتنی ہمت کیوں کی اور کیسے باہر آگئی... بس جب سے آپ کے آنے کا سنا دل میں عجیب سی بے چینی لگی تھی اور..." وہ پل بھر کو رکی۔

"صاحب میں نے اپنے بارے میں آپ کو بتا کر اچھا نہیں کیا۔ آپ سوچتے ہوں گے ناز کتنی خود غرض ہے صرف اپنا سوچتی ہے لیکن صاحب میں آپ کو بہت یاد کرتی تھی۔ آپ کے بغیر گاؤں اچھا نہیں لگتا تھا، آپ کو دیکھنے کے لیے میں یہاں تک..." وہ رونے کے ساتھ ساتھ بول بھی رہی تھی۔

"بس۔ بس..." میر نے اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ کر روک دیا اور اپنی پوروں سے اس کے آنسو صاف کیے۔ "آگے کچھ مت کہو ناز۔ میں سب جانتا ہوں۔" جانے آج اسے کیا ہوگیا تھا اس کی جذباتیت میر کو کمزور کررہی تھی۔

"اب جاؤ ناز۔" میر نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھپک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا تو اس نے سر ہلا دیا اور واپسی کے لیے مڑ گئی۔

کیوں نہ ہم اس کو دل و جان سے چاہیں تشنہ
وہ جو اک دشمن جاں پیار بھی کرتا جائے

☼ ☼ ☼

اسکول کھل گئے۔ پرانی روٹین پھر سے رواں دواں ہوگئی تھی۔ اگست کے مہینے کو تو انتظار کا مہینہ کہنا زیادہ مناسب تھا یا پھر بحث مباحثے کا مہینہ۔ کیونکہ ابا اس پر شادی کا زور ڈال رہے تھے اور شادی بھی اپنے سالے کی بیٹی ثوبیہ سے جسے میر اچھی طرح جانتا تھا نہ دھیان سے کبھی دیکھا ہی تھا۔ پھر وہ اس بات پر بھی حیران تھا کہ آخر امی اسے اپنی سگی بھتیجی سے کیوں بیاہنا چاہتی ہیں کیونکہ وہ تو میر کو خود سے دور کرنے کے بہانے ڈھونڈا کرتی تھیں اچانک ایسے مہربان کیوں...؟ لیکن معاملہ اس کی سمجھ سے باہر تھا اس لیے عارفہ پھپھو کی مدد لی اور انہیں پوری بات بتائی۔ پھپھو نے اس سے چند دن مانگے اور جانے ان کے کیا ذرائع تھے کہ واقعی چند دن میں ساری گتھی سلجھ گئی۔ پھپھو نے بتایا کہ ثوبیہ کی حال ہی میں دو منگنیاں ٹوٹی ہیں۔ پہلی منگنی اس کی گھر والوں کی مرضی سے ہوئی تھی جسے اس نے اپنی سہیلی کے بھائی کے چکر میں آکر توڑ دیا۔ گھر والوں نے مجبوراً اس کا رشتہ اس کی پسند کی جگہ پر کردیا لیکن کچھ روز پہلے دوسری جگہ پر بھی جانے کس بنا پر لڑکے والوں نے رشتہ توڑ دیا اور اب ان خود سریوں کے بعد گھر والے ثوبیہ کو مزید کوئی مہلت دیے بنا اس کی جلد از جلد کہیں شادی کردینا چاہتے ہیں... اور دوسری طرف ثوبیہ کا بھائی یعنی اس کی امی کا بھتیجا شہریار ڈاکٹر بن چکا تھا جسے امی سائرہ کے لیے پسند کرچکی تھیں اور ہر حال میں سائرہ کی شادی شہریار سے کروانا چاہتی تھیں۔ شاید انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار اپنے بھائی اور بھابھی سے کردیا جس کا ڈراپ سین یوں ہوا کہ انہوں نے ثوبیہ کی میر سے شادی کی

شرط رکھ دی اور اسی بنا پر کچھ دنوں سے مسلسل اس پر دباؤ بڑھتا ہی جارہا تھا۔ دن بڑی مشکل سے کٹے تھے۔ بہرطور کٹ ہی گئے۔ اسکول شروع ہوئے تو میر کو لگا جیسے پرندے کو پنجرے سے رہائی ملی ہو۔ گاؤں کی زمین پر قدم رکھا تو لگا جیسے ہر سمت بہار آگئی ہو۔ ناز کے تصور سے ہی روح تک سکون اتر آیا تھا۔

لیکن یہاں کی مصروفیت نے تو میر کا دماغ اور بھی چکرا دیا۔ پرنسپل صاحب پورے ہفتے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ پہلے چار دنوں میں تو پتا ہی نہیں چلا کہ وقت کہاں گیا۔ اسکول کے بعد کا وقت بھی کاموں میں مصروف گزر رہا تھا۔ پانچویں روز وہ اتفاقاً" اسی وقت گیٹ پر آیا تھا جب ناز اپنے اسکول سے واپس آرہی تھی۔ اسکول کے گیٹ پر پینٹ ہو رہا تھا۔ پرنسپل صاحب نے اسے دیکھنے کے لیے بھیجا کہ آدمی صحیح کام کر رہا ہے یا نہیں۔ میر نے آدمی کو ضروری ہدایات دے کر ناز کی طرف دھیان دیا' وہ اب کافی قریب آچکی تھی۔ اس نے بیگ سے کچھ نکال کر ہاتھ میں لیا۔ میر نے غور کیا تو لگا خط ہے۔ میر نے کچھ سوچ کر ناز سے پہلے ہی چاچا کے گھر کا رخ کیا اور پیپل کے نیچے جاکر رک گیا۔ چند منٹ بعد وہ بھی آگئی۔ وہ واقعی خط دینا چاہتی تھی۔ لیکن انداز کافی سنجیدہ سا تھا۔ نظر اٹھا کر دیکھا بھی نہیں اور بس خط تھما کر چلی گئی۔ خط پر دو دن پہلے کی تاریخ درج تھی۔ یعنی خط اس نے پہلے سے لکھ رکھا تھا لیکن دینے کا موقع آج ملا تھا۔ میر نے وہیں کھڑے کھڑے ہی کھول لیا۔

السلام علیکم صاحب

"اسکول کھلے آج تیسرا روز ہے۔ لیکن آپ ایک بار بھی ہمارے پیڑ کے نیچے آکر نہیں بیٹھے' میں روز پانچ بجے کے بعد آکر دیکھتی ہوں۔ کل چھٹی کے بعد اسکول گیٹ کے سامنے سے گزری تو آپ دور کسی کے ساتھ بیٹھ کے باتوں میں مصروف تھے۔ شاید آپ جان بوجھ کر ایسا کر رہے ہیں۔ میں اپنا قصور مانتی ہوں جی.... اس رات مجھے آپ کو باہر نہیں بلانا چاہیے تھا۔ میں بہت مطلبی ہوں صاحب' آپ کی عزت خاک میں ملانے چلی تھی۔ آپ مجھے معاف کردیں صاحب' یا چاہیں تو برا بھلا کہہ لیں۔ لیکن اپنا غصہ ختم کردیں۔

اگست کا پورا مہینہ آپ کے چلے جانے کے بعد میں بہت بیمار پڑگئی تھی' بابا مجھے کسی فقیر کے پاس لے گئے تھے دم کروانے۔ اس نے کہا کہ مجھ پر سایہ ہے اور کہا کہ پہاڑوں کا جن ہے اور کہتا ہے اس لڑکی کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ لالہ نے بابا سے کہا کہ اگر اسے جلد از جلد مزار پر نہ بٹھایا تو اور ـــــ مصیبتیں بھی آئیں گی۔ صاحب میں ان سب کو کیسے سمجھاؤں کہ مجھ پر کوئی سایہ شایہ نہیں ہے.... میں تو اتنے دن صرف آپ کے لیے پریشان تھی۔ بیمار بھی اسی لیے پڑگئی تھی کہ پورا ایک مہینہ آپ کو دیکھ نہیں سکتی تھی۔ ایک ایک دن چھٹیاں ختم ہونے کا انتظار کیا۔ آپ کی بہت یاد آتی تھی۔

صاحب میں نے ہی آپ سے کہا تھا کہ اگر میری دو باتیں گھر والے مان لیں تو کوئی اور بڑا خواب نہیں دیکھوں گی' لیکن صاحب کیا کروں گی اس آزادی کا اور کیا ملے گا پڑھ لکھ کر.... میرا تو اب جینے کو بھی دل نہیں کرتا دل چاہتا ہے لالہ سے کہوں ابھی مجھے مزار پر بٹھا آئیں اور اپنا مکان واپس لے لیں۔ کسی کے تو کام آؤں۔"

میر نے ایک آہ بھر کر خط بند کیا۔ ناز اس کی وجہ سے تکلیف میں تھی۔ بھلا اسے آرام کہاں سے آتا۔ پانچ بجے کتابیں لے کر پیڑ کی چھاؤں میں آبیٹھا۔ گرمی اگرچہ ابھی گئی نہیں تھی لیکن بہرحال برداشت کے قابل تھی۔ اس نے کاغذ پین سنبھال کر لکھنا شروع کیا۔

وعلیکم السلام

"سب سے پہلی بات یہ کہ میں تم سے ناراض نہیں ہوں اور اس رات جب تم نے مجھے بلایا تو مجھے بالکل برا نہیں لگا بلکہ بہت اچھا لگا اور یہ بات تم بھی جانتی ہو ورنہ اس طرح مجھ سے اکیلے میں ملنے نہ آتیں۔ تمہارا مجھ پر بھروسا اس لیے ہے کیونکہ تم جانتی ہو کہ میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔ البتہ میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ خود کو اس طوفان سے دور رکھوں تاکہ ہم دونوں کے لیے کوئی مصیبت نہ ہو لیکن اب میرے لیے بھی خود کو سمجھانا بہت مشکل ہوگیا ہے۔ میں نے بھی اسکول کھلنے کا انتظار اتنی شدت سے کیا جتنا تم نے۔ لیکن اسکول کھلتے ہی واقعی بہت زیادہ مصروف ہوگیا تھا۔ تم اتنے دن بلاوجہ پریشان رہیں۔ اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔

جہاں تک پیر بابا کے مزار کی بات ہے تو جلدی میں کوئی فیصلہ مت کرو۔ ویسے بھی انسان کو اپنے مستقبل کے معاملات اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دینے چاہئیں۔ ہم نے اپنی آنے والی زندگی کیسے اور کس کے ساتھ گزارنی ہے۔ اس کا بہترین فیصلہ صرف اوپر والے پر چھوڑ کر پرسکون ہوجانا چاہیے۔ جہاں تک دم دینے والے فقیر کا تعلق ہے تو ایسی معمولی باتوں پر دھیان دے کر خود کو پریشان مت کرو۔ ویسے بھی اب تو میں آگیا ہوں' امید ہے اب تم ٹھیک ہوجاؤ گی تو دم وغیرہ کروانے کی نوبت نہیں آئے گی۔ خود کو خوش رکھا کرو اور اچھی اچھی باتیں سوچا کرو۔"

ناز کو جواب کا انتظار تھا اس لیے خود ہی دروازے پر آگئی تھی۔ میر نے اسی روز ہی خط اس کو دے دیا تھا۔

✲ ✲ ✲

اتوار کے دن وہ دیر تک سوتا رہا تھا۔ کوئی دس بجے کے قریب موبائل بجا تو میر نے کسلمندی سے ہاتھ بڑھا کر ہیلو کہا لیکن ناز کی آواز سن کر ایک سیکنڈ کے اندر پورا ہوش میں آگیا۔

"ناز.... کیسی ہو؟"

"اب تو ٹھیک ہوں۔ لیکن لگتا ہے لالہ بیمار کرکے چھوڑیں گے۔"

"کیوں۔ کیا ہوا؟"

"لالہ کو پتا نہیں کیا ہوگیا ہے۔ اسی فقیر کو پھر بلا لائے تھے۔ اس نے کوئی تعویذ لکھ کر دیا ہے۔ اور بھابھی نے کپڑے میں سی کر میرے گلے میں پہنا بھی دیا ہے۔"

"تعویذ وغیرہ ایسے بے احتیاطی سے نہیں پہن لیتے۔ تم تو پڑھی لکھی ہو۔ پہلے تسلی کرلو پھر پہننا۔"

"جی میں دیکھ لوں گی۔ ویسے میں نے پھر آپ کو پریشان کردیا۔ حالانکہ میں نے سوچا تھا آج کوئی پریشانی والی بات نہیں کروں گی۔"

"اچھا۔ تو کوئی خوش کرنے والی بات کردو۔" میر نے شوخ لہجے میں کہا۔

"وہ...." ناز کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہاں.... ہاں کہو۔"

"صاحب ایک بات پوچھوں۔" وہ ذرا سا جھجکی۔

"ہاں۔ پوچھو۔"

"وہ میری سہیلی ہے نا یاسمین.... وہ کہتی ہے کہ میر صاحب اس لیے تمہارا خیال رکھتے ہیں کیونکہ تم نے خط لکھ کر انہیں اپنے حالات کے بارے میں بتایا تھا۔"

"ہوں.... ہوں.... اور...." میر نے جان بوجھ کر اپنا لہجہ سنجیدہ رکھا۔

"اس کا مطلب تھا.... مجھے آپ کو چھٹیوں میں اسکول کے باہر بلا کر وہ سب باتیں نہیں کہنی چاہیے تھیں۔ وہ کہتی ہے تمہارے صاحب کو تم سے صرف ہمدردی ہے۔"

"وہ مجھے "تمہارے صاحب" کہتی ہے۔" میر نے لہجے کو حتی الامکان سرسری رکھا۔

"وہ نا' میں آپ کی باتیں اس کو بتاتے ہوئے کہتی ہوں' میرے صاحب کی یہ بات ہے' وہ بات ہے۔ اس لیے...." ناز نے بڑے تدبر سے سمجھایا تھا۔ اس بار میر سے ہنسی روکنا مشکل ہوگیا۔

"اچھا تو یاسمین کو لگتا ہے کہ اس روز تمہیں کھل کر اظہار نہیں کرنا چاہیے تھا....؟"

"جی.... اس نے کہا آپ نے مجھے اسکول کے اندر نہیں جانے دیا کیونکہ آپ کے دل میں میرے لیے کچھ نہیں ہے۔"

"واہ.... دوست بھی اپنے جیسی سمجھ دار پال رکھی ہیں۔" میر ہنسا۔

"اچھا اور...."

”وہ۔ آپ شہر کے ہیں نا۔۔۔ تو آپ کی وہاں اور بھی۔۔۔“ ناز بات پوری نہ کر سکی۔

”اچھا۔ یعنی میری شہر میں بھی فرینڈز ہوں گی اور یہاں تم سے بھی چکر چلا رہا ہوں‘ وہ بھی ہمدردی والا ہوں۔۔۔؟“ میر نے تائید چاہی لیکن وہ چپ رہی۔

”ارے میرے سوہنے‘ اس رات اسکول کے اندر اسی لیے تو نہیں بلایا تھا کیونکہ تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ تمہارے پیارے سے معصوم اظہار نے تو مجھے اور بھی جذباتی کر دیا تھا‘ تمہیں اندازہ ہی نہیں اس وقت کتنی مشکل سے تمہیں واپس بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا‘ ناز تم ایک لڑکی ہو۔۔۔“ میر کہتے کہتے رک گیا۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی وضاحت کیسے کرے۔

”چوری چھپے ملنا یا اکیلے ملنا‘ یہ سب کسی صورت مناسب نہیں ہوتا۔ کیا اتنا کہنا کافی ہے۔۔۔؟“

”اچھا۔۔۔ چھا۔۔۔“ ناز نے کافی طویل اچھا کہی جیسے اب بات سمجھ میں آئی ہو۔

”بلکہ اگر صرف ہمدردی رکھتا شاید تب بھی اندر نہ بلاتا کیونکہ اس طرح ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ویسے کیا تمہیں بھی یہی لگتا ہے کہ میری شہر میں اور دوست ہوں گی؟“ میر نے ٹاپک بدلا۔

”دل تو نہیں مانتا‘ لیکن آج کل سارے لڑکے ایسا ہی کرتے ہیں۔“ ناز نے سادگی سے اپنی رائے بتائی۔

”واہ بھئی‘ بڑی سیانی ہو تم تو۔۔۔ لیکن میں تو صرف اپنے بارے میں پوچھ رہا ہوں‘ کیا میں بھی تمہیں باقی لڑکوں جیسا لگتا ہوں۔“

”نہیں صاحب۔ آپ میں تو ایک بات بھی آج کے لڑکوں جیسی نہیں ہے۔ لیکن میری اماں کہتی تھیں کسی مرد پہ بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔“ ناز کی کنفیوژن میر کو بہت پیاری لگی لیکن زبردستی لہجہ سنجیدہ رکھا۔

”اچھا تو شکی مزاج بیوی بنو گی۔ پھر تو سوچنا پڑے گا۔“

”نہیں صاحب۔ اللہ کی قسم۔ میں شک نہیں کرتی۔“ ناز نے بوکھلا کر اس کی بات کاٹی تو میر زور سے ہنسا جس پر وہ خاصی شرمندہ ہو گئی۔

”اب میں بند کرتی ہوں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔“ ناز نے فوراً“ اجازت چاہی۔

”ارے بات تو سنو۔۔۔“ میر ہنسے ہی گیا۔

”اچھا اگلے ہفتے سے میں پھر باہر بیٹھنے کی روٹین بناؤں گا۔ تم روز نہیں تو کبھی کبھار موقع ملنے پر دیکھ لیا کرو۔ اگر ضروری بات ہوئی تو میں خط لکھ رکھوں گا۔“

”جی اچھا۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

آنے والے دنوں میں میر نے خود کو پڑھائی میں ذرا زیادہ مصروف کر لیا۔ فائنل ایئر کی نئی نئی اسٹڈی تھی۔ سمجھنے میں ہی کافی ٹائم نکل گیا تھا۔ اس دوران دو بار ناز سے خط و کتابت ہوئی‘ اس نے لکھا تھا کہ کچھ دنوں سے ایک لڑکا اسکول آتے جاتے اس کا پیچھا کرتا ہے۔ میر کو کافی تشویش ہوئی۔ اس لیے ایک دن چھٹی کے بعد گرلز اسکول کے راستے پر کافی آگے تک آیا جہاں سے ناز نے آنا تھا۔ اور واقعی ایک اٹھارہ بیس سال کے لڑکے کو اس نے نوٹس کیا جو میر کو دیکھتے ہی راستہ بدل گیا تھا۔ میر نے ناز سے کہا کہ وہ چاچا کو اس بارے میں بتا دے اور ایک دو روز وہ اسے اسکول بھی چھوڑ آئیں تاکہ لڑکا باز آ جائے لیکن اس سے پہلے کہ ناز بابا سے شکایت کرتی حشمت نے گھر میں ہنگامہ کھڑا کیا کہ گاؤں کے لوگ ناز پر باتیں بنا رہے ہیں کیونکہ لڑکے اس کا پیچھا کرتے ہیں اور اس کی پڑھائی روک کر اسے گھر بٹھا دیا جائے۔ میر کو یہ ساری بات ناز نے خط لکھ کر بتائی تھی۔ میر کو سن کر کافی عجیب لگا کہ حشمت تو سارا دن دکان پر ہوتا ہے اور اسکول کا راستہ بھی کھیتوں سے ہو کر جاتا ہے جہاں گاؤں کے لوگوں کی کوئی خاص گزر گاہ نہیں تھی۔ پھر حشمت کو کس نے بتایا کہ لڑکے اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ اور بجائے اس لڑکے کو بے عزت کرنے کے وہ اپنی بہن پہ انگلی اٹھا رہا تھا۔ لیکن پھر رحمان چاچا نے یہ کہہ کر کہ ناز کا اسکول میں آخری سال ہے حشمت کو چپ کرا دیا۔ اور وہ خود ہی ناز کو لانے لے جانے لگے تو وہ لڑکا بھی کہیں رفو چکر ہو گیا۔ البتہ میر نے پیڑ کے نیچے بیٹھنا چھوڑ دیا کیونکہ ناز نے ہی اسے آخری خط میں منع کر دیا کہ کہیں حشمت لالہ اس پر بھی کوئی بات نہ کر دیں۔ میر کو بھی بات مناسب لگی اس لیے اسکول کی لائبریری میں بیٹھنا شروع کر دیا لیکن ناز کا لکھا وہ خط واقعی آخری ہی ثابت ہوا کیونکہ بیچ میں کافی سارے دن گزر گئے تھے۔ میر کو عجیب سی بے چینی نے گھیر لیا۔ بہت دن سے اسے اسکول آتے جاتے دیکھا تھا نہ اس نے خط لکھ کر رابطہ کیا۔

اس روز بہت مجبور ہو کر پیپل کے نیچے آ کر بیٹھا۔ چاچا نہایت خاموشی سے چائے اس کے قریب رکھ کر گئے۔ کچھ خشک پتے پیڑ سے جھڑ کر گرے تو اس نے اوپر سر اٹھایا پورے پندرہ دن ہو گئے تھے ناز کا کوئی اتہ پتا نہیں تھا۔ ساری فضا ہی جانے کیوں بہت مغموم سی لگی۔

شاید خزاں کے خوف سے رویا ہے کوئی گل
بھیگا ہوا ہے آج پھر آنچل بہار کا

اسے اچانک ہی شدت سے اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ اتنے دن ناز سے غافل رہ کر اس نے اچھا نہیں کیا۔

حشمت کا بڑا بیٹا دو بار سامنے سے گزرا‘ میر کا دل چاہا اس کو روک لے لیکن بے کار تھا۔ شام کے سائے ڈھلنے لگے تو وہ واپس آ گیا۔ مغرب کی نماز کے بعد جب وہ اور سر مختیار مسجد سے واپس آ رہے تھے تو میر نے دیکھا کہ چاچا کی پوری فیملی چاچا سمیت کہیں جا رہی تھی۔ میر حسن نے نظروں ہی نظروں میں جانچ لیا تھا‘ ناز ان میں نہیں تھی بلکہ اس کے علاوہ سب ہی تھے۔ میر چاچا سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ لوگ قریب کے گاؤں شادی میں جا رہے ہیں اور صبح واپس آئیں گے۔ میر کافی حیران حیران سا واپس آیا۔ کھانا بھی نہایت بے دلی سے کھایا اور دوسرے کمرے میں آ گیا۔ ٹیچرز کے استعمال میں دو کمرے تھے لیکن یہ دوسرا کمرہ صرف میر ہی استعمال کرتا تھا کیونکہ سر بشیر اور سر مختیار ٹی وی دیکھتے دیکھتے اسی کمرے میں سو جاتے تھے اور میر کو دیر تک پڑھنا ہوتا تھا اس لیے وہ اس کمرے میں پڑھائی بھی کرتا اور سو بھی جاتا۔ آج اس نے پڑھائی بھی نہیں کی دھیان سارا ٹائم کی طرف تھا۔

گیارہ بجنے والے تھے۔ پاس کے کمرے سے ٹی وی کی آواز آنا کافی دیر سے بند ہو گئی تھی۔ میر نے برآمدے میں آ کر دیکھا تو لائٹ آف تھی‘ یعنی دونوں صاحبان سو چکے تھے۔ اس نے اپنا موبائل اٹھایا اور آہستگی سے گیٹ کھول کر باہر آ گیا۔ چاچا کے دروازے پر بڑا سا تالا دیکھا تو مزید پریشان ہو گیا۔

”ناز کہاں ہے۔۔۔؟“ اس کی پیشانی پہ پسینہ چمک اٹھا۔ فوراً“ ایک خیال کے آتے ہی اس نے موبائل نکالا۔ یاسمین کا نمبر اس کے پاس موجود تھا۔ اگرچہ اسے بالکل مناسب نہیں لگ رہا تھا کہ بے وقت کال کر کے اس کے لیے کسی پریشانی کا باعث بنے لیکن اس وقت اور کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی پھر بھی احتیاطاً“ اس نے صرف مس کال دے کر چھوڑ دیا۔ اور خود انتظار کے لیے وہیں ٹہلنے لگا کوئی پانچ سات منٹ بعد یاسمین کی طرف سے کال آئی۔ میر نے اس سے ناز کے بارے میں پوچھا تو جواباً“ اس نے بتایا کہ دو ہفتوں سے ناز اسکول نہیں آ رہی۔ اور اس نے چاچا کے موبائل پر دو تین مرتبہ کال کر کے خود بھی ناز کا پتا کیا لیکن ایک بار بھی بات نہیں کر سکی کیونکہ کبھی چاچا گھر سے باہر ہوتے تو کبھی بتاتے کہ وہ سو رہی ہے۔ میر نے جب اسے بتایا کہ ابھی چاچا اپنے سب گھر والوں کے ساتھ کہیں جا رہے تھے اور ناز ساتھ نہیں تھی تو یاسمین نے فوراً“ کہا کہ یقیناً“ وہ اسے گھر کے اندر بند کر گئے ہوں گے کیونکہ پہلے بھی ایک بار ایسا ہو چکا ہے۔ میر نے مزید کوئی اور بات کیے بنا فون بند کر دیا۔

میر نے تالا لگے دروازے کو ہاتھ سے بجایا۔ وقفے وقفے سے تین بار اس نے ایسا کیا لیکن کوئی رسپانس نہیں آیا۔ وہ گھوم کر گھر کی سائیڈ سے ہوتا ہوا پیچھے کی طرف آیا۔ سنسناتی ہوئی خشک ہوا۔۔۔ گہرا خوفناک اندھیرا۔۔۔ اور رگ و پے میں دوڑتا عجیب سا خوف۔۔۔ میر کا گلا بری طرح خشک ہو رہا تھا۔ لیکن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے ایک ہی نقطے پر آ کر سمٹ گئی تھی کہ ناز کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ یاسمین سے بات

کرنے سے پہلے تک اس کا یہی خیال تھا کہ وہ گھر والوں سے پہلے کسی وجہ سے شادی والے گھر چلی گئی ہوگی۔ لیکن یاسمین کا بھرپور اعتماد سے دیا جواب اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ہمت کر کے میر نے اندر جانے کا فیصلہ کیا۔ دیوار کے ساتھ ایک پرانی پتھر کی چکی اور کچھ اینٹیں رکھی تھیں' میر نے سب کو ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر کافی اونچی جگہ بنائی' پھر اس پر پیر رکھ کر اونچا ہوا اور دیوار کو تھام لیا۔ اب وہ ایک ہی جست میں دیوار کے اوپر تھا۔ اندر کی زمین باہر کی نسبت کافی اونچی تھی اس لیے چھلانگ لگانا آسان تھا۔ میر نے اللہ کا نام لیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ اندر کود گیا۔ چاند کی روشنی بس اتنی تھی کہ کمروں اور دیواروں کا نقشہ سجھائی دے رہا تھا۔ بالکل سامنے دو کمرے اور ان کے سامنے برآمدہ تھا۔ ایک کمرے کی سائیڈ والی دیوار نظر آ رہی تھی۔ میر کچھ قدم چل کر صحن کے درمیان تک آیا تو اس تیسرے کمرے کا دروازہ اب اس کے سامنے تھا۔ اس کمرے میں ہلکی روشنی تھی جیسے لالٹین یا دیا جل رہا ہو۔ میر کمرے کے قریب آیا۔ لکڑی کے پرانے سے دروازے میں کئی روزن تھے اس نے آنکھ لگا کر اندر جھانکا لیکن کچھ واضح طور پر دکھائی نہیں دیا۔ اس نے دوسری پھر تیسری... کئی جگہوں سے جھانکنے کی کوشش کی لیکن کوئی انسانی وجود دکھائی نہیں دیا۔ وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اندر سے ہلکی سی کھانسنے کی آواز آئی۔ لیکن آواز سے کچھ اندازہ نہیں ہوا۔ میر نے اپنا کانپتا ہاتھ دروازے پر رکھا' جسے کھولنے یا بجانے کے لیے حد درجہ ہمت کی ضرورت تھی۔ ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے میر نے دروازہ بجا دیا۔ پہلی بار میں کوئی جواب نہیں آیا تو اس نے ذرا دیر بعد دوبارہ دروازہ بجایا۔ تھوڑی دیر بعد ہلکی سی آواز سنائی دی۔

"کون...؟" آواز بلاشبہ ناز کی تھی۔

"دروازہ کھولو ناز... میں ہو میر..." میر کو دو سیکنڈ سے بھی کم انتظار کرنا پڑا اور دروازہ کھل گیا وہ حیران نظروں سے میر کو دیکھے جا رہی تھی۔ میر کا بھی یہی حال تھا۔ کالے کپڑوں میں ملبوس' گلے میں ہلکا پیلا دوپٹہ لٹکائے کھلے بالوں کے ساتھ اس کا سفید چہرہ ہلکی روشنی میں بھی نور میں نہایا لگ رہا تھا۔ میر نے پہلی بار اسے اس انداز میں دیکھا تھا۔ وہ بھی ایسے ماحول میں اتنے قریب' میر نے ناز کو شانوں سے تھاما اور دیر تک بنا کچھ کہے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا... اور پھر بے ساختہ اپنے ساتھ لگا لیا' میر کی غیر متوقع آمد اور اپنائیت بھرا انداز پا کر ناز زار و قطار رونے لگی۔ پتا نہیں کتنا بوجھ تھا اس کے دل پر... وہ باقاعدہ ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔ اس نے مضبوطی سے میر کو پکڑ رکھا تھا۔ جیسے گمشدہ بچہ ماں کے ملنے پر اس سے لپٹ جاتا ہے' میر اس کے سر پر تسلی آمیز تھپکی دیتے ہوئے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسے لیے چارپائی کے قریب آیا اسے بٹھا کر خود بھی ساتھ بیٹھ کر نرمی سے اس کے آنسو صاف کیے۔

"بس چپ ہو جاؤ ناز... اور تسلی سے مجھے ہر بات بتاؤ۔"

"مجھے یہاں سے لے جائیں صاحب جی... میں مر جاؤں گی۔" وہ پھر سے رونے لگی۔

"اچھا بابا ٹھیک ہے... لے جانے ہی آیا ہوں۔ تم پہلے چپ تو ہو جاؤ۔" میر نے آس پاس نظر دوڑا کر پانی تلاش کیا' چارپائی کے ساتھ ہی چھوٹی میز پر پانی اور کچھ کھانے پینے کا سامان رکھا تھا۔ میر نے گلاس میں پانی ڈال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"چلو پانی پی لو۔" میر نے گلاس اس کے منہ سے لگایا تو ناز نے دو گھونٹ پیے۔

"اب بتاؤ... یہ سب کیا ہے؟" میر نے پیار سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

"میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا یا ہو رہا ہے وہ میرے سگے بھائی اور اس کی بیوی نے کیا ہے۔ یہ دیکھیں... اس نے اپنے پیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پائنچہ تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور پہلی بار میر کی نظر اس لمبی لوہے کی زنجیر پر پڑی جو ناز کے پیر سے شروع ہو کر دور ایک مضبوط کھونٹے سے بندھی ہوئی تھی۔"

"یہ کس لیے...؟" میر نے حیرت سے ناز کی طرف دیکھا اس نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

"میں شروع سے ساری بات بتاتی ہوں... وہ جو لڑکا میرا پیچھا کرتا تھا نا... مجھے شک ہے وہ لالہ کا اپنا بھیجا ہوا تھا کیونکہ اس بات کو لالہ نے بہت بڑھا چڑھا کر بابا کو پیش کیا اور مجھے اسکول بھیجنا بند کروا دیا۔ بابا ان کی ہر بات مانتے ہیں اور ان کے غصے کی وجہ سے وہی کرتے ہیں جو وہ کہتے ہیں۔ اس لیے مجھے گھر بٹھا دیا لیکن کچھ دن بعد میرے ساتھ عجیب بات ہوئی۔ ایک دن میں کچھ عجیب الٹی سیدھی باتیں کرنے لگی۔ اصل میں صبح پہلے سر میں شدید درد ہوا۔ ایسے لگ رہا تھا کسی نے سر پہ پتھر رکھ دیا ہو پھر بلاوجہ نیند سی آنے لگی لیکن بھابھی مجھے سونے نہیں دے رہی تھی اور جان بوجھ کر سب کے درمیان لا کر بٹھا دیا۔ مجھے چکر آ رہے تھے۔ میں کبھی بیٹھے بیٹھے خواب دیکھنے لگتی کبھی جاگ جاتی اسی حالت میں شاید میں نے کچھ بے ربط باتیں کیں اس پر بھابھی نے شور مچا دیا کہ مجھ پر جن آ گیا ہے۔ اور مجھ پر سایہ ہے لالہ اسی وقت کسی فقیر کو بلا لائے اس نے مجھے کمرے میں بند کر کے دھواں کر دیا۔ کچھ پڑھ پڑھ کر پھونکتا رہا۔ پشت پر جھاڑو وغیرہ مارے اور چلا گیا۔ کچھ دن بعد پھر میرے ساتھ یہی سب کچھ ہوا تب مجھے سمجھ آ گئی کہ یہ کیوں ہو رہا ہے۔ دونوں بار ایسی طبیعت ہونے سے پہلے بھابھی نے مجھے میٹھا کھلایا تھا۔ ضرور اس میں کچھ ملا ہوا تھا' ابھی تین چار دن پہلے وہی بابا جی دوبارہ آئے اس نے کہا کہ پیر نعمت شاہ اس کے خواب میں آئے اور کہہ رہے تھے کہ اگر میری امانت کو جلد از جلد مزار پر نہ پہنچایا گیا تو ان کا قہر ہمارے گھر پر نازل ہوگا' فصل تباہ ہو جائے گی' بیماری اور موت خدانا خواستہ ہمارا گھر دیکھ لے گی۔ روپے پیسے کی تنگی ہو جائے گی وغیرہ وغیرہ۔ مجھے تو صاف سمجھ آ گئی تھی کہ وہ لالے کا سکھایا سبق پڑھ رہا ہے۔"

"تو تم نے چاچا کو بتایا جو کچھ حشمت اور اس کی بیوی نے کیا...؟"

"نہیں... کیونکہ یہ سب میرے اندازے ہیں اور کسی بات کا کوئی واضح ثبوت نہیں ہے۔ بابا کو بتاتی تو وہ ضرور میرا یقین کر لیتے لیکن پھر غصے میں آ کر لالہ اور بھابھی سے کچھ کہتے تو وہ بہت بڑا ہنگامہ کھڑا کرتے۔ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ کسی حد تک بھی جا سکتے ہیں۔"

"ہاں۔ یقیناً" چاچا یہی سمجھ رہے ہیں کہ تم پر آسیب ہے ورنہ کم از کم وہ تمہیں اس طرح باندھ کر اکیلا نہ چھوڑ جاتے۔ لیکن حشمت کو یہ جن وغیرہ کا ڈرامہ کرنے کی ضرورت کیا ہے؟"

"اصل میں اماں اور بابا ہمیشہ سے یہی کہتے تھے کہ ہماری ناز بہت سمجھ دار اور ذہین ہے اور پڑھائی میں بھی اتنی لائق ہے کہ ایک دن اپنے اسکول میں استانی لگے گی۔ اب لالہ اور بھابھی کو یہی فکر کھائے جا رہی ہے کہ ایک بار میٹرک مکمل ہو گیا تو پھر یہ آگے پڑھنے کی ضد بھی کرے گی۔ بس یہی کچھ سوچ کر یہ دونوں مجھے پاگل ثابت کرنے پر تلے ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ہمارے دیہاتوں میں جنوں بھوتوں کی باتوں پر کتنا یقین کیا جاتا ہے۔ ایسی باتوں کو یہاں سب فوراً" سچ مان لیتے ہیں۔ میں نے جب کہا کہ گلشن بوا کے شادی کر کے چلے جانے کے بعد تو پیر بابا نے ہم پر کوئی قہر نازل نہیں کیا تھا تو لالہ مجھ پر بہت چلائے کہ میں فوراً" معافی مانگوں ورنہ اپنے کہے کی سزا پاؤں گی۔"

"ہوں..." میر نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا۔

"یہ بتاؤ اب آگے کیا کریں۔ تمہیں اس حال میں کیسے چھوڑ جاؤں۔ کیا کوئی ایسی جگہ ہے جہاں تم خود کو محفوظ سمجھو؟"

"میرے ایک ماموں ساتھ والے گاؤں میں رہتے ہیں۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ میری مدد کر سکتے ہیں لیکن بابا سے کیا کہیں گے؟"

"میں کوئی ایسا حل سوچ رہا ہوں جس سے حشمت کی سازش بھی بے نقاب ہو جائے اور میرا نام بھی بیچ میں نہ آئے' میں نہیں چاہتا کوئی تمہاری ذات پر انگلیاں اٹھائے کیونکہ اگر میرا نام درمیان میں آ گیا تو

لوگ واقعے کو الگ ہی رنگ دیں گے اور تم پر ہونے والا یہ ظلم کسی کو نظر نہیں آئے گا۔ ویسے ایک حل تو میرے ذہن میں آگیا ہے لیکن معلوم نہیں اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔"

"وہ کیا جی۔۔۔؟" ناز نے امید بھری نظروں سے میر کو دیکھا۔

"اتنی تفصیل کا ابھی وقت نہیں ہے۔ بس بہتری کی امید رکھو' کل شام تک ان شاء اللہ تمہیں اس تکلیف سے ضرور نجات مل جائے گی بس تم اللہ پر بھروسا رکھو اور دیکھو گھبرانا نہیں۔۔۔ اس وقت مجھے سب سے زیادہ تسلی تمہیں خیریت سے دیکھ کر ہوئی ہے۔ بس ڈرنا نہیں۔" میر نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

"آپ آگئے۔۔۔ اب مجھے کوئی خوف نہیں ہے۔ دل سے ہر ڈر نکل گیا۔" پہلی بار ناز مسکرائی۔

"یہ تمہارا یقین اور محبت تھی جس کی بدولت میں آج یہاں تمہارے پاس موجود ہوں' اس یقین کو ہمیشہ قائم رکھنا شاید یہی میری طاقت ہے۔" میر نے پیار سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"اچھا ناز اب میں چلتا ہوں؟" میر نے ناز کی زنجیر توڑ کر اسے آزاد کیا۔ وہ دیوار تک اس کے ساتھ آئی۔ میر آگے بڑھنے لگا تو ناز نے اس کا ہاتھ تھام کر روک لیا۔ وہ قدرے پریشانی سے مڑا۔

"کیا بات ہے ناز۔۔۔! اکیلے ڈر تو نہیں لگ رہا؟ میں پوری رات تمہارے ساتھ رک سکتا ہوں لیکن۔۔۔"

"نہیں صاحب۔۔۔ میں تو بس۔۔۔" اس نے بمشکل پلکوں پر آئے آنسوؤں کو روکا۔

"میں بہت پاگل اور جذباتی ہوں صاحب" اس نے سر جھکا کر کانپتے ہاتھوں سے آنکھیں رگڑیں تو میر دوبارہ رک گیا۔ آگے بڑھ کر اس کی آنکھیں صاف کیں اور پیشانی پر بوسہ دیا۔

"تمہارے پاگل پن کی اس دل میں کیا جگہ ہے' تمہیں کیا پتا۔۔؟" میر نے مسکرا کر اس کی اداسی کم کرنے کی کوشش کی تو وہ بھی ہنس پڑی۔ میر نے دیوار کے پار اترتے ہوئے ایک نظر دوبارہ اسے دیکھا اور دوسری طرف چھلانگ لگادی۔ ناز وہیں دیوار کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گئی۔

"میں بھی کتنی بدنصیب ہوں' کبھی اس کو کوئی خوشی نہیں دے سکتی۔ وہ بھی ہر بار میرے لیے ایک نئی آزمائش کا سامنا کرتا ہے۔ کب تک میرے اللہ۔۔۔ کب تک۔۔۔" وہ دیر تک بنا آواز آنسو بہاتی رہی۔

مل کے اس شخص سے میں لاکھ خموشی سے چلوں
بول اٹھتی ہے نظر پاؤں کی پائل کی طرح
پاس جب تک وہ رہے درد تھما رہتا ہے
پھیلتا جاتا ہے پھر آنکھ کے کاجل کی طرح

☆ ☆ ☆

میر نے ناز کے منہ سے اس جعلی فقیر کا نام ایک ہی بار سنا تھا' بس اگلی شام ہی پوچھتا ہوا اس تک پہنچ گیا۔ میر نے لہجے میں اعتماد پیدا کر کے صاف صاف کہہ دیا کہ اس نے حشمت کا کام جتنے پیسوں میں کیا تھا اس سے دگنے لے کر وہ میر کا ایک کام کردے۔ اور وہ تو واقعی پیسہ پیر نکلا۔ میر کو سن کر حیرت ہوئی کہ محض پانچ سو کے بدلے اس نے ناز کا مستقبل تاریک اور زندگی برباد کردی تھی۔ میر نے دو ہزار اس کے ہاتھ پہ رکھے اور کہا۔

"سیدھا رحمان چاچا کے پاس جاؤ اور اپنے جھوٹے بیان کا اقرار کرو۔ انہیں بتادینا کہ حشمت کے کہنے پر تم نے ان کی بچی کو پاگل بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

"لیکن صاحب۔ حشمت تو مجھے جان سے مار ڈالے گا۔" بابا جی کی اپنی بتی اب گل ہو رہی تھی۔

"حشمت اگر کوئی دھمکی دے تو اسے کہنا اس بار سچ مچ پیر نعمت خواب میں آئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ جس جس نے اس ڈھونگ میں حصہ لیا ہے اگر انہوں نے اپنی غلطی نہ سدھاری تو سب پر اصل عذاب آئے گا۔ تم ہی تھے نا جس نے پانچ سو کی خاطر پیر بابا سے جھوٹا خواب منسوب کیا تھا۔ اب ایک اچھے مقصد کی خاطر ایسا کرو۔ اور ہاں اس بار تو پیسے دے کر کام کروا رہا ہوں۔ اگر کوئی گڑبڑ کی تو پولیس کے ڈنڈے پڑوا کر کام نکلواؤں گا۔ سمجھ گئے نا؟" میر نے گھور کر تنبیہہ کی تو اس نے سر ہلا دیا۔

"چلو بنا وقت ضائع کیے چاچا کے پاس جاؤ۔ بلکہ ایک کام کرو۔ یہ پیسے مجھے واپس کرو۔" میر نے باقاعدہ چھین کر رقم واپس لی۔

"تم جیسوں کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ جاؤ پہلے ٹھیک طرح سے چاچا کو ساری بات بتا کر آؤ۔ پھر پیسے لے جانا۔" اس وقت تو یقیناً وہ دو ہزار کی خاطر کچھ بھی کر گزرنے کو تیار لگ رہا تھا لیکن اگر اس کے جانے کے بعد کہیں غائب ہو جاتا تو میر اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا اور پلان بھی فیل ہو جاتا اس لیے میر نے عارضی طور پر رقم واپس لے لی تھی۔

وہ خود وہاں سے پیر نعمت شاہ کے مزار پر آیا۔ بہت دنوں سے وہ یہاں آنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ جس مزار کے بارے میں اتنا سنا تھا اسے دیکھنے کی خواہش خود بخود دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ میر نے مزار پر فاتحہ خوانی کی' کچھ دیر آس پاس گھوم کر دیکھا۔ برگد کے نیچے کافی دیر سکون سے بیٹھنے کا موقع بھی ملا۔ کچی مٹی سے بنے اس چھوٹے اور سادہ سے مزار میں جانے ایسا کیا تھا' میر کا بہت دیر تک واپس جانے کو دل نہیں چاہا۔ اس مزار کی اپنی کشش اتنی زیادہ تھی کہ یہاں خدمت کرنے والوں سے اگر اس کو چھین لیا جاتا تو وہ محض اس کی محبت میں برسوں کی جنگ لڑ سکتے تھے لیکن حشمت جیسے لوگ ان جیسے اللہ والوں کو بھی اپنی غرض کے لیے استعمال کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔ انسان کم از کم ان دنیا سے بے نیاز لوگوں کو تو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا چھوڑ دے لیکن بے حس لوگوں کے لیے نرم دل لوگ برسوں سے اپنا خون جلاتے آئے ہیں پر حاصل وصول شاید کچھ بھی نہیں۔۔۔ دوسری طرف حشمت تھا جو اپنی جیتی جاگتی بہن کو اپنے مفاد کی بھینٹ چڑھا رہا تھا اس کے لیے زمین میں دفن ایک بے ضرر وجود کی وقعت ہی کیا تھی۔ وہ اسکول واپس آیا تو مغرب کی اذان ہونے لگی۔ ناز کے ساتھ پیچھے کیا کچھ پیش آیا وہ تو اگلے روز ہی معلوم ہو سکتا تھا۔ لیکن ناز کے کچھ بتانے سے پہلے ہی چاچا سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ پیڑ کے نیچے کچھ پریشان سے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ میر نے خود ہی پوچھ لیا۔

"خیریت چاچا۔ آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔"

"بس صاحب۔ اپنے نصیب کو رو رہا ہوں۔"

"کیا بات ہے چاچا۔۔۔ بتائیں شاید میں کچھ مدد کر سکوں۔" میر کو بے چینی ہونے لگی کہ پتا نہیں ایسا کیا ہو گیا۔

"اپنے بیٹے کے ہاتھوں پریشان ہوں صاحب۔ پتا نہیں اس کے سر سے مکان کا بھوت کب نکلے گا۔ خوامخواہ میری معصوم بچی کے پیچھے پڑا ہوا ہے اس غریب کو پاگل بنانے کے لیے ایک جعلی پیر بلا لایا تھا۔ میں بھی اتنے دن یہی سمجھتا رہا کہ ناز پر کوئی سایہ ہو گیا ہے لیکن ابھی شام کو وہ ڈھونگی پیر خود روتا چلاتا واپس آگیا۔ حشمت نے اسے پیسے دیے تھے کہ سب سے کہو ناز پر جن کا سایہ ہے۔"

"پھر تو خوشی کی بات ہے چاچا کہ اصل بات سامنے آگئی۔"

"ہاں صاحب' اس بات پر تو خوش ہوں لیکن حشمت کا کیا کروں۔ کہتا ہے کچھ بھی ہو جائے ناز کو مزار پر بھیجے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا۔ وہ بہت ڈھیٹ ہے میر صاحب۔ آپ ہی بتائیں بچی کو لے کر کہاں جاؤں کل کو میں مر مرا گیا تو یہ خبیث مکان کی خاطر اسے جان سے بھی مار سکتا ہے۔"

"چاچا آپ بیٹی کو کہیں اور نہیں بھیج سکتے۔ میرا مطلب ہے کسی عزیز رشتہ دار کے ہاں۔"

"ہاں صاحب۔۔۔" چاچا جیسے کچھ سوچنے لگے۔

"میرا سالا ساتھ والے گاؤں میں رہتا ہے۔ بے چارا ہے تو غریب آدمی اور بچے بھی بہت سارے ہیں لیکن اپنی ناز سے بہت پیار کرتا ہے۔ ماموں اور مامی کے پاس خوش بھی رہے گی۔" چاچا گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

"تو بس چاچا۔ سوچیں مت اور اللہ کا نام لے کر اسے وہاں چھوڑ آئیں۔ اگر حشمت ایسے ہی الٹے سیدھے پیروں والے ہتھکنڈے اپنا تا رہا تو یقیناً" ناز کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔"

"ہاں صاحب' وہ تو اس بے چاری کو پڑھنے بھی نہیں دیتا۔ وہاں اپنے امتحان کی تیاری تو کر سکے گی۔"

چاچا نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو میر نے گہرا سکون کا سانس لیا۔ بھلے وہ اس سے دور جا رہی تھی لیکن معاملے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ بہت ضروری تھا۔ ناز نے جانے سے پہلے ایک آخری خط لکھا تھا۔

السلام علیکم صاحب

"کل وہ جھوٹا پیر شاید آپ کے بھیجنے پر آیا تھا۔ آپ نے تو بہت بڑی مشکل منٹوں میں حل کر دی۔ آپ کا بہت شکریہ۔ آپ نے بابا کو مشورہ دیا کہ ناز کو ماموں کے گھر بھیجا جائے۔ کل میں وہاں جا رہی ہوں۔ آپ بہت اچھے ہیں' ہمیشہ اپنے سے زیادہ میرے بھلے کا سوچتے ہیں۔ لیکن میرا دل بہت اداس ہے۔ پتا نہیں آپ کے بغیر وہاں دن کیسے گزریں گے۔ یہاں ہوتی تھی تو آپ کے بغیر صرف ہفتہ اور اور اتوار کا دن گزارنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ صاحب میں بہت خوش قسمت ہوں جو آپ میری زندگی میں آئے۔ اماں کے بعد اگر میرا کسی نے بہت خیال رکھا تو وہ آپ ہیں۔ میرا دل کرتا ہے کبھی ہم ساتھ بیٹھ کر بہت ساری باتیں کریں۔ آپ جب بولتے ہیں تو بہت اچھے لگتے ہیں۔ کاش میری زندگی میں ایک دن ایسا ضرور آئے جب میں اور آپ بہت ساری باتیں کریں۔ آپ اپنا بہت خیال رکھنا۔ میں آپ کے لیے بہت دعا کروں گی۔ اللہ آپ کی سب مرادیں پوری کرے۔ آمین۔"

ناز بتول

☼ ☼ ☼

فضا میں سردی کی شدت کافی بڑھ گئی تھی۔ ناز کو دیکھے اسے ملے بہت سارے دن بیت گئے تھے۔ وہ اس دوران تین بار گھر آیا تھا۔ ان دنوں ناز کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی جب سے گئی تھی ایک بار بھی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ پتا نہیں اس کا وقت بھی کیسے کٹ رہا ہو گا۔ وہ نہایت بے دلی سے کتاب ہاتھ میں لیے پیپل کے نیچے آ بیٹھا۔ چاچا کے گھر کے بند دروازے پر نظر پڑی تو ناز کا مسکراتا چہرہ تصور میں در آیا۔ میر کے لب مسکرا اٹھے۔

وہ دیر تک دروازے کو دیکھتا رہا جہاں سے کبھی کبھار وہ اپنا خوبصورت چہرہ سامنے لا کر میر کو محبت بھری نظروں سے دیکھتی تھی۔ میر کو اس کی چمکتی براؤن آنکھیں' پتلی سی ناک میں پڑا چھوٹا سا گہرا سبز لونگ اور بھرے بھرے گہرے کناروں والے ہونٹ اور پتلا سا کتابی چہرہ بہت شدت سے یاد آ رہا تھا۔ وہ بہت کھلے ہوئے رنگ کی تھی لیکن بجائے گلابی سفید کے عجب سنہرا سا رنگ تھا جیسے انگریزی تاریخی فلموں کی شہزادیاں.... لیکن ناز میں ایک خالص دیہاتی رنگ تھا جو اس کی اصل خوبصورتی تھا۔

اس بار وہ گھر آیا تو نیا چیلنج اس کا منتظر تھا۔ ابو نے اس سے ثوبیہ کے بارے میں صاف صاف بات کی' امی بھی اپنی بھتیجی کی تعریفوں کے لقمے دینے کے لیے ساتھ موجود تھیں۔ سائرہ اور شہریار کے رشتے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں بولا گیا شاید جان بوجھ کر اس سے بات چھپائی جا رہی تھی لیکن میر نے خود ہی یہ ٹاپک چھیڑ دیا۔

"میرا خیال ہے پہلے سائرہ کی شادی ہونی چاہیے۔ میرے بارے میں آپ لوگ بعد میں سوچیں۔"

"تم بڑے ہو بیٹا' پہلے تمہاری شادی ہو تو اچھا ہے۔ ویسے بھی سائرہ ابھی پڑھ رہی ہے۔" امی نے بھرپور لگاوٹ کا مظاہرہ کیا تو ابو نے بھی سر ہلا کر تائید کی۔

"لیکن میں نے تو سنا ہے کہ سائرہ اور شہریار کی شادی کی بات بھی چل رہی ہے؟" میر نے صاف بات کرنا مناسب سمجھا۔

"اس سب پر تمہیں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم بس اپنے معاملے پر سوچو اور جلد جواب دو۔" ابا جی نے قدرے سخت لہجہ اپنایا۔

"میرا خیال ہے آپ لوگ فی الحال میری فکر چھوڑیں اور اپنے بھائی سے کہیں کہ رشتوں میں شرطیں نہیں رکھی جاتیں۔ اگر انہیں اپنی بھانجی سے سچی محبت ہے تو اسے اپنی بیٹی کے رشتے سے مشروط نہ کریں۔" وہ مزید وہاں رکا نہیں اور باہر چلا گیا۔ شام کو پھپھو سے ملنے چلا گیا اور انہیں بھی پوری بات تفصیل سے بتا دی۔ انہوں نے تسلی دی تو میر کو کچھ اچھا محسوس ہوا لیکن اس سب کے باوجود گھر والوں کے مطالبے سے فرار کی کوئی راہ اسے سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ اگر عام حالات میں بھی ناز سے شادی کی بات گھر میں کرتا تو خوب فساد برپا ہونا تھا اور اب تو معاملہ سائرہ کا آ گیا تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ امی شہریار سے کسی بھی قیمت پر سائرہ کو بیاہنا چاہتی تھیں اور ان کا بھائی اپنی شرط سے ایک انچ پیچھے ہونے کو تیار نہیں تھا۔ سیدھے لفظوں میں ثوبیہ سے انکار کا مطلب ہمیشہ کے لیے گھر نکالا تھا۔

اسکول میں سردیوں کی آٹھ' دس روز کی چھٹیاں ہوئی تھیں وہ گھر آیا تو ابا جی کے بارے میں پتا چلا کہ وہ دو تین دن کے لیے لاہور گئے ہیں۔ وہ شام کو دوستوں کی طرف نکل گیا۔ دل اگرچہ اداس تھا لیکن کسی طور وقت تو کاٹنا ہی تھا۔ رات کو ٹی وی دیکھ رہا تھا جب موبائل پر ایک ساتھ تین چار مسیج موصول ہوئے۔

"اوہ...." میر نے سخت کوفت سے موبائل دور پھینکا۔

"کیا مصیبت ہے۔ پتا نہیں کون ہے ہو وہ لڑکی تھی پچھلے کافی دنوں سے یہی چل رہا تھا۔ پہلے ایک لڑکی نے لیٹ نائٹ فون کر کے کہا کہ "میں گھر میں اکیلی ہوں' گھبرا رہی ہوں اس لیے پلیز کچھ دیر مجھ سے بات کر لیں۔" میر ایسے ڈرامے اچھی طرح جانتا تھا اس لیے فوراً" کہہ دیا کہ اپنی کسی سہیلی یا کزن وغیرہ سے بات کر لیں میں فارغ نہیں ہوں۔ اسے پتا تھا کہ اگنور کرنے سے ایسے معاملات سے جان چھوٹ جاتی ہے لیکن پتا نہیں اس لڑکی کو کیا تھا باوجود میر کے روکھے رویے کے وہ مسلسل پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ کبھی غزلیں تو کبھی شعر' پتا نہیں کیا کیا بھیجتی رہتی تھی۔ میر پورا مسیج پڑھنے کی زحمت بھی نہیں کرتا تھا۔ اس نے بتی بجھائی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

صبح ناشتے کے بعد وہ باہر نکلنے کی تیاری کر رہا تھا جب اس لڑکی کا فون آ گیا۔ بیل لگاتار بج رہی تھی۔ لیکن میر نے نمبر پہچان کر کال اٹینڈ نہیں کی۔ تین بار جب اس نے ریسیو نہیں کیا تو اس کا مسیج آ گیا۔ میر نے اوپن کیا تو لکھا تھا۔

"میں اس وقت پوسٹ آفس کے پاس اکیلی کھڑی ہوں' کوئی رکشا' ٹیکسی نہیں مل رہی۔ پلیز آپ آ جائیں۔"

"اف...." میر کا دل چاہا اپنے بال نوچ ڈالے' اس نے غصے سے کال ملائی۔

"دیکھو لڑکی' تم جو کوئی بھی ہو۔ میری بلا سے جہنم میں جاؤ میں کہیں نہیں آ رہا۔ دوبارہ مسیج مت کرنا پلیز۔" اس نے غصے سے موبائل بھی وہیں چھوڑ دیا اور باہر نکل گیا۔

چھٹیوں کے تین دن گزر گئے تھے۔ گھر میں سوائے آرام کرنے کے اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ یا پھر وہ کھسکی ہوئی لڑکی جس کے موبائل پیغامات ایک تواتر سے جاری تھے۔ اگلے روز ابا جی آ گئے اور ثوبیہ کا موضوع جو کافی دن سے زیر بحث نہیں آیا تھا پھر سے چھڑ گیا۔ دوپہر کو ابا جی نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ میر کو حیرت ہوئی کہ امی کے ساتھ ساتھ وہاں سائرہ اور نیلم بھی تھیں۔ جیسے اسی کا انتظار ہو رہا ہو۔

"جی ابا جی...." وہ پلنگ کے کنارے پر ٹک گیا اور انہوں نے دوبارہ وہی قصہ شروع کر دیا۔

"دیکھو بیٹا یہ ٹھیک ہے کہ ان کے ماموں نے شہریار کے لیے سائرہ کا رشتہ مانگا ہے لیکن تمہاری ثوبیہ سے شادی کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم تو یہ سوچتے ہیں کہ اچھا ہو گا بہن' بھائی کا ایک ہی گھر میں رشتہ ہو جائے۔ لڑکی بھی بہت اچھی ہے۔"

"ابا جی اگر سائرہ کا رشتہ میرے وہاں شادی کرنے سے مشروط نہیں ہے تو آپ کو مجھے مجبور نہیں کرنا

چاہیے۔"

"لیکن اگر تمہاری ثوبیہ کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ ہو چکی ہے تو تمہیں شادی سے کیوں انکار ہے؟"

"جی۔۔۔؟" میر نے حیرت سے باپ کو دیکھا۔

"کس نے کہا میری ثوبیہ سے کوئی انڈر اسٹینڈنگ ہے؟"

"ارے بیٹا۔۔۔ ہمیں ثوبیہ نے سب بتا دیا ہے' اب ہم سے کیا چھپانا۔" امی ہنسنے لگیں۔

"شرماؤ مت میر ابا کو بتا دو۔" اور میر حیران حیران سا ان کی صورت دیکھنے لگا۔ یہ امی کیا کہہ رہی تھیں اسے کچھ سمجھ نہیں آئی۔ ثوبیہ ایسا کیوں کہنے لگی؟

"میں نے تو کبھی اس سے بات نہیں کی۔ کبھی یہاں آپ لوگوں سے ملنے آجاتی ہے تو بس سلام کر لیتا ہوں اس سے زیادہ تو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"جھوٹ مت بولو میر۔" امی نے لہجہ سخت کیا۔

"وہ کہتی ہے کہ میر اور میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور ہمارے بیچ فون پر لمبی لمبی باتیں ہوتی ہیں۔ مسیج ہوتے ہیں۔"

"مسیج۔۔۔" میر کے پہلی بار کان کھڑے ہوئے۔

"اس کا نمبر کیا ہے؟" میر نے سائرہ کی طرف دیکھا۔

"ارے واہ ہم سے پوچھ رہے ہو۔ اپنا موبائل چیک کرو اسی کے پیغامات سے بھرا پڑا ہے۔" سائرہ نے منہ بنایا اور باہر چلی گئی۔

"دکھاؤ۔۔۔" ابا جی نے ہاتھ بڑھا کر موبائل مانگا تو میر نے بنا کچھ کہے موبائل ان کو دے دیا۔ اس کا دماغ اس وقت گھن چکر بنا ہوا تھا۔ لیکن اتنی تسلی ضرور تھی کہ اس کا دامن صاف تھا۔ البتہ اس بات پر اسے ضرور پچھتاوا ہوا کہ اسے وہ پیغامات اپنے موبائل سے مٹا دینے چاہیے تھے۔ ابا جی ابھی کچھ دیکھ ہی رہے تھے کہ ایک اور مسیج ریسیو ہوا۔ اسے ابا جی نے خود ہی کھولا اور پڑھ کر میر کی طرف بڑھا دیا۔

"اب بھی کہو گے کوئی تعلق نہیں؟"

"میں پارک میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔ آپ کب آئیں گے۔"

"دیکھیں ابا جی۔۔۔ یہ لڑکی بہت دن سے مجھے پریشان کر رہی ہے۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا یہ کون ہے اور نہ مجھے جاننے میں کوئی دلچسپی تھی' آپ لوگ ہی بتا رہے ہیں کہ یہ ثوبیہ ہے۔ میں نے اسے کبھی بڑھاوا نہیں دیا' کبھی کسی مسیج کا جواب نہیں دیا۔ آپ خود چیک کر لیں۔" میر نے موبائل دوبارہ ان کی طرف بڑھایا۔

"اب تم اتنے بھی بھولے نہیں کہ اپنے جوابات بھی محفوظ رکھو گے؟" امی نے لقمہ دے کر ابا جی کو خود ہی جواز فراہم کر دیا۔ میر بنا کچھ کہے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب مزید انکار کی تمہارے پاس کوئی گنجائش نہیں نکلتی میر۔۔۔ اگر تم ایک معصوم لڑکی کے ساتھ محض وقت گزاری کر لو میں جلد ہی انہیں نکاح یا شادی کی تاریخ دینے والا ہوں۔" ابا جی نے اپنا فیصلہ سنا کر گویا اسے چلے جانے کی اجازت دی اور وہ بھی بنا کچھ کہے اپنے کمرے میں آگیا۔ برآمدے میں سائرہ فون پر بزی نظر آئی تھی اور میر کو دیکھ کر خاموش بھی ہو گئی جس سے میر کو شک ہی نہیں بلکہ یقین ہو گیا کہ آخری مسیج کے آنے میں اسی کا ہاتھ تھا۔

میر سمجھ گیا کہ اس کے خلاف یہ سازش کیوں بنائی گئی تھی۔ یقیناً" ان سب کا یہی خیال تھا کہ میر موبائل پر بننے والے تعلق کے چکر میں آسانی سے پھنس جائے گا جیسا کہ عموماً" ایسے معاملات میں ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں یقیناً" میر ایک دن خود ان سے کہتا کہ وہ ثوبیہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن میر کی قسمت اچھی تھی کہ ایسا ہو نہیں سکا اور نہ وہ آگے مزید اس سازش کا شکار ہونا چاہتا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ابا کو اس کی بات پر یقین نہیں تھا۔

"او۔۔۔" میر نے اپنا سر ہاتھوں پہ گرایا اور ڈھیلا سا چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"پتا نہیں یہ کیا ہو رہا ہے۔ سب کچھ خلاف توقع پیش آ رہا تھا۔ جیسے ستارے اچانک گردش میں آجائیں۔" موبائل کی گھنٹی بجی تو میر نے نہایت بے دلی سے فون اٹینڈ کیا لیکن آگے کوئی اور نہیں بلکہ ناز اس سے مخاطب تھی۔

"ناز۔۔۔" میر نے جیسے اندر تک سکون اترتا محسوس کیا' پہلی بار ایک احساس جاگا کہ ابھی وہ اتنا اکیلا بھی نہیں ہے کہ جینے کی امنگ ہی چھوڑ دے "کیسی ہو ناز۔۔۔؟"

"میں ٹھیک ہوں۔۔۔ لیکن آپ۔" وہ کہتے کہتے رکی تو میر ہنسا۔

"اچھا تو اب تم میرا لہجہ بھی پہچاننے لگی ہو۔ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے کہ تم بنا بتائے میرے دل کی بات سمجھ لو۔"

"میں تو ہمیشہ ہی آپ کے دل کی بات سمجھ جاتی ہوں لیکن کبھی بتائی نہیں۔" وہ بھی شرارت سے ہنسی

"جیسے کب۔۔۔؟" میر کے دل سے جیسے کوئی دھند چھٹنے لگی تھی لہجہ خود بخود شوخ ہو گیا۔

"جیسے۔" وہ سوچنے کے لیے رکی۔

"جیسے پہلی بار جب آپ نے میرا ہاتھ اپنے دل پر رکھا ہوا تھا اور پھر نروس ہو کے ایسے بھاگے کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور جب رجب کی شادی سے واپس آ رہے تھے تو سارا راستہ بنا کچھ کہے آپ نے مجھ سے جتنی باتیں کیں وہ سب مجھے سمجھ آ رہی تھیں۔۔۔ اور چھٹیوں میں جب میرے بلانے پر گاؤں آئے تھے اور پھر جان بوجھ کر رات کو یہیں رک گئے تھے۔۔۔" اس نے "جان بوجھ" پر خصوصی زور دیا تو میر کا قہقہہ بلند ہوا۔

"بس بس۔۔۔ تم تو واقعی بہت کچھ جانتی ہو۔ اب اور نہ شرمندہ کرو اور یہ بتاؤ اتنے عرصے بعد کہاں سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔"

"یہ ماموں کا موبائل ہے۔ ابھی بابا کا فون آیا تھا۔ ان سے بات کرتے کرتے دور نکل آئی اور سوچا آپ سے بات کر لوں۔ ابھی تو ماموں بھی باہر چلے گئے ہیں۔"

"اچھا تم بند کرو۔ میں کال کرتا ہوں۔" میر نے خود ہی کال کاٹ کر دوبارہ نمبر ملایا۔

"ہاں جی تو اور سناؤ' بابا سے کیا باتیں ہوئیں؟"

"وہ جی۔۔۔ اصل میں بابا ہسپتال میں ہیں۔ آپ کے شہر میں؟"

"خیریت کیا ہوا چاچا کو؟"

"بابا کو کالا یرقان ہو گیا تھا۔ لالے سے کہتے رہے کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ لیکن وہ گاؤں کے حکیم سے دوائی لاتے رہے۔ مجھے پتا چلا تو میں نے ماموں کو بھیجا۔ وہی پرسوں بابا کو داخل کروا آئے تھے۔ پرسوں شہر آنے پر ہی بیماری کا پتا چلا۔"

"اوہ یہ تو بہت بری خبر ہے۔ تم بھی اب بتا رہی ہو۔ سرکاری ہسپتال میں ہیں کیا؟"

"جی ہاں۔۔۔"

"اچھا میں ابھی ان کے پاس جاتا ہوں اور آگے کے لیے بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ میں ان کی پوری دیکھ بھال کروں گا۔" میر نے فون بند کیا اور اسی وقت ہسپتال کے لیے نکل گیا۔ چاچا کا بیڈ جنرل وارڈ میں لگا تھا۔ کافی کمزور اور اداس لگ رہے تھے۔ میر کو دیکھ کر البتہ خوش بھی ہوئے اور حیران بھی میر نے اپنے وہاں آنے کا یہ جواز بتایا کہ وہ کسی دوست سے ملنے آیا تھا اور اتفاقاً" انہیں دیکھ لیا۔ کیونکہ ناز کے فون کا وہ چاچا کو نہیں بتا سکتا تھا۔ جنرل وارڈ کا ماحول تو ہرگز صحت بخش نہیں تھا۔ میر نے فوری طور پر ان کے لیے اسپیشل وارڈ کا بندوبست کیا۔

"کیوں تکلیف اٹھاتے ہو بیٹا میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔"

"اگر جلد از جلد ٹھیک ہو کر گھر جانا چاہتے ہیں تو چپ چاپ میری بات ماننا ہو گی۔ آپ بس زیادہ نہ سوچیں۔" میر نے ان کی ایک نہیں سنی اور اسی شام وہ اسپیشل وارڈ میں شفٹ ہو گئے۔

میر اگلی صبح ان کے لیے کچھ ضروری سامان اور پھل وغیرہ لے کر آیا تو وہ اٹھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔

"طبیعت کیسی ہے چاچا۔۔۔ رات تو ٹھیک گزری؟"

”ہاں صاحب..... یہاں تو اتنا سکون ہے۔ مجھے لگ رہا ہے آدھی بیمار رخصت ہو گئی۔ آپ کی بڑی مہربانی ہے صاحب۔“ چاچا جذباتی ہونے لگے تھے۔ میر نے ان کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

”کیسی غیروں والی باتیں کرتے ہیں چاچا..... کچھ کہنے کی ضرورت نہیں بس دعا دیا کریں۔“

”آج کل تو اپنے بھی اتنا خیال نہیں رکھتے صاحب۔“

”تو آپ سمجھ لیں کہ میری بھی کوئی غرض ہو گی۔“ میر نے ہنس کر کہا تو چاچا بھی مسکرانے لگے۔

”نہیں صاحب ایسا میں کیسے سوچ سکتا ہوں۔“

اسکول کھلنے میں دو روز باقی تھے۔ میر اس شام چاچا سے ملنے آیا تو وہ کافی خاموش اور بجھے بجھے سے لگے۔

”کیا بات ہے چاچا طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”لگتا تو ہے کہ بہتر ہو رہی ہے۔“

”آپ شاید یہاں الگ کمرے میں بور ہو جاتے ہیں۔ وہاں جنرل وارڈ میں کافی رونق لگی رہتی تھی۔“

”نہیں صاحب..... وہاں تو سونے کے لیے بھی ترس جاتا تھا۔ آپ نے اتنی مہربانی کی۔ جانے کتنا خرچہ اٹھ گیا ہو گا۔ بس دن رات یہی دعا کرتا ہوں کہ جلدی یہاں سے فارغ ہو جاؤں۔“

”ہاں صحت کی دعا ضرور مانگا کریں، لیکن اس لیے نہیں کہ میرا خرچہ ہو رہا ہے۔ اچھا حشمت یا کوئی اور ملنے والا بھی آیا تھا۔“ میر نے موضوع بدلا لیکن چاچا نے نہایت افسردگی سے آہ بھری۔

”نہیں صاحب۔ وہ کیوں پوچھنے آئے گا اس کے خیال میں تو اب میری عمر ہی بستر پر پڑنے کی ہے۔ ہسپتال آنے کو وہ میرے چونچلے سمجھ رہا تھا۔ وہ تو ناز نے خادم حسین کو بھیجا' صاحب سوچتا ہوں ایک طرح۔ ، حشمت کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔ آج نہیں تو کل..... جانے کا وقت تو اب قریب ہے۔ لیکن اپنی فکر کسے ہے۔ مجھے تو اپنی بیٹی کا خیال آتا ہے۔ میرے بعد تو ایک دن بھی حشمت اسے خادم حسین کے گھر رہنے نہیں دے گا۔ خادم بتا رہا تھا بار بار فون کر کے دھمکیاں دیتا ہے کہ کسی بھی وقت آ کر اپنی بہن کو واپس لے جائے گا یا مزار پر بٹھائے گا یا جان سے مار دے گا' بر

”چاچا آپ کے ذہن پر زیادہ زور دینا اچھا نہیں ہے۔“ میر نے اپنی تشویش دبا کر انہیں تسلی دی۔

”سوچوں سے نجات نہیں مل سکتی صاحب..... بس یہی فیصلہ کیے بیٹھا ہوں کہ آج خادم حسین آئے اس کے ذمے ناز کی شادی کا کام لگاؤں۔ وہ اپنے گاؤں میں کوئی اچھا شریف لڑکا دیکھ کر اس کو بیاہ دے تو میں سکون سے مر سکوں گا۔ جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی حشمت چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔“ چاچا جیسے اپنے آپ سے باتیں کیے جا رہے تھے اور میر پرسوچ انداز میں لب چبا رہا تھا بات تو چاچا کی بلاشک و شبہ درست تھی۔ ناز جن حالات کا شکار تھی ان میں شادی ہی سب سے مناسب حل تھا۔ اس کی کہیں شادی ہو جاتی تو حشمت اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

”کب آنا ہے خادم حسین نے.....“ میر سوچوں سے باہر آیا۔

”شہر تو پہنچ چکا ہے۔ ٹرک چلاتا ہے۔ یہاں سے سامان دوسری جگہوں پر لے جاتا ہے۔ ابھی سامان لوڈ کروا رہا ہو گا۔ پھر فارغ ہو کر مجھ سے ملنے آئے گا۔“

”چاچا اگر.....“ میر نے بڑی مشکل سے ہمت مجتمع کر کے کہنا شروع کیا۔

”اگر..... آپ مجھے کسی قابل سمجھتے ہیں تو میں ناز سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میر صاحب۔ کیوں اتنی بڑی بات کر کے مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ ہماری ہمدردی کے چکر میں اپنی زندگی تباہ نہ کریں۔ پہلے ہی آپ کے اتنے احسانات ہیں۔“

”احسان کی بات نہ کریں چاچا..... اور نہ ہی زندگی تباہ ہو گی کیونکہ جتنا تباہ حال اب ہوں تو شاید اس اقدام سے تھوڑی زندگی سنور جائے مجھے تو خود سہارا چاہیے۔ چاہے تو اسے میری خود غرضی سمجھ لیں لیکن میں اس وقت واقعی بہت اکیلا ہوں۔“

”یہ تو آپ کا بڑا پن ہے صاحب جو آپ ایسا کہہ رہے ہیں۔ باقی میری کیا مجال جو آپ کے لیے انکار کروں مجھے سوائے ناز کے کسی سے مشورہ کرنا ہے اور نہ پوچھنے کی ضرورت ہے۔“

”میں اپنے گھر والوں سے ناراض ہو کر آیا ہوں اس لیے پہلے بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان میں سے کوئی شادی میں شریک نہیں ہو گا آگے آپ کی مرضی آپ کا فیصلہ آخری ہو گا۔“

صاحب' جس طرح میں ناز کے سگے بھائی کو شادی میں نہیں بلا سکتا' آپ بھی اپنی مجبوریوں کو بہتر سمجھتے ہیں' اللہ کی یہی رضا ہے تو بسم اللہ کریں.....' چاچا نے اتنا ہی کہا تھا کہ خادم حسین اندر داخل ہوا۔ میر سے مصافحہ کر کے اس نے چاچا کی طبیعت پوچھی۔ میر نے دونوں سے تھوڑی دیر کی اجازت مانگی اور کمرے سے چلا گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ چاچا آرام سے خادم حسین سے مشورہ کر لیں۔ جب وہ واپس آیا تو چاچا' خادم حسین سے بات کر چکے تھے۔ وہ انہیں مشورہ دے رہا تھا کہ حشمت تک کسی صورت بات نہیں پہنچنی چاہیے اور جو بھی کرنا ہے جلد کیا جائے۔

”آئیں صاحب' آپ کا کیا کہنا ہے۔“ چاچا نے اپنے قریب میر کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔

”جی ہاں' میرا بھی یہی خیال ہے لیکن کب اور کہاں کا فیصلہ آپ لوگ بہتر کر سکتے ہیں۔“

”مجھے تو صبح سات بجے سامان لے کر نکلنا ہو گا۔ آپ یہاں آجائیں تو لالے سے مل کر نکل جائیں گے۔“ خادم ماموں نے چاچا کی طرف اشارہ کیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں صبح چھ سے سات کے درمیان یہاں پہنچ جاؤں گا۔“

حالات کی پیچیدگی کبھی محبت کی الجھی گرہوں کو ایسے بھی سلجھاتی ہے۔ اس نے آج صبح سے پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ جن حالات کو وہ ستاروں کی گردش سمجھ رہا تھا ان حالات نے تو نصیب ہی جگا لیے تھے میر نے فیصلہ کر لینے کے بعد اس دل میں جہاں ایک طرف اطمینان محسوس کیا تھا وہیں زندگی کے اتنے بڑے فیصلے پر ابا جی کی لاعلمی پر عجیب سا بوجھ بھی محسوس کیا لیکن جس قسم کے حالات سے وہ دوچار تھا ابا جی کو بتانا ممکن نہیں تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے میر نے پھپھو کا نمبر ملایا اور انہیں ساری سچویشن بتائی فوری طور پر وہ بھی بالکل خاموش ہو گئیں' لیکن پھر نا صرف اجازت دے دی بلکہ ڈھیر ساری دعاؤں سے بھی نوازا میر نے کسی حد تک سکون محسوس کیا اور مارکیٹ کا رخ کیا۔ وقت اگرچہ بہت کم اور تقریب نہایت سادہ بلکہ ایمرجنسی جیسی تھی لیکن بہرحال سچویشن اتنی ٹف بھی نہیں تھی کہ وہ خالی ہاتھ چل پڑتا۔ اس نے ناز کے لیے دو ریڈی میڈ سوٹ اور چھوٹا موٹا ضروری سامان جو پسند آتا گیا لے لیا۔ گھر آ کر اس نے چھوٹا سا بیگ تیار کیا کیونکہ آگے ایک ہفتے کے لیے اسکول بھی جانا تھا۔ سونے سے پہلے صرف نیلم کو بلا کر بتایا کہ پرسوں کے بجائے وہ کل ہی کسی ارجنٹ کام کی وجہ سے اسکول چلا جائے گا۔

آٹھ بجے وہ ناز کے ماموں کے ساتھ ان کے گاؤں پہنچا۔ وہ اسے ایک چھوٹے اور سادہ سے گھر میں لے آئے بیٹھک نما اس کمرے کا ایک دروازہ باہر گلی میں اور ایک اندر گھر میں کھلتا تھا۔ جہاں میر کو بٹھایا گیا۔ خادم ماموں چند منٹ کے لیے اندر گئے اور پھر واپس آ گئے۔

”صاحب۔ مجھے ایک ضروری کام کے لیے نزدیک ایک جگہ جانا ہے۔ آدھے گھنٹے تک واپسی ہو گی۔ ناشتے کا میں نے کہہ دیا ہے۔ بس ناز سے بات کرنا باقی ہے۔ اس کے بعد ہی نکاح کا بندوبست ہو سکے گا۔“

”اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو..... میں خود ناز سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ میر نے سنبھل کر مدعا بیان کیا۔

”کیوں نہیں صاحب..... آپ پڑھے لکھے ہیں۔ بات کا ڈھنگ ہم سے زیادہ جانتے ہیں اور ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ وہ راضی ہو جائے۔ میں اس کی مامی سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ ناز کے ہاتھ ناشتا بھجوا دے گی۔ تب آپ اس سے بات کر لیں۔“

"بہت شکریہ۔۔۔ لیکن آپ سے ایک درخواست ہے کہ صاحب کے بجائے مجھے بیٹا کہا کریں۔"

"ٹھیک ہے صاحب۔" انہوں نے بے ساختہ کہا اور ساتھ ہی ہنس دیے۔ میر نے بھی ہنس کر سرہلایا۔ ماموں اس سے اجازت لے کر چلے گئے۔ میر کو بیٹھے قریب پندرہ منٹ ہوئے جب دروازے کا پردہ ہٹا اور ناز ناشتے کی ٹرے لیے اندر آئی۔۔۔ حقیقی حسن واقعی کسی زیور کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ اس وقت ہلکے فیروزی رنگ کے سادہ سے سوٹ میں تھی۔ بالوں کی دور تک نکالی سیدھی مانگ کے ساتھ کھینچ کر باندھی لمبی چوٹی اور بڑی بڑی براؤن آنکھوں میں گہری کالی کاجل کی لکیر لگائے وہ سیدھی دل میں اتری جارہی تھی میر اس کے چہرے پر پھیلی واضح گھبراہٹ کی پروا کیے بنا تسلی سے اسے دیکھتا رہا۔

"السلام علیکم۔" وہ دو قدم چل کر آگے آئی۔

"وعلیکم السلام کیسی ہو ناز؟" میر پوری طرح اسے تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔ اس لیے انداز خاصا معصوم رکھا۔

"آ۔۔۔ آپ یہاں کیسے آئے؟" اس نے بنا نظر اٹھائے سوال کیا۔

"خادم ماموں کے ٹرک پر۔۔۔" میر نے بمشکل مسکراہٹ ضبط کی۔

"بابا کو پتا ہے آپ کے آنے کا۔۔۔ اور ماموں سے کیا بہانہ بنایا؟" اس کی سوئی میر کی یہاں موجودگی پر اٹکی تھی۔

"اچھا تو میں بہانے بناتا ہوں؟" میر اٹھ کر اس کے قریب آیا۔

"کیا سچ بول کر نہیں آسکتا۔۔۔؟"

"سچ۔۔۔؟" ناز نے آنکھیں پھیلائیں۔ "کون سا سچ۔۔۔؟"

"وہی جو میرے اور تمہارے بیچ ہے۔" میر نے آرام سے سینے پہ ہاتھ باندھے اور دیوار سے ٹیک لگالی۔

"بتائیں نا کیا کہہ دیا۔۔۔ کیسے سب نے یہاں آنے دیا؟" ناز کی پریشانی بڑھتی ہی جارہی تھی۔

"پہلے کچھ کھا پی تو لوں پھر آرام سے بتاتا ہوں۔" میر نے اس سے ٹرے لینا چاہی اس نے فوراً ہاتھ پیچھے کیے۔

"نہیں پہلے بتائیں۔" اس نے گھور کر کہا تو میر ہنس دیا۔

"اچھا بابا ٹھیک ہے۔۔۔ لاؤ اسے یہاں رکھ دو۔" میر نے ٹرے چھوٹی میز پہ رکھی اور اسے شانوں سے پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا کیا۔۔۔

"بات ذرا سیریس ہے ناز و حوصلے سے سننا۔" میر نے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"دراصل۔ تمہارے بابا اور ماموں نے یہ طے کیا ہے کہ حشمت کے عزائم کو فیل کرنے کے لیے جلد از جلد تمہاری شادی کہیں کردی جائے۔ تمہارے ماموں نے یہاں اپنے جاننے والوں میں کچھ اچھے رشتے دیکھے ہیں۔ چاچا کی طبیعت تو ابھی ایسی نہیں تھی کہ وہ خود آتے۔ میں نے کہا میں چلا جاتا ہوں۔ سوچا تمہیں سمجھانا بھی تو ہے۔۔۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا۔" میر نے ذرا اٹک اٹک کر بات مکمل کی تو ناز نتھنے پھلا کر پیچھے ہوئی۔

"جی ہاں۔۔۔ اچھی طرح سمجھ رہی ہوں کہ آپ نے اتنی دور تک آنے کی تکلیف کیوں کی۔"

"ارے بات تو سنو۔۔۔ تم تو غصہ ہو گئیں۔ بھئی ہمیں مجبوراً "یہ فیصلہ کرنا پڑا۔"

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے کسی سے شادی نہیں کرنی۔ جائیں آپ۔" وہ باقاعدہ رونے لگی۔

"لیکن کبھی نہ کبھی تو کرنی پڑے گی۔۔۔ کسی سے کرلو۔" میر نے مزید چڑایا۔

"نہیں۔۔۔ کبھی نہیں کسی سے نہیں۔" وہ غصے سے سرخ ہو رہی تھی۔

"مجھ سے بھی نہیں۔۔۔" میر نے مسکرا کر کہا تو پہلی بار اس نے سوچنے والے انداز میں نظریں اٹھائیں۔

"بہت بری ہو قسم سے۔۔۔" میر اس کے نزدیک آیا اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔

"جس جملے کو سننے کی خاطر اتنی دور تک آیا وہ تو تم نے بولا نہیں۔۔۔ لگتا ہے تمہارے فیصلے سے چاچا کو آگاہ کرنا ہی پڑے گا۔" میر نے لہجے کو ازحد افسردہ بنایا۔

"کون سا فیصلہ۔۔۔؟" ناز سمجھ چکی تھی۔ اس لیے انداز بھی کچھ کچھ شرمایا ہوا سا تھا۔

"وہی۔۔۔ کسی سے شادی نہ کرنے والا۔" میر نے مایوسی سے کندھے اچکائے۔

"تو میں بھی کہہ دوں گی' صاحب جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں نے تو ان کو کوئی اور ہی فیصلہ سنایا تھا۔ انہوں نے خود ہی بدل دیا۔" وہ اب مسکرا رہی تھی۔

"تب تو چاچا پوچھیں گے کہ۔۔۔ وہ "کوئی اور فیصلہ" کیا تھا۔" میر نے ایک شوخ نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔

"وہ تو میں انہی کو بتاؤں گی؟"

"ارے یہ غضب نہ کرنا۔۔۔ ان کو بتانے بیٹھیں تو بہت لیٹ ہو جائیں گے اور تمہارے ماموں تو نکاح خوان کو بلانے گئے ہیں۔"

"نکاح خوان۔۔۔ ابھی؟" ناز نئے سرے سے حیرت میں مبتلا ہو گئی۔

"جی جناب۔۔۔ آج ہمارا نکاح ہے؟"

"مجھے تو کسی نے نہیں بتایا' اتنی جلدی کیوں؟" ناز نے بے یقینی سے میر کا چہرہ دیکھا تو میر نے اسے چاچا سے ملنے کے بعد کا سارا احوال بتا دیا۔

"اور ہاں۔۔۔ یہ تھوڑی سی شاپنگ بھی کی تھی تمہارے لیے۔۔۔ اور یہ موبائل اور سم لایا ہوں۔ اب میں آرام سے پورے حق کے ساتھ اپنی بیوی سے باتیں کیا کروں گا۔ ان شاء اللہ اور اب تم مامی کے پاس جاؤ۔ وہ بے چاری کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔ انہیں اپنی رضامندی کے بارے میں بتا دو۔"

عصر کی نماز کے بعد نکاح کا وقت رکھا گیا۔ خادم ماموں اسے اپنے ساتھ قریبی مسجد لے گئے۔ جہاں ان دونوں کے علاوہ پانچ افراد اور موجود تھے۔ مولوی صاحب کچھ دیر کے لیے خادم حسین کے ساتھ اندر گھر میں گئے۔ ناز سے اس کی مرضی جان لینے کے بعد باقاعدہ نکاح پڑھوایا گیا۔ سب نے اسے مبارک باد دی' خادم حسین نے مٹھائی بانٹی۔ کچھ دیر بعد جب سب رخصت ہو گئے تو ماموں اسے لے کر گھر واپس آگئے۔ وہ بیٹھک میں تھا جب پہلی بار ناز کی ممانی اس سے ملنے آئیں۔ سر پر ہاتھ رکھ کر مبارک دی اور منہ بھی میٹھا کرایا۔

"ماموں اب میں بھی جاؤں گا۔ کچھ دیر میں تو شام بھی ہو جائے گی۔"

"کیوں بیٹا۔۔۔ اسکول تو کل کھلے گا۔۔۔ اور ادھر سے تو ایک گھنٹہ بھی نہیں لگتا اور بندہ پہنچ جاتا ہے۔۔۔ پھر اسکول کی چابی بھی حشمت کے پاس ہو گی۔ خوامخواہ سب سوال کریں گے کہ شام کو کیسے آتا ہوں۔"

"جی ہاں بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔ لیکن" میر کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

آج آرام کریں' میں نے خود کل صبح ٹرک لے کر کوہاٹ نکلنا ہے۔ آپ کو راستے میں چھوڑ سکتا ہوں۔"

خادم حسین نے اصرار کیا تو اس بار میر نے بھی سر ہلا دیا۔ ماموں چلے گئے تو وقت گزارنے کے لیے میر نے اپنی کتاب نکال لی لیکن اس میں ناز کا چہرہ نظر آیا تو میر نے مسکراتے ہوئے کتاب بند کی اور وہاں سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آگیا۔ ایک پٹ ہٹایا تو سامنے نظر ماموں کے صحن میں کھلے پنک اور سرخ گلابوں پر پڑی۔ میر کے لب مسکرا اٹھے دروازے پر آہٹ ہوئی تو میر چونک کر پلٹا۔

"ارے تم۔۔۔" ناز کی آمد بالکل ہی غیر متوقع تھی۔ میر نے نکاح کے بعد اس سے ملنے کی امید باندھی ہی نہیں تھی۔ کیونکہ یہ بات' ہسپتال میں خادم ماموں کے سامنے ہی طے پا گئی تھی کہ جب تک حالات رخصتی کے حق میں نہیں ہو جاتے ناز ان کے پاس ہی رہے گی۔ اس لیے جب تک رخصتی نہ ہو جاتی میر کا ناز سے ملنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"وہ۔۔۔ ماموں گھر پر نہیں تھے تو مامی نے کہا آپ

سے مل آؤں۔" ناز کی سنہری رنگت مارے شرم کے سرخ ہو رہی تھی۔

"زہے نصیب..." میر مسکرا کر آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ تھام کر اپنے سامنے چارپائی پر بٹھا دیا۔ اپنے لیے بھی قریب پڑی کرسی کھینچی اور ناز کے سامنے بیٹھ گیا۔ ناز وہی میرون سوٹ پہنے ہوئے تھی جو میر لایا تھا۔ آنکھوں میں کاجل کی لکیر اور ہونٹوں پر لپ اسٹک سجائے وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

"تیار ہونے کو مامی نے کہا تھا؟" میر نے سوال کیا تو ناز نے شرما کر سر ہلایا۔

"آج تم واقعی دلہن لگ رہی ہو۔ لیکن افسوس میں اپنی دلہن کو ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"

"آپ کے گھر والوں کو معلوم ہے کہ..."

"نہیں۔ میں نے سوائے اپنی پھپھو کے کسی کو نہیں بتایا لیکن تم فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ بس دعا کرتی رہنا کہ حالات جلد ہمارے حق میں ہو جائیں اور ہم ساتھ رہیں۔ اللہ تمہاری دعائیں ویسے بھی جلدی سنتا ہے دیکھو ناں تم نے اس دن خط میں لکھا کہ ہم دونوں کبھی بہت ساری باتیں کریں اور آج ہم آمنے سامنے بیٹھے ہیں لگتا ہے شادی کی دعا بھی چپکے چپکے مانگا کرتی تھیں" میر نے ہنس کر چھیڑا تو ناز مسکرانے لگی۔

"جی ہاں۔ دعا تو مانگی تھی، لیکن یہ نہیں سوچا تھا شادی ان حالات میں ہو گی۔" وہ سیریس ہو گئی۔

"ہمیں تو شکر کرنا چاہیے۔ بتاؤ اگر حالات ایسے نہ ہو جاتے تو ہم اتنے جلدی ایک ہو سکتے تھے۔"

"لیکن مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ پہلے مجھے صرف اپنا ڈر تھا۔ اب یہ فکر بھی لگی رہے گی کہ اگر لالہ کو پتا چل گیا تو خدانا خواستہ وہ آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ آپ تو رہتے بھی وہیں ہیں۔" ناز کی آنکھیں اندیشوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے بے ساختہ میر کا ہاتھ بھی تھام لیا تھا۔ میر نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔

"سب سے بڑا ڈر تمہیں کھونے کا تھا۔ آج [illegible] میری ہو گئیں... باقی سب ڈر بھی بے معنی ہو گئے [illegible] تم بھی ہر وہم دل سے نکال کر آنے والے وقت [illegible] اچھے اچھے سپنے دیکھا کرو۔ وہ وقت جو بہت جلد ہمارا [illegible] ہو گا۔" میر نے ہاتھوں سے اس کا چہرہ اوپر کیا۔ لیکن [illegible] سے نظر نہیں اٹھائی گئی۔ آنکھیں معلوم نہیں کیوں بھر آئی تھیں۔ میر کی ہتھیلی پر چند آنسو گرے تو اس نے ناز کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

"مجھے خوش ہونے سے بھی ڈر لگتا ہے صاحب... جیسے ابھی یہ خواب ٹوٹ جائے گا۔ آپ صبح چلے جائیں گے اور میں ایک ایک لمحہ خوفزدہ ہوتی رہوں [illegible]"

وہ ابھی بھی رو رہی تھی، میر بھی سمجھ رہا تھا کہ نا[illegible] کے خدشے بے جا نہیں ہیں لیکن وہ جان بوجھ کر اس [illegible] بحث سے گریز کر رہا تھا۔ وہ اپنی طرف سے کچھ بول کر اس کے ڈر کو بڑھاوا نہیں دینا چاہتا تھا۔

"چلو بس۔ اب رونا بند کرو اور جاؤ شاباش، کہیں ماموں واپس آ گئے تو اچھی بات نہیں ہے۔" میر نے پیار سے اس کا گال تھپتھپایا تو ناز آنکھیں صاف کر کے مسکرا دی۔

✡ ✡ ✡

رحمان چاچا ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر آ گئے تھے لیکن فی الحال گھر پر آرام کر رہے تھے۔ میر روزانہ شا[م] کو ان کی خیریت دریافت کرنے جاتا۔ ناز سے بھی فو[ن] پر بات ہو جاتی تھی۔ اس کا ایک ہی اصرار تھا کہ [وہ] واپس آنا چاہتی ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں بابا [کا] یہاں کوئی خیال رکھنے والا نہیں تھا۔ میر تو مان بھی [گیا] لیکن چاچا ناز کو واپس بلانے سے ڈر رہے تھے۔ انہیں حشمت پر ذرہ برابر بھروسا نہیں تھا۔

"لیکن چاچا۔ اگلے مہینے ناز کے سالانہ امتحان ہیں [اور] پھر تو اسے یہاں آنا ہی ہے۔ تو اب بلانے میں کیا حرج ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس کے آنے سے آپ کی طبیعت جلدی بہتر ہو گی۔"

"اچھا صاحب دیکھتا ہوں۔ بس ذرا اس کے امتحا[ن] اور نزدیک آ جائیں پھر بلائیں گے۔" چاچا نے بالآخر ہامی بھر لی۔

گھر میں وہی مستقل سرد مہری کا ماحول تھا جیسے سب نے ٹھان لی تھی کہ میر ثوبیہ سے شادی کرے گا تو اس گھر میں قابل قبول ہو گا۔ ابا جی بھی ناراض ناراض سے رہتے تھے۔ میر نے الگ گھر کے لیے کچھ دوستوں کے ذمے کام لگایا ہوا تھا، اس بار گھر واپس آیا تو اسی کام میں مصروف رہا۔ اس کا ارادہ باپ سے ناراض ہو کر جانے کا نہیں تھا نہ ہی اس نے ایسا امپریشن دیا۔ جب اسے ایک گھر پسند آ گیا تو ابا جی سے کہا کہ "چند دوست مل کر اسٹڈی کی خاطر الگ گھر لے رہے ہیں۔ وہ بھی کچھ دن کے لیے وہاں شفٹ ہو رہا ہے۔" ویسے بھی فی الحال وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ الگ گھر کا تجربہ اس کے لیے بہتر رہتا بھی ہے یا نہیں اور یوں وہ چھوٹے سے نئے گھر میں آ گیا۔ میر نے جب ناز کو بتایا تو بجائے خوش ہونے کے وہ پریشان ہو گئی۔

"آپ اپنے اسکول والوں میں سے کسی کو الگ رہنے کا مت بتائیں۔"

"کیوں... خیر تو ہے نا، اس سے کیا ہو گا؟"

"وہ... میں نہیں چاہتی کہ لالہ کو آپ کے الگ رہنے کا پتا چلے۔ مجھے بابا نے بتایا ہے کہ جس جعلی پیر کو آپ نے پیسے دے کر لالہ کی اصلیت بتانے کا کہا تھا اس نے لالہ کو آپ کے بارے میں بتا دیا ہے۔ لالہ کل آپ کے پرنسپل سے بھی ملے تھے۔"

"اوہ..." میر کو اس اچانک اطلاع نے فوری طور پر ڈسٹرب کر دیا۔

"اچھا تم پریشان مت ہو۔ میں سنبھال لوں گا۔ تم اپنی پڑھائی پر دھیان دو۔ میں نے سنا ہے ڈیٹ شیٹ آ گئی ہے۔"

"جی ہاں پڑھائی تو کر رہی ہوں اور پرسوں ماموں کے ساتھ واپس گھر بھی آ رہی ہوں؟"

"اچھا...؟" میر نے اس کی آمد کا سن کر خوشگوار حیرت محسوس کی۔

"چلو دیکھتے ہیں۔ جدائی نے تمہیں کتنا کمزور کیا ہے۔"

"کمزور تو ہو گئی تھی، لیکن پرسوں آنے کی خوشی نے دوبارہ وزن بڑھا دیا ہے۔" ناز کے بے ساختہ جواب پر میر نے قہقہہ لگایا۔

"ہاں ہاں۔ اب بہانے بناؤ۔ اچھا ٹھیک ہے۔ اب رکھتا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔"

پرنسپل صاحب نے اسے اگلے روز بلا لیا۔ لیکن گفتگو کافی اچھے ماحول میں ہوئی، وہ صرف جاننا چاہتے تھے کہ حشمت نے اس کے خلاف ایسی شکایت کیوں لگائی تھی۔ انہی کی زبانی پتا چلا تھا کہ حشمت نے کہا میر صاحب ان کے گھریلو معاملات میں دخل اندازی کر رہا ہے۔ میر نے جواباً اتنا کہا کہ حشمت کی شکایتوں کا وہ فی الحال کھل کر جواب نہیں دے سکتا البتہ رحمان چاچا اس معاملے میں انہیں صحیح جواب دے سکتے ہیں کیونکہ رحمان چاچا کو میر سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میر کی بات پر پرنسپل صاحب نے تائید کے انداز میں سر ہلایا۔

"ہاں حشمت کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ کیسے مزاج کا آدمی ہے۔ میرا بھی یہی خیال تھا کہ جب رحمان نے تمہارے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں کی تو حشمت کی شکایت کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور رحمان تو تمہاری بہت تعریف کرتا ہے۔ میں صرف تمہارے علم میں لانا چاہتا تھا میر... اور کوئی بات نہیں ہے۔" پرنسپل صاحب نے مسکرا کر وضاحت کی۔

"تھینک یو سر... میں جانتا ہوں۔" میر بھی اجازت لے کر باہر آ گیا۔

ناز کے پیپرز میں صرف دس دن رہ گئے تھے۔ اسے گھر واپس آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ میر کی اس سے بات بہت ہی کم ہو پا رہی تھی۔ کیونکہ حشمت اور بھابھی کی وجہ سے اسے موبائل چھپانا پڑ رہا تھا۔ میر نے اسے تسلی دی کہ کوئی بات نہیں جذبات سے زیادہ وہ احتیاط کو مد نظر رکھے۔ ویسے بھی وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ اسے اپنا دھیان پڑھائی پر لگانا چاہیے۔

وہ جمعہ کا دن تھا۔ اگلے روز چھٹی کے بعد گھر واپس

جاتا تھا۔ معلوم نہیں کیوں رات کو اس کی طبیعت عجیب بوجھل سی ہو گئی تھی۔ آدھی رات گزر جانے کے باوجود اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے سرہانے رکھی کتاب بنا دیکھے کھولی۔

کون تھا جس کی آہوں کے غم میں ہوا سرد تھی شہر کی
کس کی ویران آنکھوں کا 'لے کے اثر چاند خاموش تھا
کل کہیں پھر خدا کی زمیں پر کوئی سانحہ ہو گیا
میں نے کل رات جب بھی اٹھائی نظر چاند خاموش تھا

میر نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کروٹ بدلی۔ ناز کی یاد بہت شدت سے آرہی تھی۔ طبیعت پر عجیب سی بے سکونی طاری تھی۔ اس نے لائٹ آف کر کے زبردستی سونے کی کوشش کی' باقی کی رات الٹے سیدھے بوجھل قسم کے خواب دیکھتے گزر گئی۔ صبح اٹھا تو سر بھی بہت بھاری تھا۔ کسی طور خود کو مسجد تک جانے کے قابل بنایا۔ نماز پڑھ کر دیر تک خیر اور سلامتی کی دعا کرتا رہا۔

شروع کے دو پیریڈ لگاتار ساتویں جماعت میں تھے۔ تیسرے پیریڈ میں جب وہ دسویں جماعت میں داخل ہوا تو سبھی لڑکوں کو چہ میگوئیوں میں مصروف پایا۔ میر نے ڈپٹ کر سب کو چپ کرایا اور پڑھانا شروع کیا۔

"سر آج پڑھنے کا موڈ نہیں ہے۔" پیچھے سے کسی نے شوخی کی لیکن میر نے نوٹس نہیں لیا۔

"سر آپ کو پتا چلا آج ہمارے گاؤں میں کیا ہوا؟" پھر کسی کے پیٹ میں درد ہوا۔

"کیا مصیبت ہے ۔۔۔ کیا ہوا؟" میر نے نہایت اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"سر وہ اپنے رحمان چاچا ہیں نا ۔۔۔ ان کی بیٹی ۔۔۔" میر کے ہاتھ سے لکھتے لکھتے چاک چھوٹ گیا۔ فوراً چونک کر پلٹا۔

"کک۔ کیا ہوا ان کی بیٹی کو۔"

"سر وہ اس کے گھر والے اسے مزار کی خدمت پر نہیں لگا رہے تھے نا ۔۔۔ تو پیر نعمت شاہ کی روح کو جلال آگیا آج صبح چاچا کی بیٹی مزار پر بے ہوش پڑی ملی۔ سب کہہ رہے ہیں رات کو پیر بابا کی کرامت سے وہ خود بخود مزار پر پہنچ گئی کیونکہ اسے خود نہیں پتا کہ وہ کیسے پہنچی۔"

"اوہ ۔۔۔" میر نے دیر سے رکا سانس بحال کرتے ہوئے پیشانی کا پسینہ صاف کیا ۔۔۔ تھوڑی دیر بعد اور پھر کتاب کھول کر جلدی جلدی بورڈ پر کچھ سوال لکھے۔

"جاوید اور رحمت اللہ ۔۔۔ تم دونوں یہاں آؤ ۔۔۔ ان سب پہ نظر رکھو۔ یہ سرپرائز ٹیسٹ پیریڈ میں حل کر کے دو۔ مجھے ذرا پرنسپل صاحب سے کام ہے۔" میر نے انہیں کام میں مصروف کر کے خود باہر نکل آیا۔ پرنسپل صاحب سے گھنٹے کی اجازت لی اور چاچا کے دروازے پر آیا لیکن وہاں تالا تھا۔

میر نے بنا وقت ضائع کیے مزار کی راہ لی۔ کھیتوں کی پگڈنڈیوں سے ہوتے ہوئے مزار تک کا سفر اس نے بھاگتے ہوئے طے کیا۔ دماغ جیسے پھٹنے کے قریب تھا۔ آگے کیا پیش آنے والا تھا۔ اس کے بارے میں سوچ کر اسے ہول اٹھ رہے تھے۔

مزار کے احاطے میں مرد تو بس چند ایک تھے ایک سائیڈ پر عورتیں کافی ساری جمع تھیں۔ چاچا کی نظر میر پر پڑی تو خود ہی اس کی طرف بڑھے اور کھینچتے ہوئے اسے مزار سے باہر ایک سائیڈ پر لے آئے۔

"یہ سب کیا ہے چاچا ۔۔۔ ناز کو مزار پر کون لایا؟"

"بہت بڑا گناہ ہو گیا صاحب ۔۔۔ بڑی بھول ہوئی ہم نے ۔۔۔ پیر بابا کا جلال دیکھا؟"

"کیا مطلب چاچا ۔۔۔ ناز کیسی ہے۔ پلیز مجھے بات بتائیں۔"

"آج صبح جب ہم جاگے تو میری بہو نے سب سے پہلے بتایا کہ ناز گھر میں نہیں ہے۔ میں تو صاحب گھر سے نکل کر آپ کی طرف ہی آرہا تھا کہ مزار کے آدمی دکھائی دیے۔ انہوں نے مجھے آواز دے کر روکا اور بتایا کہ جب متولی نے مزار کا دروازہ کھولا تو اندر ناز بے ہوش پڑی تھی وہ تو شور مچاتا باہر آیا کیونکہ رات دس بجے وہی سارے کنڈیاں دروازے بند کر کے گیا تھا اور صبح کھولے بھی اپنے ہاتھوں سے تھے ۔۔۔ دیکھا صاحب۔ یہ کھلی نشانی ہے۔ خود ناز کو نہیں پتا وہ کب اور کیسے مزار پہنچی۔ بس صاحب' اسی وقت سے لوگ زیارت کو آرہے ہیں۔ اس کو اچادر اوڑھا دی ہے۔ اندر کوئی مرد نہیں جا سکتا۔ بس عورتیں ہی دیکھ سکتی ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں چاچا ۔۔۔ وہ میری بیوی ہے۔" میر کا ضبط جواب دے گیا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چاچا اس طرح ساتھ چھوڑ جائیں گے۔

"آہستہ صاحب۔ شکر پڑھیں اپنے گاؤں میں کسی کو اس کا علم نہیں ہے۔ جو غلطی ہم سے بھولے میں ہو گئی تھی اسے ہمارے بیچ ہی رہنے دیں اور توبہ کریں ورنہ پیر بابا کا غضب مجھے اور آپ کو بھی لے ڈوبے گا۔ جلد از جلد اسے آزاد کر دیں اب وہ پیر بابا کی امانت ہے۔" چاچا بولے جا رہے تھے اور میر کا بس نہیں چل رہا تھا اپنے بال نوچ ڈالے۔ فی الحال چاچا کو سمجھانا ناممکن لگ رہا تھا ناز سے ملاقات کی بھی کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ پتا نہیں وہ کس حال میں تھی اور کیا سوچ رہی تھی۔ میر تھکے قدموں سے اسکول واپس آیا۔

چھٹی کے بعد ٹیچرز شہر واپس جا رہے تھے۔ لیکن میر اسکول میں ہی رک گیا۔ پرنسپل صاحب شاید اسے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن دوسروں کی موجودگی یا پھر کسی مصلحت کے تحت چپ ہی رہے۔ میر اب اسکول میں اکیلا رہ گیا تھا ذہن میں کوئی پلاننگ تھی نہ کوئی رہنمائی کرنے والا بس اتنا معلوم تھا کہ ناز مصیبت میں ہے اور اسے یہیں رہنا ہے۔ اس کے قریب وہ اسکول سے نکل کر کھیتوں کی پگڈنڈی پر چلتا چلا گیا اور بالآخر تھک کر وہیں بیٹھ گیا۔

خیال و خواب ہوا برگ و بار کا موسم
بچھڑ گیا تیری صورت بہار کا موسم
وہ نرم لہجے میں کچھ تو کہے کہ لوٹ آئے
سماعتوں کی زمیں پر پھوار کا موسم

میر نے ایک آہ بھرتے ہوئے گہرے کالے بادلوں پر نگاہ کی۔ "کہیں تو کچھ گڑبڑ تھی ۔۔۔ ناز مزار کے اندر کیسے پہنچی ہو گی؟ کاش کوئی ایک بار مجھے اس سے بات کرنے دیتا۔" گھاس نوچتے ہوئے وہ برابر اسی قسم کی باتیں سوچ رہا تھا۔ اچانک اسے ایک خیال آیا اس نے پہلا فون یاسمین کو کیا۔ چاچا نے بتایا تھا کہ عورتوں کو ناز کے پاس جانے کی اجازت ہے۔ یاسمین یقیناً" اس کی مدد کر سکتی تھی۔ میر نے اسے کہا کہ وہ آج ہی کسی طرح ناز کے پاس جائے۔ شاید وہ کچھ بتانا چاہتی ہو اور مزید اپنی طرف سے یہ پیغام بھی دیا کہ وہ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لے گا اس لیے وہ حوصلے اور صبر سے انتظار کرے۔ دوسری کال میر نے خادم ماموں کے نمبر پر ملائی۔ اسے یقین تو نہیں تھا لیکن ایک امید ضرور پیدا ہوئی کہ شاید وہ چاچا کی طرح توہم پرست نہ نکلیں اور میر کی امید اس وقت خوشی میں تبدیل ہو گئی جب ماموں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ میر نے انہیں یہاں بلایا' انہوں نے بتایا کہ وہ فی الحال سفر میں ہیں اور اگلی صبح دس بجے تک پہنچ جائیں گے۔

میر کا ارادہ خادم ماموں کو ساتھ لے کر زمیندار صاحب کے پاس جانے کا تھا۔ وہ چاہتا تو اسی روز اکیلا ہی نکاح نامہ لے کر ان سے ملنے جا سکتا تھا لیکن اس طرح وہ یہ بھی سمجھ سکتے تھے کہ شاید نکاح چوری چھپے ہوا ہو۔ خادم حسین کی موجودگی اس بات کا ثبوت فراہم کرتی کہ نکاح باہمی رضامندی سے ہوا تھا۔ شام کو یاسمین کا فون آیا اس نے بتایا کہ ناز کو حشمت پر شک ہے وہ کہتی ہے شاید اسے نیند کی گولی کھلائی گئی تھی' اسے صرف اتنا یاد ہے کہ وہ بیل گاڑی میں مزار تک آئی تھی اور بیل گاڑی لالہ کے ایک قریبی دوست رب نواز کے پاس بھی ہے۔ شاید لالہ نے اس کی مدد لی ہو۔

اگلی صبح خادم ماموں دس بجے سے پہلے ہی آگئے۔ میر انہیں لیے مخدوم صاحب کے ڈیرے پر آیا' وہ اس وقت تقریباً" فارغ ہی بیٹھے تھے۔ میر نے جب کہا کہ وہ اکیلے میں کچھ بات کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے ان دو

چار افراد کو بھی رخصت کر دیا جو اس وقت ان کے پاس بیٹھے تھے۔ سب کے جانے کے بعد میر نے زمیندار صاحب کو نہایت سلجھے ہوئے انداز میں ناز سے اپنے نکاح کی بات بتائی اور نکاح نامہ بھی دکھا دیا۔ انہوں نے بھی بڑے تدبر سے میر اور خادم حسین کی بات سنی۔ میر نے انہیں ناز کے پچھلے روز والے بیان کے بارے میں بھی بتا دیا جس میں اس نے حشمت اور رب نواز کی بیل گاڑی کا ذکر کیا تھا۔

"ہونہہ۔" زمیندار صاحب نے سر ہلایا۔

"حشمت کے بارے میں تو سب جانتے ہیں کہ وہ اپنا مکان حاصل کرنے کے لیے برسوں سے دیوانہ ہوا پھر رہا ہے۔ لیکن استاد صاحب آپ بتا رہے ہیں کہ رحمان بھی اب آپ کا ساتھ دینے پر راضی نہیں ہے بلکہ آپ کو طلاق کے لیے بھی کہہ رہا ہے۔ مجھے نہیں لگتا وہ میرے سمجھانے سے اپنا ارادہ بدل دے گا۔"

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لیکن آپ گاؤں کے بڑے ہیں' میں آپ سے مشورہ کرنے بلکہ مدد مانگنے آیا ہوں۔"

"صاحب' مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے لیکن میں بھی کل صبح سے یہی قصہ سن رہا ہوں۔ گاؤں والوں کا اعتقاد پیر بابا پر بڑا پکا ہے۔ میں نے کچھ کہا تو سب میرے بھی خلاف ہو جائیں گے۔ میں لاکھ گاؤں کا بڑا سہی لیکن پیر بابا کے سامنے میری کیا اوقات' اگر میں معاملہ پنچائیت میں لے جاؤں تو رہی سہی امید بھی گئی کیونکہ پنچائیت بی بی کو مزار پر بٹھانے کے حق میں ہی فیصلہ دے گی اور اگر میں نے اپنی طرف سے آپ کے حق میں فیصلہ سنایا تو مجھے گاؤں والوں کی بڑی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"تو پھر ہم کیا کر سکتے ہیں؟" میر کی امید ایک بار پھر دم توڑنے لگی۔

"سوچتے ہیں..... شاید کوئی راہ نکلتی ہو۔" مخدوم صاحب کا جواب میر کو محض تسلی دیتا ہی لگا۔ اس نے اجازت لی اور خادم ماموں کو لیے باہر آ گیا۔ ماموں کو اتنی دور تکلیف دینے پر بھی اسے کافی افسوس ہوا۔ ان سے معذرت کر کے میر نے انہیں واپس بھیج دیا۔ پھر انہوں نے جاتے جاتے کہا کہ اگر آگے بھی ا ضرورت پڑے تو وہ آ جائیں گے۔

پیر سے اسکول کی روٹین پھر شروع ہو گئی۔ میر اس دوران رب نواز کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن پتا چلا صبح کے بعد سے اس کی کچھ نہیں ہے۔ میر کو اباجی کی بہت یاد آ رہی تھی۔ اس شدت سے احساس ہوا کہ شاید وہ ان کا دل دکھانے کا باعث بنا تھا۔ میر نے بنا سوچے ان کا نمبر ملا دیا۔

"کیسے ہیں اباجی؟"

"ٹھیک ہوں بیٹا۔ تم سناؤ۔"

"میں بھی ٹھیک ہوں..... بس آپ کی یاد آ رہی"

"اس بار ویک اینڈ پہ ملنے بھی نہیں آئے۔ تم گھر کیا بدلا ملنا بھی چھوڑ دیا۔" ان کے چھوٹے شکوے نے میر کو ڈھیر ساری خوشی دی۔

میں اس بار گاؤں میں ہی رک گیا تھا۔ شہر آنا نہیں ہوا۔ اگلی بار ضرور آؤں گا۔ ان شاء اللہ۔"

"تم چاہو تو گھر واپس آ سکتے ہو میر..... شاید ثوبیہ سے شادی کے لیے تم پر دباؤ نہیں ڈالنا چاہ تھا۔"

"نہیں اباجی..... میں آپ سے خفا ہو کر نہیں گ بلکہ اپنے دل میں سخت شرمندہ ہوں کہ آپ کا صر ایک حکم بھی مان نہیں سکا۔"

"میر' تم جوان اور خود مختار ہو مجھے تم پر زبردستی کوئی حق نہیں۔ کل ہی تمہاری پھپھو سے میری بات ہوئی اس نے مجھے بتایا کہ تم ثوبیہ میں انٹرسٹڈ نہیں بلکہ سب مل کر تمہیں ٹریپ کر رہے تھے اور تم پر الزام غلط تھا۔" اباجی نے وضاحت کی تو میر نے ا تک سکون محسوس کیا۔

"جی ہاں میں واقعی اس معاملے میں بے قصور دراصل اباجی..... "وہ کہتے کہتے رکا۔

"میں کہیں اور کمٹڈ ہوں۔"

"کہیں گاؤں میں تو نہیں..... ؟ ویک اینڈ پہ آنا چھوڑ دیا ہے۔" اباجی نے ہلکے پھلکے انداز میں چھیڑا تو میر جھینپ گیا۔

"جی' اباجی..... اس بار میں آؤں گا تو آپ سے تفصیل سے بات ہو گی۔"

"او کے بیٹا اپنا خیال رکھنا۔ اللہ کی امان میں رہو۔" انہوں نے فون بند کر دیا۔ میر نے ان سے بات کر کے بے حد سکون محسوس کیا۔

ظہر کی نماز اور کھانے کے بعد باقی ٹیچرز آرام کر رہے تھے۔ میر بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا جب رحمان چاچا اس کے کمرے میں آئے۔ نا صرف یہ بلکہ آتے ہی میر کے پیروں پہ گر گئے۔

"مجھے معاف کر دو بیٹا' میں پھر حشمت کے دھوکے میں آ گیا تھا۔" وہ باقاعدہ رو رہے تھے۔

"ارے..... " میر نے فوراً انہیں اٹھایا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں..... کیا ہوا سب خیریت تو ہے؟"

"بس بیٹا آنکھوں پہ پٹی بندھ گئی تھی۔ میں سمجھا پیر بابا آپ کے اور ناز کے نکاح پر جلال میں آ گئے اور یہ سب ہوا؟"

"چاچا آپ آرام سے ساری بات بتائیں..... بلکہ پہلے یہ بتائیں ناز کہاں ہے..... اور کیسی ہے؟" میر کو چاچا کی بے سروپا گفتگو سے کچھ بھی اخذ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے کی بات ہے..... ناز کے پاس گاؤں کی سب عورتیں جمع تھیں تو اچانک اسے وجد سا آیا اور پیر بابا اس کے اندر حلول کر گئے اور وہ بھاری آواز میں ناز کی زبان کہنے لگے کہ ناز کے مزار آنے پر وہ بہت خوش ہیں۔ لیکن اس کا بدنیت بھائی مزار کے آس پاس بھی نظر نہ آئے اور مزار کے ساتھ والے مکان کو ہمیشہ کے لیے مزار کا حصہ بنا دیا جائے۔ وہ اب کسی کی ملکیت نہیں رہے گا۔ بس صاحب یہ سننا تھا کہ میری بہو جو وہاں عورتوں میں بیٹھی تھی اس نے شور مچا دیا کہ ناز جھوٹ بول رہی ہے۔ اس پر پیر بابا کا نزول نہیں ہو سکتا کیونکہ اسے حشمت رات کو مزار پر چھوڑ گیا تھا اور بے ہوش بھی انہوں نے کیا تھا۔ بڑا تماشا لگا صاحب..... اوپر سے متولی بھی آ گیا' مجھے اور حشمت کو بلایا گیا۔ پھر تو حشمت نے سب سچ بتا دیا کہ اس نے ناز کو نیند کی گولی دی تھی اور رب نواز کی بیل گاڑی پر ڈال کر مزار لے گئے۔ وہاں چھوٹی دیوار پھلانگ کر اسے مزار کے اندر لٹایا اور واپس آ گئے۔ اگلی صبح مشہور کرا دیا کہ یہ سب پیر بابا کی کرامات تھیں۔ حشمت سے سچ اگلوانے کے لیے ناز نے وجد میں آنے کا ڈرامہ کیا تھا۔"

"اوہ..... " میر نے ایک گہرا سانس لیا۔

"اب ناز کہاں ہے؟"

"وہ تو ابھی ادھر ہی ہے۔ عورتیں حشمت کو برا بھلا کہتی وہاں سے رخصت ہو رہی تھیں۔ اب تک مزار خالی ہو گیا ہو گا۔"

"تو اب آگے کیا کرنا ہے چاچا..... آپ کو نہیں لگتا ناز کو گھر لے آنے میں خطرہ ہے۔"

"ہاں بیٹا..... میں تو کہتا ہوں۔ آج ہی اپنی امانت لے جاؤ۔ میں یہاں سب کو بتا دوں گا۔"

"لیکن اس کے امتحان..... دو روز بعد اس کا پہلا پیپر ہے؟" میر کا دماغ الجھنے لگا۔

"اچھا خیر فی الحال سب سے بڑی خوشی کی بات یہی ہے کہ سچ سامنے آ گیا۔" میر چاچا سے باتیں کرتا اسکول سے باہر آ گیا۔

مزار پر آئے تو واقعی اب وہاں کوئی رش نہیں تھا۔ ناز کے پاس صرف متولی کی بیٹی بیٹھی ہوئی تھی جو میر اور چاچا کو دیکھ کر اپنے گھر چلی گئی۔ چاچا نے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا اور خود وہیں رک گئے۔ ناز اسے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میر نے اسے صحیح سلامت دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ اس نے واقعی نہیں سوچا تھا کہ حالات اتنے جلدی اس کے حق میں ہو جائیں گے۔

"کیسی ہو ناز..... ؟" میر نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"جی ٹھیک ہوں۔" اس نے سر جھکایا ہوا تھا۔

"تم نے بڑی ہمت دکھائی ناز..... آج تمہاری وجہ سے ہم پھر ایک دوسرے کے سامنے ہیں۔"

نہیں صاحب ــــ میری عقل کہاں اتنا کام کرتی ہے۔ وہ تو کل بی بی جی آئی تھیں۔ سمجھانے انہوں نے سکھایا تھا سب کچھ۔"

"بی بی جی ــــ" میر نے حیرت سے دہرایا "وہ کون ہیں؟"

جی وہ اپنے زمیندار صاحب کی گھر والی۔" ناز نے وضاحت کی تو میر بری طرح چونکا پھر ایک دم ہنس پڑا۔ مخدوم صاحب تو بڑے اسمارٹ آدمی نکلے تھے۔ بنا خود پر نام لائے اس کی اتنی بڑی مشکل حل کردی تھی۔

"یعنی مدد کے لیے زمیندار صاحب کا انتخاب کرنا میری بھول نہیں تھی۔" وہ بڑبڑایا۔

"جی؟" ناز نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے میر کو دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔

"کچھ نہیں فی الحال تمہارے کہیں رہنے کا بندوبست کر آؤں۔"

"رہنے کا ــــ کیا مطلب؟" وہ پھر اسے دیکھنے لگی۔

"ارے میری بھولی سی دلہن ــــ لالہ سے اتنا بڑا پنگا لے کر کیا سمجھتی ہو وہاں رہ سکتی ہو؟" میر نے بھنویں اٹھا کر سوال کیا تو ناز نے ہنس کر نفی میں سر ہلایا۔ میر نے ناز اور چاچا کو وہیں انتظار کرنے کا کہا اور مخدوم صاحب سے بات کرنے چلا گیا۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی سے میر کو گلے لگایا تھا' میر نے ان کا شکریہ ادا کیا' انہیں ناز کے امتحانوں کے بارے میں بتایا اور چند دن کسی محفوظ جگہ پر رکھنے کی درخواست کی۔ انہوں نے میر کو تسلی دی اور بتایا کہ انہوں نے حشمت کو تھوڑی دیر میں اپنے ڈیرے پر بلایا ہے انہوں نے پنچائیت سے مشورہ کرلیا تھا سب کا یہی خیال تھا کہ حشمت کو پیر بابا کے مزار کی خدمت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسے صرف ذاتی مکان سے سروکار ہے۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اسکول کے ساتھ والے مکان کو چاچا کے نام کردیا جائے۔ ویسے بھی مزار والا مکان ان کے باپ دادا کی جاگیر تھا اس لیے ذاتی مکان پر ان کا حق بنتا تھا۔ مزید انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ حشمت سے وعدہ لیں گے کہ ناز کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے۔

"اوہ۔" میر نے ایک گونہ گو سکون محسوس کیا۔ مطلب اب ناز اپنے گھر جاسکتی ہے۔ میں آپ کا شکریہ لفظوں میں ادا نہیں کرسکتا۔

"نہیں استاد صاحب میں سمجھتا ہوں ہماری سستی کی وجہ سے بچی نے اتنے سال تکلیف میں گزارے اب تو بس ولیمہ کھلائیں۔" زمیندار صاحب نے چھیڑا تو میر ہنس دیا۔

ضرور۔ بس میری بیگم ذرا امتحانوں سے فارغ ہولے۔" میر نے ان سے اجازت لی۔

☼ ☼ ☼

آیت جاں سے در دل کو اجالے رکھوں
مثل تعویذ گلے میں اسے ڈالے رکھوں
آ میرے چاند نہ کھا جائے ستاروں کو نظر
میں تیرے گرد مناجات کے ہالے رکھوں

ناز اور میر کھڑکی میں کھڑے بارش کا نظارہ کررہے تھے۔ شادی ہال میں ولیمہ کی تقریب ختم ہوئی تو ابا جی نے گاڑی کی چابی اس کے ہاتھ پہ رکھ کر کہا کہ کوئی انہیں گھر تک ڈسٹرب نہیں کرے گا۔ البتہ صرف اس شرط پر کہ وہ چند دن ہی اپنے نئے گھر میں رہ سکتا ہے۔ پھر اسے ان کی بہو کو اپنے گھر لے آنا ہوگا۔

"جی ابا جی ــــ میرا بھی یہی ارادہ ہے۔ ان شاء اللہ۔" میر نے آگے بڑھ کر ان کو گلے لگایا۔

"کیسا لگ رہا ہے ناز ــــ" میر نے ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کر بارش کو اپنے ہاتھوں پر محسوس کیا۔

"یقین نہیں آرہا۔" ناز نے شیشے کے کھلے پٹ سے سر ٹکایا تو میر رخ موڑ کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اس نے گہرے جامنی اور سبز رنگ کی پشواز پہنی ہوئی تھی۔ سلیقے سے کیے خوب صورت میک اپ اور کھلے بالوں کے ساتھ وہ آج بے حد حسین لگ رہی تھی۔ میر نے اس کے خوب صورت روپ کو آنکھوں میں بسائے ہوئے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔

"جانتی ہو یقین کب نہیں آتا؟" میر نے اس کا ہاتھ اپنے دل پر رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"جب محبت خوشی دیتی ہے تو دل خوش بعد میں ہوتا ہے اور ہزاروں وہم پہلے لاحق ہوجاتے ہیں۔ تمہاری بے یقینی میں جو محبت چھپی ہے وہی میری زندگی کا حاصل ہے۔ تم نے کہا تھا ماں کے بعد اگر کسی نے تمہارا بہت خیال رکھا ہے تو وہ میں ہوں ــــ اور یہی ماننا میرا بھی ہے۔ جس دن پہلی بار تم سے ملا تھا اس سے پچھلی رات میری امی نے خواب میں مجھے پھول دیے تھے۔ میں ای کے خواب کے بارے میں سوچتا ہوا آرہا تھا جب تم نالے کے پار بالکل میرے سامنے آکھڑی ہوئیں۔

اچھا سنو۔ تمہیں تو بہت برا لگا ہوگا جب میں نے تمہارا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔"

"نہیں ــــ" ناز شرمیلے انداز میں ہنسی۔ "آپ کو گھبراہٹ میں خود پتہ نہیں تھا کہ کیا ہوا۔ ہاتھ تو مجھے چھڑا لینا چاہیے تھا لیکن ــــ" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"لیکن ــــ" میر نے بھرپور دلچسپی سے اس کی مسکراہٹ پر غور کیا۔

"میں تو سوچ رہی تھی یہ فرشتہ کہاں سے اچانک نمودار ہوا۔ آپ کو پہلے کبھی دیکھا بھی تو نہیں تھا۔"

"اور پتا کب چلا کہ فرشتہ تو اپنے اسکول میں ٹیچر ہے۔" میر نے چھیڑا تو اس کی جھینپی جھینپی ہنسی نکل گئی۔

"جب آپ نے نالے پر تختہ ڈلوایا تو بابا نے گھر میں صرف اتنا بتایا تھا کہ میر صاحب راستہ ٹھیک کروا رہے ہیں اس وقت مجھے صرف شک ہوا کہ شاید آپ ہی میر صاحب ہوں' لیکن جب دیوار سے دیکھا تب یقین ہو گیا۔"

"اور کیا سوچا تھا دیکھ کر ــــ؟"

"بہت خوشی ہوئی تھی کیونکہ سانپ والے واقعے کے بعد سے ہر وقت آپ کو ہی سوچتی رہتی تھی۔ جب آپ کو گھر کے اتنے پاس دیکھا تو یقین ہی نہیں آیا ــــ شروع کے دنوں میں تو اپنے حالات کے بارے میں جیسے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ لیکن بار بار سامنا ہونے پر جب احساس ہوا کہ آپ بھی میرے بارے میں سوچنے لگے ہیں تو پہلی بار ہوش آیا اور یہ خیال بھی کہ آپ کو اپنے بارے میں بتا دینا چاہیے ــــ اگر" وہ کچھ کہتے کہتے جیسے جھجک کر رک گئی۔

"ہاں بولو ــــ" میر دلچسپی سے اس کے بولنے کا منتظر تھا۔

"اگر میں آپ کو خط لکھ کر پہل نہ کرتی تو کیا ہوتا؟" ناز نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا تو میر ہنس پڑا اور پیار سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"کیوں ان وہموں میں خود کو پریشان کریں ــــ تم خط نہ لکھتیں تو کوئی اور وسیلہ بن جاتا' کیونکہ اوپر والے نے یہ چاند میرے ہی گھر میں اتارنا تھا۔" میر نے محبت سے کہا تو ناز نے مسکراتے ہوئے اپنا سر اس کے شانے سے ٹکا دیا۔

اسی میں خوش ہوں میرا دکھ کوئی تو سہتا ہے
چلی چلوں کہ جہاں تک یہ ساتھ رہتا ہے
زمین دل یونہی شاداب تو نہیں اے دوست
قریب میں کوئی دریا ضرور بہتا ہے

☼ ☼

شازیہ جمال

اعتبارِ حاصلِ زیست

اس کے نزدیک دنیا کی سب سے خوش نصیب عورت وہ تھی جس کا خاوند اس کے حق میں بہتر ثابت ہو۔ جو بنا کہے اس کے اندر تک کا حال جان لے جس کی ذات اپنی بیوی کے لیے زمانے کی تپتی دوپہر میں گھنے پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں کی مانند ہو اور جو اس کی غیر موجودگی میں بھی زندگی کے ہر موڑ پر ـــ اس کا دفاع کرسکے اور اگر یہ سچ ہے تو پھر اس کی ماں دنیا کی سب سے بدنصیب عورت ٹھہری۔

وہ بچپن ہی سے بہت حساس تھی۔ اکثر معمولی معمولی باتوں پر گالیاں بکتے' توڑ پھوڑ مچاتے اور اماں کو زدوکوب کرتے ابا کو دیکھ کر وہ باتھ روم میں بند ہوجاتی تھی اور اس وقت تک باہر نہ نکلتی جب تک چیختے چنگھاڑتے ابا ڈیوڑھی پار نہ کرجاتے۔

ابا کے باہر نکلتے ہی ندا آپا بھاگ کر پانی کا گلاس اماں کے منہ سے لگا دیتیں اور ردا انہیں اپنی بانہوں میں بھر کر اپنے ساتھ لگا کر دھیرے دھیرے تھپکتی رہتی۔

جبکہ پورے صحن میں ٹوٹے ہوئے گلاس کی کرچیوں' اوندھی پڑی میز اور یہاں سے وہاں تک پھیلے کھانے کے داغ دھبوں کو دیکھ کر اس کا دل چاہتا کہ وہ بھی ابا کی دکان کی ساری چیزوں کو جاکر یونہی الٹ پلٹ کردے۔ نہ جانے انہیں اتنا غصہ کیوں آتا تھا؟

کوئی بھی خلافِ مزاج بات ان کا پارہ ساتویں آسمان پر چڑھا دیتی اور پھر ان کے مزاج بھلا ملتے ہی کہاں تھے۔ گھر کے اندر قدم رکھتے ہی ان کے ماتھے پہ ہمہ وقت پڑے بلوں میں ایک دم اضافہ ہوجاتا۔ ان کی ایک ہی دھاڑ اماں کے ساتھ ساتھ ندا آپا اور ردا کو تھر تھر کانپنے پر مجبور کردیتی۔

جبکہ وہ ان کے برعکس ابا کی ٹیڑھی باتوں کے جواب اس قدر "ٹیڑھے پن" سے دیتی کہ وہ اکثر دانت کچکچا کر رہ جاتے۔ اسے اپنی کم گو' سلیقہ شعار اور خدمت گزار ماں پر بہت ترس آتا تھا اور کبھی کبھی ان کی کم ہمتی اور بزدلی پر بے انتہا غصہ بھی۔

"آپ ابا کو ٹوکتی کیوں نہیں ہیں کہ وہ غلط ہیں' ان کا طریقہ غلط ہے' ان کی سوچ غلط ہے' انہیں کہتی کیوں نہیں ہیں کہ وہ ہمیں سکون سے عزت کی زندگی کیوں نہیں گزارنے دیتے؟" کبھی کبھی وہ ان کے سامنے پھٹ پڑتی تھی۔ دادی اس کی ایسی باتیں سن کر اپنے گال پیٹ ڈالتیں۔

"توبہ توبہ کیا زمانہ آگیا ہے اب بیٹیاں اپنے باپ کے بارے میں ایسے ایسے الفاظ استعمال کریں گی۔"

"دادی! باپ جس "شان" کا ہے یہ آپ بھی جانتی ہیں یہ اور بات ہے کہ اپنے "بیٹے" کے خلاف کچھ سننا نہیں چاہتیں۔" وہ صاف گوئی سے کہتی وہاں سے اٹھ جاتی۔

ایک بیوی کمزور ہوسکتی ہے' ایک بیٹی کمزور ہوسکتی ہے' ایک بہن بھی کمزور ہوسکتی ہے۔ لیکن ایک ماں کیسے کمزور ہوسکتی ہے؟ وہ ساری زندگی ایک شخص سے نہ تو اپنی ذات منوا سکیں اور نہ ہی اپنی اولاد کا وجود اسے ساری زندگی اپنی ماں سے یہی گلہ رہا۔

زندگی سے کبھی بہت زیادہ خوشیوں کی توقع نہیں رکھنی چاہیے جہاں جو خوشی ملے اسی پر خوش ہوجانا چاہیے۔ اماں سارا دن فریم پر سر جھکائے کڑھائی کرنے میں مگن رہتیں۔ ان کے ہاتھ میں بہت نفاست تھی اور ردا مشین پر جھکی دھڑا دھڑ کپڑے سیے جاتی۔

ابا کو مشین کی گھر رگھرر سخت ناپسند تھی۔ اس لیے ان کے گھر میں قدم رکھتے ہی مشین ایک طرف رکھ کر گھڑی دو گھڑی کے لیے اسے بھی ابا کے طفیل کمر

سیدھی کرنے کا ٹائم مل ہی جاتا۔

"بڑا مشکل وقت آن پہنچا ہے۔ مجھ سے "تعاون" کرو گے تو ٹھیک ورنہ مجھ سے اب یہ جنجال نہیں پالا جاتا۔ بہت عیش کروائے تم لوگوں کو۔" ابا اکثر ہاتھ جھاڑ کر بے نیازی سے کہتے تو اس کے منہ میں نوالہ پھنس کر رہ جاتا۔ کریانے کی اچھی خاصی چلتی دکان سے آنے والا پیسہ وہ اپنے دوستوں اور اللّے تللّے میں اڑا دیتے۔

ندا آپا کی شادی ہوئی تو وہ بہت خوش تھی کہ چلو کسی ایک کو تو اس گھٹن زدہ ماحول سے نجات ملی۔ لیکن بہت قلیل عرصہ میں آپا کی آنکھوں کے بجھتے ستارے اور پھیکی پڑتی مسکراہٹ نے اسے باور کرادیا کہ ریاض بھائی ابا جیسے نہ سہی پر ان سے کچھ مختلف بھی نہیں ہیں۔ آپا آئے دن ان کا "فرمائشی پروگرام" لے کر نڈھال سی حاضر ہو جاتیں۔ ابا سے توقع رکھنا عبث تھا۔ چنانچہ اماں ہی پائی پائی جوڑ کر جمع کیے ہوئے پیسوں میں سے کچھ آپا کے ہاتھ پر رکھ دیتیں۔ کبھی یہ تو کبھی وہ۔ ان کی فرمائشوں اور دھمکیوں کی کوئی حد نہیں تھی وہ یہ سب کچھ دیکھ کر بہت کڑھتی تھی۔

"آپا! یہ سب آپ کا کیا دھرا ہے اسی دن ان کا منہ توڑ دینا تھا جب وہ آپ سے پہلی بار اس قسم کا تقاضا کر رہے تھے کم از کم انہیں کچھ تو غیرت آتی۔"

آپا کی زرد پڑتی رنگت اور شرمندگی کے مارے جھکتا سر دیکھ کر اس کا دل چاہتا کہ ریاض بھائی کا منہ نوچ لے۔ اسی لیے اپنی بیویوں کو پیروں کی جوتی سمجھنے والے مردوں کو وہ اپنی جوتی کی دھول کے برابر بھی نہیں سمجھتی تھی۔ اور اماں کو اس کی انتہا پسندی سے بہت خوف آتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"سمجھا دو اپنی صاحب زادی کو میرے گھر میں یہ بے ہودگی نہیں چلے گی۔ اپنی حد میں رہیں ورنہ چوٹی سے پکڑ کر سب کو نکال باہر کروں گا۔" ابا کی تنفر بھری آواز رخصت ہوتی زرد شام کو مزید اداس کر رہی تھی۔

"تم نے ابا سے کچھ کہا ہے؟" حنا نے ویڈیو کھیلتے احد سے پوچھا۔

"آپا۔ وہ۔۔۔" احد ایک دم گڑبڑا گیا۔

"سچ سچ بتاؤ تم نے ابا سے کیا کہا ہے؟" حنا ڈپٹ کر بولی۔

"ابا نے پوچھا تھا کہ میرے گھر سے باہر جانے کے بعد تمہاری بہنیں اکیلے کمرے میں بیٹھ کر کیا کرتی ہیں۔ اگر تم مجھے سچ سچ بتاؤ گے تو میں تمہیں تمہاری پسند کی آئس کریم کھلاؤں گا۔"

"پھر۔"

"پھر میں نے ابا سے کہا کہ چھوٹی آپا ٹی وی پر جا سینا کی ریسلنگ دیکھتی ہے اور۔۔۔" وہ خالی خالی نظروں سے اپنے دس سالہ بھائی کو دیکھے گئی۔ باہر ابا اس کی ذات کے پرخچے اڑا رہے تھے۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر وہاں سے بہت دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔

ابا کے کلف لگے سوٹ کو جما جما کر استری کرتی ہوئی اس نے بہت دکھ سے اسے دیکھا اسے بھی اس وقت اتنا ہی اتنی ہی توہین محسوس ہوتی جب وہ ڈیوڑھی کے کونے میں پڑی بالٹی کے ارد گرد بکھرا کوڑا اکٹھا کرنے میں مگن ہوتی تو ابا بہت اچانک دروازہ کھول کر گلی میں جھانک کر اسے "رنگے ہاتھوں" پکڑنے کے لیے چھاپہ مارتے۔

"نہ جانے لوگوں کے ذہن میں اتنا گند کہاں سے آجاتا ہے؟" وہ گند اگلتی بالٹی پر نظر جمائے سوچتی چلی جاتی۔

☼ ☼ ☼

اسے اپنی نظروں پر دھوکے کا گمان ہوا۔ یا شاید وہ یقین ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ عدیل بھائی کسی الٹرا ماڈرن لڑکی کے ساتھ عین اس کی آنکھوں کے سامنے موٹر بائیک زن سے اڑاتے ہوئے گئے تھے وہ دھول اڑاتے رستے پر نظریں جمائے ساکت کھڑی رہی آمنہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے آگے بڑھی ان کے روٹ کی وین آ گئی تھی۔

وہ گھر پہنچ کر چیزیں اٹھا پٹخ کر اپنے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن جب غصہ کسی طور پر کم نہ ہوا تو ردا کے سامنے پھٹ پڑی۔

"آج میں نے عدیل بھائی کو کسی لڑکی کے ساتھ دیکھا ہے۔" مشین پر جھکی ردا ذرا کی ذرا ٹھٹکی پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

"پھر؟"

"پھر؟ یعنی کہ تمہیں یہ بات سن کر کوئی شاک نہیں لگا؟" صدمے کے مارے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"ان کی ایک نہیں بلکہ کئی ایک گرل فرینڈز ہیں اور یہ بات میں بہت پہلے سے جانتی ہوں۔" ردا بے تاثر لہجے میں کہتی دانتوں سے دھاگہ توڑنے لگی۔ حنا بے دم ہو کر بیٹھ گئی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے وہ شادی کے بعد چینج ہو جائیں گے؟" اس کے لہجے میں پھر سے آس گھل گئی تھی۔

"نہیں، مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں ہے کیونکہ میں جانتی ہوں کہ مرد کی فطرت کبھی نہیں بدلتی۔" نہ جانے عورتیں اتنے اہم معاملے میں بے حس کیوں ہو جاتی ہیں؟ یا شاید جو بات ان کے بس میں نہیں ہوتی اس کے متعلق بے حسی کی ردا اوڑھ کر یونہی لاتعلق ہو جاتی ہیں۔

حنا بہت دکھ سے اپنی بہن کی نم آلود لرزتی پلکیں دیکھے گئی۔ جن عورتوں کو باپ کی شفقت، بھائیوں کا مان اور شوہر سے عزت و محبت نہ ملے ان کی ذات کسی خزاں رسیدہ پتے کی مانند ہوتی ہے جسے ہوا جہاں چاہے اڑا کر لے جائے۔

☼ ☼ ☼

اور پھر بہت اچانک ردا کی شادی کا غلغلہ اٹھا تو اماں بوکھلا کر رہ گئیں۔ اگرچہ انہوں نے تنکا تنکا اکٹھا کر کے اس کے لیے بہت کچھ جوڑ رکھا تھا۔ لیکن فرنیچر کے لیے ان سے کچھ نہیں بن پا رہا تھا۔ شادی سر پر پہنچ گئی تو اماں نے مجبوراً ابا کے سامنے دامن پھیلا دیا۔ ابا تکیے سے ٹیک لگائے بے نیازی سے کھانا کھاتے رہے گویا ان کی بات سنی ہی نہ ہو۔

"بس کر دیں اماں! اور کتنا ذلیل کروائیں گی خود کو ہمارے لیے؟ مجھے ایسا جہیز نہیں چاہیے۔" ردا سے برداشت نہ ہوا تو اماں کے منہ پر ہاتھ رکھ کر سسک اٹھی۔

"کچھ سنا میری بیٹی کیا کہہ رہی ہے؟ اسے جہیز میں کچھ نہیں چاہیے۔ ارے وہ بھی تو لوگ ہوتے تھے جو دو کپڑوں میں بیٹیوں کو رخصت کر دیتے تھے اور تم ویسے تو بڑی صوم و صلوٰۃ کی پابند بنتی ہو اور دنیا داری کا اتنا خیال ہے؟" ابا اپنے مطلب کی بات نکال کر تمسخرانہ لہجے میں بولے۔

حنا نے اپنے ایم اے انگلش کی ایڈمیشن فیس اور ٹیوشنز سے ملنے والی رقم بہت خاموشی سے لا کر اماں کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ابا کی غیر جانبداریت اور اکلوتے

بیٹے کی کم سنی کی بنا پر اماں نے فرنیچر پسند کرنے اور خریدنے کی ذمہ داری ریاض بھائی کے سپرد کردی۔

''خالہ جی! ندا کی دفعہ تو آپ نے اتنا سامان نہیں دیا تھا جو ردا کو دے رہی ہیں۔'' ریاض بھائی بظاہر ہنس کر بول رہے تھے لیکن اماں ان کی بات میں چھپے مفہوم سے اچھی طرح واقف تھیں۔ حنا نے چائے پٹخنے کے سے انداز میں ان کے سامنے رکھی۔ ندا آپا دہل کر اسے دیکھنے لگیں۔ اس کی ایسی جذباتی حرکتیں اکثر بعد میں ان پر بہت بھاری بن کر گزرتی تھیں۔

''ریاض بھائی! آپ نے بچپن میں وہ والی کہانی تو سنی ہوگی؟'' اس نے اماں کی ملتجی نظروں کو نظرانداز کرتے ہوئے ان سے اچانک پوچھا۔

''کون سی؟''

''وہ جس میں ایک درویش کسی مفلس کو سرمہ دے کر کہتا ہے کہ اگر ایک آنکھ میں ڈالوگے تو دنیا جہاں کے خزانے نظر آئیں گے۔ لیکن دوسری آنکھ میں مت ڈالنا ورنہ اندھے ہو جاؤ گے۔ لیکن مفلس نے لالچ میں آکر دونوں آنکھوں میں سرمہ ڈال دیا نتیجتاً ''اندھا ہوگیا کیونکہ لالچ کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے' ہے نا؟'' وہ معصومیت سے بولتی انہیں بہت کچھ جتا گئی تھی جبکہ بدمزاج شوہر کے ماتھے پر پڑتی سلوٹیں ندا آپا کو اپنی پیشانی کا نادیدہ پسینہ پونچھنے پر مجبور کررہی تھیں۔

اور بہت چپکے سے ردا اس گھر سے رخصت ہوگئی اور اپنے پیچھے ڈھیر ساری اداسی چھوڑ گئی۔ کبھی کبھی وہ سوچتی تھی کہ شاید بیٹیوں کے چلے جانے کے بعد ابا کو ان کے وجود' ان کی اہمیت کا احساس ہوجائے لیکن ردا کی شادی کے دوسرے روز جب اماں بہت خاموشی سے اس کی مشین پر انگلی پھیر کر اس کے لمس کو محسوس کررہی تھیں کہ ابا نے پھر سے کسی معمولی بات پر ہنگامہ کھڑا کرکے ان کے خیالات اور حنا کی خوش فہمی کا شیرازہ بکھیر دیا۔

☼ ☼ ☼

ایسے ہی روکھے پھیکے دنوں میں خالہ رشیدہ کے توسط سے اس کے لیے ایک متمول گھرانے کا رشتہ آیا۔ اماں عجب شش و پنج میں گرفتار تھیں۔ بیٹی کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھیں اور زمانے کی ریت رواج سے بھی۔ اور مشکل میں تو وہ خود بھی گرفتار تھی جو کسی حاکم پسند مرد کی ''محکوم'' بن کر زندگی بسر کرنے سے تاعمر کنواری رہنا بہتر سمجھتی اور وہ ایسا کر بھی گزرتی لیکن ابا اب کسی ''بوجھ'' کو مزید اپنے سینے پر مونگ دلتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ایک طرف کنواں دوسری طرف کھائی اس نے سارا معاملہ اللہ کے سپرد کردیا اور پھر سارے معاملات یکے بعد دیگرے بطریق احسن طے ہوتے چلے گئے۔

رخصت ہوتے سمے اس کا شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ وہ ابا کے سینے سے لگ کر ڈھیر سارے آنسو بہا دے اور وہ کسی شفیق باپ کی مانند اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ڈھیروں دعاؤں کے سنگ اسے رخصت کردیں۔ آہ! لیکن ابا سفید کاٹن کے شلوار قمیص میں ملبوس دولہا والوں کے ساتھ آنے والے مووی میکر سے مختلف پوز بنا بنا کر مووی بنواتے اور تصویریں کھنچواتے رہے۔ اس نے پلکیں جھپک جھپک کر سارے آنسو اندر اتار لیے۔

گزرتے ماہ و سال میں اپنے آپ کو ایک خول میں مقید کرنے کے باوجود وہ اتنا تو جان چکی تھی کہ ''اسد رحمان'' اس کی زندگی میں آنے والا سب سے مختلف' سب سے منفرد اور سب سے خاص انسان ہے۔ جو بنا کہے اس کے دل کی ہر بات جان لیتا ہے۔ جس کی موجودگی اس کے لیے کسی گھنے پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں کی مانند ہے اور جو اس کی غیر موجودگی میں بھی اس کی ذات کو ڈیفنڈ (Defend) کرکے اسے اپنی ہی نظروں میں معتبر کردیتا ہے۔ لیکن وہ پوجے جانے کے لائق اپنے شوہر کو یہ نہیں بتا سکتی کہ وہ اس پر ''اعتبار'' کرتے ہوئے اب بھی ڈرتی ہے۔ لیکن اس سے محبت کرنے سے بھی خود کو روک نہیں پا رہی۔

☼ ☼

ریگانہ امجد بخاری

وہ اک پری ہے

تیسری قسط

خون ہی خون تھا مقتل کے ہر اک گوشے میں
ڈر کے قاتل سے میں سر اپنا کدھر رکھ دیتا

اذان کے دل و دماغ میں ایک چھناکا سا ہوا تھا۔ جیسے اچانک کچھ ٹوٹ گیا ہو۔ ایک عجیب سی گونج تھی۔ جس نے اسے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔

فہیم کی آواز اسے صدائے بازگشت کی طرح چاروں طرف سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ الفاظ اس کی سماعتوں کو مجروح کر رہے تھے۔ اس کے پورے وجود کو زخما گئے تھے۔ اذان نے اپنی اس بے ساختہ کیفیت پر غور کیا تو اسے ایک عجیب سے احساس نے آگھیرا۔ خوف کا احساس۔۔۔ ایک عجیب سا ڈر تھا۔۔۔ کسی کو کھو دینے کا ڈر۔۔۔ ڈر جو ایک سائے کی طرح انسان کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتا ہے۔

نئی نئی خواہشیں' نئے نئے اندیشے پیدا کرتی ہیں۔ نئے نئے اندیشے نئی نئی خواہشیں تخلیق کرتے ہیں اور خواہش کے ادھورا رہ جانے کا پورا نہ ہونے کا ڈر تو ہر خواہش کے باطن میں چھپا ہوتا ہے۔ لیکن ڈر اور خوف کے باوجود انسان خواہش کا دامن نہیں چھوڑتا یہ الگ بات ہے کہ چھن جانے کا احساس اسے خوف زدہ کرتا ہی رہتا ہے وہ خوف جو ایک مفروضہ ہے۔ وہ المیہ جو ابھی رونما ہی نہیں ہوا۔ اندیشہ ہی تو کہلائے گا۔ مستقبل صرف خواب ہی تو ہے۔ خوف ناک ہو یا حسین' محتاج تعبیر ہے۔ ماضی کتنا ہی بھیانک کیوں نہ ہو ایک تصویر ہی تو ہے' بے جان تصویر۔۔۔ حقیقت صرف حال ہے۔ حال زندگی ہے۔ جو ہوا سو ہو چکا اور جو ہونا ہو وہ ہو جایا کرتا ہے۔ خوف کسی خطرے کو ٹال تو نہیں سکتا نا؟

صرف خوف زدہ رہنے سے تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا نا؟ عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور عمل کے لیے خوف سے نجات کی' تو اذان نے بھی عمل کیا۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کا عمل۔۔۔ اور جلد ہی وہ اپنے اس عمل میں کامیاب ہو گیا۔

اس کے لبوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ آکر معدوم ہو گئی۔۔۔ پھر وہ اپنے اسی مخصوص دلکش لہجے میں فہیم سے مخاطب ہوا۔

"مائی ڈیر رانا فہیم! سجدے سے انکار کرنے والا حسن آدم سے بے خبر ابلیس محبت سے محروم تھا۔ وہ رحمت الٰہی سے مایوس ہوا تو مردود قرار دے دیا گیا۔ ابلیس کا معبود تو تھا۔ مگر محبوب کوئی نہیں تھا اور لعین ہونے کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ انسان کی محبت کے بغیر اللہ کا سجدہ انا کا سجدہ ہے۔"

انسٹی ٹیوٹ کے پرسکون ماحول میں صرف اذان کی گمبھیر آواز گونج رہی تھی۔ اس کی شخصیت میں جو مقناطیسی کشش تھی اور اس کی ذات کے گرد جو دلکشی کا ہالہ تھا۔ اس سے وہاں موجود ہر شخص متاثر تھا۔ اس کی شخصیت بڑی مغلوب کر لینے والی تھی۔ فہیم نے اس کی شخصیت سے خائف ہوتے ہوئے اس کی بات توجہ سے سننے کا پوز دیا۔ جو اپنے اسی دلکش لہجے میں بول رہا تھا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تو انسان سے محبت کرتا ہے۔ ابلیس اور اس کے پیروکار انسان سے محبت نہیں کرتے اور کر بھی کیسے سکتے ہیں۔ انسان سے محبت وہی کر سکتا ہے جس کے دل میں اللہ کی محبت ہو اور جس پر اللہ مہربان ہو۔"

فہیم جو بظاہر بڑے انہماک سے اذان کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر عجیب سے انداز میں گویا ہوا۔

"دھت تیرے کی۔۔۔ پھر فلسفہ۔۔۔ آدھا گھنٹہ لیکچر جھاڑا ہے۔ مجال ہے جو ذرا سمجھ آئی ہو۔۔۔ گل بنتی ہے۔ آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو۔"

اس کی بات سن کر اذان پھر مسکرایا' اور بولا۔

"مطلب سمجھ میں آتا تو آج تم اذان فیضی کی جگہ کھڑے ہوتے۔۔۔ خیر میں ایک اور کوشش کرتا ہوں اور تمہیں ایک نظم سناتا ہوں۔ شاید تم سمجھ سکو۔"

خلوصِ سجدہ سجود عنقا
محبتوں کا وجود عنقا
وہ سچے جذبے مہکنے والے
خوشی کے پنچھی چہکنے والے
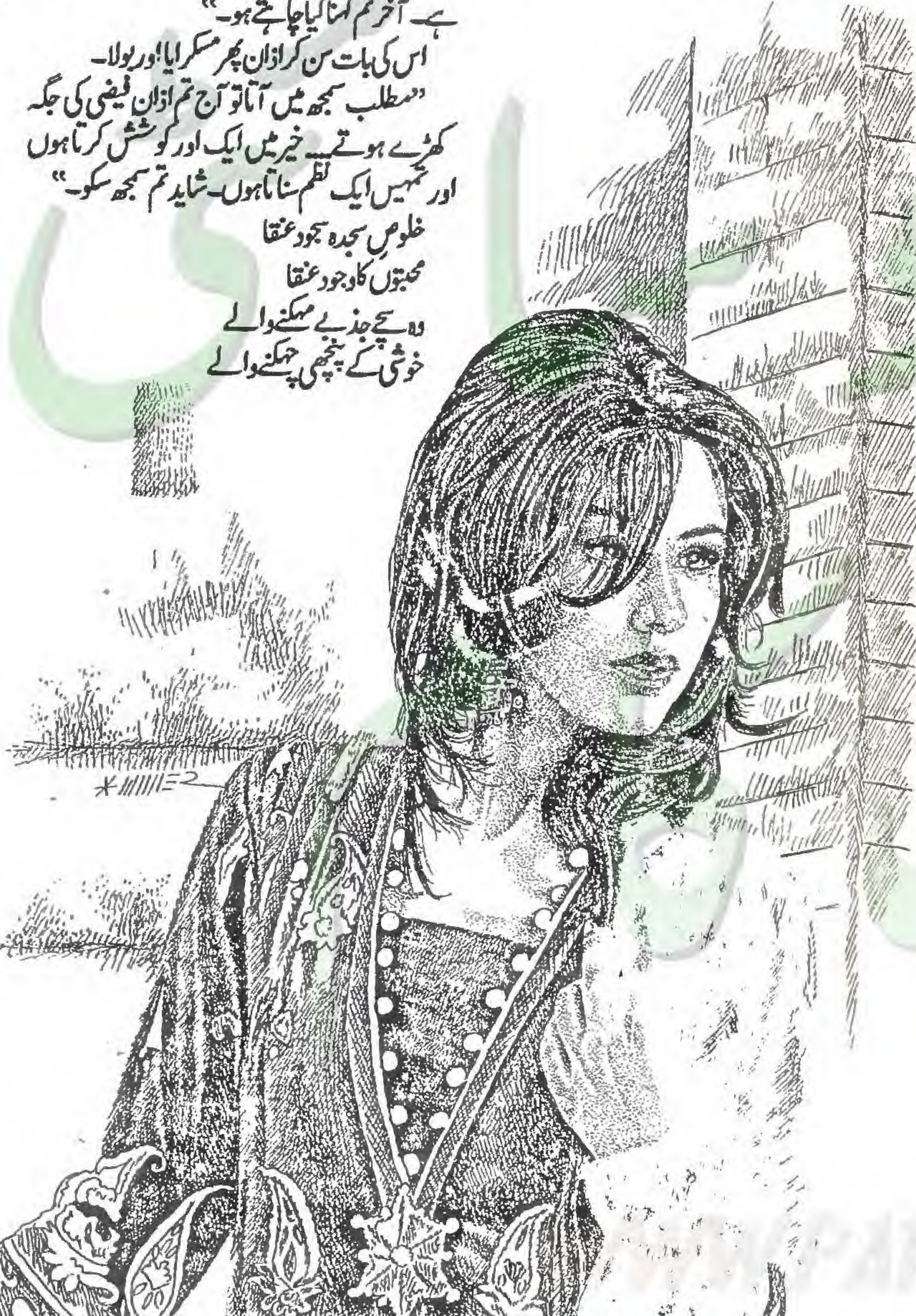
جواب توناپاب ہوگئے ہیں
اندھیری راتوں میں کھوگئے ہیں
وہ آرزوئیں دھنک میں لپٹی
وہ صورتیں چاندنی میں سمٹی
انا پرستی کی زد میں آکر
منافقت کی سناں کے نیچے
ہر ایک لمحہ
سسک رہی ہیں
تمام سوچیں
دہک رہی ہیں
تو کاش کوئی پیام لائے
محبتوں کے سلام لائے
کہیں سے بادہ وجام لائے
کوئی سہانی سی شام لائے
تو پھر شکستہ وجود میرا
بنام چاہت دوام پائے
مگر یہ ممکن نہیں ہے شاید
کہ دور حاضر کی نفسا نفسی میں
معجزوں کا ظہور عنقا
بتوں کی صورت میں نور عنقا

اذان کی آواز گونج کر خاموش ہوگئی تھی۔

ایک گہری خاموشی انسٹی ٹیوٹ کی دیواروں پر چھا گئی۔ لگتا تھا کسی نے جادو کی چھڑی گھما کر سب کو پتھر کا کردیا ہو۔ اس سکون میں صرف وال کلاک کی مدھم سی ٹک ٹک اس خاموشی کو مجروح کررہی تھی کہ اچانک ماحول جاگ گیا۔

"واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ کیا کہنے۔۔۔ کیا ہی خوب صورت نظم ہے۔" عبداللہ' علی اور ولیکا نے بے ساختہ داد دی۔ اذان نے استفہامیہ نظروں سے فہیم کی طرف دیکھا جو برا سامنہ بنائے "میں نہ مانوں" کی پالیسی پر عمل پیرا ڈھٹائی سے کہہ رہا تھا۔

"بات سمجھ میں نہیں آئی۔" اذان نے ایک طویل سانس لی اور اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

"ہاں میں جانتا ہوں۔"

مرد ناداں پہ کلام نرم و نازک بے اثر

پھر بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے چند لمحوں کو رکا اور بولا۔

"پنجابی میں کسی نے کیا خوب کہا ہے۔"

گل سمجھ لئی تے رولا کی؟
ایہہ رام' رحیم تے مولا کی؟

اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"اس وقت کون آگیا؟" زارا جو ابھی بھی گھر کی صفائی وغیرہ سے فارغ ہوئی تھی اور کھانا پکانے کے ارادے سے کچن کی طرف بڑھی تھی کہ بیرونی دروازے کی دستک پر چونک کر رکی اور خود سے سوال کیا۔

پڑوسیوں میں سے کوئی اب تک ان کے گھر نہیں آیا تھا۔ فرزان کے آنے کا یہ وقت نہیں تھا۔ وہ رات گئے ہی گھر واپس لوٹتا تھا۔ ابھی وہ اسی خیال میں گم تھی کہ دستک دوبارہ ہوئی۔ اس دفعہ دستک میں تیزی تھی۔

"وہ شاید امی ہوں۔۔۔ اتنی گرمی میں باہر کھڑی ہیں۔" اس خیال کے آتے ہی وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی اور دروازہ کھولنے سے پہلے احتیاطاً" پوچھا۔

"کون؟"

"حنا نور۔۔۔" باہر سے سریلی سی آواز سنائی دی اور زارا نے حیرت زدہ سے انداز میں دروازہ کھولا تو حنا نور اور ہما نور کے چہرے نظر آئے۔ زارا کو حیرت اس بات پر تھی کہ دونوں کو اس جگہ کا پتا کیسے چلا اور اس کی حیرانی اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔

"کیا ہمارے سینگ نکل آئے ہیں؟" ہما نے اپنے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے ساختہ سوال کیا۔

"کک۔۔۔ کیا مطلب۔" زارا نے گھبرا کر پوچھا۔

"اوہ ہو۔۔۔ مطلب یہ کہ اتنی حیران' پریشان کیوں ہو؟ ایسے دیکھ رہی ہو جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو؟ یا

یادداشت گم ہوگئی ہے کیا؟ اگر تھوڑی دیر اور دروازے پر اسی طرح ظالم سماج بنی کھڑی رہیں تو اس گرمی سے ہمارے دماغ ضرور پگھل جائیں گے۔" ہما کے بجائے حنا نے اپنے مخصوص شرارتی انداز میں کہا۔

"اوہ سوری۔۔۔ دراصل تمہاری اچانک آمد نے مجھے حیران ہی اتنا کردیا کہ میں۔۔۔ آؤ آؤ اندر آؤ۔۔۔" زارا نے شرمندہ سے انداز میں ایک طرف ہٹ کر انہیں راستہ دیتے ہوئے کہا۔

کمرے کے ٹھنڈے ماحول میں ان دونوں کے اعصاب کچھ پرسکون ہوئے تو انہوں نے بیڈ پر بیٹھ کر ٹانگیں پھیلالیں۔ زارا ان دونوں کو بٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی تھی۔ ہما نے دوپٹہ سے ماتھے پہ آیا پسینہ پونچھ کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔

"یہ لو ٹھنڈا ٹھنڈا شربت پی کر خود بھی ٹھنڈی ہوجاؤ۔" زارا تین گلاسوں میں شربت لے آئی تھی۔ ان دونوں کی طرف بڑھا کر خود بھی اپنا گلاس لے کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"اچھا باقی باتیں کرنے سے پہلے میری الجھن دور کرو۔ یہ بتاؤ اس گھر کا ایڈریس تمہیں کس نے بتایا۔" زارا نے شربت کے خالی گلاس ٹرے میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"قمر بھائی چھوڑ کر گئے ہیں۔ جس دن تمہارا سامان اس گھر میں شفٹ ہوا تھا تو سامان شفٹ کرنے والوں میں قمر بھائی بھی شامل تھے۔"

ہما نے تفصیل سے جواب دیتے ہوئے ایک لمحے کے لیے توقف کیا تو زارا نے ایک طویل سانس لی۔ قمر' فیضان فیضی کا شاگرد تھا اور فرزان کا دوست بھی۔

"اصل میں ہم لوگ بلوچستان جارہے تھے۔ سوچا تم سے الوداعی ملاقات کرلیں۔" ہما نے اپنے آنے کی وجہ بیان کی۔

"خیر سے جارہی ہو بلوچستان۔" زارا نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

"ہم دونوں کی وہاں جاب ہوگئی ہے۔ تعلیم فاؤنڈیشن گرلز اسکول میں بطور ٹیچر دونوں نے اپلائی کر رکھا تھا۔ وہاں سے کال لیٹر آگیا ہے۔" حنا نے فخریہ انداز میں کہا۔

"گڈ نیوز۔۔۔ یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔۔۔ وہاں جاکے سیٹل ہونے کے بعد مجھے بھی بتانا۔ وہاں کا ماحول' مراعات وغیرہ۔۔۔ شاید فرزان مجھے اجازت دے دیں تو میں بھی اپلائی کردوں۔" زارا نے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ تم اپنا سیل نمبر وغیرہ دے دو۔ وہاں جاکے فوراً" ہی تم سے رابطہ کریں گے۔" ہما نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ زارا اٹھ کر کاغذ پین تلاش کرنے لگی۔ اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی۔

"اوہ اب کون آگیا۔۔۔ آج تو لگتا ہے مہمانوں کا اور میرے حیران ہونے کا دن ہے۔" زارا نے مسکرا کے کہا۔

"یار حیران بعد میں ہونا' پہلے جاکر دروازہ کھولو۔ اتنی گرمی میں باہر کھڑا ہونا ایک امتحان ہے۔" حنا نے زارا کو ٹوکا تو زارا کاغذ تلاش کرنے کا ارادہ چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کے پوچھنے سے پہلے ہی ذکیہ بیگم کی آواز سنائی دی۔

"دروازہ کھولو بیٹا۔"

زارا نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ ان سے سلام دعا کرکے پیار لے کر وہ انہیں بھی اسی کمرے میں لے آئی۔

"السلام علیکم آنٹی۔" حنا' ہما نے کھڑے ہوتے ہوئے ایک ساتھ سلام کیا۔ ذکیہ بیگم نے قریب آکر دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہیں دعاؤں سے نوازا۔

"باہر بہت گرمی ہے نا؟" حنا نے ذکیہ بیگم کے سرخ چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں بیٹا جون' جولائی کے مہینے میں تو آگ ہی برسا کرتی ہے۔ شام میں ٹھنڈک ہوجاتی ہے تو سکون ہوتا ہے۔"

زارا ان کے لیے بھی شربت بنالائی تھی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے گلاس لے کر زارا کو دعا دی۔

"اللہ جزائے خیر دے۔" اور گلاس ہونٹوں سے لگالیا اور گھونٹ گھونٹ شربت پیتی رہیں۔

"اچھا زارا اب ہمیں اجازت دو۔ ابھی ہمیں بہت سارے کام کرنے ہیں۔"

"ارے یہ کیا بات ہوئی۔ میں آئی اور تم لوگ اٹھ کھڑی ہوئیں، بیٹھو تم لوگ۔" ذکیہ بیگم نے شفقت سے کہا۔

"ہاں نا! میں بس کھانا پکانے ہی جارہی تھی، کھانا کھاکے جانا، جب تک گرمی بھی کچھ کم ہوجائے گی۔" زارا نے محبت سے کہا۔

"نہیں آنٹی ہم لوگ بہت دیر سے آئے ہوئے ہیں۔ آپ لوگ باتیں کریں۔ ان شاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔" ہما نے شائستگی سے کہا۔

"او کے زارا، تمہارا کھانا ادھار رہا۔ اگلی بار آئیں گے تو ضرور تمہارے ہاتھ کے پکے ہوئے مزے دار کھانے کھائیں گے۔" حنا نے زارا کے گلے لگتے ہوئے شرارت سے کہا۔ زارا بھی مسکرادی۔

"میں پہنچ کے رابطہ کروں گی۔ اپنا نمبر تو لکھوادو۔" حنا نے یاد دلایا اور زارا جلدی جلدی کاغذ پر اپنا اور ان کا نمبر نوٹ کرنے لگی۔

ان دونوں کو رخصت کرکے زارا اندر آئی تو ذکیہ بیگم کو دیکھ کر اسے خیال آیا۔ وہ اس وقت غیر متوقع طور پر کیسے آگئیں۔ کچھ دن پہلے ہی تو وہ ہو کر گئی تھیں۔ سامان وغیرہ دے کر۔

"امی آپ آرام سے یہاں بیٹھ جائیں، میں کھانا پکانے جارہی تھی، یہ بتائیں کیا کھائیں گی۔"

"ارے کھانے وانے کو چھوڑو۔ تم یہاں میرے پاس بیٹھو، میں تو ترس گئی ہوں لوگوں سے بات کرنے کو۔ تنہائی سی تنہائی ہے۔" ذکیہ بیگم بھرائے لہجے میں بولیں۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ مگر کھانے کا ٹائم ہورہا ہے، مجھے پتا ہے آپ نے کچھ نہیں کھایا ہے میں بس دو منٹ میں سالن چڑھا کے آتی ہوں، پھر ڈھیر ساری باتیں کروں گی آپ سے؟" زارا نے ان کا ہاتھ پیار سے سہلاتے ہوئے کہا اور اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"اف اتنی گرمی میں بچی چولہے کے آگے کھڑی ہوگی۔" وہ بڑبڑائیں۔

"ایک تو اس گرمی نے برا حال کردیا ہے۔ انہوں نے پنکھے کی طرف دیکھا جو سست رفتاری سے چل رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

گرمی لگی تو خود سے الگ ہوکے سو گئے
سردی لگی تو خود کو دوبارہ پہن لیا
بیدل لباس زیست بڑا دیدہ زیب تھا
پر ہم نے اس لباس کو الٹا پہن لیا

"ہی از فرزان۔" شاہ رخ نے فرید خان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا تو فرید خان نے پہلی مرتبہ نظر بھر کر بغور فرزان کی طرف دیکھا۔

سڈول اور مضبوط جسم کا مالک۔ بغیر کنگھی کیے بکھرے ہوئے بال، ستواں ناک، فراخ پیشانی، سرخ و سفید رنگت، سرو قد، گہری آنکھیں جن میں ذہانت کی چمک تھی۔ مجموعی طور پر فرزان ایک خوب صورت نوجوان تھا۔ لیکن فرید خان کی نظر میں یہ سب کچھ اہم نہیں تھا۔ اس کی دلچسپی کی وجہ اس کے الفاظ اور اس کا لب ولہجہ تھا۔

چائے پینے کے لیے فرزان استاد اچھو اور شاہ رخ کے ہمراہ "بابو کینٹین" میں داخل ہوا تھا اور ظاہر ہے کہ رات دو بجے "چائے" پورے شہر میں سوائے بابو کینٹین کے اور کہاں ملتی؟ یہ واحد شاپ تھی جو چوبیس گھنٹے کھلی رہتی تھی۔

سرشام ہی شاہ رخ آپہنچا تھا۔ جب وہ لوگ کام سے فارغ ہوکر گھروں کو جانے ہی والے تھے۔ باقی سب تو اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ لیکن فرزان، استاد اچھو اور شاہ رخ کا ڈیرہ اسی مخصوص زیر تعمیر عمارت میں جم گیا۔ جو ان کی سٹنگ روم بھی تھی اور گیسٹ روم بھی۔ شاہ

رخ فرزان کا کالج کے زمانے کا دوست تھا اور ان دنوں لاہور میں ایک ریسٹورنٹ میں بطور منیجر جاب کررہا تھا۔ کبھی کبھار گھر آتا تو فرزان سے ملنے ضرور آتا اور جب بھی آتا ان کی محفل اسی طرح ساری رات جمتی تھی۔

آج بھی چائے کا موڈ بنا تو تینوں بابو کینٹین آپہنچے، لیکن جوں ہی وہ لوگ ہال میں داخل ہوئے شاہ رخ کی نظر سائیڈ پر بنے کیبن میں براجمان ایک شناسا چہرے پر پڑی تو اس کے قدم رک گئے۔ پھر وہ فرزان سے مخاطب ہوا۔

"آؤ آج تمہیں تمہارے جیسے ایک اور سرپھرے سے ملواتا ہوں۔"

پھر دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے سائیڈ میں بنے کیبنز کی قطار میں سے ایک کیبن میں داخل ہوگئے۔

فرید خان نے باری باری سب سے مصافحہ کیا اور نہایت شائستگی سے مخاطب ہوا۔

"اور کیسی گزر رہی ہے آپ سب لوگوں کی۔"

اور اس کے جواب میں فرزان نے بیدل حیدری کے دو شعر سنادیے۔

ساتھ ہی شاہ رخ نے اس کا تعارف کروایا تو فرید خان چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد گویا ہوا۔

"اچھا تو یہ ہیں فرزان فیضی صاحب۔"

اور اس مرتبہ چونکنے کی باری فرزان کی تھی۔ اس نے حیرت سے فرید خان کی طرف دیکھا پھر اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"میرے خیال میں ہم اس سے پہلے کبھی نہیں ملے۔"

فرید خان کے ہونٹوں پر ایک پراسراری مسکراہٹ نمودار ہوگئی جو غالباً اس کی شخصیت ہی کا حصہ تھی پھر وہ بولا اور اس کی مسکراہٹ کی طرح اس کے الفاظ بھی پراسراریت لیے ہوئے تھے۔

"لیکن اس کے بعد ضرور ملتے رہیں گے۔"

فرزان نے ایک لمحے کے لیے اس کے الفاظ پر غور کیا پھر مڑ کر شاہ رخ کی طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ اندا میں دریافت کیا۔

"ان کا تعارف نہیں کرواؤ گے شاہ رخ۔" شاہ ر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے مسکرا کے جواب دیا۔

میں اس کا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

"بھئی میں ان کا تعارف کیا کرواؤں۔"

فرید خان نے ہاتھ اٹھا کر شاہ رخ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"زیادہ کھمبے پر نہیں چڑھاؤ مجھے، میں خود اپنا تعارف کروادیتا ہوں۔" پھر اس نے فرزان کی طرف دیکھا اور کہا۔

"نام فرید خان ہے اور، پتن ترقیاتی تنظیم کی یوتھ ایکسچینج فورم میں بطور والنٹیر کام کرتا ہوں، دنیا کے اس اسٹیج پر شاید میرا اتنا ہی کردار ہے جو میں بساط بھر ادا کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔"

فرزان نے چند لمحے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جیسے نظروں ہی نظروں میں اسے تولا۔ پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں اس احمقانہ بات پہ اتفاق نہیں کرتا مسٹر فرید خان۔ یہ دنیا ایک اسٹیج ہے نہ ہی ہم کوئی کردار۔

ہم دنیا میں کوئی کردار لے کر نہیں آتے ہم مکمل طو پر بے کردار پیدا ہوتے ہیں ایک سادہ کاغذ۔

جسے ہم اپنا کردار کہتے ہیں وہ دوسروں کی تحریر ہوتی ہے۔"

فرزان کی بات مکمل ہوئی تو شاہ رخ نے گھبرائے ہوئے انداز میں فرید خان کے چہرے کی جانب دیکھا جو پوری توجہ فرزان پر مرکوز کیے بیٹھا تھا اور اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ کسی بھی قسم کے تاثرات سے یکسر عاری۔

شاہ رخ نے فرزان کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ بھی سپاٹ تھا۔ ایک واحد استاد اچھو تھا جو مسلسل خاموش تھا لیکن اس کے ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ اس بات

کا ثبوت تھی کہ وہ اردگرد سے بے نیاز نہیں تھا۔
فرید خان یک لخت اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا اور فرزان کی طرف دراز کرتے ہوئے بولا۔
"آپ سے مل کر خوشی ہوئی فرزان صاحب۔"
ایک لمحے کی تاخیر کے بعد فرزان نے بھی اپنا ہاتھ بڑھایا اور فرید خان کا بڑھا ہوا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔

لالی میرے لعل کی جت دیکھو تب لال
لالی دیکھن میں گئی' میں بھی ہو گئی لال

☼ ☼ ☼

"انسان فطرتاً" جلد باز ہے ابھی اس کے خاکی وجود میں روح پھونکی ہی گئی تھی کہ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔
یہ جلد بازی اس کے خمیر میں ہے وہ فوری طور پر اپنی زندگی کو مکمل کرنا چاہتا ہے وہ جلدی جلدی اسے بناتا ہے بناتے بناتے بگاڑتا ہے اور زندگی اس کے ہاتھ سے یوں نکل جاتی ہے جیسے ہاتھ آیا کبوتر۔۔۔۔ انسان میانہ روی کو برداشت نہیں کرتا ایک ہی دن میں بہت سارے کام ختم کرنا چاہتا ہے کیا زندگی کمانے' کھانے' پینے اور سونے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ کیا زندگی کے نصیب میں فرصت نہیں۔ کیا ہمارے پاس کسی کے آنسو پونچھنے کا بھی وقت نہیں۔
ہم ہر انسان کو اپنی ضرورت اور فائدے کی حد تک جانتے ہیں۔ کیا انسان' انسانوں کو انسانیت کے حوالے سے کبھی نہیں پہچانے گا۔ وہ کون لوگ تھے جو خود پیاس سے مر جاتے تھے اور پانی اپنے دوسرے پیاسے بھائی کو دے جاتے تھے۔۔۔۔ کیا وہ لوگ تھے بھی یا یہ صرف ہمارا وہم ہے۔ آخر ہم کب سمجھیں گے کہ جو چیز چلنے سے حاصل نہیں ہوتی وہ ٹھہرنے سے حاصل ہو جاتی ہے۔ آخر ہم کیوں نہیں سمجھتے کہ مصروفیت غلامی ہے اور فرصت آزادی۔۔۔۔"
اذان دریچے میں کھڑا بہت دیر سے گہری سوچ میں گم تھا۔ دن بھر کی سخت گرمی کے بعد ایک گرم گرم زردی مائل دم گھونٹ دینے والا دھواں سا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

آسمان صاف تھا ایک بھی ستارہ نظر نہیں آ رہا تھا نہ ہی کوئی پرچھائیں پڑ رہی تھی جب وہ دریچے میں کھڑا ہوا تھا تو رات میں تبدیل ہوتی شام خاموش اور افسردہ تھی اسے کھڑے کھڑے اور خیالوں میں کھوئے نہ جانے کتنی دیر ہو گئی تھی چاروں طرف پھیلے خوابیدہ سکوت نے اسے احساس دلایا تھا کہ رات گہری ہو گئی ہے اس نے خیالات کی ڈور وہیں سے باندھنی چاہی جہاں سے ٹوٹی تھی کہ ہلکی سی دستک پر اس نے بے ساختہ وال کلاک کی طرف دیکھا اور پھر بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔
ذکیہ بیگم کو دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تھی۔ مگر خاموشی سے اس نے ایک طرف ہو کر انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ رات کے اس پہر ذکیہ بیگم کی اس کے کمرے میں آمد خلاف معمول تھی اسے تشویش ہوئی تھی مگر خاموشی سے ان کے بیٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔
ذکیہ بیگم بیڈ کے ایک طرف بیٹھ کر اذان کی طرف دیکھنے لگیں۔ اذان کو ان کی خاموشی سے الجھن ہوئی۔ پھر وہ خود ہی ان سے مخاطب ہوا۔
"خیریت امی؟ آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔"
ذکیہ بیگم نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر دھیرے سے بولیں۔
"فرزان نے تو گھر چھوڑ دیا۔ لیکن تم تو گھر میں ہوتے ہوئے بھی نہیں ہوتے میرا پریشان ہونا تو فطری سی بات ہے۔"
ذکیہ بیگم کی بات پر اذان شرمندہ سا ہو گیا۔
"اوہ۔ معاف کیجیے گا میں آج کل کچھ زیادہ ہی مصروف تھا جب ہی آپ کو شکایت ہوئی۔ آئندہ میں خیال رکھوں گا۔"
"میں یہاں تمہیں شرمندہ کرنے نہیں آئی۔ میں کسی اور مقصد سے آئی تھی۔"
اس بار اذان نے ذکیہ بیگم کی طرف غور سے دیکھا جہاں پریشانی کے گہرے سائے لہراتے نظر آ رہے تھے۔
"کیا ہوا ہے امی کچھ بتائیں تو۔" اذان نے تشویش سے پوچھا۔ ذکیہ بیگم نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور بولیں۔
"کچھ دن پہلے لاہور سے پروین کا فون آیا تھا کہ اس کے شوہر کی طبیعت خراب ہے تمہارے ابو اس کا پتا کرنے گئے تھے۔"
"اوہ۔ مجھے پتا نہیں تھا۔ اب کیسی طبیعت ہے ان کی۔ خیریت تو ہے نا؟"
اذان نے شرمندہ سے انداز میں دریافت کیا۔ وہ جانتا تھا کہ پروین کی طرح اور بہت سارے لوگ بھی فیضی صاحب کے عقیدت مند تھے اور مختلف معاملات میں نا صرف ان سے دعا کے خواستگار رہتے تھے بلکہ اکثر امور میں ان سے مشاورت بھی کرتے تھے۔ وہ ابھی ان ہی خیالات میں گم تھا کہ ذکیہ بیگم کی آواز سن کر دوبارہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔
"ان کی طبیعت کا تو پتا نہیں۔ میری پریشانی کی وجہ کچھ اور ہے۔"
ذکیہ بیگم نے آہستہ سے کہا۔ اذان کی سوالیہ نظریں ان کے چہرے پر ٹک گئیں۔
"تمہارے ابو دو تین دن میں آنے کا کہہ کر گئے تھے۔ لیکن آج پورے آٹھ دن ہو گئے ہیں وہ واپس آئے ہیں نہ ان کے بارے میں کوئی اطلاع ملی ہے۔ ایسا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ تمہارے پاس پروین کا نمبر ہو گا تم کل فون کر کے اپنے ابو کی خیریت معلوم کر لو۔"
ذکیہ بیگم کا لہجہ نم ہو گیا۔ اذان نے اپنی بے خبری پر خود کو لعنت ملامت کی۔ وہ اٹھ کر ذکیہ بیگم کے قریب بیٹھ گیا اور ان کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر دبایا۔
"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ابھی فون کر لیتا مگر یہ وقت مناسب نہیں میں صبح ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہ ہی کروں گا۔" اذان نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا تو ذکیہ بیگم دھیمے سے مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

"خالص مال" کا گاڑھا اور خالص دھواں پورے کمرے میں چکراتا پھر رہا تھا۔ جس نے ماحول کو بوجھل بنا رکھا تھا۔ آواز دھوئیں کے تعاقب میں تھی یا دھواں آواز کے تعاقب میں۔ لیکن بہرحال کمرے میں صرف فرزان کی آواز گونج رہی تھی۔

دل بے مدعا ہے میں نہیں ہوں
کوئی دم کی ہوا ہے میں نہیں ہوں
گلستاں ہے گھٹا ہے میں نہیں ہوں
نسیم جاں فزا ہے میں نہیں ہوں
بقید ابدیت مشتاق میں ہوں
با اطلاقاً" خدا ہے میں نہیں ہوں

فرزان خاموش ہوا تو کمرے میں کچھ دیر چاروں طرف کھوکھلی سی خاموشی رقص کرتی رہی اس خاموشی کو دروازے پر ہونے والی دستک نے مجروح کیا تھا۔
محبوب خان کے اس کمرے میں محبوب خان کے علاوہ اس وقت فرید خان' فرزان اور استاد اچھو بھی موجود تھے۔ ان دنوں فرزان اور محبوب خان کی ملاقاتوں میں کافی "برکت" پیدا ہو چکی تھی۔ اگر محبوب خان اس سے ملنے نہیں آتا تو فرزان خود اس کے پاس آ جاتا تھا بہرحال میل ملاقات میں کچھ افاقہ ضرور ہوا تھا۔
کمرے میں چاروں طرف کثیف سا دھواں چکراتا پھر رہا تھا۔ دستک کی آواز پر مشتبہ نظروں سے سب ہی نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا سب کے چہروں پر عجیب سے تاثرات تھے۔ ان میں فکر اور پریشانی کا عنصر نمایاں تھا۔ اس بے وقت دستک کے بارے میں کوئی بھی یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ آنے والا کون ہے۔
"کون ہو سکتا ہے اس وقت؟" استاد اچھو نے پریشانی سے کہا۔ فرزان نے چونک کر استاد اچھو کو دیکھا پھر اس کی نظر فرید خان پر پڑی جس کے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ فرزان کا ماتھا ٹھنکا۔ ایک واحد فرید خان تھا جو مکمل طور پر پرسکون تھا باقی سب ہی حواس باختہ دکھائی دے رہے تھے۔ فرزان کی سوالیہ نظریں فرید خان کے چہرے پر جم گئیں۔ فرید

خان کی نظریں فرزان کی نظروں سے ٹکرائیں تو اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔ شاید وہ فرزان کی خاموش نظروں میں چھپے ہوئے سوال کو سمجھ چکا تھا۔

"مس نیلم شیراز ہوں گی۔" فرید خان نے پرسکون انداز میں کہا۔

فرزان کا دماغ گھوم گیا۔

"کیا مطلب؟" وہ تلخ لہجے میں بولا

"ان کا یہاں کیا کام؟"

"میں نے بتایا تھا کہ آج محبوب خان کے ہاں ہم لوگ بیٹھیں گے۔ تم نے تو ملاقات سے انکار کر دیا۔ مگر مس نیلم کو تم سے ملنے کا اشتیاق ہی اتنا تھا کہ شاید وہ خود یہاں پہنچ گئی ہیں۔"

فرزان کے ذہن میں فرید خان کی باتیں گونجنے لگیں۔ جب کیبن میں بیٹھتے ہوئے فرزان نے فرید خان سے سوال کیا تھا کہ آپ مجھے کیسے جانتے ہیں، تو جواب میں فرید نے کہا تھا۔

صرف میں ہی نہیں بلکہ ہماری تنظیم کی پوری باڈی آپ کو جانتی ہے۔ ہماری ڈسٹرکٹ کوآرڈینیٹر مس نیلم بہت عرصے سے اس بات کی خواہش مند ہیں کہ کسی بھی طرح آپ کو تنظیم میں شامل کیا جائے اور یہ ہی نہیں تنظیم کے ہیڈ سرورداری تک بھی آپ کے حوالے سے کافی سفارشات پہنچی ہیں اور بحیثیت ایک رائٹر وہ بھی آپ کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔

پچھلے دنوں ہماری ایک میٹنگ میں شاہ رخ بھی شریک ہوا تھا۔ جہاں معاشرے کی فلاح و بہبود کے حوالے سے ایک سیمینار منعقد کیے جانے کے حوالے سے ڈسکشن کی گئی تھی۔ تو شاہ رخ نے بتایا تھا کہ اس حوالے سے ایک بہت اچھے رائٹر ہمارے اپنے ہی شہر میں موجود ہیں جو بہت اچھا فیچر بھی لکھ سکتے ہیں اور نیو جنریشن کی اصلاح کے لیے خاصا گریٹ ایڈورک کر سکتے ہیں۔ تو مس نیلم کی نظریں شاہ رخ کے چہرے پر جم گئی تھیں اور ان کے ہونٹوں سے ایک ہی جملہ سرسراتا ہوا نکلا تھا۔

"آپ کا مطلب ہے فرزان فیضی۔۔۔"

اور اس بات نے شاہ رخ کو اچنبھے میں ڈال دیا تھا کہ مس نیلم، فرزان کو کیسے جانتی ہیں۔

"مڑا تم سب کو سانپ کیوں سونگھ گیا۔ ٹیک اے ام دیکھتا ہے۔" محبوب خان نے کہا اور فرزان نے اپنے خیالات سے چونک کر محبوب خان کو دیکھا جو دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد محبوب خان کے پیچھے داخل ہونے والی شخصیت کو دیکھ کر سب کا سانس جیسے سینے میں ہی رک گیا تھا۔

قیامت خیز سراپے سے اٹھنے والے امپورٹڈ پرفیوم کی خوشبو نے کمرے میں پھیلی چرس کی بدبو کو کم کر دیا تھا۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ صراحی دار گردن میں پڑی سونے کی چین کو اپنی نرم و نازک مخروطی انگلیوں سے بل دیتے اس نے مسکرا کر مدھم سی آواز میں بغیر کسی کو دیکھے ہیلو کہا تھا۔ جواب میں کوئی کچھ نہیں بول سکا تھا۔

سب ہی کی نظروں میں اشتیاق تھا اور وہ مبہوت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ نیلم کو بخوبی احساس تھا اسی قسم کی پذیرائی کا۔ وہ ایک انداز سے چلتی ہوئی آگے بڑھی۔ سانچے میں ڈھلا گداز جسم، سیاہ مشکبو دراز گیسو قدرت کا وہ حسین شاہکار۔۔۔ پری تمثال فرزان کے قریب جا کے رک گئی۔ اسے کھڑا دیکھ کر فرزان اپنے اسی مخصوص لہجے میں گویا ہوا۔

"مس نیلم کہتے ہیں شہر میں ایک مرتبہ مست بابا آ گئے۔ آتے ہی انہوں نے حکم دیا کہ ایک بہت بڑی دیگ لائی جائے۔ لوگ دوڑ پڑے، دیگ لائی گئی، پھر حکم دیا اب اس دیگ کے سائز کے مطابق چولہا بنایا جائے۔ چولہا بن گیا۔ حکم ہوا لکڑیاں رکھ کر آگ جلا دی جائے۔ چولہا جل گیا۔ مست بابا نے حکم دیا۔ دیگ میں پانی بھر کر ڈھکنا لگا دیا جائے اور اسے چولہے پر رکھ دیا جائے۔ اگلی صبح ڈھکنا اٹھایا گیا تو دیگ پلاؤ سے بھری ہوئی تھی۔ سارے شہر میں اعلان کیا گیا کہ حاجت مند آئیں، انہیں کھانا کھلایا جائے گا۔ اس اعلان پر سارا شہر تھالیاں اٹھا کر پہنچ گیا۔ کھانا تھالیاں بھر بھر کر تقسیم کیا جانے لگا۔ اگلے روز جب دوبارہ دیگ کا ڈھکن

فرزان نے اس بار تحمل سے پوچھا۔ اذان کو فرزان کے جملے سے زیادہ اس کے تحمل پر غصہ آ گیا۔

"میرا مقصد صرف یہ ہے کہ بابا کے پاس اس وقت ہم میں سے کسی کا ہونا ضروری ہے۔ میں شاپ اور امی کو تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ ان کی خرابی طبیعت کے باعث۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت بابا کے پاس تمہارا ہونا بہت ضروری ہے اور ہو سکتا ہے اس وقت تمہارے وہاں پہنچنے سے ان کی ناراضی بھی ختم ہو جائے۔"

اذان نے اپنے غصے پر قابو پا کر اس بار نرمی سے ساری بات کی۔ فرزان نے کام روک کر اذان کی ساری بات بغور سنی۔ پھر اس کے چہرے پہ نظریں جماتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

شکریہ اے گردش دوراں عنایت ہے تری
زخم تازہ ہو گئے ہیں ٹھوکریں کھانے کے بعد
غم نہ ہوتا تیز لہروں میں جو کشتی ڈوبتی
ناؤ ڈوبی دوستو، دریا اتر جانے کے بعد

"میرے ساتھ جو ہونا تھا ہو گیا۔ مجھے گھر سے نکالنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اب ان کا ایک ہی بیٹا ہے اور اس کا نام ہے اذان فیضی۔۔۔ فرزان اب پھر فرزان ہے فرزان فیضی نہیں۔۔۔ بہتر ہو گا کہ جو کچھ بھی کرنا ہے تم خود کرو۔ میں تم لوگوں کے لیے مر چکا۔"

"اور ہمارے بابا۔۔۔ وہ تو تمہارے بابا ہیں نا۔"

فرزان کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بابا سے کون پوچھے۔"

جس کی خاطر مجھے لوگوں نے نکالا گھر سے
اس نے رہنے کے لیے آنکھ میں گھر بخشا ہے
قتل کرتے ہوئے احساس نہ ہونے دے گا
تو نے قاتل کو بڑا ذوق ہنر بخشا ہے
ایک دن تجھ سے مری دربدری پوچھے گی
زندگی دے کے مجھے کیسا سفر بخشا ہے

"سمجھے مسٹر اذان فیضی۔۔۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔"

اٹھایا گیا تو دیکھا دیگ جوں کی توں بھری ہوئی ہے۔ شہر میں مست بابا کی دھوم مچ گئی۔ پیروکار اور عقیدت مند تھالیاں بھر بھر کر بانٹتے مگر دیگ جوں کی توں بھری رہتی۔

حاجت مندوں میں مجھ جیسا ایک فقیر بھی تھا جو خالی ہاتھ آتا اور سارا دن کھڑا تماشا دیکھتا۔ عقیدت مند کہتے "میاں تم کیوں خالی ہاتھ کھڑے ہو۔ برتن لاؤ اور چاول لے جاؤ۔" وہ کہتا "میں حاجت مند نہیں ہوں۔" عقیدت مند اس بات پر بہت حیران ہوتے کہ کھڑا بھی رہتا ہے۔ دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا بھی ہے۔ مگر چاول لیتا ہے نہ ہی کچھ کھاتا پیتا ہے۔ انہوں نے مست بابا سے بات کی۔ بابا نے کہا "اس شخص کو میرے پاس لایا جائے۔"

میرے جیسے غریب فقیر کو بابا کے سامنے پیش کیا گیا۔

بابا نے پوچھا۔ "میاں کیا بات ہے۔ سارا دن دیگ کے سامنے کھڑے رہتے ہو۔ لیکن دیگ کے چاول نہیں کھاتے۔"

فقیر بولا "میں یہاں دیگ کو دیکھنے نہیں آتا، نہ ہی چاول کھانے آتا ہوں۔"

بابا نے پوچھا "تو پھر تو یہاں کیوں آتا ہے۔"

فقیر بولا "میں تیری زیارت کرنے آتا ہوں۔"

"میری زیارت، وہ کیوں۔۔۔" بابا نے اچنبھے سے پوچھا۔۔۔ تو فقیر بولا "تو جو اس شہر کا رب بنا ہوا ہے اور لوگوں کو رزق تقسیم کر رہا ہے۔ تیری زیارت تو کرنی ہی چاہیے۔" یہ سن کر مست بابا کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ چہرے پر بدحواسی کے تاثرات پھیل گئے۔ پھر وہ چیخ کر بولا۔

"دیگ کو الٹ دو، چولہے پر پانی پھیر دو۔" اتنا کہہ کر مست بابا نے لاٹھی اٹھائی اور شہر سے باہر نکل گیا۔"

فرزان چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا تھا۔ نیلم نے جو مسلسل فرزان کی طرف متوجہ تھی۔ اپنی ریشمی پلکوں کو جنبش دی اور مسکراتے ہوئے اپنی گنگناتی ہوئی آواز میں بولی۔

"لیکن یہاں معاملہ مختلف ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ یہاں فقیر نہیں بلکہ مست بابا خود چل کے آئے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ پھر حاجت مند بھی ہم خود ہیں۔ تیسری بات یہ کہ مست بابا کو تو فقیر کی مچی ہوئی دھوم یہاں کھینچ لائی ہے۔ مست بابا تو شہر سے نکل گئے۔ لیکن ہم جانے والوں میں سے نہیں۔"

حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے' بیٹھ گئے۔

یہ کہہ کر وہ پر سکون انداز میں فرزان کے مقابل بیٹھ گئی۔

اس دوران کوئی کچھ نہیں بولا۔ پھر فرید خان ہی گلا کھنکھار کے گویا ہوا۔

"دیگ کا اشارہ کہیں ہمارے ملک کی طرف تو نہیں ہے۔ یہاں بھی تو یہ ہی کچھ ہو رہا ہے۔ ایک گروپ آتا ہے۔ کھاتا ہے' چلا جاتا ہے۔ پھر دوسرا گروپ آتا ہے تو اس کے جفاکش دیگ پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ لیکن دیگ ختم ہونے میں ہی نہیں آتی۔۔۔ اور۔۔۔"

فرزان نے ہاتھ اٹھا کے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں فرید خان ایسا نہیں ہے۔۔۔ یہاں صرف دیکھنے میں ہی زبوں حالی کا دور دورہ ہے۔ وگرنہ سڑکوں پر بیش قیمت گاڑیوں کی لائنیں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔ دکانوں میں سامان کے انبار بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہوٹلوں کی رونقیں عروج پر ہیں۔ شاپنگ مال خواتین سے بھرے ہوئے ہیں۔ خواتین کے چہرے گلال ہو رہے ہیں۔ ان کی بھوری' کالی آنکھوں سے کرنیں پھوٹتی ہیں۔ اسٹیٹس کے درجات بڑھتے جا رہے ہیں۔ انسان اب انسان نہیں بلکہ اسٹیٹس انیمل بن چکا ہے۔ آپ میری مثال نہیں سمجھ سکے۔"

فرزان کی بات پر نیلم مسکرائی۔ اس کے دانت موتیوں کی مانند چمک اٹھے تھے۔ اس کی مسکراہٹ اس کی شخصیت کی طرح دلکش تھی۔ پھر وہ فرید خان سے مخاطب ہوئی۔

"فرید خان دنیا میں جو بھی بڑا آدمی پیدا ہوا ہے۔ عالم' محقق' سائنس دان' ڈاکٹر' سوشل ورکر' وہ ہمیشہ غریبوں میں سے ابھرا ہے۔

آج تک دولت مندوں نے بھی بڑا آدمی پیدا کیا؟

نہیں۔۔۔ دولت مندی نے ہمیشہ صرف عیاش لوگ پیدا کیے ہیں۔ غربت ہی ہے جو ایک دوسرے سے ہمدردی کا درس دیتی ہے۔ یہی غریب ہیں جن کی بدولت ہمارے یہاں خاندان قائم ہیں۔ یورپ میں تو خاندان کی بچی کھچی باقیات پر بھی جھاڑو پھر چکی ہے۔"

فرزان نے پہلی بار دلچسپی سے نیلم کا چہرہ دیکھا۔ شاید اس کی باتیں اس کے دل کو لگی تھیں۔ پھر وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گویا ہوا۔

"سنتے ہیں غربت میں اللہ قریب آ جاتا ہے۔"

پھر نیلم کے جواب کا انتظار کیے بغیر ادھر ادھر دیکھ کر نظریں جھکا کر چند لمحے خاموش رہا' پھر بولا۔

جنت کی آرزو ہے نہ دوزخ کا خوف ہے
پروردگار کیا میں مسلماں نہیں رہا

☼ ☼ ☼

اذان نے موٹر سائیکل لاک کی اور کی چین ہاتھ میں لے کر کھڑا ہو کے کچھ دیر ورکشاپ کی طرف پر سوچ نظروں سے دیکھا۔ پھر مضبوط قدموں سے اندر داخل ہو گیا۔ ورکشاپ میں ٹھک ٹھک کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ لیکن جوں ہی اذان نے قدم اندر رکھا خاموشی طاری ہو گئی۔

استاد اچھو' کھاری اور خلیل کام روک کر حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اذان نے سرسری انداز میں اس کا جائزہ لیا اور ورکشاپ کے آخری کونے کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ جہاں فرزان کٹیرہ اٹھائے فولادی چادر کو کاٹنے میں مصروف تھا۔ اذان قریب جا کے رکا تو فرزان نے کام کرتے کرتے ایک نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور دوبارہ کام میں مصروف ہو گیا۔

"کیسے ہو فرزان۔۔۔" اذان نے خائف ہوتے ہوئے پوچھا۔

"جیسا تھا' ویسا ہی ہوں۔" فرزان نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

"وہ میں۔۔۔ تم سے کچھ بات کرنے آیا تھا۔" اذان نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"تو کرو روکا کس نے۔" فرزان کا انداز ہنوز تھا۔

"وہ دراصل چند دن پہلے بابا لاہور گئے تھے۔" اذان نے زمین پر اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جانتا ہوں' اکثر جاتے رہتے ہیں۔" فرزان نے لاپروائی سے کہا۔

"لیکن اس مرتبہ کچھ عجیب بات ہوئی۔ بابا دو' تین دن کا کہہ کر گئے تھے۔ لیکن پورے آٹھ دن گزر جانے کے بعد بھی وہ واپس نہیں آئے۔ ان کا فون بند مل رہا ہے اور ان کی طرف سے کوئی اطلاع بھی نہیں ملی۔"

"تو۔۔۔؟" فرزان نے کام روک کر اذان کو گھورتے ہوئے سوالیہ انداز میں کہا۔

"تو لازمی سی بات ہے کہ ہم پریشان ہو رہے ہیں۔ امی جان نے مجھ سے کہا کہ پروین خالہ سے فون کر کے پتا کروں۔" اذان نے اس بار برہمی سے کہا۔

"تو میں کیا پروین خالہ ہوں؟ جاؤ' جا کے پتا کرو۔" فرزان نے اسی کھردرے لہجے میں کہا۔

"یار ایک تو تم بات کو سنتے' سمجھتے نہیں ہو۔ بیچ میں ہی بول پڑتے ہو۔"

اذان نے جھنجلا کر کہا۔

"میں پتا کر چکا ہوں۔ پروین خالہ نے بتایا کہ دو دن رکنے کے بعد وہ ان کی بہن مختاراں کی طرف چلے گئے۔ پھر میں نے خالہ مختاراں کو فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ بابا بخار کی حالت میں گھر سے نکلے تھے اور ان کے ہاں جاتے ہوئے راستے میں بارش ہو گئی۔ بخار کی حالت میں بارش میں بھیگنے کی وجہ سے ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر روزانہ گھر آ کے چیک کر رہا ہے۔ لیکن کوئی افاقہ نہیں ہو رہا۔ انہوں نے ہم لوگوں کے نمبر پر کال کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن نہ جانے کیا مسئلہ تھا کہ رابطہ نہیں ہو سکا۔ وہ شکر ادا کر رہی تھیں کہ اچھا ہوا تمہاری کال آ گئی۔ میں تو یہ سب سن کر پریشان ہو گیا ہوں۔ امی جان کو یہ سب کیسے بتاؤں؟ وہ تو پہلے ہی بہت جلدی پریشان ہو جاتی ہیں۔ ان کی طبیعت بھی بہتر نہیں رہتی۔"

"مجھے یہ ساری رام لیلا سنانے کا مقصد کیا ہے؟"

فرزان سخت انداز میں کہہ کر دوبارہ سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ اذان کو اندازہ تو تھا کہ فرزان ضدی اور سرکش ہے اس کا خیال تھا بابا کی بیماری کا سن کر شاید وہ اپنے رویے میں کچھ لچک پیدا کر لے۔ لیکن فرزان کے انداز نے اس کے خیال کی نفی کر دی تھی۔ اسے غصے کے ساتھ ساتھ افسوس بھی ہو رہا تھا وہ کچھ دیر کھڑا تاسف سے اسے دیکھتا رہا پھر ایک جھٹکے سے مڑ کر باہر نکل گیا۔ فرزان نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا اسے۔

اذان نے فرزان کا سارا غصہ کک مار کر نکالا تھا موٹر سائیکل کے اسٹارٹ ہوتے ہی اس نے طوفانی رفتار سے بائیک آگے بڑھالی۔ اذان' فرزان کی باتوں کو سوچتا چلا جا رہا تھا اسے فرزان کا لب ولہجہ اور اس کے الفاظ پسند نہیں آئے تھے۔ لیکن فرزان کو احساس تک نہیں تھا ظاہر ہے اگر ان باتوں کی پروا اگر فرزان کو ہوتی تو فیضی صاحب اسے "دیس نکالا" کیوں دیتے۔ اذان کے جذبات اپنی جگہ مگر فرزان۔۔۔ فرزان تھا۔

اذان سوچوں میں گم بائیک اڑائے جا رہا تھا سگنل ہونے پر کچھ دیر ٹریفک رک گیا تھا۔ اذان نے لاشعوری انداز میں اپنے اردگرد دیکھا اور اس کی نظریں ایک شناسا چہرے پہ جم گئیں۔ اس نے بائیک کا رخ موڑ لیا۔ اسکول کے پروگرام ختم ہوئے پندرہ بیس دن گزر چکے تھے تاہم دو چار پروگرام کرنے کے بعد ہی ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ اذان نے اقبال صاحب سے ایگریمنٹ کیا تھا تو بقیہ پروگرام کرنے ہی تھے لہٰذا ان

پروگرامز کے لیے اذان کو ایک پروفیشنل ایکٹریس کی خدمات حاصل کرنی پڑیں جو کہ اذان کو کافی "ایکسپینسو" پڑی۔ لیکن ظاہر ہے جس کام کا بیڑہ اٹھایا تھا اسے پایہ تکمیل تک تو پہنچانا تھا۔ طوہاً" کرہاً" باقی پروگرام بھی کرلیے گئے۔ لیکن نہ جانے کیوں اذان پہلے جیسی دلچسپی برقرار نہ رکھ سکا بس فرض ادا کرنے والی بات تھی اور جیسے تیسے اس نے یہ فرض ادا کردیا تھا اور اب بیس تیس دن کے وقفے کے بعد اس کی ٹیم کا ایک لڑکا آج پہلی مرتبہ اسے نظر آیا تھا۔

"آہا۔ ہا اذان صاحب بڑے دنوں بعد دیدار ہورہے ہیں کہاں غائب تھے۔" نعیم خرم جو اس دوران اذان کو دیکھ چکا تھا قریب آتے ہوئے بولا۔

"ہم نے کہاں جانا ہے۔ یہیں ہیں۔ تم سناؤ کیسے ہو؟" اذان نے بائیک لاک کی اور اتر کر نعیم سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہوں یار۔ آؤ کچھ دیر بیٹھتے ہیں چائے پیتے ہیں۔" نعیم اذان کا ہاتھ تھامے قریب ہی موجود ہوٹل کی اندرونی سمت کھینچ لے گیا۔

"اور سناؤ کیا ہورہا ہے آج کل۔" اذان نے دریافت کیا۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے ہال کمرے میں داخل ہوگئے اور ایک میز کے گرد رکھی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

"بس یار ہونا کیا ہے۔"

وہی ہے چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

"صبح اسکول اور شام ٹیوشن کلاسز ایک ٹیچر کی زندگی میں اس کے علاوہ ہوگا بھی کیا۔"

"اچھا۔" اذان نے نعیم کی بات پر دھیمے سے مسکراتے ہوئے ویٹر کو اشارہ کیا۔ ویٹر کو چائے کا آرڈر دے کر اذان پھر نعیم کی طرف متوجہ ہوا جو پوچھ رہا تھا۔

"آپ سنائیں اذان صاحب کوئی نیا پروجیکٹ ہاتھ نہیں لگا۔" نعیم نے پوچھا۔

"نہیں یار فی الحال تو نہیں۔ اگر ہوتا تو تم ہی لوگوں سے رابطہ کرتا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا بات ہے اذان صاحب کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟" نعیم نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا۔

"ہاں یار آج کل واقعی پریشان ہوں۔" اذان نے سچائی سے اعتراف کیا۔

"کیا ہوا خیریت تو ہے۔" نعیم نے خلوص سے پوچھا۔

"اصل میں بابا پچھلے دنوں لاہور گئے تھے اور وہاں جاکے ان کی طبیعت ناساز ہوگئی ہے۔ میں اسی پریشانی میں ہوں اور ویسے بھی وہ کام تو خود چل کے میرے پاس آگیا تھا ورنہ تم تو جانتے ہو تمہاری طرح میری بھی اپنی روٹین ہے میں بھی اپنی شاپ میں مصروف رہتا ہوں۔"

"اوہ۔ پریشان نہیں ہوں آپ۔ موسمی بخار ہوگا ٹھیک ہوجائیں گے۔" نعیم نے تسلی دی تو اذان نے بھی سر اثبات میں ہلادیا۔

ویٹر چائے رکھ کے جاچکا تھا۔ دو منٹ کے لیے دونوں خاموشی سے چائے پینے لگے۔

"بہت اچھے دن تھے۔ بہت انجوائے کیا۔ خاص طور پر فہیم کی "بتاؤ یار گل بنتی ہے" کو۔" ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے نعیم کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ اذان بھی مسکرادیا۔

"یار اذان! ایک بات یاد آئی وہ ہمارے ساتھ ایک لڑکی کام نہیں کررہی تھی شروع میں۔ کیا نام تھا اس کا۔" نعیم نے یاد کرنے کوشش کرتے ہوئے دو انگلیوں کی مدد سے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔

اذان نے غور سے نعیم کے چہرے کی طرف دیکھا اور گویا ہوا۔

"ماہم کی بات کررہے ہو۔"

"ہاں وہی۔ ماہم کی بات کررہا ہوں یار بڑی عجیب لڑکی ہے وہ۔" نعیم کے انداز میں بے ساختگی تھی۔

اذان کی تمام حسیات سمٹ کر جیسے کانوں میں آگئی تھیں اس کی پوری توجہ نعیم کے الفاظ پر مرکوز ہوگئی تھی لیکن بظاہر لاتعلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

"کیوں کیا ہوگیا اسے؟"

"تمہیں تو پتا ہی ہوگا کہ اس نے ٹیم کے تمام لڑکوں کو اپنا سیل نمبر دیا تھا۔" نعیم ذرا دیر رکا تو اذان بولا۔

"ہاں جانتا ہوں۔ تو۔"

"تو کیا یار۔ بس میں نے بھی بات چیت کرنے کی کوشش کی کچھ دن تک تو بڑے دوستانہ ماحول میں بہت اچھے انداز میں گپ شپ ہوتی رہی لیکن پھر بات بگڑ گئی۔"

نعیم ایک مرتبہ پھر خاموش ہوگیا اس بار اذان کو نعیم کی خاموشی سے الجھن ہوئی تھی اور اس کا اظہار بھی اس نے کردیا۔

"ہوا کیا یار۔ پہیلیاں کیوں بوجھوا رہے ہو کھل کے بتاؤ۔" اذان نے جھنجلا کر کہا۔

"یار ہونا کیا ہے اچھی خاصی روز بات ہوتی تھی اور تم تو جانتے ہو جب دو لڑکا لڑکی آپس میں بات کرتے ہیں تو ظاہر ہے بات ملاقات پر ہی آکر ٹوٹتی ہے حسب دستور جب میں نے ماہم سے ملاقات پر اصرار کیا تو موصوفہ ہتے سے اکھڑ گئیں کہنے لگیں ہم نے فیملی ممبر کی طرح ایک ساتھ ٹیم ورک کیا تھا اور آپ کو اچھا انسان سمجھتے ہوئے اپنا سیل نمبر دے دیا اب اگر آپ مجھے کال کرتے ہیں تو اخلاق کا تقاضا یہ ہی ہے کہ میں آپ کی بات سنوں اور بساط بھر آپ کی باتوں پر توجہ بھی دوں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز بھی نہیں کہ میں آپ سے سڑکوں اور پارکوں میں ملاقات کروں اگر میں نے آپ کو ایک اچھا انسان سمجھتے ہوئے دوستانہ انداز میں آپ سے بات چیت کرلی تو اس کا یہ مطلب تو ہرگز بھی نہیں کہ اب ہم باقاعدہ سے ٹائم سیٹ کریں اور ڈیٹ ماریں۔" یہ سب بتاتے ہوئے نعیم کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ اذان اندازہ نہیں لگاسکا کہ اسے اتنا غصہ کیوں آیا ہے مگر نعیم کی اگلی بات سن کر اس کی یہ الجھن دور ہوگئی۔

"ہونہہ۔ محترمہ فرمارہی تھیں ایک بات کان کھول کر سن لیں مسٹر نعیم میں کوئی لوز کریکٹر لڑکی نہیں۔ آپ نے میرے بارے میں بہت غلط اندازہ لگایا ہے بہتر یہ ہوگا کہ آئندہ میرے نمبر پر فون مت کیجیے گا۔ یہ انداز ہیں ان لڑکیوں کے پہلے نمبر بانٹتی ہیں پھر نخرے دکھاتی ہیں کہ فون نہیں کیجیے گا۔" نعیم نے ماہم کے انداز کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

"ہا۔ ہا۔ ہا۔" اذان کے حلق سے ایک بے ساختہ قہقہہ آزاد ہوا۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات۔ یہاں میرا خون جل رہا ہے اور آپ قہقہے لگا رہے ہیں۔" نعیم تلملائے ہوئے انداز میں بولا۔

"اوہ سوری۔" اذان نے جلدی سے معذرت کی پھر تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"یار اس میں اتنا خون جلانے کی کیا بات۔ اس نے صحیح تو کہا تم نے اندازہ لگانے میں غلطی کی۔ ہر لڑکی اس مزاج کی نہیں ہوتی ضروری نہیں ہے کسی بات سے کسی کی شخصیت کا جو امیج آپ بنالیں وہ ویسا ہی ہو۔" کہہ کر اذان نے چائے کا کپ جو رکھ دیا تھا دوبارہ اٹھالیا اور سلسلہ کلام دوبارہ جوڑتے ہوئے بولا۔

"ویسے جو کچھ بھی ہے تمہاری بات سن کر مزا آگیا۔" اذان نے نعیم کی لمبی چوڑی گفتگو سن کر مسکراتے ہوئے کہا اور مزے سے چائے کے سپ لینے لگا۔

☆ ☆ ☆

چائے کا کپ جلدی سے ٹیبل پر رکھ کر مختاراں نے صحن کی طرف دیکھا باہر سے ذکیہ بیگم کی آواز آرہی تھی۔

"بسم اللہ بسم اللہ۔ جی آیاں نوں۔" مختاراں نے پہلے تو حیرت سے ان دونوں کو دیکھا پھر لپک کے ذکیہ بیگم کی طرف بڑھی اور گرمجوشی سے انہیں گلے لگالیا۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے آپ لوگ آگئے میں بہت

پریشان ہو رہی تھی۔ فیضی صاحب کی طبیعت کافی خراب ہے ابھی ابھی فدا ڈاکٹر کو لینے گیا ہے۔"

"ہاں فدا نے بتایا ہے اسی نے دروازہ کھولا تھا۔" ذکیہ بیگم نے آہستگی سے کہہ کر ادھر ادھر دیکھا ان کی نظریں فیضی صاحب کو تلاش کر رہی تھیں ان کا انداز دیکھ کر مختاراں بولی۔

"آئیں ادھر آجائیں۔" مختاراں انہیں لیے دوسرے کمرے میں داخل ہو گئی۔

نرم و گداز بستر پر بے سدھ پڑے فیضی صاحب کو دیکھ کر ذکیہ بیگم کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں انہوں نے اذان کو دیکھا وہ بھی فیضی صاحب کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا وہ بے حد کمزور لگ رہے تھے۔

"بابا جانی۔ بابا جانی۔" اذان نے بیڈ پر آہستگی سے بیٹھ کر ان کو پکارا۔ بند پلکوں میں کچھ جنبش ہوئی تھی مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کل کچھ طبیعت بہتر ہوئی تھی کل ڈاکٹر آیا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ بخار کی حالت میں بارش میں بھیگنے سے انہیں ڈبل نمونیا ہو گیا ہے دوائیں لکھ کر دی تھیں مگر خالی پیٹ دوائیں کیا اثر کریں گی آج پھر بخار ہو گیا تو میں نے فدا کو بھیجا ہے کہ ڈاکٹر کو بلا کے لائے ڈاکٹر نے ٹھنڈی چیزوں کا سختی سے منع کیا تھا کہا تھا کہ انڈہ بوائل کر کے دیں مگر فیضی صاحب رات میں بھی ضد کرتے رہے ٹھنڈا پانی مانگتے رہے کہتے ہیں دودھ سوڈا دو آپ بتائیں کیسے دوں ہمارے لیے تو یہ بہت زیادہ قابل احترام ہیں ہم ان کے ساتھ زبردستی بھی نہیں کر سکتے۔ سمجھ سے باہر ہے فیضی صاحب کی مانیں یا ڈاکٹر کی "اب آپ کو دیکھ کر میری جان میں جان آئی ہے۔ ہمارا کہا تو وہ یہ مان نہیں رہے آپ کی بات ہی مانیں گے۔" مختاراں نے آہستہ آہستہ ذکیہ بیگم کو پریشانی سے بتایا۔

"بابا جانی۔" اس بار اذان نے ان کی پیشانی پہ ہاتھ رکھ کر دھیرے سے پکارا۔

فیضی صاحب نے بمشکل آنکھیں کھول کر دیکھا اور اذان کو دیکھ کر ان کی آنکھیں چمک اٹھیں انہوں نے بے ساختہ اٹھنے کی کوشش کی مگر نقاہت کے باعث اٹھ نہیں سکے اذان نے سہارا دے کر انہیں اٹھایا اور ان کی پشت پر تکیہ رکھ کر انہیں بٹھا دیا۔

اذان سے ہوتی ہوئی ان کی نظریں ذکیہ بیگم کی طرف گئیں ان کے ہونٹوں پر لرزش ہوئی پھر لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولے۔

"بیگم۔ تم کب آئیں۔"

"بس ابھی ابھی۔ یہ آپ نے اپنی کیا حالت کرلی ہے۔" ذکیہ بیگم نے خفگی سے کہا اور ان کے بیڈ کے قریب کرسی گھسیٹ کے اس پر بیٹھ گئیں۔

"ارے واہ ذکیہ بہن آج تین دن بعد فیضی صاحب کی آواز سنائی دی ہے آپ کا چہرہ تو جادو کی حیثیت رکھتا ہے۔"

مختاراں کی بات سن کر فیضی صاحب کے چہرے پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں بھی تو آیا ہوں۔" اذان نے ان کی توجہ خود پہ نہ پا کر روٹھے پن سے کہا۔

فیضی صاحب نے ایک نظر اذان کی طرف دیکھا اور کپکپاتے — ہوئے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اذان نے اس ہاتھ کو چومتے ہوئے پوچھا۔

"کیسی طبیعت ہے بابا؟"

"تم لوگوں کو دیکھ لیا اب کافی بہتر محسوس کر رہا ہوں۔" اس بار فیضی صاحب کا لہجہ خاصا سنبھلا ہوا تھا۔

"مختاراں بتا رہی ہیں آپ کچھ کھاتے پیتے نہیں کیوں ٹھیک نہیں ہونا آپ نے۔" ذکیہ بیگم کے لہجے میں شکوہ ہی شکوہ تھا پھر وہ پلٹ کر مختاراں سے مخاطب ہوئیں۔

"مختاراں بہن کچھ کھانے کو لائیں۔ دیکھتی ہوں کیسے نہیں کھاتے۔"

"جی ابھی لائی۔" مختاراں جلدی سے پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی اس کے چہرے پہ مسرت کے تاثرات تھے فیضی صاحب کی سنبھلی ہوئی حالت دیکھ کر اسے بہت سکون ہوا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ کمرے میں داخل ہوئی۔

"یہ لو ذکیہ بہن دودھ میں باقر خانی ڈال کے لے آئی ہوں۔" مختاراں نے پیالہ ذکیہ بیگم کو تھماتے ہوئے کہا۔

ذکیہ بیگم نے چمچہ بھر کے فیضی صاحب کے منہ کی طرف بڑھایا فیضی صاحب نے بے چارگی سے اذان کی طرف دیکھا۔ مگر اذان نے کندھے اچکا دیے ناچار فیضی صاحب کو منہ کھولنا پڑا ابھی دو تین چمچے ہی انہوں نے کھائے تھے اسی دوران ہلکی سی دستک دے کر فدا اندر داخل ہو گیا۔

"میں ڈاکٹر صاحب کو لے آیا ہوں۔" ان لوگوں سے کہہ کر فدا نے باہر جھانکا۔

"آئیے ڈاکٹر صاحب۔" فدا نے میڈیکل باکس اٹھا کر بیڈ کی سائیڈ میز پر رکھ دیا۔ ذکیہ بیگم ہٹ کر دور کھڑی ہو گئیں۔

اذان نے کھڑے ہوتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے لیے کرسی کھینچ کر بیڈ کے سامنے کر دی۔ ڈاکٹر صاحب نے بیٹھ کر پہلے ان کی نبض چیک کی پھر ٹمپریچر چیک کیا پھر اسٹیتھسکوپ ان کی پشت پر جماتے ہوئے کہا۔

"لمبے لمبے سانس لیں۔" ڈاکٹر نے چند لمحے اپنی کارروائی مکمل کرلی اور پھر ایک کاغذ پر نسخہ لکھ کر فدا کی طرف بڑھا دیا۔

"آج تو ان کی طبیعت کافی بہتر لگ رہی ہے مگر آپ ان کی خوراک کی طرف خصوصی توجہ دیں اور اس کے ساتھ ہی یہ دوا جو میں نے لکھ کر دی ہے انہیں باقاعدگی سے کھلائیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔"

کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے اسٹیتھسکوپ بیگ میں رکھا اور کھڑے ہو گئے۔ اذان نے فدا کے ہاتھ سے وہ نسخہ لے لیا تھا فدا بیگ اٹھا کر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہی باہر نکل گیا۔

"میں یہ دوا لے کر آتا ہوں۔" اذان نے ذکیہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور باہر جانے کے لیے مڑا۔

"رکو اذان۔ ابھی تو آئے ہو اتنی جلدی کیا ہے ابھی میرے پاس بیٹھو۔" فیضی صاحب کی نقاہت زدہ آواز بلند ہوئی تو اذان جاتے جاتے رک کر بیڈ کے کونے پر ٹک گیا۔

"ایسا کیسے چلے گا نہ آپ کھانا کھاتے ہیں اور اب دوا لینے جا رہا ہے تو اس کو بھی منع کر رہے ہیں ایک بات دھیان سے سن لیں اب آپ کو کھانا پینا بھی پڑے گا اور دوائیں بھی استعمال کرنی پڑیں گی۔" ذکیہ بیگم نے محبت بھری دھونس سے کہا۔

"بس بیگم دوائیں کھا کھا کر زبان پر چھالے پڑ گئے ہیں اور کچھ کھانے کو تو دل ہی نہیں کرتا اندر جیسے آگ لگی ہوئی ہے پیاس نہیں بجھ رہی لگتا ہے اندر چاول کی فصل اگ آئی ہے۔" فیضی صاحب کے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ تھی ان کی بات سن کر سب ہی مسکرا دیے مختاراں تو جیسے خوشی سے نہال ہو گئی۔ فیضی صاحب مختاراں کے چہرے کی طرف ایک نظر ڈال کر ذکیہ بیگم سے مخاطب ہوئے۔

"سب سے پہلے تو ان لوگوں کا شکریہ ادا کرو بیگم صاحبہ! ان لوگوں نے میرا بڑا خیال رکھا میری بڑی خدمت کی لیکن سچی بات تو یہ ہی ہے کہ بستر پر لیٹے لیٹے بے زار ہو گیا ہوں میرا یہاں دل نہیں لگ رہا جی چاہتا ہے کہ اڑ کر گھر پہنچ جاؤں لیکن مجھے اندازہ ہے کہ ابھی میں ٹرین کے سفر کے قابل نہیں۔"

"یہ کون سا مسئلہ ہے اگر آپ گھر جانا چاہتے ہیں تو میں ابھی پرائیویٹ گاڑی کا ارینج کر لیتا ہوں آرام سے چلیں گے۔" اذان نے ان کا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے محبت سے معمور لہجے میں کہا۔

"ایسے کیسے چلے جائیں گے ابھی تو آپ لوگوں کی تھکن بھی نہیں اتری ہوگی اور آپ فیضی صاحب کو لے جانے کی باتیں کر رہے ہیں ابھی تو آئے ہیں ایک دو دن رکیں اس دوران فیضی صاحب کی طبیعت بھی مزید سنبھل جائے گی پھر آرام سے جائیے گا۔"

مختاراں مہمان نوازی پر اتر آئی لیکن فیضی صاحب

نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کمزور لہجے میں کہا۔
"نہیں مختاراں، ضد مت کرو کل کس نے دیکھا سارا مسئلہ وقت کا ہی تو ہوتا ہے اور کون جانے دوبارہ وقت ملے نہ ملے اور میں ــــ یہ وقت اپنے گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔"

فیضی صاحب کے لہجے میں ایک عجیب سی تھکن تھی مختاراں جو ان کے قریب ہی کھڑی تھی ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے لرز کے رہ گئی ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی ویرانی اتر آئی۔

"اللہ نہ کرے فیضی صاحب! ابھی آپ کو بچوں کے ساتھ بھی بہت سا وقت گزارنا ہے اور ہمیں بھی آپ کی دعاؤں کی شدید ضرورت ہے۔"

"چھوڑو ان باتوں کو مہمان کو آخر ایک دن جانا ہی ہوتا ہے تم بھی زیادہ اصرار نہیں کرو۔ جاؤ اذان اگر تم کوئی انتظام کر سکتے ہو تو کرو۔" اذان نے ایک نظر ذکیہ بیگم کی طرف دیکھا پھر چند لمحوں کے لیے اس کی نظریں مختاراں کے چہرے پر رکیں جہاں رنجیدگی تھی پھر وہ اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

بمشکل دس پندرہ منٹ بعد ہی اذان کی واپسی ہوگئی تھی وہ بہت عجلت میں تھا اس نے ذکیہ بیگم کو مخاطب کیا۔

"میں گاڑی لے آیا ہوں امی جان۔ تیاری کرلیں۔"

"تیاری کیا کرنی ہے، بس چلو۔" ذکیہ بیگم اٹھ کر کھڑی ہوتے ہوئے بولیں۔

یہ دیکھ کر مختاراں جلدی سے دروازے کی طرف لپکی اور با آواز بلند پکارا۔

"ندا۔ فدا۔ ذرا ادھر آؤ۔"

"جی امی۔" فدا چند لمحوں بعد کمرے میں داخل ہوتا ہوا بولا۔

"اذان کے ساتھ فیضی صاحب کو سہارا دے کر گاڑی تک لے جاؤ۔"

اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد وہ لوگ گھر سے باہر نکل رہے تھے۔ فیضی صاحب کو دائیں بائیں فدا اور اذان سہارا دیے باہر لے کر جا رہے تھے۔ ذکیہ بیگم اور مختاراں سست قدموں سے ان کے پیچھے چل رہی تھیں۔ ڈرائیور نے ان لوگوں کو آتے دیکھ کر تیزی سے باہر نکل کر عقبی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ اذان اور فدا نے انہیں آرام سے نشست پر بٹھایا۔ ذکیہ بیگم مختاراں سے گلے ملنے کے بعد فدا کے سر پر ہاتھ پھیر کر اور گھوم کر دوسری جانب کا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

اذان گاڑی کا دروازہ بند کر کے مختاراں کی طرف بڑھا اور ان کے سامنے سر خم کر دیا۔ مختاراں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کے دعاؤں سے نوازا۔" اس سے دعائیں لے کر وہ فدا کی طرف مڑا اور اس سے معانقہ کر کے فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی تو مختاراں اور فدا جلدی سے گاڑی کے عقبی دروازے کی طرف پہنچے اور کھڑکی میں سے فیضی صاحب کا کپکپاتا ہوا ہاتھ برآمد ہوا مختاراں نے جلدی سے اپنا سر آگے کر دیا۔ فیضی صاحب نے اپنا دست شفقت اس کے سر پر رکھا اس کے بعد فدا نے سر جھکا دیا تو فیضی صاحب اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

اس کے ساتھ ہی سبک روی سے گاڑی آگے بڑھ گئی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

عمرہ انوار

فسانہ محبت

اوائل مارچ کے دن تھے۔ موسم تبدیل ہو رہا تھا۔ سردی بھی کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔ صبح سے آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ خنکی میں قدرے اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ موسم اس کا پسندیدہ موسم تھا۔ وہ موسم انجوائے کرنے کے ساتھ ساتھ اسائنمنٹ بنا رہی تھی کہ زین اس کے پاس چلا آیا۔ اس نے ذرا سا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

"سردیوں کی شامیں کتنی اداس ہوتی ہیں نا۔" وہ ریلنگ سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

"اچھا.... ! مجھے تو نہیں لگتا۔" وہ مصروف سے انداز میں بولی۔

"ان اداس شاموں میں "کوئی" آپ کے ساتھ ہو تو پھر یہ رنگین لگنے لگتی ہیں۔ ورنہ تو ان شاموں میں اداسی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔" اب وہ بارش کو دیکھنے لگا۔

"اب تو سردیاں بھی گزر رہی ہیں اور تمہیں ایسا کیوں فیل ہو رہا ہے؟" وہ حیرانی سے اس کے بدلے ہوئے انداز دیکھ رہی تھی۔

"کیونکہ مجھے محبت ہو گئی ہے۔" زین نے تو جیسے اس کے سر پر دھماکہ کیا۔

"کیا؟ کب؟ کیسے؟ کس سے؟ کہاں رہتی ہے؟ کب ملواؤ گے؟" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس کے پاس آئی اور ایک ہی سانس میں ڈھیر سارے سوال کر ڈالے۔

"او.... او.... تیز گام.... پہلے کسی کی پوری بات تو سن لیا کرو۔" وہ فوراً اس کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

"تو پھر بتاؤ نا کون ہے وہ؟"

"تم ہو۔"

"کیا؟ تمہارا دماغ ٹھیک ہے نا۔" وہ دبی دبی آواز میں چلائی۔

"ہاں میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے اور ویسے بھی محبت کے لیے دل کا ہونا ضروری ہے' دماغ کا نہیں۔" وہ جتنی بے چین تھی اس کا جواب سننے کے لیے' وہ اتنے ہی پرسکون انداز میں بولا۔

"اچھا سیدھی طرح بتاؤ وہ کون ہے؟ مجھے بے وقوف نہ بناؤ۔"

"مجھے تو کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تمہیں بے وقوف بنانے کی۔ ویسے بھی بنے بنائے کو بنانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔" وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آہستہ سے بڑبڑایا۔ لیکن عرشیہ اس کی بات نہیں سن سکی۔ اس کے لب ہلتے ہوئے دیکھے تو فوراً بولی۔

"کیا کہا تم نے؟"

"کچھ نہیں' میں تو کہہ رہا تھا مجھے محبت ہو گئی ہے۔" وہ ہنوز مسکرائے جا رہا تھا۔

"ہاں.... تو بتاؤ نا کس سے ہوئی ہے؟" وہ جھنجلا گئی۔

"تمہیں کبھی محبت ہوئی ہے؟" اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"جی نہیں۔"

"مجھ سے بھی نہیں؟"

"مجھے تم جیسے فضول انسان سے محبت کبھی نہیں ہو گی۔ اگر محبت ہوئی بھی تو کسی اچھے انسان سے ہو گی اور ویسے بھی مجھے الجھاؤ مت' اپنی بات کرو۔" وہ ابرو اچکا کر بولی۔

"محبت بتا کر تھوڑی ہوتی ہے۔ کیا پتا تمہیں مجھ جیسے فضول انسان سے ہی محبت ہو جائے۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا تو عرشیہ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں محبت کے بارے میں بڑی انفارمیشن ہے۔"

"جب دل پر چوٹ لگتی ہے تب ہی پتا چلتا ہے۔" زین کا انداز عرشیہ کو حیران کیے دے رہا تھا۔

"زین آر یو او کے۔ کیا ہو گیا ہے؟ اچھا یہ بتاؤ کون ہے وہ؟ کب سے جانتے ہو؟" وہ اس کے بازو پر دھیرے سے ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"کافی عرصے سے جانتا ہوں اس کو' لیکن محبت کا احساس کچھ دنوں سے ہونے لگا ہے۔ حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوا۔"

"کیا تم کافی عرصے سے اسے جانتے ہو اور مجھے اب بتا رہے ہو۔" اسے دھچکا لگا۔ کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہر بات شیئر کرتے تھے۔

"بتا تو رہا ہوں محبت کا احساس ابھی ہوا ہے اس کا نام عینا ہے۔" اس کا انداز ہنوز دھیما اور گمبھیر تھا۔

"میرے آفس میں ہی کام کرتی ہے۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں تمہارے لیے۔"

"صرف دعا۔"

"کیوں وہ تمہیں پسند نہیں کرتی؟"

"مجھے لگتا ہے کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتی تم دعا کرو اس کے دل میں میرے لیے بھی وہی احساسات' وہی جذبات پیدا ہو جائیں جو میرے دل میں ہیں۔" وہ ریلنگ پر ہاتھ رکھے رکھے کہیں کھو سا گیا۔

"دعاؤں پر بہت یقین ہے؟" عرشیہ نے آہستگی سے پوچھا۔

"ہاں...." اس کا لہجہ اب بھی کھویا کھویا سا تھا۔

"ٹھیک ہے میں دعا کروں گی۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ تائی جان اور تایا جان کو بھیجو اس کے گھر۔" اس نے اپنی طرف سے ایک معقول مشورہ دیا۔

"نہیں جب تک اس کے دل میں میرے لیے محبت پیدا نہیں ہو جاتی تب تک میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔"

"میرے خیال میں تو زین تم تایا جان اور تائی جان کو بھیج دو اس کے گھر یہی مناسب طریقہ ہے اور کیا پتا تمہارے نام سے جڑنے کے بعد اسے تم سے محبت ہو جائے' بلکہ یقیناً" ہو جائے گی۔" وہ اسے سمجھانے لگی۔

"نہیں پہلے اس کے دل میں بھی میرے جیسے جذبات پیدا ہونے چاہئیں۔ جیسا میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں ویسا ہی وہ بھی میرے بارے میں سوچے۔" اس کی سوئی ابھی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

"تو تمہیں کیسے پتا چلے گا کہ وہ بھی تم سے محبت کرنے لگی ہے۔" وہ بھی اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

"مجھے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت نظر آ جائے گی۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا تو وہ سر جھٹکتے ہوئے اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔

"عجیب منطق ہے تمہاری بھی۔ میں تمہارے لیے دعا کروں گی' اب جاؤ یہاں سے میں نے اسائنمنٹ بنانی ہے۔" وہ تیزی سے بولتے ہوئے پیپر سمیٹنے لگی۔

☼ ☼ ☼

عرشیہ اور زین کزنز ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے دوست بھی تھے مگر زین' عرشیہ کو چڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا'

عرشیہ کو سب پیار سے عرشی کہا کرتے تھے جبکہ زین اس کو چڑانے کے لیے قرشی کہتا۔ دونوں کی عمروں میں صرف دو سال کا فرق تھا لیکن عرشیہ کبھی اس فرق کو خاطر میں نہ لاتی۔ اس نے رو رو کر گریجویشن کر لیا تو زین نے چیلنج کر دیا کہ اب ماسٹرز بھی کر کے دکھاؤ چیلنج زین کی طرف سے اسی لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے زین کا چیلنج قبول کرنا پڑا اور سب سے بڑا عذاب تو تب نظر آتا جب اسے صبح صبح اٹھ کر زین کے ساتھ ہی یونیورسٹی جانا پڑتا کیونکہ زین کے آفس کے راستے میں ہی یونیورسٹی تھی۔ زین کے دو بہن بھائی بڑا بھائی شایان اور چھوٹی بہن زونیہ جبکہ عرشیہ کا بڑا بھائی کاشان تھا۔ عرشیہ کو خاندان کی پہلی لڑکی ہونے کی وجہ سے تایا جان اور تائی جان سے بھی بے حد پیار ملا.... کاشان اور شایان کی شادی ہو چکی تھی جبکہ بڑوں کا ارادہ زین اور عرشیہ کو مضبوط بندھن میں باندھنے کا تھا مگر ان دونوں کے لاابالی پن کی وجہ سے خاموش تھے۔ دوسری طرف جب سے زین نے اسے عینا کے بارے میں بتایا تھا وہ دعا کے لیے جب بھی ہاتھ اٹھاتی تو اس کے لیے دعا کرنا نہ بھولتی آخر کو دونوں اچھے دوست بھی تو تھے۔

☼ ☼ ☼

زین کو عرشیہ سے عینا کے بارے میں بات کیے کافی دن گزر چکے تھے اس کے بعد ان دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔ رات وہ سونے کے لیے لیٹی تو اچانک ہی اسے زین کا خیال آگیا ساتھ ہی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ دو تین دن سے ایسا ہی ہو رہا تھا جب زین کے بارے میں سوچتی تو دل شور مچانے لگتا اسے خود سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا بچپن کی دوستی تھی اس کی زین کے ساتھ مگر..... مگر اب کیا ہو رہا ہے وہ اپنی اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔

"کیا مجھے زین سے محبت..... نہیں..... نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" اس نے فوراً" تردید کی لیکن دل کی آواز کو دبانا مشکل تھا۔

"عرشیہ جی آپ کو زین سے محبت ہو گئی ہے۔" اس نے دل کو ڈپٹ کر چپ کروایا مگر کب تک..... دل تو دل ہوتا ہے اس کا تو کام ہی محبت کے نام پر شور مچانا ہے۔ اسے جتنا خاموش کرواؤ اتنا ہی شور مچاتا ہے۔

رات اسی طرح سوتے جاگتے گزر گئی۔

______ صبح یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو کر ناشتے کے لیے آئی تو سامنے زین بیٹھا ناشتا کر رہا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی ایک "خاص" مسکراہٹ نے عرشیہ کے چہرے کا احاطہ کیا لیکن اگلے ہی پل وہ مسکراہٹ معدوم ہو گئی اسے دیکھ کر جو "خاص" چمک اس کی آنکھوں میں آئی تھی وہ بھی غائب ہو چکی تھی وہ چیئر گھسیٹ کر آرام سے بیٹھ گئی اور سامنے رکھے ہوئے ناشتے کو گھورنے لگی۔ اس کے اترے ہوئے چہرے کو سب سے پہلے تائی جان نے دیکھا۔

"عرشی بیٹا کیا ہوا؟ طبیعت ٹھیک ہے نا تمہاری ناشتا بھی صحیح طرح سے نہیں کر رہیں۔"

"جی تائی جان ٹھیک ہوں۔" حد درجہ دھیما لہجہ آواز میں پہلے جیسا کرارا پن نہیں تھا۔

"پھر کیا ہوا ہے؟ طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو چھٹی کر لو۔" امی پریشانی سے بولیں۔

"کہہ تو رہی ہوں ٹھیک ہے طبیعت کچھ نہیں ہوا مجھے۔" دھیمے لہجے میں بے زاری جھلکنے لگی آواز میں نمی گھل گئی تھی۔ سب سے پہلے زین نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا مگر کہا کچھ نہیں۔ عرشیہ کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے لیکن ادراک کا ایک لمحہ تھا اور اسی لمحے میں اسے اپنی اس کیفیت کی "وجہ" سمجھ میں آگئی تھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ اچانک بیٹھے بٹھائے اسے کسی سے محبت ہو جائے گی۔ جس شخص کو وہ بچپن سے جانتی تھی، بچپن سے دوستی تھی مگر آج تک ایسا نہیں ہوا تھا مگر اس کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ جسے وہ چاہنے لگی تھی وہ کسی اور کو چاہتا تھا۔

"عرشی بیٹا کہاں کھو گئیں؟" پاپا کی آواز نے ایک مرتبہ پھر سے سوچوں کے بھنور سے باہر نکالا۔

"کچھ نہیں پاپا بس ایسے ہی میں کچھ سوچ تو نہیں رہی۔" اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"واقعی اگر طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو چھٹی کر لو آج۔" زین نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"صاف کہو تم ساتھ لے کر جانا نہیں چاہتے۔" اچانک ہی اس کا لہجہ تلخ ہو گیا سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا زین کا بھی بائیک کی چابی کی طرف بڑھتا ہاتھ رک گیا پھر توقف کے بعد بولا۔

"نہیں چلو تم۔" زین نے کہا تو وہ اٹھ گئی اور سب کو اللہ حافظ کہتی اس کے پیچھے چل پڑی۔

☼ ☼ ☼

"تم آج اتنی چپ کیوں ہو؟" وہ اس کی خاموشی کو کب سے نوٹ کر رہا تھا۔

"بس ایسے ہی۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟"

"ٹھیک ہوں۔" اچانک ہی اسپیڈ بریکر آیا تھا اور عرشیہ گرتے گرتے بچی بائیک پر بیٹھتے وقت فطری جھجک آڑے آگئی تھی جس کی وجہ سے اس نے زین کے کندھے کو نہیں پکڑا تھا وہ اپنے دھیان میں ڈھیلی ہو کر بیٹھی تھی اور جب اسپیڈ بریکر آیا وہ گرتے گرتے

بچی اور الٹا اسی پر برس پڑی۔

"تم بائیک دھیان سے نہیں چلا سکتے کسی دن خود بھی مرو گے اور مجھے بھی اگلے جہاں پہنچاؤ گے۔" وہ اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے شوخی سے بولا۔

"ہاں تو ٹھیک ہے نا پھر وہی ہو گا ہم تو ڈوبے ہی تھے صنم تمہیں بھی لے ڈوبے۔"

"تمہاری صنم ہو گی وہ عینا مجھے نہ لاؤ بیچ میں۔" وہ دانت چباتے ہوئے بولی۔ ابھی اور آگے گئے ہی تھے کہ ایک اور اسپیڈ بریکر آیا اور عرشیہ سڑک کے کنارے گھٹنوں کے بل گر پڑی۔ زین کو بائیک روکنی پڑی اس نے خود کو بیلنس کر لیا تھا اگر بیلنس نہ کرتی تو منہ کے بل گرتی۔

"عرشی چوٹ تو نہیں لگی۔" وہ فوراً" اس کے پاس پہنچا اور سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ اردگرد کے کچھ لوگ بھی ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ شرمندگی کے احساس سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"کچھ نہیں ہوا مجھے پہلے بھی کہا ہے دھیان سے بائیک چلایا کرو اگر روڈ پر گرتی نا تو یہاں مری پڑی ہوتی۔" گھٹنے پر چوٹ لگنے کے باعث وہ لنگڑا کر چل رہی تھی۔

"اللہ نہ کرے کیا ہو گیا ہے آج تمہیں۔"

"کچھ نہیں ہوا مجھے۔" وہ رونے لگی۔

"اچھا رو تو مت پاس ہی کلینک ہے چوٹ لگی ہے تو بینڈیج کروا لو اور اس کے بعد گھر ہی چلو گی یا یونیورسٹی۔" وہ اس کے رونے کی وجہ سے پریشان ہو گیا۔

"یونیورسٹی جاؤں گی۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

"واپسی پر آجاؤ گی نا یا گھر فون کر دوں تمہیں کوئی آکر لے جائے۔"

"اگر ضرورت پڑی تو کر دوں گی تم پریشان نہ ہو میرے پاس سیل فون ہے۔" وہ بائیک پر بیٹھتے ہوئے بولا تو زین ہلکا سا مسکرا دیا اور بائیک اسٹارٹ کر دی بہت آرام سے چلاتے ہوئے یونیورسٹی پہنچا اور اسے یونیورسٹی کے گیٹ کے سامنے اتارتے ہوئے کہا۔

"اپنا خیال رکھنا۔" اس کا ایک جملہ اسے اندر تک سرشار کر گیا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہونے تک اسے دیکھتی رہی پھر سر جھٹک کر گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

دن ایسے ہی روکھے پھیکے سے گزر رہے تھے۔ زین، عینا کا ذکر کم ہی کیا کرتا تھا۔ عرشیہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے سارا دن وہ یونیورسٹی، گھر اور کبھی پڑھائی میں مگن رہتی جس کی وجہ سے وہ سوچوں سے چھٹکارا حاصل کر لیتی لیکن جیسے ہی رات ہوتی تو ایک لامتناہی سوچوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا کیا کرے کیا نہ کرے کی جنگ میں الجھ جاتی۔

"کہیں وہ میں تو نہیں ہوں۔" سوچتے سوچتے ایک خوش کن سا خیال آیا لیکن اگلے ہی پل۔ "نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے خود ہی اپنے خیال کو جھٹک دیا۔ اس نے بہت دل سے زین اور عینا کے ایک ہو جانے کی دعا مانگی تھی اور اپنے دل سے زین کی محبت نکل جانے کی بھی.....

اتوار کا دن تھا تقریباً" سب ہی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے وہ دوپہر کی سوئی شام میں ہی نیچے آئی تو سامنے صوفے پر زین کو براجمان پایا جس کے ہاتھ میں ایک تصویر تھی وہ محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا آنکھوں میں گہری چمک اور لبوں پر گہری مسکراہٹ۔ اس کا انداز عرشیہ کو بہت کچھ باور کرا گیا اس کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹا تھا پھر وہ آگے بڑھی اور تصویر کے پیچھے لکھی تحریر کو پڑھنے لگی۔

"ون اینڈ اونلی مائی....." اس کی آواز اتنی اونچی تھی کہ زین نے سن لی اور فوراً" تصویر کو کشن کے نیچے چھپا دیا۔

"کس کی تصویر ہے؟" اسی صوفے پر اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"عینا کی۔"

"کیا... عینا کی؟ کہاں سے لی ہے؟" وہ دبی دبی آواز میں چلائی۔

"بس لے لی ہے۔" اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

"زین سچ بتاؤ موبائل میں لی ہوگی اور بعد میں...."

"جی نہیں میں ایسی حرکتیں نہیں کرتا۔" وہ اس کی بات سمجھ چکا تھا اسی لیے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"تو پھر۔"

"تمہیں اس سے مطلب؟"

"زین سچ سچ بتاؤ ورنہ میں تائی جان اور تایا جان کو بتا دوں گی۔" انگلی اٹھا کر اسے وارننگ دی۔

"جاؤ جا کر بتا دو میں کسی سے نہیں ڈرتا۔" وہ کشن کے نیچے سے تصویر نکال کر لے گیا اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھتی رہی اسے بہت افسوس ہو رہا تھا اس کے رویے پر لڑائی تو پہلے بھی ہوتی تھی ان دونوں کے درمیان مگر اس نے کبھی اتنا محسوس نہیں کیا تھا بات تو اب بھی معمولی سی تھی مگر وہ زیادہ محسوس کر رہی تھی دل کے انداز جو بدل گئے تھے تو محسوس ہونا لازم تھا۔

وہ رات کو عشاء کی نماز پڑھ کر دعا مانگ رہی تھی۔ زونیہ سر تک کمبل اوڑھے بے خبر سو رہی تھی اتنی دیر میں کوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ عرشیہ کی عادت تھی وہ دعا تھوڑی اونچی آواز میں مانگا کرتی تھی۔ عرشیہ کی اس کی طرف پشت تھی اس کو دعا مانگتا دیکھ کر وہ چونک گیا۔

"یا اللہ وہ میرا نہیں ہے۔ وہ میرا ہو بھی نہیں سکتا اسے عینا سے ملا دے اے میرے اللہ جی! میرے دل سے اس کا خیال نکال دے وہ میرا کیسے ہو سکتا ہے اس کے دل میں تو عینا بستی ہے پھر میں کیسے.... میں کیسے اس کے دل میں جگہ بنا سکتی ہوں ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے' عینا کے دل میں زین کی محبت پیدا کر دے اور میرے دل سے اس کی محبت نکال دے پلیز یا اللہ' پلیز۔" وہ روتے روتے سجدے میں چلی گئی اور وہ مسکرا کر پلٹ گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ زین سے ناراض تھی یونیورسٹی اس کے ساتھ جاتی مگر صحیح طرح سے بات نہیں کرتی۔ زین نے اس کے رویے کو نوٹ کیا تھا اگر وہ بات کرنے لگتا تو وہ اٹھ جاتی عرشیہ کی غیر معمولی خاموشی کو سب نے نوٹ کیا اسی لیے جب شام کو سب بیٹھے تو تایا جان نے پوچھ لیا۔

"عرشی بیٹا کیا بات ہے آج کل آپ کچھ چپ چپ سی رہنے لگی ہیں؟"

"کچھ نہیں تایا جان بس ایسے ہی ایگزام ہونے والے ہیں تو اس کی ٹینشن ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی تو پاس بیٹھے زین کو خوامخواہ کھانسی آگئی کاشان بھائی اور شایان بھائی اس کی شرارت سمجھتے ہوئے مسکرا دیے۔

"اچھا تو ہماری قرشی کو پڑھائی کی فکر کب سے ستانے لگی۔" وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔

"تم سے مطلب۔"

"تم دونوں میں ناراضی ہوئی ہے کیا؟" تائی جان بولیں۔

"نہیں تم مجھ سے ناراض ہو اور حیرت کی بات دیکھو مجھے اوروں سے پتا چل رہا ہے۔" وہ مصنوعی حیرت سے اس کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم کرو اپنی اس عینا کی فکر' میری فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ دانت چباتے ہوئے بولی اس کی آواز صرف زین سن سکا تھا جس کی وجہ سے اس کا قہقہہ ابھرا۔

"کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے؟" زونیہ بیچ میں ٹپکی۔

"تمہیں کیوں بتائیں؟" زین فوراً بولا۔

"ادھر آؤ زونی میں بتاؤں کیا ہوا ہے؟" وہ اسے چڑانے لگی۔

"خبردار جو تم نے کسی کو کچھ بتایا۔" وہ اسے وارن کرتے ہوئے بولا مگر وہ اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے تائی جان کی طرف بڑھی۔ آج وہ اپنے آپ کو سب کے سامنے نارمل رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تائی یہ جو زین ہے نا...."

"ہاں بیٹا کیا ہوا کچھ کہا اس نے تم سے؟"

"جی تائی جان بہت بدتمیز ہو گیا ہے آج کل بہت تنگ کرتا ہے یونیورسٹی لے کر جاتے ہوئے بائیک بھی ایسے چلاتا ہے جیسے ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو۔" وہ لاڈ سے ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

"کیوں بھئی؟ کیوں تنگ کرتے ہو میری بیٹی کو۔" تایا جان نے اس کی سائیڈ لی۔

"نہیں ابو جی میں نے اسے کبھی کچھ نہیں کہا اس کی تو عادت ہے لڑاکا بلیوں کی طرح لڑنے کی اور ہر وقت شکایتیں لگاتی رہتی ہے۔" وہ اس کے الزام پر تڑپ اٹھا تھا۔

"بھائی جان! آپ کبھی عرشی کے بھی کان کھینچ لیا کریں یہ بھی کسی سے کم تو نہیں ہے۔" اب کی بار امی بولیں تو وہ برے برے منہ بنانے لگی۔

"امی میں آپ کی بیٹی ہوں یا زین آپ کا بیٹا ہے۔"

"تو تم کیوں میری امی اور ابو کے ساتھ چپک کر بیٹھی ہو وہ میرے امی ابو ہیں یا تمہارے' چپکو کہیں کی۔" زین مقابلے پر اتر آیا۔

"تایا جان اس سے کہیں اپنی زبان بند رکھے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" اس سے پہلے کہ تایا جان اس کی حمایت میں ایک دفعہ پھر بولتے زین فوراً بول پڑا۔

"تم سے برا اب بھی کوئی نہیں ہے قرشی کی بچی۔"

"اب مجھے قرشی کہا نا تو چھوڑوں گی نہیں۔"

"بس کرو تم دونوں کیا بچوں کی طرح لڑتے رہتے ہو۔" بابا ان دونوں کو ڈپٹتے ہوئے بولے تو وہ دونوں خاموش ہو گئے مگر ایک دوسرے کو منہ چڑانا لازمی سمجھا تھا۔ ان دونوں کی یہ حرکت دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنے روم میں بیٹھی تھی جب زونی عجلت میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

"عرشی آپی باہر دیکھو کتنا پیارا موسم ہو رہا ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟" وہ بے نیازی سے بولی۔

"تم آج کل مرچیں چبا کر کیوں بیٹھی رہتی ہو چلو نا ہم زین بھائی سے کہتے ہیں کہ ہمیں آئس کریم کھلانے لے چلیں۔" وہ خوشی سے چہکی۔

"تم نے جانا ہے تو جاؤ' میں نہیں جا رہی میرا ٹیسٹ ہے اس کی تیاری کر رہی ہوں۔" اس نے بہانہ گھڑا وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اپنے ہی لفظوں میں بری طرح پھنس جائے گی زونی بھی اس سے دو ہاتھ آگے تھی۔

"تو یہ ہاتھ میں موبائل پکڑ کر کون سے ٹیسٹ کی تیاری ہو رہی ہے۔"

"افوہ کیا مصیبت ہے پیچھے کیوں پڑ جاتی ہو چلتی ہوں۔" وہ دونوں نیچے آگئیں زین سامنے صوفے پر براجمان تھا۔

"بھائی دیکھو نا کتنا پیارا موسم ہو رہا ہے۔" زونیہ نے تمہید باندھی۔

"ہاں تو پھر۔"

"ہمیں آئس کریم کھلانے لے چلو۔"

"زیادہ فری نہ ہو میں نہیں جا رہا۔" اس نے صاف انکار کیا تو زونیہ نے عرشیہ کو بولنے کا اشارہ کیا۔

"زین لے چلو نا پلیز۔"

"کسی اور کو کہہ دو میں تم لوگوں کا نوکر نہیں ہوں فرینڈ کے گھر جانا ہے تو زین جائے گا۔ بازار جانا ہے تو زین جائے گا' حد ہوتی ہے بھئی۔" وہ کلس کر بولا۔

"اور کس کو کہیں کاشان اور شایان بھائی تو گھر ہیں ہی نہیں آپ جلدی گھر نہ آتے تو ہم کہتے بھی نہیں۔" زونیہ کو غصہ آنے لگا۔

"ہاں تو وہ گھر میں ہوں بھی تو میں ہی نظر آتا ہوں ان دونوں کو اپنی بیویوں کے نخروں سے فرصت ملے تو تم دونوں کی طرف دیکھیں۔" اتنی دیر میں ندا بھابھی اور سونیا بھابھی بھی چلی آئیں زین کی ان کی طرف پشت تھی جس کی وجہ سے وہ دھڑلے سے ان کی "تعریف" کر رہا تھا ان دونوں نے اس کی بات سن لی تھی اسی لیے

آگے بڑھ کر انہوں نے اس کا دایاں' بایاں کان پکڑ لیا۔
"او مر گئے۔" زین آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔
"کیا کہہ رہے تھے تم؟" ندا بھابھی بولیں۔
"تمہارے نخرے ختم نہیں ہوتے۔" اب سونیا بھابھی بولیں تو اس نے آہستہ سے اپنے کان چھڑوائے دوسری طرف زونیہ اور عرشیہ کا ہنس ہنس کر برا حال ہو رہا تھا۔
"نہیں بھابھی ایسی کوئی بات نہیں ہے' میں تو بس کہہ رہا تھا اب آپ ان کی ذمہ داری ہیں نا آپ دونوں کی ذمہ داری اٹھانا تو ان کا فرض ہے اور آپ کے نخرے اٹھانا بھی میں نے کوئی جھوٹ بولا ہے۔" وہ اپنی صفائی دیتے ہوئے بولا۔
"چلو معاف کیا ویسے کہاں جانے کا ارادہ ہے؟" ندا بھابھی ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولیں۔
"بھابھی دیکھیں نا میں بھائی سے کہہ رہی ہوں ہمیں آئس کریم کھلانے لے چلیں مگر یہ مان ہی نہیں رہے۔" زونیہ' سونیا بھابھی کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔
"ہاں زین یہ تو بہت اچھا آئیڈیا ہے چلو سب مل کر چلتے ہیں۔" سونیا بھابھی بھی خوش ہو گئیں۔
"یک نہ شد چار شد۔" اس نے محاورے کا ستیاناس کیا۔
"میں نہیں جا رہا۔" اس نے اپنی طرف سے بات ختم کی۔
"مجھ سے بات مت کرنا۔" عرشیہ اتنا کہہ کر رکی نہیں ٹیرس پر چلی گئی اور وہ جانتا تھا وہ ناراض ہو گئی ہے۔ جب بھی وہ ناراض ہوتی تھی وہ ٹیرس پر چلی جاتی تھی یا پھر اپنے کمرے میں ابھی بھی وہ فوراً اس کی طرف لپکا۔
"ان دونوں کو کیا ہو گیا ہے؟" ندا بھابھی نے حیرانی سے زین کو جاتے ہوئے دیکھا۔ زین نے پہلے اس کے کمرے میں جھانکا لیکن وہ وہاں نہیں تھی وہ ٹیرس کی طرف بڑھا تو وہ ریلنگ پر ہاتھ رکھے زار و قطار رو رہی تھی۔
"ناراض ہو گئی ہو؟" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
"کیوں آئے ہو میرے پاس جاؤ اپنی عینا کے پاس اسی کی خواہشات پوری کرو۔" فطری جیلسی در آئی۔
"اچھا سوری نا۔"
"تم جاؤ یہاں سے۔"
"کیوں ظلم کر رہی ہو اپنی ان چنی چنی آنکھوں پر۔" اس نے اسے ہنسانے کی کوشش کی مگر وہ اب بھی رو رہی تھی وہ ایسے کبھی بھی نہیں روئی تھی اگر روئی تو تھوڑی دیر بعد چپ کر جاتی وہ اتنے دنوں کا غبار نکال رہی تھی جب سے محبت جیسے خوبصورت احساس نے اس کے دل پر دستک دی تھی وہ بجائے کھلنے کے مرجھا گئی تھی اس احساس نے اس کی خوشی چھین لی تھی وہ سوچتی تھی کاش اسے محبت نہ ہوئی ہوتی اور اگر ہوتی تو کسی ایسے شخص سے ہوتی جسے اس سے محبت ہوتی اسے اب ذرا ذرا سی بات پر رونا آنے لگا تھا۔ پاس کھڑے زین نے اسے کھل کر رونے دیا وہ بھی کبھی کبھی زیادتی کر جاتا تھا اب وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی تو زین کے دل کو کچھ ہونے لگا برداشت ختم ہو گئی تو اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔
"عرشی پلیز چپ کر جاؤ سوری کر تو رہا ہوں مانتا ہوں غلطی ہو گئی مگر اس میں اتنا رونے والی کون سی بات ہے پہلے بھی تو ہم دونوں میں جھگڑا ہوتا تھا تم نے پہلے تو اس طرح ری ایکٹ نہیں کیا آج کیا ہو گیا ہے؟"
"میں نے..... میں نے کہا نا تم جاؤ یہاں سے۔" وہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔
"عرشی کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"
"تم نہیں سمجھو گے۔"
"کیا مطلب؟"
"کچھ نہیں۔"
"اچھا چلو اب کان پکڑتا ہوں اب کچھ نہیں کہوں گا تمہیں پرامس۔" وہ کان پکڑتے ہوئے بولا تو وہ روتے روتے ہنس دی جبکہ زین اس کو دیکھتا رہ گیا۔
"زین عینا بہت خوبصورت ہے؟" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔
"عرشی محبت خوبصورتی سے تو مشروط نہیں ہے محبت تو دلوں سے مشروط ہوتی ہے محبت کے لیے دل کا خوبصورت ہونا ضروری ہے صورت کا نہیں' دیکھنے والی آنکھ خوبصورت ہونی چاہیے اور جب ہم کسی سے محبت کرتے ہیں تو اسی کی صورت سب صورتوں سے اچھی لگنے لگتی ہے جس کو دیکھتے ہی سکون مل جائے اور دل کی کھیتی سیراب ہو جائے اسی لیے جس شخص سے ہم محبت کرتے ہیں اس کا خوبصورت ہونا ضروری نہیں ہے اور ویسے بھی محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے اور جس سے محبت ہو جائے وہی خوبصورت لگنے لگتا ہے چاہے اس سے خوبصورت کتنے بھی چہرے آپ کے سامنے آجائیں اگر محبت سچی ہے تو اس کے علاوہ کوئی اچھا نہیں لگے گا اور ویسے بھی جس سے میں محبت کرتا ہوں وہ میرے لیے بہت خوبصورت ہے ڈیٹس اٹ۔" وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے گمبھیر لہجے میں بولتا کوئی اور ہی زین لگا تھا اس کی نظروں میں کچھ ایسا تھا جس نے عرشیہ کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ زین کے لیے بھی وہ کوئی اور ہی عرشیہ تھی جسے آج اس نے پہلی بار اس طرح روتے ہوئے دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

عرشیہ کے ایگزام شروع ہو چکے تھے اور وہ پوری طرح ان کی تیاریوں میں مگن تھی اس وجہ سے گھر میں ہونے والی ہلچل کی اس کو کانوں کان خبر نہ تھی۔ زین نے نہ جانے تائی جان کے کانوں میں کیا اسم پھونکا تھا۔ انہوں نے امی اور پاپا سے بات کی تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ روزانہ شام کو دیر تک بڑوں کی میٹنگ چلتی جس میں کاشان بھائی اور شایان بھائی بمعہ اپنی بیگمات کے شامل ہوتے۔ وہ رات کو پیپر کی تیاری کر رہی تھی جب امی اس کے پاس آئیں۔
"کیا کر رہی ہو بیٹا؟"
"امی پیپر کی تیاری کر رہی ہوں صبح لاسٹ پیپر ہے گھر آ کر سارا دن سوؤں گی۔" وہ انگڑائی لیتے ہوئے بولی۔
"اچھا بیٹا ایک بات پوچھوں؟" عرشیہ ان کے انداز پر ٹھٹک گئی پھر حیرانی سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
"جی امی۔"
"تمہیں زین کیسا لگتا ہے؟" ان کے پوچھنے کا انداز ہی ایسا تھا کہ وہ حیران سی ان کی شکل دیکھنے لگی پھر سنبھلتے ہوئے بولی۔
"اچھا ہے امی آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟"
"پھر بھی کیسا لگتا ہے؟"
"اچھا ہے۔"
"ٹھیک ہے۔" وہ اتنا کہہ کر اسے پیار کر کے چلی گئیں جبکہ وہ اپنی جگہ بت بنی رہ گئی اب وہ امی کو کیا کہتی۔ امی یہ سب کیوں پوچھ رہی تھیں؟ اگر ایسی ویسی کوئی بات ہوئی تو کیا زین سے کسی نے پوچھا ہے؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اس نے سوچتے ہوئے جھنجھلا کر تکیہ کو بیڈ پر پٹخا پھر تھوڑی دیر بعد لائٹ آف کر کے سو گئی۔
عرشیہ لاسٹ پیپر دے کر گھر آئی اور اپنی نیند پوری کرنے کی غرض سے سو گئی۔ شام کو ندا بھابھی' سونیا بھابھی اور زونیہ آندھی طوفان کی طرح اس کے کمرے میں داخل ہوئیں اور اس کا کمبل کھینچ کر اتار دیا جس کے نتیجے میں وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور گھبرا کر پوچھا۔
"کیا ہوا؟" مندی مندی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر ذہن ابھی تک سویا ہوا تھا۔
"وہاں تمہاری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ ہو گیا ہے اور تم یہاں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی ہو۔" ندا بھابھی تیزی سے بولیں۔
"کیا مطلب؟ سونے دو یار بہت نیند آ رہی ہے۔" وہ ان کی بات کو نظر انداز کرتی دوبارہ لیٹ گئی مگر زونیہ اس کا بازو پکڑ کر دوبارہ اٹھاتے ہوئے بولی۔
"پتا ہے سب تمہیں میری چھوٹی بھابھی بنانے والے ہیں اب اٹھ جاؤ پلیز۔" اس کا ذہن جو تھوڑا

بہت جاگ گیا تھا اب پوری طرح جاگ گیا اور آنکھیں بھی پوری طرح کھل گئیں۔ وہ اس کی بات پر اچھل پڑی اور فوراً" کھڑی ہو گئی۔

"کیا... کیا کہہ رہی ہوں؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا؟"

"کیوں کیا ہوا؟ اس میں اتنی حیرانی والی کون سی بات ہے کیا تمہیں زین بھائی اچھے نہیں لگتے؟" زونیہ پریشانی سے بولی مگر اس کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

"یہ سب کس نے کیا ہے زین سے پوچھا کسی نے؟"

"بھئی اسی نے تو امی سے بات کی تھی کہ تمہیں پسند کرتا ہے۔ لہٰذا جلد از جلد منگنی وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔" ندا بھابھی نے وضاحت دی۔

"کیا؟ مگر وہ عینا... زین کہا ہے؟" وہ چیخ پڑی مگر سنبھلتے ہوئے بولی۔

"اپنے کمرے میں۔" سونیا بھابھی بولیں تو وہ فوراً" وہاں سے نکل پڑی جبکہ وہ تینوں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

وہ تن فن کرتی زین کے کمرے میں پہنچی اور زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا اور اجازت ملتے ہی اندر چلی گئی وہ بیڈ پر نیم دراز وہی تصویر ہاتھ میں لیے اسی انداز میں دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیا ہے زین؟"

"تصویر ہے۔" وہ حد درجہ معصومیت سے بولا۔

"افوہ میں اس کی بات نہیں کر رہی یہ گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ تم... تم ایسا کیسے کر سکتے ہو اگر تم نے کسی کے دباؤ میں آکر یہ سب کیا ہے تو انکار کر دو میں... میں تائی جان اور تایا جان کو منالوں گی تم بالکل فکر نہ کرو تم کیسے آسانی سے اپنی محبت سے دستبردار ہو سکتے ہو زین یہ سب کیا ہے؟" وہ بغیر کوما فل اسٹاپ کے بولے جا رہی تھی اور زین لبوں پر گہری مسکراہٹ سجائے گہری نظروں سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کے چپ ہونے پر آہستگی سے بولا۔

"ہو گئی تقریر ختم؟ کتنی دفعہ کہا ہے پہلے کسی کی پوری بات سن لیا کرو پھر بولا کرو یہ سب میری مرضی سے ہوا ہے سنا تم نے۔"

"لیکن زین وہ عینا... اگر عینا نہیں مان رہی تو میں اس کو منالوں گی تم مجھے اس سے ملوا دو۔"

"عینا مان چکی ہے اس کو بھی مجھ سے محبت ہے۔"

"زین پھر یہ سب کیا ہے؟ کیوں الجھا رہے ہو مجھے۔" وہ جھنجلا گئی۔

"الجھا کب رہا ہوں، میں تو سمجھا رہا ہوں عینا کی تصویر دکھاؤں تمہیں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ تکیے کے نیچے سے تصویر نکال کر اس کے سامنے لے آیا تو عرشیہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"یہ... یہ تو میری تصویر ہے۔" جب اس نے تصویر کو پلٹ کر دیکھا تو اس کے پیچھے "ون اینڈ اونلی مائی عرشی" لکھا ہوا تھا۔

"زین یہ سب کیا ہے؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا وہ عینا کون تھی پھر۔" ابھی بھی اس الجھی ڈور کا سرا عرشیہ کے ہاتھ نہ لگا تھا زین سر پیٹ کر رہ گیا۔

"عقل سے پیدل ہو بالکل ابھی بھی سمجھ میں نہیں آیا تو آرام سے بیٹھو اور سنو۔" وہ اسے کندھوں سے تھام کر بیڈ پر ٹکاتے ہوئے بولا اور خود کچھ فاصلے پر بیٹھ کر بولنے لگا۔

"عینا تم ہی تھیں۔ تمہارا فرضی نام میں نے عینا رکھ دیا تھا، میں تم سے محبت کرتا ہوں لیکن تم مجھ سے محبت نہیں کرتی تھیں اسی لیے میں نے تمہارے سامنے عینا کا ذکر کیا کہ ہو سکتا ہے کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو لیکن ظاہر نہ کرتی ہو اور عینا کے بارے میں سن کر تمہاری فیلنگز ظاہر ہو جائیں لیکن میرا اندازا غلط تھا تم واقعی مجھ سے محبت نہیں کرتی تھیں۔ پھر میں نے تمہیں دعا کرنے کے لیے کہا کیونکہ میں جانتا تھا کہ تم سچے دل سے میرے لیے دعا کرو گی اور جو دعا سچے دل سے کی جاتی ہے وہ قبول بھی تو ہوتی ہے۔ مجھے بھی دعاؤں پر بہت یقین تھا میں بھی دعا کرتا تھا کہ تمہارے دل میں میرے لیے محبت پیدا ہو جائے اور تم نے بھی میرے لیے دعا کرنی شروع کر دی عینا کا تو سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تھا وہ تم ہی تھیں اس طرح تمہارے دل میں میری محبت پیدا ہو گئی۔

تمہاری محبت مجھے آنکھوں میں نظر آنے لگی تھی مگر مجھے یقین نہیں تھا ایک دن تم رات کو دعا مانگ رہی تھیں کہ اچانک میں تمہارے کمرے میں آگیا تمہاری میری طرف پشت تھی اسی لیے میں نے تمہیں دعا مانگتے ہوئے سن لیا اس پل مجھے یقین ہو گیا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو اور تمہیں مجھ جیسے "فضول انسان" سے محبت ہو گئی بس یا اور کچھ؟" وہ اس کے انکشاف پر حیرت سے اس کی شکل دیکھ رہی تھی پھر تھوڑے توقف کے بعد سنبھلتے ہوئے بولی۔

"تو تم سیدھی طرح یہ بات منہ سے نہیں پھوٹ سکتے تھے، میں کتنا روئی ہوں اس کا اندازہ ہے تمہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے لیکن میں کون سی بات اپنے منہ سے سیدھی طرح پھوٹتا۔" وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔

"یہ ہی کہ تم مجھ سے..."

"کیا میں تم سے...؟"

"یہ ہی کہ..." اس نے بات کرتے کرتے اچانک اس کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی وہ اس کی نظروں کا مفہوم جان چکی تھی کہ وہ اس کے منہ سے اگلوانا چاہتا ہے۔

"بہت فضول انسان ہو تم۔" اس کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"اب کیا کیا جا سکتا ہے تمہیں تو اس "فضول انسان" سے محبت ہو گئی ہے۔"

"اگر میں اب انکار کر دوں تو پھر۔" وہ اتراتے ہوئے بولی۔

"اب تو محبت ہو گئی ہے انکار کرنے کا حوصلہ ہے؟ ویسے میں نے شادی ابھی اس لیے نہیں کروائی کہیں تم فیل نہ ہو جاؤ ایک دفعہ پاس ہو جاؤ پھر ہی شادی کریں گے۔" وہ اس کو چھیڑتے ہوئے بولا۔

"اب ایسی بھی بات نہیں ہے خود جینئس ہو تو ہر کسی کو نالائق ہی سمجھتے ہو، میں بے شک کم نمبر لوں لیکن پاس ہو جاتی ہوں کبھی فیل نہیں ہوتی۔" وہ اپنی ٹون میں واپس آچکی تھی۔

"ویسے تم ایگزام میں اچھے نمبروں سے پاس ہو یا نہ ہو لیکن یہاں تم بہت اچھے نمبروں سے پاس ہو چکی ہو۔" وہ شہادت کی انگلی اپنے دل پر رکھتے ہوئے بولا تو وہ آہستہ سے ہنس دی۔ دونوں کی دعائیں رنگ لے آئی تھیں دونوں نے دعاؤں کے ذریعے ایک دوسرے کو پا لیا تھا۔
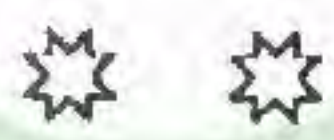
☼ ☼

عُنیزہ گل

حسابِ عمر کا گوشوارہ

"اور یہ شام بھی زندگی کے نام ہوئی۔" بس سے اتر کر تھکے تھکے قدموں سے گھر تک کا سفر طے کرتے ہوئے منتہی نے سوچا۔

بابا کی دوائیاں یوٹیلٹی بلز، غنی کے کالج کی فیس، اگلے دن کے کاموں کی فہرست ابھی سے تیار ہونی شروع ہو گئی تھی۔

"کاش... آسمان سے کوئی شہزادہ اترے اور میرے سارے دکھوں کو سکھوں میں بدل دے۔" اسٹاپ سے گھر تک کے دس منٹ کے دورانیے میں شاہ خاور کی بلا شرکت حکمرانی میں کالے اودے بادلوں نے ایسا شب خون مارا کہ ساری روشنی کو تاریکی کا لبادہ اوڑھا دیا۔ اس کے گھر تک پہنچتے پہنچتے خوب زوردار گھمسان کے ٹکراؤ کے بعد ٹپ ٹپ بوندیں پڑنا شروع ہو گئیں۔

"شکر ہے کہیں کا تو حبس ٹوٹا۔" وہ گھر میں داخل ہوئی برآمدے سے ابا کے کمرے میں گھسنے کے وقفے کے دوران ہی موسم کی پہلی بارش اسے بھگو چکی تھی ابا اپنے بستر پر آنکھیں موندے لیٹے تھے وہ کتنی دیر چوکھٹ پکڑے ان کے وجود کو آنکھوں میں سماتی رہی ہمیشہ کی خواہش نے پھر سے زور پکڑ لیا۔

"کبھی تو ایسا ہو کہ وہ لوٹے تو ابا اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے گلے لگالیں۔" بیتے دنوں کی ریاضت کے ثمر کا کوئی تو امکان پیدا ہو، کچھ بہت پرانی بات بھی نہیں بس چار سالوں کا ہی تو عرصہ جھیلا تھا اس نے اماں کی ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ، ابا کا پیرالائز ہو جانا ایک ساتھ دو بڑے غم اس ننھی جان پر ایسے پڑے کہ اب تو مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آسان ہو گئیں حالانکہ اس کا نمبر تو دوسرا تھا لیکن بس وہ ہی جب قسمت کسی کا پیچھا لے لے تو نمبر، عمر کچھ نہیں دیکھتی، ابا کی پرسکون نیند کا اطمینان کر کے سب کے مشترکہ کمرے میں داخل ہوئی۔

"کتنی دفعہ کہا ہے کہ ابا کو کمرے میں اکیلا نہ چھوڑا کرو خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو وہ تو آواز دے کر بلانے کے بھی قابل نہیں۔" ھدیٰ آپی کے سلام کا جواب دینے کے ساتھ اس نے سدرہ کو خالی بیٹھے دیکھا تو بول پڑی۔

"گھر سے باہر ہی نہیں اندر بھی سو کام ہوتے ہیں۔" تڑخ کر جواب دیتی سدرہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ اس کے جوگرز کی لیس کھولتے ہاتھ ساکت رہ گئے۔

"اسے کیا ہوا؟" اس نے حیرانی سے ھدیٰ آپی کی جانب دیکھا۔

"کچھ نہیں دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا ہو جائے گا صحیح تم فکر مت کرو۔"

"لیکن..." وہ کچھ کچھ کہتے رک گئی۔ سدرہ آؤٹ اسپوکن ضرور تھی لیکن بدتمیز نہیں تھی۔ الماری سے کپڑے نکال کر چینج کرنے تک اس کا ذہن سدرہ کے رویے پر الجھ سا گیا اسی الجھے ذہن کے ساتھ نماز ادا کر کے جب وہ ھدیٰ آپی کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھی تو انہوں نے ایک اور سوچ کی ڈوری اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

"شہریار کی بھابھی آئی تھیں وہ لوگ اور انتظار نہیں کر سکتے اگلے دو مہینوں میں اگر ڈیٹ نہیں دی تو وہ بات ختم کر دیں گے۔" شاید ھدیٰ آپی بھی اس کھیل سے تھک گئی تھیں کوئی مشورہ دیا اور نہ ہی کسی رائے کا اظہار کیا... محض ایک خبر ہی اس تک پہنچائی گئی تھی چار منٹ روٹی کا نوالہ ہاتھ میں پکڑے رہنے کے بعد وہ پلیٹ کھسکاتی اٹھ کھڑی ہوئی ھدیٰ آپی اس کی باڈی لینگویج سے اس کی کیفیت کا اندازہ لگاتی رہ گئیں۔

وہ کمرے میں آ کر اندھیرا کر کے آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی لیکن اندھیرا کرنے یا آنکھیں بند کر لینے سے ہر چیز تو محو نہیں ہو جاتی بعض چیزیں تو ہر وقت سوتے جاگتے آنکھیں بند کر لو یا کھول لو، اپنی تلخیاں لیے آپ کے ذہن پر سوار رہتی ہیں۔

"شہریار درانی اور منتہی فرید دو ایک سالوں سے نہیں پانچ سالوں سے جڑا نام ٹوٹ جائے گا تو وہ کیسے آنکھوں کے پیچھے خواب سجائے گی زندگی چاہے کتنی کڑوی نامہربان سہی سوچ کے سہارے کے لیے ایک کرن تو موجود تھی اب وہ کرن بھی مٹنے کو تھی۔" رات

کے نہ جانے کون سے پہر نیند نے اسے اپنا ساتھی بنالیا۔
صبح حسبِ معمول کام نبٹانے کے ساتھ ساتھ وہ ھدیٰ آپی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا نہ بھولی تھی۔
"خوامخواہ دو مہینے کا انتظار کروائے وہ اس بے چارے کو ابھی وہی جواب دے دے جو دو مہینے بعد دینا ہے تو کیا پتا وہ کسی اچھی سی لڑکی سے شادی بھی کرلے اور آج کل کے دور میں لڑکی ملنا بھی تو بہت آسان تھا اور ارزاں بھی۔" یونیورسٹی کے دو سالوں کی رفاقت جب وہ رومیو جولیٹ کے لقب سے پکارے جاتے تھے وقت بھی کیا ظالم شے ہے ہر جذبے کو فنا کردینے کی طاقت رکھتا ہے اور نہ جانے یہ محبت تھی بھی یا محض دل لگی یا سہاروں کی تلاش اب دل کو بھی کون بہلائے اور کہاں تک اسے خود تو یہی لگ رہا تھا کہ اسے کوئی دکھ نہیں ہے ایک ایسا کچا دھاگہ جس میں پہلے ہی پانچ سالوں میں نہ جانے کتنی گرہیں لگ چکی تھیں اس دھاگے کا ٹوٹ جانا ہی بہتر تھا۔ پھر امجد صاحب بھی تو کہتے ہیں۔

چاہتوں کے رشتوں میں گرہ نہیں لگتی
لگ بھی جائے تو اس میں وہ کشش نہیں رہتی
پھیکا پھیکا سا رابط تو رہتا ہے تازگی نہیں رہتی

لیکن سینے میں دھڑکتا لوتھڑا اس کی دہائیاں ہی ختم ہونے میں نہ آتی تھیں چاہے سلوں کے نیچے ہی کیوں نہ دبادو اس نے بھی قبول کرلیا۔

ابھی کچھ دن لگیں گے
دل ایسے شہر کے پامال ہونے کا منظر بھول جانے میں

آفس میں صبح صدف نے جب اس سے اس کی ویرانی کا سبب پوچھا تو اس نے خوامخواہ کی ری چیکنگ کرتے ہوئے کی بورڈ پر بلاوجہ ہاتھ چلاتے ہوئے آسان لفظوں سے ادھورے رشتے کے اختتام کو نیوز رپورٹر کے انداز سے روز کی معمول کی خبروں کی طرح سنا دیا لنچ بریک کا وقت آیا تو اسے گھڑی کی سوئیوں کی رفتار سست لگنے لگی وقت کبھی کبھی بہت بھاری بھی ہوجاتا ہے صدف کو نشتر چبھونے کی عادت نہیں تھی لیکن کچھ دورانیے ایسے ہوتے ہیں ناکہ مرہم بھی نمک جیسی تکلیف دیتا ہے منتہیٰ بھی ایسے ہی دورانیے کا شکار تھی۔
"مجھے تو تم نے یہ خبر دی ہے لیکن محب عالم کو کس نے بتایا ہے اس بارے میں۔" صدف اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی منتہیٰ چونک گئی۔
"محب عالم... اسے پتا چل گیا۔"
"ہاں شاید کینٹین میں ملا تھا کہنے لگا آپ کی دوست منتہیٰ بی بی خیریت سے ہیں، تمہاری خیریت دریافت کررہا تھا' میں نے کہا خود جاکر پوچھ لو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔ تو بس مجھ پر ایک گہری نگاہ ڈال کر چلا گیا اور ویسے بھی منتہیٰ تم اتنی ٹینشن کیوں لے رہی ہو ایک نہ ایک دن تو سب کو علم ہو ہی جائے گا نا تم خود بتادو اور تمہاری منگنی' شہریار سے تمہارا تعلق' تمہارے حالات کسی سے کچھ چھپا تو نہیں تھا۔" صدف ناصحانہ انداز اپنائے ہوئے تھی۔
کتنا عجیب لگتا ہے نا جب آپ اپنے آپ کو بہت مضبوط سمجھتے ہوں پھر اچانک آپ کو پتا چلے کہ آپ کی ساری مضبوطی تو کسی اور کے سہارے پر انحصار کرتی تھی تو آپ یوں ہی پژمردہ ہوجاتے ہیں۔ واپسی میں لفٹ میں داخل ہوتے ہوئے وہی ہوا جو وہ نہیں چاہتی تھی۔ محب عالم سے سامنا... محب عالم کا اس سے پہلے اس سے تعلق بالکل اس مصرعے کے موافق تھا۔
"میں خیال ہوں کسی اور کا مجھے سوچتا کوئی اور ہے۔" اور اب جب وہ کسی اور کا خیال بھی نہیں رہی تھی تو نہ جانے کیوں اس سے سامنا کرنے سے کترا رہی تھی۔
"آپ خیریت سے ہیں؟" شروعات محب عالم نے کی۔
"ایک ہی دن میں دو دو بار میری خیریت کیوں مطلوب ہوئی آپ کو؟" منتہیٰ نے آخر کار سامنا کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔
"بعض اوقات ہوتا ہے نا ایسا کہ کوئی بات جو آپ کی زندگی کی اولین خواہش ہو اس کی تکمیل کے رستے کھلنے لگیں تو کوئی انہونی' کوئی ڈر' خدشہ گھیر لیتا ہے جو آپ برسوں سے چاہتے ہوں وہ ہی یکدم ہونے لگے تو عجیب کیفیت ہوتی ہے دل کی کہ... شاید ہم نے ایسا تو "نہیں" چاہا تھا۔" محب عالم بھی عجیب ہی دنیا کا باسی تھا لفٹ سے نکل کر اسٹاپ تک وہ اس کے ہمراہ ہی رہا۔
"بہت اچھا فیصلہ کیا آپ نے ویسے بھی۔"

وہ افسانہ جسے انجام تکمیل تک لانا نہ ہو ممکن
اسے اک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا

"تو آپ اس ادھورے قصے کو کہانی میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔" منتہیٰ بولی نہ جانے کیوں یہ دل تمام ضابطے توڑنے چلا تھا۔
"ہاں ایک خوشگوار اختتام کے ساتھ... موسم بہت خوبصورت ہوگیا ہے حبس ٹوٹنے کے بعد سے۔" محب عالم آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ایک تو یہ بولتا بہت تھا۔
منتہیٰ پک گئی تھی اس کی مستقل بکواس کو سنتے سنتے۔
"ارے آپ ہم سے کسی دانشوری کی توقع رکھتی ہیں کیا... ہم خرد کی دنیا سے باہر کے بندے ہیں اور... حرف ملامت ہی سہی آپ ہماری بات کے جواب میں کچھ تو بولیں بس ہماری لفاظی بے ثمر نہیں رہے بس اب یہ کہیں گے۔"

ہمہ وقت رنج و ملال کیا جو گزر گیا سو گزر گیا
اسے یاد کرکے نہ دل دکھا جو گزر گیا سو گزر گیا

"دعا کیا کریں اپنے لیے بھی اور ہم بے چاروں کے لیے۔"
محب عالم کی بس آگئی تھی لیکن ہمیشہ کی طرح وہ اس کی بس آنے تک کھڑا رہا۔ اپنی گرین بس میں سوار ہوتے ہوئے محب عالم کی صحبت کے اثر سے اس کی شاعرانہ روح بھی بے دار ہونے لگی۔

تمنا بجھ گئی ہو تو دعا مانگی نہیں جاتی
رتوں کی بے ثباتی سے صبا مانگی نہیں جاتی
یہ اپنی بے بسی ہے یا اب بے حسی کہہ لیں
بلا کا حبس ہے لیکن ہوا مانگی نہیں جاتی

☆ ☆ ☆

"محب عالم کو آپ نے ہی آگاہ کیا ہوگا۔" منتہیٰ' ھدیٰ آپی سے سوال و جواب کرنے لگی۔
"ہاں۔"
"کیوں؟"
"جو میں نے بہتر سمجھا وہی کیا منتہیٰ۔" ھدیٰ آپی آرام سے بولیں۔
"آپ کو اس کا کوئی حق نہیں تھا۔" اس کا لہجہ خراب ہونے لگا۔
"میں تم سے بڑی ہوں منتہیٰ یہ مت بھولو۔" ھدیٰ آپی اس سے زیادہ سخت لہجے میں بولیں وہ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔
"جب آپ کی عقل کسی حل کو تلاش کرنے میں ناکام رہے تو بہتر یہی ہے کہ آپ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیں... وہ بہتر فیصلہ ساز ہوسکتا ہے... بہت میچور ہو لیکن نہ جانے کیوں دھوکا کھا گئی تھیں تم خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا حیرت ہوتی ہے مجھے ہیرا چھوڑ کر پتھر چن لیا تم نے Sense of Judgment کہاں چلا گیا تھا تمہارا۔" ھدیٰ آپی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔
"آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں اب تو ہیرا نہ پتھر... زندگی میں کسی کی جگہ نہیں رہی ہے۔" منتہیٰ چڑ گئی۔
"اتنی آسانی سے کسی کے جذبات کو نہیں رگیدتے منتہیٰ ایک دفعہ اپنی پسند آزمائی تھی اب ہم پر چھوڑ دو۔" ھدیٰ آپی بولیں۔

کوئی کیسے ہمارا انتظار کرے گا
اپنی زندگی میرے لیے بے کار کرے گا

منتہیٰ کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ سج گئی۔
"جس جذبے کا مالک محب ہے نا اس میں انتظار بے کار نہیں ہوتا... اور سب سے بڑی بات کیا یہ منظر

تبدیل نہیں ہوگا؟ چند سالوں کی بات ہے سدرہ اپنے گھر کی ہو جائے گی غنی اپنا کیریئر کا آغاز کر لے گا۔"
ھدیٰ آپی کی اپنی خوش گمانیاں تھیں اور ہر بندہ اپنے دماغ سے ہی سوچے گا ہمارے دماغ سے تو نہیں رائے میں اختلاف کوئی انہونی تو نہیں پھر۔

☼ ☼ ☼

"اماں آپ کو یاد کر رہی تھیں۔" محب عالم سے آج پھر اتفاقیہ ملاقات سر درد بن رہی تھی۔
"محب عالم بعض چیزیں آپ کی دسترس میں ہونے کے باوجود آپ کے نصیب کا حصہ نہیں ہوتیں۔" وہ اس موضوع کو کلوز کرنا چاہتی تھی شاید اسی لیے شروعات کر دی۔
"آپ کو میرے نصیب کی بڑی آگاہی ہے۔" اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔
"لاحاصل کے لیے بے کار انتظار سے کیا حاصل محب عالم اور اب جب سب کچھ راکھ ہو گیا ہے تم کیوں چنگاری تلاش کرتے ہو۔" منتہیٰ فرید چٹختے ہوئے لہجے میں بولی۔

رواں ہے نبضِ دوراں گردشوں میں آسماں سارے
جو تم کہتے ہو سب کچھ ہو چکا ایسے نہیں ہوتا

"ایسی بات مت کیجیے گا حاصل اور لاحاصل کی وہ تو الگ ہی فلسفہ ہے۔"

عجب سلسلہ ہے نماز محبت کا
کبھی ادا کر کے روئے کبھی قضا کر کے روئے

محب عالم کے انداز میں پھر وہی شوخی' بے نیازی در آئی جس سے منتہیٰ کو چڑ تھی۔
"انتظار بہت جاں گسل ہوتا ہے.... سولی پر لٹکا دیتا ہے انسان کو۔" منتہیٰ نے کہا۔
"آپ رسی کی فراہمی کا امکان تو پیدا کریں ہم سولی پر بھی چڑھ جائیں گے ابھی آپ نے پیمائش نہیں کی منتہیٰ صاحبہ ہماری۔" محب عالم کا لہجہ بے نیاز کچھ غرور والا تھا۔ اسے بالکل اچھا نہ لگا۔
"شہریار کے والدین جب اس کا رشتہ میرے گھر نہیں لا رہے تھے تو اس نے اپنا گھر چھوڑ دیا تھا منتہیٰ زیدی کے لیے.... بتانے کا مقصد بس یہی ہے کہ ہر دور میں ایک وقت ایسا ہوتا ہے جب ہر بندہ' ہر چیز' ہر دعوا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے ہر وہ کام جس پر بعد میں اسے پشیمانی کا احساس ہوتا ہے اور جسے وہ بعد میں اپنی نادانی گردانتا ہے تو محب عالم تم یہ نادانی مت کرو۔" منتہیٰ کا ٹھہرا ہوا لہجہ پرسکون تھا۔
"ادائے عشق کو آپ نادانی کا نام دیتی ہیں تو دے لیجیے جناب ہم تو سودائی لوگ ہیں۔ آپ کا کیا بگاڑ رہے ہیں جو آپ پریشان ہوتی ہیں۔" محب عالم واقعی عجیب تھا۔ منتہیٰ چڑ گئی۔
"آپ میرا بگاڑ بھی کیا سکتے ہیں اور میں پریشان ہوں گی بھی تو کیونکہ ایک انسانیت کے ناتے سے سمجھانے چلی آئی تھی خوامخواہ میں کسی کے پیچھے زندگی کے خوبصورت ایام کو برباد کرنا دانشوری نہیں۔"
"چھوڑیے منتہیٰ — ہماری فکر مت کیا کریں ہم تو وہ لوگ ہیں۔"

ہم لوگ ہیں خانہ خراب اور طرح کے
بس جائیں تو صحرا ہیں اجڑ جائیں تو دنیا

"بس نوازش یہ ہو گی کہ ہمارا انتظار تو آخری شام تک ہوگا لیکن آپ روایتی ستم گری نہیں برتیے گا ہمارے ساتھ۔" محب عالم چلا گیا تھا.... نہیں گیا تو کہیں نہیں تھا چپ چاپ انتہائی خاموشی سے ڈیرہ ڈال لیا تھا اس نے دہلیز پر اور منتہیٰ — سوچتی ہی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

پھر کچھ یوں ہوا کہ غم معاش کے بوجھ نے تمام غموں کو ایک طرف کر دیا اس نے تین سال خود سے بھی اجنبی ہو کر گزار دیے اور اب جب سارے غموں کا علاج ہونے لگا تو کسی شناسا کی ریاضت کا احساس ہونے لگا۔
منظر بدل چکا تھا ویسا ہی جیسے ھدیٰ آپی کی سوچ تھی۔ سدرہ اپنے گھر کی ہو گئی تھی ھدیٰ آپی بابا کو لے کر سعودیہ شفٹ ہو گئی تھیں ان کے شوہر بابا کے بھتیجے تھے۔ غنی نے لاہور میں اپنے کیریئر کا آغاز کر لیا تھا۔ لیکن اس کا منظر اب تک وہی تھا وہی ویرانی دل' تشنگی حیات' کبھی سوچتی پیچھے مڑ کر دیکھوں۔
"کیا پتا کوئی واقعی سولی پر لٹکا ہو۔" کبھی سوچتی اس نے کون سی خبر گیری کی اتنے سال خوامخواہ میں پلٹوں اور بکلی کا احساس ہو اور میں نے کون سا کوئی وعدہ کیا تھا اور جب خود ہی دل و دماغ کی جنگ اختتام پر پہنچی تو موبائل میں Save ہوا شناسا نمبر جاگ اٹھا۔

اے جنوں سکھلا ذرا آداب محفل مجھے
ہاں بنا دے اب حضور دوست کے قابل مجھے
لن ترانی کہہ کر میرے شوق کو رسوا کیا
آپ نے سمجھا تو ہوتا دید کے قابل مجھے

ان باکس میں دیگر پیغامات کی آمد و رفت جاری رہی روز ان باکس چیک کرتے ہوئے غیر ارادی طور پر وہ نئے سرے سے پیغام کو پڑھتی مطلب اخذ کرنے کی کوشش کرتی سات دن گزر گئے کہ اسکرین پر وہ نمبر پھر جگمگایا۔

کٹ ہی گئی جدائی بھی یہ کب ہوا کہ مر گئے
ترے بھی دن گزر گئے میرے بھی دن گزر گئے
راہوں میں ملے تھے ہم راہیں نصیب بن گئیں
تو بھی نہ اپنے گھر گیا ہم بھی نہ اپنے گھر گئے
وہ بھی غبار خاک تھا ہم بھی غبار خاک تھے
وہ بھی کہیں بکھر گیا ہم بھی کہیں بکھر گئے
ترے لیے چلے تھے ہم ترے لیے ٹھہر گئے
تو نے کہا تو جی اٹھے تو نے کہا تو مر گئے

"اب تمہیں اور کن الفاظوں کا مدعا چاہیے منتہیٰ۔"
دل نے دماغ کو لتاڑا لیکن وہ بھی کیا جواب دیتا اور آٹھویں دن پھر ایک پیغام ان باکس کی زینت تھا۔

جانے کو ہے بہار اب آ بھی جائیے
ہاتھوں میں نہ سوکھ جائے یہ گجرا گلاب کا

صبح آفس کے رستے پر دوڑتی گاڑی کا رخ خود بخود ہی محب عالم کے گھر کی جانب ہو گیا کیونکہ اسے سوکھے گلابوں کا گجرا پسند نہ تھا۔

مکمل ناول

اک سیل فیصلے کا

فرحین اظفر

فلیٹوں کی دنیا بھی عجیب ہی ہوتی ہے۔

ایک دوسرے سے اس قدر ملے جلے گھر کہ پرائیویسی نام کی شے عنقا ہو جائے۔ اس فلیٹ کے لاؤنج میں بیٹھا ہوا شخص بیٹھے بیٹھے ہی تاڑ لے کہ سامنے والے فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں جو مہمان براجمان ہے۔ وہ سوسائٹی کی کون سی کلاس سے تعلق رکھتا ہے۔

یا پھر کچن میں نکالے جانے والے ریفریشمنٹ سے 'میزبان کے گھر اور دل میں ان کی حیثیت کا پتا ہی لگا لے۔ اپنے کچن میں نہیں' سامنے یا برابر والے فلیٹ کے کچن کی بات ہو رہی ہے۔ اور ایسی ہی مشکل کا شکار وہ بھی تھی۔

غانیہ حسن! جو اس وقت ایک کولیگ کم دوست کو گھر لانے کی حماقت کر بیٹھی تھی۔

اس کے اور وقار احسن کے فلیٹ کی بالکونیاں اور بیرونی دروازوں میں فقط چند انچ موٹی دیوار کا فاصلہ تھا۔

ہنسنے' رونے' بولنے' جھگڑنے یہاں تک کہ لوڈ شیڈنگ کے دوران کھانسنے تک کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ رہی سہی کسر اس روشن دان نے پوری کی تھی۔ اپنے فرائض بخوبی انجام دے رہا تھا۔

ستم بالائے ستم' نازش کی جھگڑالو طبیعت۔

ٹھیک ٹھاک جھگڑا تو اسی بات کا تھا کہ وہ' یعنی غانیہ حسن اسے نازش کیوں کہتی ہے۔ بھابھی کیوں نہیں۔ کیا وہ وقار کو اپنا بھائی نہیں سمجھتی۔

"صبح صبح۔ کم بخت مارے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ بھونپو میرے سر پہ کھول کر۔" جانے کس کی شامت آئی تھی۔ اچھی خاصی پرسنالٹی تھی نازش کی۔

وہ اکثر کھلے دل سے اعتراف کرتی۔ وقار کے ساتھ اس کی جوڑی جچتی بھی خوب تھی۔ لیکن... اور اکثر ہی لوگ زبان پر آ کے مات کھا جاتے ہیں۔

جیسے خود اس نے' وقار نے بس زبان سے ہی تو مات کھائی تھی۔

"غانیہ!" تابندہ کچن کے دروازے پر کھڑی تھی۔

اس نے چونک کر دیکھا۔ پھر مسکرا دی۔

"تم بیٹھو نا۔ یہاں گرمی میں کیوں آ گئیں۔ میں بس آ رہی ہوں۔ چائے کے ساتھ کچھ لو گی۔" حال میں لوٹتے ہی اسے آداب میزبانی نبھانے کا خیال آ گیا۔

برابر والے گھر سے آوازیں آنی بند ہو گئی تھیں۔

کچھ دیر پہلے وہاں گھمسان کا رن تھا۔ آج وقار بھی خوب گرج رہا تھا۔ ورنہ دوبدو بحث کرنا اس کی عادت نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ سے جانتی تھی۔

"کیوں پریشان ہو رہی ہو؟" تابندہ نے اس کے چہرے سے کچھ پڑھا۔

"میاں بیوی میں جھگڑے ہوتے ہی ہیں۔ تو کیا ہوا اگر وہ تمہارے بھائی بھابھی ہیں اور پھر ان کابک نما گھروں میں یہی تو برائی ہے۔ کوئی چیز' کوئی بات کانفیڈنشل نہیں رہتی۔ کبھی کبھی تو ٹی وی پر لگا ہوا چینل بھی..." وہ اپنی بات کہہ کر شگفتگی سے ہنس دی۔

غانیہ نے ممنون نظروں سے اسے دیکھا۔

پرخلوص' سچے دوست اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہیں اس نے اکثر ہی اس بیش بہا نعمت کے ملنے پر اللہ کے حضور شکرانہ ادا کیا تھا۔

تابندہ بہت عرصے بعد اس کے گھر آئی تھی۔ اس نے سوچا تھا ڈنر کروا کے ہی بھیجے گی۔ لیکن برابر میں ہونے والی بدمزگی نے اس کا موڈ بھی اچھا خاصا کرکرا کر دیا۔ اب وہ اسے زیادہ دیر روکنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ تابندہ بھی اس کا مزاج سمجھتی تھی۔ اسی لیے بھانپ کر جلد ہی واپسی کے لیے اٹھ گئی۔

جانے سے پہلے اس نے سرسری سا' نازش اور وقار سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ غانیہ ایکدم گھبرا سی گئی۔

"پھر کبھی مل لینا۔ آج تو تم جانتی ہو۔ نازش کا موڈ ٹھیک نہیں۔ ایویں کچھ الٹا سیدھا نہ کہہ دے تمہیں۔" تابندہ اس کا گریز سمجھتی تھی۔ مسکراتے

ہوئے پلٹ گئی۔

دروازہ بند کر کے اس نے گھر پہ ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ وہی مانوس سناٹا ہر جگہ بول رہا تھا جو اب گھر کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج کی بھی خاصیت بنتا جا رہا تھا۔

زندگی کی رفتار الگ الگ لوگوں کے لیے جدا جدا ہوتی ہے۔ کہیں پلک جھپکتے بیت جاتی ہے تو کہیں کاٹے نہیں کٹتی۔

گہری سانس لے کر اماں بی کی تصویر کو اٹھا کے اس نے یونہی چوم لیا۔ پھر دیر تک دیکھتی اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتی رہی۔

"اللہ آپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اماں جی۔"

یونہی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیر گئی۔ اس نے دھیرے سے آنکھیں رگڑ کے ٹی وی کھول لیا۔

آفس ٹائم تک تو ٹھیک تھا۔ لیکن آفس سے آ کے جب گھر پر آفس سے لایا ہوا کوئی کام بھی نہ ہوتا تو اس کے لیے وقت گزارنا ایسے ہی مشکل ہو جاتا تھا۔

ٹی وی میں بھی دل نہیں لگتا تھا۔

برابر والے گھر میں اب معمولی سی بھی آواز نہیں تھی۔ وہ لوگ کہیں چلے گئے تھے۔ یقیناً" نازش کے میکے۔ آج کا تنازعہ وہیں جانے یا نہ جانے پر کھڑا ہوا تھا۔

"کچھ ملی ہوئی دیواریں' کچھ نازش کی کان پھاڑتی آواز۔ اس گھر کا کوئی ایشو اس سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔"

سر جھٹک کر اس نے دھیان کو وقار کی طرف بڑھنے سے زبردستی روکا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح کافی ہنگامہ خیز تھی۔ اسے اٹھنے میں تاخیر ہوئی اور ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ کوشش کے باوجود اسے دیر ہو جائے۔ ویگن کا انتظار فضول تھا۔

دل کڑا کر کے اس نے برابر والے فلیٹ کی کال بیل پر ہاتھ رکھا۔ صبح صبح والی گہما گہمی کے آثار ادھر بھی نمایاں تھے۔ دروازہ نازش نے ہی کھولا تھا۔

"وہ۔" سلام کرنے کے بعد اس نے بلاوجہ ہی تھوک نگلا۔

"مجھے آفس سے دیر ہو گئی ہے۔ اگر وقار۔۔۔" اس نے نازش کے پھیلے ہوئے وجود سے دائیں بائیں جھانکنے کی کوشش کی۔

"نہیں ہیں۔ وہ چلے گئے۔" لٹھ مار انداز۔ بغیر سلام کے جواب کے۔

"اچھا۔" اس نے وجود میں ایک الگ ہی تھکن محسوس کی۔

"چلیں ٹھیک ہے۔" بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ دروازہ بند۔ کھٹاک۔

وہ جی بھر کے بدمزا ہوئی۔ "میں کون سا ناشتا مانگنے آئی تھی۔ چلی ہی جاتی واپس۔" دل ہی دل میں کڑھنے کی عادت پرانی تھی۔

بقول اماں جی کے "اندر ہی اندر جلنے سے رنگت ماند پڑ جاتی ہے۔"

"آپ کو کیا پتا اماں جی! زندگی میں کتنی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو چہرہ کیا' زندگی کو بھی ماند کر دیتی ہیں۔"

بس اسٹاپ پر کھڑے چند ہی منٹ گزرے تھے۔ جب اس نے وقار کو بائیک پر آتے دیکھ کے سوچا۔ نازش نے جھوٹ بولا تھا۔ کیوں؟ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

اور نظریں چرا لینا۔ حالات سے فرار بھی کیا فن ہے۔ بائیک پر اس کے پیچھے بیٹھے اڑتا آنچل سنبھالتے وہ فرصت سے سوچے گئی۔

باس کا موڈ خراب تھا۔ شکر ہے وہ' وقت پر پہنچی تھی۔ ممکنہ بے عزتی سے بچنے پر شکر ادا کیا۔

"شکر ادا کرنے کی توفیق بھی اللہ نے دے دی تو سمجھو بڑی مہربانی۔"

توصیف صدیقی ابھی ابھی اندر سے ڈانٹ کھا کے نکلا تھا۔ مزاج کی شگفتگی مگر عروج پر تھی۔ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

آفس کے سب ہی اسٹاف ممبرز کو آپریٹو تھے۔ آفس کے روایتی ماحول کی طرح آپس میں ہنس بول تو بھی لیتے تھے۔ لیکن وہ مخصوص فحش کلامی اور بے ہودہ مذاق۔ جو ہر گھر سے باہر نکلنے والی عورت کو سہنے پڑتے ہیں اس سے سب ہی پرہیز کرتے تھے جو دو ایک ایسی ذہنیت کے تھے بھی تو انہیں کوئی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

اس کی دوستی تو صرف تابندہ سے تھی۔ ہاں سلام دعا سبھی سے ہو جاتی تھی۔ مگر ایک حد میں رہ کر۔ زیادہ گھلنا ملنا' زور زور سے ہنسنا' مذاق ٹھٹھول کبھی بہت پہلے اس کے مزاج کا حصہ تھا۔ اب نہیں۔ کارنر والی ٹیبل سے ہنسی کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ توصیف اب وہاں پایا جاتا تھا۔

"پارے کی طرح بے چین طبیعت ہے اس کی۔ کل پریزنٹیشن دینی ہے کام ان کمپلیٹ ہے اور اطمینان دیکھو۔" وہ تابندہ کی بات پر پھر مسکرائی۔

"کیا بات ہے۔ آج بہت دانت نکل رہے ہیں۔ آفس کس کے ساتھ آئی ہو۔"

"کوئی نہیں۔" اس نے گڑبڑا کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

"اب ایسی روکھی پھیکی بھی نہیں ہوں میں۔"

جی ایم صاحب کے آفس میں طلبی کے آرڈرز آ گئے تھے۔ وہ دل ہی دل میں تابندہ کے خطرناک حد تک درست اندازوں پر داد دیتی اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

نیم گرم موسم بڑی بڑی کھڑکیوں سے آفس کینٹین کے اندر اتر آیا تھا۔ وہ بڑی بے دلی سے تلخ چائے کے گھونٹ حلق سے اتار رہا تھا۔

عجیب سی سستی سوار تھی۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ لیکن چند دن ڈھنگ سے گزارنے کے بعد اسے اداسی کا یہ دورہ بہت بچتے بچاتے بھی پڑ ہی جاتا تھا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" تابندہ نے کینٹین میں قدم رکھا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

"اوہ۔" بے ساختہ ایک گہری سانس اس کے لبوں سے نکلی۔ کینٹین کے موسم کی تپش میں کمی آنے لگی۔

"غانیہ حسن!" اس نے ایک جانی پہچانی خوشبو کو آس پاس پھیلتے محسوس کیا۔ دل و دماغ میں سستی کی جگہ معطر سی تازگی بھر گئی۔

زور سے سانس اندر کھینچ کر یہ جانی پہچانی خوشبو کسی پرانی یاد سے جوڑ کر پھیپھڑوں میں بھر لی۔ اور بہت دھیرے سے تابندہ کو آواز دے ڈالی۔

"ارے! مرتضیٰ صاحب بیٹھے ہیں بھئی۔" خوشدلی سے کہتی ہوئی وہ نزدیک آئی جبکہ ساتھ موجود دوسری خاتون کے چہرے پر اترتی سنجیدگی کی لہر کو اس نے پوری شدت سے محسوس کیا۔

"خیریت۔ آج آپ نے اس بے رونق جگہ کو عزت کیسے بخش دی۔"

"درویش صفت لوگ ہیں۔ جہاں منہ ہو گیا۔ اسی سمت چل دیے۔" اس نے بھی شاہانہ انداز میں جواب دیا۔ تابندہ ہنسنے لگی۔ وہ البتہ خاموش سی بیٹھی تھی۔

"کیا لائی ہو۔" وہ لنچ نہیں کرتا تھا۔ پھر بھی تابندہ کو ٹفن کھولتے دیکھ کر دلچسپی سے پوچھنے لگا۔

"کریلے۔" وہ ایک بار پھر ہنسی۔ مرتضیٰ کا منہ بن گیا۔

"کبھی کوئی اچھی چیز بھی پکا لیا کرو۔"

"ارے اتنے مزے کے ہیں۔ کھا کے تو دیکھو۔"

"معافی۔" اس نے فوراً" ہی ہاتھ جوڑ دیے۔

"جیسے کل تم مجھے۔ بہت ہی لذیذ گوبھی کھلانے والی تھیں۔ مس غانیہ! آپ نہیں کھا رہیں۔" دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے وہ ایکدم ہی اسے پکار بیٹھا تھا۔

"جی میں' مجھے کریلے پسند نہیں۔" وہ سٹپٹا کر ایکدم بول پڑی۔

"اوہ۔ و۔ و۔ ایک تو تم لوگوں کی پسند ناپسند آپس میں بہت ملتی ہے۔" تابندہ مزے لے لے کر اپنے ہاتھ سے بنے کریلے کھا رہی تھی۔

"تو آپ لنچ میں کیا لیں گی۔ مجھے بتا دیں۔ میں منگوا دیتا ہوں۔"

''تو تھینکس میں لنچ نہیں کرتی۔'' اب کے اس کا لہجہ خاصا روکھا تھا۔ وہ خفیف سا ہو گیا۔
''دیکھا' دیکھا۔ ایک اور میچ۔'' تابندہ کی اپنی ہی راگنی تھی۔ مرتضیٰ اور غانیہ نے بیک وقت اسے گھور کے دیکھا تھا۔

٭ ٭ ٭

''ایک اور میچ۔ ایک اور موافقت۔''
''یہ تابندہ بھی بس کبھی کبھی بہت ہی فضول بولتی ہے۔'' اس نے جھنجلا کے فائلیں پٹخیں۔
''زبردستی میرے اور اس کے تار جوڑتی رہی ہے۔ ایویں بس۔ مان نہ مان۔'' واپسی میں سارا وقت وہ دل ہی دل میں تابندہ کو باتیں سناتی رہی۔
صبح آتے وقت موڈ قدرتی طور پر خوشگوار تھا۔ وقار کی تھوڑی سی رفاقت بھی اس کے اوپر ایسے ہی خوشگوار اثرات مرتب کرتی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سب کی نظروں میں اس کے چہرے پر شگفتگی آجاتی تھی۔
''میں ابھی تک' ابھی تک تمہارے حصار سے نکل نہیں پائی وقار۔''
فلیٹ کا دروازہ کھولتے۔ اس نے اندر بکھری بے چین اداسی کو پوری شدت سے محسوس کرتے دل ہی دل میں اسے مخاطب کیا۔
''اور یہ تم سے باتیں کرنے کی عادت کب جائے گی بھلا۔''
بھاپ اڑاتا چائے کا مگ' اس کی توجہ کا منتظر تھا۔ اور نگاہیں اس کی سوچ ہی کی طرح ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔
محسوس تو کرتا ہوں مگر چھو نہیں سکتا
تم پھول نہیں پھول کی خوشبو کی طرح ہو
کسی کا دلنشیں لہجہ سماعتوں میں جلترنگ بکھیر رہا تھا۔ اور اس کی ہنسی کی پھوار میں کسی کی سماعتیں بھیگ رہی تھیں۔
پورا کمرہ رنگ برنگی یادوں سے بھر چکا تھا۔ اس کے دائیں بائیں صوفے پر' زمین پر' دروازے کے پاس' اس کی پکی سہیلیوں کی طرح جمی بیٹھی تھیں۔ اور یہ محفل کب تک بجی رہنی تھی۔ وہ ان میں کھو کر بالکل بھول ہی گئی۔ نماز پڑھنی تھی۔ آفس کا کام کرنا تھا۔ کھانا پکانا تھا۔

٭ ٭ ٭

موحد رات سے بخار میں پھنک رہا تھا۔ بوا سنبھالتے سنبھالتے ہلکان ہو گئی تھیں۔ اسے دیکھ کر بگڑ سی گئیں۔
''میری عمر ہے۔ اتنے ننھے بچے سنبھالنے کی۔'' وہ چپ چاپ اس کی کلائی تھامے گھڑی پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ تھرمامیٹر موحد کے منہ میں تھا۔
''کتنی بار کہہ چکی ہوں۔ عورت کے بغیر گھر نہیں چلتے۔''
''آپ بھی تو عورت ہیں۔ بوا جی۔'' اس نے ہلکے سے ہنس کے ماحول کی کثافت کو کم کرنا چاہا۔
''ارے میاں۔ بات کو ٹالو نہیں۔ میں گھر والی کی بات کر رہی ہوں۔'' وہ چپ سا ہو گیا۔ جان کر انجان بھی کب تک بنا جا سکتا ہے۔
''تم ہامی بھرو تو بات چلاؤں۔ نبیہہ ابھی چھوٹی ہے۔ پر لڑکیوں کو ماں کی ضرورت ہوتی ہے بیٹا۔'' وہ ہنوز سوچ میں گم تھا۔ بوا بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئیں۔
''میرے ہامی بھرنے سے کیا ہوتا ہے بوا۔ جس سے ہاں کہلوانی ہے۔ وہ تو اک نظر ڈالنے کی بھی روادار نہیں۔'' نگاہوں میں کسی کا مانوس سراپا لہرایا۔
کمرے کی بوجھل فضا میں وہی خوشبو بھرنے لگی۔ پاکیزہ خوشبو۔

٭ ٭ ٭

''آج مرتضیٰ آفس نہیں آیا۔ اس کے بیٹے کی طبیعت بہت خراب ہے۔'' تابندہ صبح صبح رپورٹنگ کر رہی تھی۔ اس کی عدم دلچسپی جوں کی توں تھی۔
''آج میں اس کے گھر جاؤں گی۔ اس کے بیٹے کو دیکھنے۔ تم بھی چلی چلنا۔''
''میں کیوں جاؤں۔ مجھے کیا ضرورت ہے؟'' وہ بدک گئی۔
''یار! دوست ہے وہ ہمارا۔'' اب باری کرسی سے اچھلنے کی تھی۔
''جی۔ ی۔ ی۔ نہیں۔ وہ ہم دونوں میں سے کسی کا دوست نہیں۔ صرف تمہارا کزن ہے۔ اور وہ بھی دور پرے کا۔'' اس نے تصحیح کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔
''تو انسانیت کے ناتے ہی سہی۔'' تابندہ جانے کیوں اتنا اصرار کر رہی تھی۔
''پلیز تابی!۔ میں نہیں جاؤں گی۔ کوئی سنے گا تو کیا سوچے گا۔''
''کوئی نہیں سوچ رہا کچھ۔ کسی کے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے اور جس کے سوچنے کی تمہیں اتنا پروا ہے جب اس کے سوچنے کا ٹائم تھا تب تو شادی رچا کے بیٹھ گیا۔ اور......''
''تابی!'' اس کی تنبیہی نظریں اور آواز تابی کو چپ کرا گئے۔
''میں تھوڑا کام کر لوں۔ اگر تم مائنڈ نہ کرو تو۔''
''میرے مائنڈ کو چھوڑو اپنے مائنڈ کی فکر کرو پیچھا چھڑاؤ اس پرانی یادوں اور ٹوٹے ہوئے رشتوں سے۔ کچھ نہیں دیں گے یہ تمہیں۔ سوائے خالی ہاتھ اور پچھتاووں کے۔''
تابی رکی نہیں تھی۔ اپنی بات کہہ کر یہ جا وہ جا وہ ہکا بکا اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔
سوچوں کا ایک جہاں' یادوں کے پرستان کا دروازہ کھل چکا تھا۔ وہ جانتی تھی اب' آفس میں دل لگنا بہت مشکل ہو گا۔
جلدی جلدی الٹا سیدھا کام نبٹا کے' اسے گھر جانے کی جلدی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ' وہاں جا کر تو گزرے دنوں کی خوبصورت یادیں' اسے تنہا دیکھ کر اور بھی جان سے چمٹ جائیں گے۔
''دل میں بسنے والی ہستیاں بھی کیا کمبل ہوتی ہیں۔ انسان زندگی چھوڑ دے۔ مگر وہ دل نہیں چھوڑتیں۔''

٭ ٭ ٭

یہی گھر تھے اور یہی دیوار جو اول روز سے دونوں گھروں کے درمیان تھی۔ اور شاید کہیں دلوں میں بھی۔ بس ادراک بہت دیر سے ہوا۔
بڑے ابا' ابا میاں کے سوتیلے بھائی تھے۔ اسے ہمیشہ سے یہی محسوس ہوتا۔ بڑے ابا کے رویے میں ابا میاں کے لیے وہ گرمجوشی اور اپنائیت نہیں تھی۔ جو ابا میاں کے رویے میں تھی۔ وہ اکثر اس بات کا اظہار اماں جی کے سامنے کر دیتی۔ اور اکثر جھاڑ کھاتی۔
اماں جی! محبت کا بے کراں سمندر تھیں۔ جتنا بڑا دل تھا۔ اتنی ہی اعلا ظرف اور بلند کردار۔ کبھی اپنی اور جیٹھانی کی بیٹیوں میں فرق نہ سمجھا۔ ہمیشہ اپنی بیٹیوں ہی کی طرح ان کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ سینے سے لگایا اور شاید اسی سادہ لوحی میں مار کھا گئیں۔
اس کی دونوں تایا زاد بہنیں عاصمہ اور بسمہ' عمر میں اس سے بڑی ہونے کے باوجود زبردست ذہنی ہم آہنگی رکھتی تھیں۔ تینوں کا ہی آدھا دن ادھر تو آدھا دن ادھر گزرتا تھا۔
یونہی ہنستے کھیلتے دن پہ دن گزرتے رہے۔ بچپن بیتا۔ لڑکپن گیا اور جب جوانی کی سرحدوں پر قدم رکھا تو کسی کی نگاہوں کے بدلتے مفہوم نے دھڑکنوں کو نئی تال دے دی۔ وہ دن رات اسی تال پہ سر دھننے لگی۔ بنا کچھ سوچے۔ بنا کچھ سمجھے۔

٭ ٭ ٭

سبک رفتاری سے گزرتے دنوں کو شدت غم کا پہلا جھٹکا تب لگا۔ جب بڑے ابا اچانک ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں' زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسے۔
بڑی اماں کے گھر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کس کو خبر تھی اچھے بھلے بڑے ابا' گھر سے جائیں گے تو' چار کندھوں پر واپسی ہو گی۔
بڑی اماں کو رہ رہ کر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ بیٹیاں غم سے نڈھال' ابا میاں صدمے سے چور' وقار بار بار اپنی نم آنکھوں کو ہتھیلیوں سے رگڑتا' تعزیت کے لیے آنے والوں اور تجہیز و تکفین کے انتظامات دیکھ

رہا تھا۔

حادثہ تھا ہی اتنا بڑا اور اس قدر غیر متوقع' ان سب ہی کے ہوش لے اڑا۔ کتنے دن کھانے پینے کا خیال تک نہ آیا۔ بڑے ابا کے جانے سے دلوں کو جو صدمہ تھا سو تھا۔ وہ گھر کے واحد کفیل تھے۔ وقار اس وقت تک پڑھائی سے فارغ نہیں ہوا تھا۔ دونوں بہنیں بھی کالج جاتی تھیں۔

ان کی پڑھائیاں اور گھر کا خرچہ بڑے ابا اکیلے برداشت کرتے تھے۔ گھر میں بہت خوشحالی نہ تھی۔ مگر مالی حالات پھر بھی چھوٹے بھائی سے بہتر تھے۔

گزرتے وقت نے نرمی سے پھائے رکھے تو کئی مسائل منہ پھاڑے کسی عفریت کی طرح سامنے کھڑے تھے۔

ابا میاں کی معمولی سی کریانے کی دکان میں دونوں گھروں کا خرچ اور پڑھائیاں نہیں چل سکتی تھیں۔ سو وقار نے تعلیم ادھوری چھوڑ کر نوکری کی تلاش شروع کردی۔ عاصمہ اور بسمہ کو بھی کالج چھوڑ کر گھر بیٹھنا پڑا۔

گو کہ پڑھنے میں دونوں ہی کوئی بہت خاص نہیں تھیں۔ پھر بھی گھر سے نکلنے کا بہانہ تو تھا۔ بڑی اماں کو گھر کے مسائل اور بڑے ابا کی جدائی نے دائمی مریض بنا کے رکھ دیا۔

عاصمہ اور بسمہ ان کی خدمتیں کرتیں' پڑھائی چھوڑ کر گھر جو بیٹھیں تو تھوڑے سے دنوں میں ہی بری طرح اکتا گئیں۔ گھر کی گاڑی جیسے تیسے گھسٹ ہی رہی تھی۔

ان ہی دنوں غانیہ نے میٹرک کرکے کالج میں ایڈمیشن لے لیا اور ان دونوں کے دل میں حسد کی پہلی لہر جاگی۔

"ہمیں تو کالج چھڑوائے گھر بٹھا دیا بھائی جان نے۔ یہ چھوٹے ابا کا ہی مشورہ تھا نا۔ تو پھر اب یہ نوابزادی کیوں کالج جا رہی ہے۔ اس کی پڑھائی کیا مفت میں ہوگی۔" عاصمہ کی آواز ٹھیک ٹھاک تپی ہوئی تھی۔

"اور کیا ہم سارا دن گھر کی دیواریں دیکھیں اور وہ محترمہ مزے کریں۔" ان دونوں کے نزدیک کالج جانا صرف مزے کرنے کا کام تھا۔

وہ بھول گئی تھیں کہ ابا میاں نے انہیں پڑھائی چھوڑنے کا نہیں بلکہ پرائیویٹ پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ کیونکہ ان دونوں کے گھر سے چلے جانے کے بعد بڑی اماں اکیلی پڑ جاتی تھیں۔ بڑے ابا کے انتقال کے بعد ان کی جسمانی قوت بہت تیزی سے زوال پذیر ہوئی تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح چست اور چاق و چوبند نہیں رہی تھیں۔

"اس کا باپ ابھی زندہ ہے۔ تمہاری قسمت کہ تم یتیم ہوگئیں۔ اب یتیموں کے سر پر کون ہاتھ رکھے۔" بڑی اماں کے خیالات بھی ان کے گھر کے حالات کی طرح تیزی سے پلٹا کھا گئے تھے۔

نہیں کب' کیوں اور کیسے۔

ابا میاں نے جب بھی سوچا ان کا بھلا ہی سوچا۔ بڑے ابا کی زندگی میں بھی اور ان کے چلے جانے کے بعد بھی ان کی محبت اور شفقت میں کبھی کہیں کمی نہیں آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ایسے کیوں دیکھتے ہیں آپ مجھے۔" اس کا نوخیز کلیوں جیسا حسن' وقار کی پر تپش نگاہوں کی حدت سے پگھل رہا تھا۔

"پھر کیسے دیکھوں۔ اس سے اچھا کوئی طریقہ ہے تو بتا دو وہی۔"

"اگر آپ مجھے ایسے ہی دیکھتے رہے تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

"ایسا ظلم کرتے شرم نہیں آئے گی تمہیں۔" وہ گہرا سانس لے کر سیدھا ہو بیٹھا۔ ٹانگیں سامنے پھیلالیں۔

اسے جاب مل تو گئی تھی لیکن بہت ٹف' صبح کا نکلا رات میں کہیں شکل دکھاتا۔ غانیہ نوٹ کر رہی تھی۔ وہ پہلے سے بہت کمزور ہوگیا تھا۔

گندمی رنگت میں چمک کی جگہ سنولاہٹ آگئی تھی۔

"آپ کوئی دوسری جاب ڈھونڈ لیں نا۔" بازوؤں کا تکیہ بنا کے سر کے پیچھے رکھے اس نے آنکھیں موندلی تھیں۔ اس کی بات پہ ایک دم چونک گیا۔

"کیوں؟"

"آپ بہت تھک جاتے ہیں نا۔" اس نے ایک نظر اسے دیکھا' اس کی معصومیت پہ ہنس کے پھر سے آنکھیں موندلیں۔

"نوکری! تھکاوٹ کا ہی دوسرا نام ہے۔" وہ کچھ کہے بغیر اس کے چہرے کے نقوش آنکھوں سے پڑھتی رہی۔

بڑی اماں کمرے میں سو رہی تھیں۔ بسمہ اور عاصمہ ایک عرصے کے بعد شاپنگ کے لیے گئی تھیں' وہ بڑی اماں کی ٹانگوں کی مالش کرکے گھر واپسی کے ارادے سے ہی نکلی تھی کہ وقار آگیا' اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔

مدتیں گزر گئی تھیں۔ تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کیے ہوئے۔

کتنی دیر گزری تھی۔ ایک دوسرے کی خوشبو کو محسوس کرتے۔ جب وہ ایک دم آنکھیں کھول کے بولا۔

"ایک کپ چائے تو بنا دو۔" وہ تابعداری سے کچن میں چلی گئی۔ وقار اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

چائے بنا کے ہمیشہ کی طرح اس کے کمرے میں دستک دے کر وہ اندر آئی تو' وقار نہا کے نکلا تھا۔ گیلے بال تولیے سے رگڑتا' نکھرا نکھرا تر و تازہ وہ ہمیشہ سے زیادہ اچھا لگا۔

"کیا دیکھ رہی ہو۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرایا۔

"کچھ نہیں' چلتی ہوں' دیر ہوگئی۔" وہ سٹپٹا کے باہر نکلی تو دروازے پر عاصمہ اور بسمہ تھیں۔

"کب سے بجا رہے ہیں دروازہ تمہیں آواز ہی نہیں آئی۔"

بات معمولی تھی مگر لہجہ غیر معمولی مگر اس نے دھیان نہیں دیا۔

"کمال ہے' مجھے تو آواز ہی نہیں آئی۔" اس کا لہجہ سرسری ہی تھا۔

اتنے میں وقار چائے کے کپ لے کر کمرے سے نکلا' بسمہ اور عاصمہ نے معنی خیزی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"اچھا! جبھی آواز نہیں آئی۔" بسمہ عجیب سے انداز میں بولتی اندر کمرے میں چلی گئی۔ عاصمہ نے بھی اس کی تقلید کی۔

اس نے جب تک اس کی بات کا نتیجہ نکالا۔ لاؤنج خالی ہوچکا تھا۔

دونوں بہنوں کے ہاتھ میں شاپنگ بیگز تھے۔ وقار یقیناً" وہی دیکھنے ان کے پیچھے چلا گیا۔ اسے کسی نے پوچھا تک نہیں۔ وہ دل پر بوجھ لیے وہاں سے نکلی تھی۔ ایسی نظراندازی اس سے پہلے کبھی حصے میں آئی جو نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

پھر تو ایسا اکثر ہی ہونے لگا۔

بڑی اماں کے گھر میں اس کی اہمیت کم ہونے لگی اور حیثیت معمولی۔ اسے نظرانداز کیا جانے لگا۔

بسمہ اور عاصمہ بہنیں تھیں۔ لیکن غانیہ تو اکلوتی تھی۔ اکیلی اپنی اماں جی اور ابا میاں کی آنکھوں کا تارا۔ اس نے بہنوں کی کمی ہمیشہ ان ہی دونوں کے وجود سے پوری کی تھی۔ جب انہوں نے توجہ میں کمی کی تو اسے ایک دم ہی اکیلے پن کی شکایت ہوگئی۔

بڑی اماں بھی چپ رہتیں۔ وہ اب بھی وہاں جاتی۔ ان کے پیروں کی مالش کرتی۔ ان کے سر میں تیل ڈالتی۔ جیسے اماں جی نے سکھایا تھا۔ نصیحت کی تھی کہ بڑی اماں کا خیال رکھا کرو۔ خیال تو ان کی بیٹیاں بھی رکھتی تھیں' لیکن ان کی خدمت میں وہ لگن اور جانفشانی نہیں تھی۔

بڑی اماں کے منہ سے دعاؤں کے پھول جھڑتے

رہتے۔ اس کے ہاتھ چلتے رہتے۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوتا تھا۔ وہ خود دنیا جہان کی باتیں کیے جاتی۔ تائی اماں ہوں ہوں کرتی رہتیں۔ اسے لگتا وہ اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ اکیلا محسوس کرنے لگی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارنے کی کوشش کرتی۔

ان ہی دنوں ایک عجیب بات ہوئی۔ گو کہ اتنی عجیب تھی نہیں۔ ابا میاں اور اماں جی کے لیے بھی خاصی تو تھی، مگر عجیب نہیں، پر اسے تو عجیب ہی محسوس ہوئی۔

ابا میاں کے ایک دوست کے توسط سے اس کے لیے رشتہ آگیا۔ وہ اسے اپنی بہو بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ پہلے تو وہ بری طرح سٹپٹا گئی۔ پھر ذرا حواس قابو میں آئے تو اس نے رو رو کر دن رات ایک کر دیے۔ اماں جی، ابا میاں اور سب سے بڑھ کر وقار کی جدائی کا خیال اتنا ہی سوہان روح تھا۔ اس نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ وہ وقار کے علاوہ کسی اور کی ہو جائے گی اور ابھی عمر بھی کم ہی تھی۔ ابا میاں کو انکار کرتے ہی بنی۔

معاملہ ختم ہوا تو اس نے بھی سکون کا سانس لیا۔

وقار کی خالہ ایک عرصے کے بعد کراچی شفٹ ہوئی تھیں۔ بڑی اماں کے گھر ان کی دعوت تھی۔ وہ اطمینان سے کام میں ہاتھ بٹانے چل دی۔

ابا میاں بہت ہی نرم مزاج انسان تھے۔ زندگی میں پہلی بار ان کے دل میں اس کے وہاں جانے سے کھٹک ہوئی۔

"اسے یوں دن رات وہاں مت جانے دیا کریں۔" وہ اماں جی سے بہت عزت سے بات کرتے تھے۔

"اب وہ پہلے جیسی بات نہیں رہی۔ بچے بڑے ہو گئے ہیں۔"

ابا میاں کا اتنا کہہ دینا ہی کافی تھا اور وہ خود بھی بہت فرماں بردار بچی تھی۔ چپ چاپ اماں جی کی بات سن کر سر جھکا دیا۔ دل میں اٹھتے، لبوں پر مچلتے سوال کو نوک زباں پر نہ آنے دیا۔

"جس گھر میں آتے جاتے بچپن بیت گیا۔ اب وہاں جانے میں قباحت کیسی؟"

☼ ☼ ☼

وقار کی خالہ جان کی دعوت خوب دھوم سے ہوئی۔ اچھے خاصے لوازمات تھے۔ ان کی اہمیت ہر ایک پر واضح ہوتی گئی۔ خاص طور پر برابر والے گھر میں رہنے والوں پر۔ دو بچے تھے ان کے، بیٹی نازش اور بیٹا جبران۔

وہ دونوں اکثر ان کے گھر میں پائے جانے لگے۔ آمد و رفت بڑھنے لگی تو اماں جی نے دن میں ایک بار بھی ادھر جانے پر پابندی لگا دی۔ خاص طور پر ان دونوں بہن بھائی کی موجودگی میں۔

عجیب بے باکی اور بے ہودگی بھرے انداز و اطوار تھے ان دونوں کے۔ ابا میاں اور بی اماں نے پہلی ملاقات میں ہی ان کو ناپسندیدہ قرار دے دیا۔ وہ خود بھی اپنے والدین سے متفق تھی۔

حیرت تو اسے عاصمہ اور بسمہ پر ہوتی جو چند ہی روز میں ان سے گہری دوستی کر بیٹھی تھیں۔

"کیا ہو گیا ہے ان دونوں کو۔ کیسی فضول کی باتیں کرتی ہے وہ اور یہ دونوں ہنستی رہتی ہیں۔" وہ دل ہی دل میں کڑھتی، اداس ہوتی، لیکن پھر اطمینان کی ایک لہر اس کے دل میں دوڑ جاتی۔

وقار اور اس کی محبتیں بالکل ویسی ہی تھیں۔ ان میں بال برابر فرق نہیں آیا تھا۔ ہاں بس وہ پہلے سے زیادہ فکرمند اور سنجیدہ رہنے لگا تھا۔

اب تو اس کے اور غانیہ کے بیچ بات بھی بالکل نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ لیکن اس کا یقین قائم تھا۔

"بس چچی جان! دعا کیا کریں آپ۔" وہ کبھی کبھی آفس سے سیدھا ان کے گھر بھی آجاتا تھا۔ وہ دن اس کے لیے عید سے کم نہیں ہوتا تھا۔ وہ بہت دھیان اور محبت سے اس کا چہرہ تکتی رہتی۔

"امی پریشان ہیں، بسمہ اور عاصمہ کی شادی کی عمر ہے۔ رشتوں کا کہتی رہتی ہیں سب سے۔" وہی روزمرہ کے معمولات کی سرسری تفصیل۔

اماں بی کی تسلیاں اور دعائیں اس کے ساتھ تھیں۔

☼ ☼ ☼

عاصمہ کی بات، ان کی خالہ نے اپنے سسرال میں کہیں طے کروا دی تھی۔ ابا میاں اور اماں بی تو حق دق رہ گئے۔

"کمال ہے ہم سے سرسری سا ذکر بھی مناسب نہیں سمجھا بھابھی جان نے، میں کہوں گی ضرور۔" اماں بی کو بہت صدمہ تھا۔ ابا میاں نے ان کی تائید کی۔

"اور کیا۔۔۔ ہم ہمیشہ ان کی ہر خوشی غمی میں ساتھ رہے اور ہم ہی کو دودھ سے مکھی کی طرح نکال باہر کیا انہوں نے۔" اس نے زندگی میں پہلی بار اماں بی کو اس قدر غصے میں دیکھا تھا۔

لیکن معاملہ کچھ اور ہی نکلا۔ گئے تھے شکایت لے کر اور سننی پڑی الزامات کی تفصیل۔

"دودھ سے مکھی کی طرح تو آپ نے ہمیں نکالا تھا بھائی صاحب۔" اماں بی اور ابا میاں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"ہم نے۔۔۔" ان سے بات بھی مکمل نہیں کی گئی۔

"اور نہیں تو کیا۔۔۔ بھول گئے آپ کے دوست کے گھر سے آپ کی بیٹی کے لیے پیغام آیا تھا۔" بڑی اماں کی آواز تک بدلی ہوئی تھی۔ ہمیشہ کی رہنے والی ہماری بیٹیاں۔ آج میری بیٹیاں اور تمہاری بیٹی ہو گئی تھیں۔

"ہاں تو۔۔۔ وہ تو معاملہ ہی کچھ نہ تھا، میں کیا بتاتا۔" ابا میاں بھی کچھ نہ سمجھے تھے۔

"کچھ کیوں نہیں تھا۔ آپ کو اس وقت ہمارا خیال نہیں آیا۔ ساری زندگی آپ اور آپ کے بھائی عاصمہ، بسمہ اور غانیہ کو اپنی بیٹیاں بتلاتے رہے۔ لیکن آپ نے کیا کیا۔ بالا ہی بالا انہیں کہلا بھیجا۔ کیونکہ آپ کی بیٹی چھوٹی تھی۔ اس وقت آپ کو عاصمہ اور بسمہ کا خیال کیوں نہیں آیا۔ آج جب میری بیٹی کا رشتہ خیر سے اچھی جگہ ہو رہا ہے تو آگئے خامیاں اور اعتراضات لے کر۔" بڑی اماں کے تیور بہت بدلحاظ تھے۔

"اور میری بیٹیوں کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ کالج چھڑوا دیا آپ نے، کیونکہ آپ خرچہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ غانیہ تو کالج جا رہی ہے اور ٹیوشن بھی لیتی ہے۔"

عاصمہ اور بسمہ خاموش تماشائی بنی بیٹھی تھیں، جبکہ پس پردہ بڑی اماں کی ڈوریاں ہلانے والی وہی تھیں۔

"میں نے پڑھائی چھوڑنے کے لیے نہیں، پرائیویٹ پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ کیونکہ ان دونوں کے پاس آرٹس تھی۔ یہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ کسی اسکول میں جاب بھی کر سکتی تھیں۔ تمہارا ہی ہاتھ بٹاتیں۔ جبکہ غانیہ۔۔۔"

ابا میاں نے کب سوچا ہو گا کہ انہیں یوں اپنی اولاد کے بارے میں وضاحتیں دینی پڑیں گی۔

"بس بس بھائی صاحب رہنے دیں۔ آپ کے خلوص کا پول پوری طرح کھل چکا ہے۔ آخر آپ نے اپنا سوتیلا پن دکھا ہی دیا۔ اب بہتر ہو گا آپ ہمارے معاملات میں ٹانگ اڑانا چھوڑ دیں۔" بڑی اماں نے زبان درازی کی انتہا کر دی۔

ابا میاں اور اماں بی بہت دکھی دل کے ساتھ واپس آئے۔ سوتیلے پن کے طعنے نے ابا میاں کے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگا دی تھی۔

غانیہ کو بھی صورت حال کا علم ہوا تو گہرا دکھ دل میں گھر کر گیا، لیکن ابھی تو قسمت میں اور بھی دکھ لکھے تھے۔ وہ کتنے بھاری تھے۔ اسے علم نہ تھا۔

برابر میں عاصمہ کی شادی کا شور اٹھا۔ دن بھر گانوں اور شور شرابے کی آوازیں آتیں۔ اماں بی چپکے چپکے آنکھیں خشک کرتی گھر کا کام کرتی رہتیں۔ انہیں کسی نے، یہاں تک کہ ہمیشہ سے ساتھ رہتی بھاوج نے جھوٹے منہ بھی نہیں بلایا تھا۔ وہ دل مسوس کر ادھر سے آنے والی آوازیں سنتی رہتی۔ جس میں سب سے اونچی آواز خود نازش کی ہوتی۔

مایوں سے ایک دن پہلے شرمندہ شرمندہ سا وقار شادی کا کارڈ لے کر آیا اور ابا میاں سے اپنی ماں کے رویے کی معافی مانگی۔

"امی کو تو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ عاصمہ کی پیسے والی سسرال کے آگے کچھ سوجھ ہی نہیں رہا۔ میں بہت

شرمندہ ہوں چچا جان۔ امی کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔ آپ پلیز ان کی باتوں کو دل پر مت لیں' میں انہیں سمجھاؤں گا۔ انہیں جلد ہی احساس ہو جائے گا۔ خون کے رشتے اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹتے' وہ غلط کر رہی ہیں۔"

ابا میاں جو روکھے منہ سے مارے باندھے بھتیجے کے سامنے بیٹھے تھے۔ اس کی بات سن کر خوش ہو گئے۔ فوراً" شادی میں آنے کی ہامی بھرلی۔ ان کے لیے یہی بہت تھا کہ بھابھی نے جو بھی کہا تھا غلط کہا تھا اور ان کے بھتیجے کو اس کا احساس تھا۔

وہ خوشی خوشی شادی میں شرکت کے لیے گئے۔ گوکہ وہاں اسی مخصوص سردمہری سے ان کا استقبال کیا گیا۔ لیکن پھر بھی انہوں نے دل چھوٹا کرنے کے بجائے اعلا ظرفی سے بھابھی کو اتنی اچھی جگہ رشتہ طے کرنے پر مبارک باد بھی تھی۔

ولیمہ والے دن کسی نے ذکر کیا کہ وقار کے خالو اسے کوئی سرکاری ملازمت دلوانے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔ ابا میاں کی خوشی کا احساس دوچند ہو گیا' یوں بھی وہ دوسروں کی خوشی میں خوش ہونے والے انسان تھے۔ حسد اور جلن جیسے جذبے تو انہیں چھو کے بھی نہیں گزرے تھے۔

غانیہ اور اماں بی البتہ غیروں کی طرح ہال کی سب سے پچھلی سیٹوں پر سوکھے منہ سے بیٹھی رہیں۔ کسی نے انہیں کھانے کو پوچھا' نہ اسٹیج پر بلایا۔ مارے باندھے دنیاداری اور بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ خود ہی اٹھ کر کھانے کے ٹائم پلیٹ میں تھوڑے سے چاول ڈال کے لے آئی۔

اسے بھی وقار کی جاب کی تفصیلات کا علم ہو چکا تھا۔ جو بہت عالی شان نہ سہی' مگر ان حالات میں بہت بہتر تھی' جو اس وقت وہ لوگ گزار رہے تھے۔ لیکن وہ یہ خبر سن کر ابا میاں کی طرح خوش نہیں ہو سکی۔ پتا نہیں کیوں دل کو ایک بے چینی سی لاحق ہو گئی تھی۔

شادی اور ولیمہ کی دونوں تقریبات میں وقار محض سلام دعا کرنے ان کے پاس آیا۔ باقی کا سارا وقت نازش اس کے گلے کے ہار بنی اور بسمہ اس کے ساتھ سائے کی طرح لگی رہی اور دونوں کا ہی رویہ اتنا بے گانہ تھا کہ ان کی موجودگی میں وہ قہقہے لگاتے وقار کے قریب جانے کی ہمت نہ کر سکی۔ بس شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھ کر رہ گئی۔

ان کی خالہ سارا وقت بھانجے کی واری صدقے جاتی رہیں۔ یہ وہی خالہ تھیں جو بڑے ابا کے انتقال پر لاہور سے صرف ایک دن کے لیے آئی تھیں اور مصروفیت کا شور مچاتی شام میں ہی واپسی کی راہ پکڑلی۔

ان کے التفات اور محبت کی وجہ غانیہ تب نہیں سمجھ پائی تھی۔ وقار خوب صورت' تعلیم یافتہ اور تمیز دار نوجوان تھا۔ اگر کسی چیز کی کمی تھی تو وہ تھی نوکری یا پیسہ اور یہ کمی اگر وہ پوری کرنے والی تھیں تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔

کوئی نوک دار چیز دل میں بہت گہرائی تک جاکے چبھ گئی تھی۔ وقار اسے ایک دم ہی اپنے آپ سے بہت دور فاصلے پر محسوس ہونے لگا۔ بہت غیر' اجنبی۔

اب یہ سوچوں تو بھنور ذہن میں پڑ جاتے ہیں
کیسے چہرے ہیں جو ملتے ہیں بچھڑ جاتے ہیں
کیوں تیرے درد کو دیں تہمت ویرانی دل
زلزلوں میں تو بھرے شہر بھی اجڑ جاتے ہیں
موسم زرد میں اک دل کو بچاؤں کیسے
ایسی رت میں تو گھنے پیڑ بھی جھڑ جاتے ہیں

☼ ☼ ☼

ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے دل میں واہمے اور اندیشے زور پکڑتے گئے۔ جاتے پت جھڑ کے دنوں میں اداسی کا سایہ پڑ چکا تھا۔

وہ کالج سے آکے سارا دن دونوں کمروں میں بلاوجہ چکر لگاتی۔ وقت کسی طور کاٹے نہیں کٹتا۔ وقار کے آفس سے آنے کے وقت وہ جان بوجھ کے بالکونی میں جاتی۔ اسے بائیک سے اتر کے لاک لگاتے دیکھتی رہتی۔

اسے پتا تھا وقار کو اس کے وہاں موجودگی کا علم ہے' مگر اس نے کبھی سر اٹھا کے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ دن گزرتے رہے۔ رات سے صبح اور صبح سے رات اور پھر رات سے صبح ہو جاتی۔ وہ صرف اس کی بے گانگی پر کڑھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

ابا میاں نے ایک دن بالکل اچانک اس کا دل بہلانے کے لیے ایک سیل فون لا دیا۔ "خوشی سے وہ پھولے نہیں سمائی۔ ہر نئی چیز بچپن سے کھلونوں سے لے کر نئے کپڑوں تک پڑوس میں رہنے والی اپنی بہنوں کو دکھانے کی عادت اس قدر پکی ہو چکی تھی کہ وہ اس وقت بھی موبائل ہاتھ میں لے کر سیدھی وہیں چلی آئی۔ دروازہ کھولنے والا وقار ہی تھا۔

اسے علم تھا وہ گھر پر ہو گا۔ اتنے دن بعد سامنا ہونے پر پیاسی نظریں سیرابی کے لیے مچل گئیں۔ اس نے بمشکل اپنے آپ کو ڈپٹ کر نظریں جھکائیں۔ گھر پہ اس وقت کوئی نہ تھا۔ یہ احساس ہوتے ہی گھبرا گئی۔

"میں چلتی ہوں' پھر آؤں گی۔"

"کیوں؟" وقار بھی جیسے اتنی مدت بعد اسے دیکھ کر بے چین سا ہو گیا۔

"اتنا بھی بھروسا نہیں رہا مجھ پر۔" اس کے شکایتی لہجے پر وہ تڑپ کر اسے دیکھنے لگی۔

"آپ پر تو ہے' خود پر شاید نہیں رہا۔"

"کیوں اتنی مایوس ہو رہی ہو۔"

"میں کہاں؟ مایوسی تو ہر چیز پہ طاری ہے۔"

ایک پھیکی سی مسکراہٹ نے لبوں کا احاطہ کیا اور اسے اپنا سیل دکھا کے نمبر دے کر فوراً" ہی واپس چلی آئی۔

زیادہ دیر اکیلے وقار کے ساتھ اس کے گھر پر رہنا ٹھیک نہ تھا۔ کیا وقت آ گیا تھا۔ ایک وقت تھا جب وہ گھنٹوں وقار کے ساتھ اس گھر میں گزارتی تھی اور کوئی کچھ کہہ تو کیا سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

موبائل فون نے اس کی بوریت کو بڑی حد تک ختم کر دیا۔ اس نے کالج میں بھی سہیلیوں کو موبائل دکھایا۔ نمبرز کا تبادلہ ہوا۔ تعریف سمیٹی۔ لیکن سب سے خاص بات یہ تھی کہ اس فون پہ اکثر اسے وقار کے میسج موصول ہونے لگے۔

جسم و جان ان خوب صورت پیغامات سے جھلکتی محبت محسوس کر کے سرور سے بھیگ بھیگ جاتے۔ چاہے جانے کا غرور نشہ بن کر آنکھوں سے چھلکتا' چہرے کی شگفتگی لوٹ آئی۔ ہونٹوں پر ہنسی کے کنول پھر سے کھلنے لگے۔

"آئی مس یو۔"

"آئی لو یو۔"

اور ایسے ہی لاتعداد میسجز اس کے ان بکس میں پڑے رہتے۔ وہ ڈیلیٹ کرنے سے پہلے بار بار انہیں پڑھتی' مسکراتی اور محبت اس کی آنکھوں میں لو دیتی رہتی۔

☼ ☼ ☼

"سنا ہے وقار کی خالہ بسمہ کو مانگ رہی ہیں اپنے بیٹے کے لیے اور بدلے میں نازش کی وقار سے۔۔۔"

اماں بی کو محلے کی ایک خاتون کی زبانی علم ہوا۔ وہ کچن میں کھڑی پیاز کاٹ رہی تھی۔ تیز دھار چھری انگلی میں اتر گئی اندر تک۔ خون کی دھار ابل پڑی۔

"سی۔ ی۔ ی۔" کی آواز پر اماں بی نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر انگلی پکڑے کھڑی تھی۔

"کیا کرتی ہو' کتنا گہرا کاٹ لیا۔ دھیان کہاں ہے تمہارا۔"

اماں بی تو جانتی ہوں گی کہ اس کا دھیان کدھر تھا۔ مگر پھر بھی فکرمندی سے ڈانٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ کے دھلانے لگیں۔

"دھیان تو اسی دشمن جاں میں اٹکا ہے اماں بی' اب میں کیا کروں۔" وہ بے رحمی سے نل سے بہتی پانی کی تیز دھار میں اپنا خون ملتے ہوئے دیکھتی رہی۔

"مجھے وقار سے صاف صاف بات کرنی ہو گی۔ یہ چکر کیا چل رہا ہے سارا۔" وہ موبائل میں سے اس کے سارے میسجز مٹاتے ہوئے غصے سے سوچتی رہی۔

کتنے بہت سارے دن ایک دوسرے کے آگے پیچھے بھاگتے ہوئے نکل گئے' نہ اس کی وقار سے بات ہو سکی' نہ اس نے وقار کی کوئی کال اٹینڈ کی' نہ کسی بھی میسیج کا جواب دیا۔ یوں گھر میں ہر وقت اماں بی کی موجودگی میں بات کرنی مشکل ہوتی تھی۔

سولی پر ٹنگی جان کی طرح دن رات گزر رہے تھے۔ جب ایک دن اسے وقار کا میسیج ملا۔

"گھر آؤ' مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

بڑی اماں اپنے کمرے میں تھیں۔ وہ دروازے پر ہی مل گیا اور اس کے قدم رکھتے ہی ہاتھ پکڑ کے سیدھا کمرے میں لے گیا۔

غانیہ بری طرح سٹپٹا کے رہ گئی۔ اتنا دھونس اور استحقاق پہلے کبھی اس نے اظہار نہیں کیا تھا۔

"بسمہ کہاں ہے؟"

"مارکیٹ گئی ہے نازش کے ساتھ۔" وہ دروازہ بھیڑ کر اس کے برابر آن بیٹھا۔

"تم ناراض ہو مجھ سے' بات کیوں نہیں کرتیں۔" غانیہ نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ بے حد الجھا ہوا نظر آرہا تھا۔

"گھر میں آپ کی شادی کی باتیں چل رہی ہیں۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہیں' آپ کو سب کچھ پتا تو ہے۔" اس نے بھی دو ٹوک انداز اختیار کرلیا۔

"ہاں۔" وہ ایک گہری سانس لے کر سیدھا ہو بیٹھا۔ غانیہ کو اس سے اس انداز کی امید نہیں تھی۔ اس نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔

"پتا نہیں خالہ نے یہ شرط کیوں رکھی۔ مجھے ان سے اس خود غرضی کی امید نہیں تھی۔ وہ عاصمہ کے رشتے اور میری جاب کو اس انداز میں کیش کروانا چاہتی ہیں۔"

"اور آپ؟" ہزاروں اندیشے اس کے دو لفظی سوال میں مچل رہے تھے۔ وقار کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر سر جھکا لیا۔

"پتا نہیں۔" اس کی آواز میں حد درجے مایوسی تھی۔

"پتا نہیں مطلب۔" وہ تڑپ گئی۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ اس کے لہجے کی سچائی اور کھوکھلا پن بھانپ گئی۔

"کیوں بلایا ہے مجھے یہاں پھر۔ اپنے وعدے سے دست بردار ہونے کے لیے۔ یہ بتانے کے لیے کہ آپ مجبور ہیں بڑی اماں کی وجہ سے' اپنی خالہ کی وجہ سے' ان کی لگائی ہوئے شرط اور بسمہ کے بھائی ہونے کی وجہ سے۔" اس کا لہجہ سلگ اٹھا۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو غانیہ۔"

"میں بالکل ٹھیک سمجھ رہی ہوں۔ اور حیرت ہے کہ اتنی دیر سے کیوں سمجھی۔ مجھے تو جب ہی سمجھ جانا چاہیے تھا جب اپنے زور بازو پر بھروسہ کرنے کے بجائے آپ نے ان کی دی ہوئی نوکری قبول کرلی تھی۔"

"میں اس وقت مجبور تھا غانیہ! کم از کم تم تو میری مجبوری کو سمجھو۔" اس کی آواز میں حد درجہ بے چارگی تھی۔ غانیہ کو وہ سچ مچ بہت مجبور لگا۔ بہت بے بس۔

"اور اب۔ اب بھی تو مجبور ہیں آپ۔ آپ کے ساتھ تو بہت ساری مجبوریاں ہیں کوئی ایک تو نہیں۔ اور میں سب مجبوریاں سمجھتی ہوں۔" اس کا دل قطرہ قطرہ پگھلنے لگا۔

"لیکن آپ کی مجبوری سے میری زندگی بھر کی محبت بندھی ہے وقار! اگر آپ اب بھی مجبور ہوگئے تو میں' میں تو مر جاؤں گی۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"ایسی باتیں مت کرو۔ کوئی کسی کے بغیر نہیں مرتا۔ ماضی کو بھول کر نئی زندگی میں....." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ غانیہ کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

"تو آپ فیصلہ بھی کرچکے۔ صرف اپنے آپ کو باعزت بری کرنے کے لیے مجھے بلایا ہے اس وعدے سے آزاد کرنے کے لیے جو کبھی کیا ہی نہیں تھا۔" اس کی آواز دکھ اور صدمے سے بوجھل ہوگئی۔

سامان سے بھرے کمرے کی دیواریں کچھ اور بھی تنگ لگنے لگیں نیم روشن کمرے میں حبس بڑھنے لگا۔ وقار کو اس سے اس صاف گوئی کی امید نہیں تھی۔ وہ اسے بہت معصوم اور کم عقل سمجھتا تھا لیکن آج جو غانیہ اس کے سامنے کھڑی تھی وہ کم از کم بے عقل نہیں تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن بات منہ میں رہ گئی۔

کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ بڑی اماں اور بسمہ شرربار نگاہوں سے اسے گھور رہی تھیں۔ غانیہ کو جسم سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

☼ ☼ ☼

"یہ گل کھلائے جارہے تھے وہاں' اکیلے میں میرے بیٹے کے ساتھ۔" بڑی اماں کی کان پھاڑتی آواز آس پاس کے اور گھروں میں بھی سنی جارہی تھی یقیناً" ابا میاں گھر پہ تھے اور بڑی اماں نے جان بوجھ کے یہ وقت نکالا تھا۔

"خدا کے لیے بھابھی جان! آرام سے بات کریں۔ سب لوگ سن لیں گے۔ کیا سوچیں گے۔" ابا دھیمی آواز میں ان کی منتیں کررہے تھے۔

غانیہ کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

"لوگ کیا سوچیں گے یہ باتیں تو آپ کی بیٹی کو سوچنی چاہئیں۔ جس نے اپنے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں آوارگی میں لپیٹ کر گروی رکھ دی ہیں۔" بسمہ کی آواز حد درجہ بلند اور لہجہ انتہائی گستاخانہ تھا۔

"بھابھی جان! اس کو چپ کرائیں جب بڑے بات کررہے ہیں تو بیچ میں۔"

"میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں۔ اتنی بڑی ہوگئی غانیہ! بڑوں کے علم میں لائے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھایا اس نے۔"

"خدا کا خوف کھائیے بھابھی جان! میری بیٹی ایسی نہیں ہے۔"

"سارے ماں باپ ایسے ہی کہتے ہیں۔ ابھی میری بیٹی کا کہنا اتنا برا لگا۔ جب ساری دنیا کہے گی تو کس کس کا منہ بند کروگے۔"

"اوہ میرے خدا۔" اس نے کرب سے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

"بلاؤ اسے اور پوچھو۔ جب سب کو پتا ہے کہ میں وقار کا رشتہ اپنی بہن کے گھر کرنے والی ہوں۔ تو یہ اکیلی اس سے ملنے کیوں گئی تھی۔ کون سی قسمیں' وعدے تھے۔ جو یاد دلانے گئی تھی۔"

بڑی اماں کی حد سے گری ہوئی باتیں اس کے حواس سلب کررہی تھیں۔

اس نے یکے بعد دیگرے کئی مسیج وقار کو بھیجے تھے۔ اس نے تسلی دی تھی کہ وہ جلدی پہنچ جائے گا۔ لیکن اب تک نہیں آیا تھا۔ ہاں لیکن وہ ذلت آمیز گھڑی آگئی۔

ابا میاں' اماں بی' بڑی اماں اور بسمہ چاروں نفوس اس پر نگاہیں جمائے بیٹھے تھے۔ ہر نگاہ میں الگ تاثر تھا۔ التجا' امید' حسرت' خوف' تحقیر' نفرت اور وہ ان میں سے کسی ایک کے سامنے بھی ٹھہر نہیں سکتی تھی۔

آواز اس کے حلق میں گھٹنے لگی۔ آنکھوں میں کنکر سے چبھنے لگے۔ دل میں بے ساختہ پچھتاوے نے سر اٹھایا۔

"ایسی محبت سے تو میں نامراد ہی بھلی تھی۔ جس نے مجھے اور میرے ماں باپ کو خوار کردیا۔" کب تک سر جھکا کے کھڑی رہتی۔ بڑی اماں کی زبان کو روکنا بے حد مشکل تھا۔

"میں۔ مجھے وقار نے خود بلایا تھا۔" آواز پھنسی پھنسی سی حلق سے نکلی۔

"لو بھائی وائی کا لاحقہ بھی ختم۔ وہ صرف وقار کب سے ہوگیا۔ تمہارے لیے۔" بڑی اماں نے بہت باریک نکتہ سوچ سمجھ کے اٹھایا تھا۔ شرمندگی کے مارے اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ یہ فرمائش بھی وقار ہی کی تھی۔

"ابا میاں! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے پتا تھا بڑی اماں گھر پہ ہیں۔ اسی لیے میں چلی گئی ورنہ....." آنسو قطار در قطار اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

اسے لگ رہا تھا آج اس کی زندگی کا آخری دن ہے۔ اتنی ذلت اور وہ بھی اپنے اتنے قریبی لوگوں کی

زبان سے سہنے کے بعد زندہ رہنے کا دل بھی کس کا چاہے۔

یہ وقت بھی آنا تھا زندگی میں۔ اتنی ذلت بھی برداشت کرنی تھی۔ اسے بھی اور اس ہی کی وجہ سے اس کے اتنے پیارے اور معصوم ابا میاں اور اماں بی کو بھی۔

"انہوں نے مجھے مسیج کیا تھا کہ......" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

"موبائل کب آیا تمہارے پاس۔ یہ بات بھی ہمیں اب پتا چلی۔ تم کب آکے اسے بتا کے چلی گئیں۔ ہمیں کیا پتا اور ہمیں بتانا، دکھانا، نمبر دینا گوارا نہیں کیا۔ اس کے پاس سب تفصیل موجود ہے۔ بس وہی اہم ہے سارے گھر میں تمہارے لیے۔"

بڑی اماں کی آواز تھی یا صور اسرافیل۔ آج ان ہی کا دن تھا اس کے خوف زدہ دل اور اچھل پھل دھڑکنوں نے تسلیم کیا اور صدق دل سے اپنے مرجانے کی دعا مانگی۔ لیکن ابھی دعاؤں کی قبولیت کی گھڑی آئی ہی نہیں تھی۔

بڑی اماں دبنگ انداز میں واپسی کے لیے کھڑی ہوچکی تھیں۔ جب ہی اس نے داخلی دروازے سے وقار کو آتے دیکھا۔

اس کے مردہ وجود میں جان سی پڑگئی۔ معاملہ کیا تھا۔ وہ جانتا تھا اور اسے صرف وقار کی گواہی کی ضرورت تھی بس۔ اس سے آگے وہ اس سے کچھ امید نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے بی اماں کے جھکے ہوئے سر اور زردی مائل ابا میاں کے اترے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔

"تم! تم کیوں آئے ہو یہاں۔ میں نے منع کیا تھا نا۔" بڑی اماں اسے دیکھ کر غضبناک ہوئیں۔ وہ اب بھی کسی مجرم کی طرح دیوار سے لگی تھی۔

"یہ سوال تو مجھے آپ سے کرنا چاہیے۔ کیوں آئی ہیں آپ یہاں۔ اپنے سگوں کی عزت کا جنازہ نکالنے۔" وقار ان پر الٹ پڑا۔ اس کی بات پر بڑی اماں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"ارے میں کیا جنازہ نکالوں گی۔ اس جنم جلی سے کہو جو کہنا ہے۔"

"مجھے کسی سے کچھ نہیں کہنا۔ آپ گھر چلیں بس۔"

"کیوں۔ کیوں جاؤں میں۔ کسی سے ڈرتی نہیں ہوں میں۔"

"اللہ سے تو ڈرتی ہیں نا امی۔ اللہ کے واسطے چپ ہوجائیں۔ اور کسی کی بیٹی پر کیچڑ اچھالنے سے پہلے اپنا گھر اور اپنی بیٹی کو یاد رکھیں۔ میں نے بلایا تھا غانیہ کو وہ خود سے نہیں گئی تھی۔ وہ بھی خود سے میرے پاس نہیں آئی۔ کبھی بھی نہیں۔" بڑی اماں کو اس سے اس صاف گوئی کی امید نہیں تھی۔ وہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئیں۔

"چچا جان!" وہ بت کی مانند ساکت ابا میاں کی طرف بڑھا۔

"مجھے کچھ نہیں کہنا آپ سے۔ سوائے اس کے کہ غلطی میری تھی۔ اس کی سزا کسی طور غانیہ کو مت دیجیے گا۔ اس کا کوئی قصور نہیں۔ ہوسکے تو مجھے معاف کردیجیے گا۔ میں آپ کی عزت کو اپنی عزت نہ بنا سکا۔ نہ اپنی بات نبھا سکا۔"

ابا میاں کے مردہ ہوئے وجود میں اس کے اعتراف سے جیسے جان سی پڑ گئی۔ بی اماں دوپٹہ منہ پر ڈال کے پھپھک کے رو پڑیں۔

بڑی اماں اور بسمہ جاچکی تھیں۔ ان کے پاس یہ جذباتی منظر دیکھنے کی برداشت تھی نہ وقت۔ وقار نے ایک آخری نظر اس پر ڈالی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں اور وہ ایک پل میں پلٹ گیا۔ آخری نظر یادوں کی اساس بنا کر دل میں ہمیشہ کے لیے ثبت کرکے۔

✡ ✡ ✡

لمس جاناں، فشار جاں بارش
زخم تازہ کی راز داں بارش
ٹوٹ کر برسے تیری یاد کے پھول
پھر ہوئی رات ناگہاں بارش

اک نئے قرب کا پیاسا ہے وجود
ایک نئے خواب کا جہاں بارش
ہجر کی دھوپ ولاتی ہے یاد
پیاس بھڑکاتی مہرباں بارش
حبس جاں کس طرح سہاریں گے
پل دو پل دے، ہمیں اماں بارش
خواہش وصل استعارہ ہے
بھول سکتے ہیں ہم کہاں بارش
قرب یاراں کی تیز خوشبو اور
کشتی خواب، بادباں بارش

پیلے پڑتے اوراق پہ موتی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی انگلیاں لفظوں پر بے تابی سے مچلتی، کسی کا کھویا ہوا لمس تلاش کررہی تھیں۔

وہ ان کی شادی کے بعد پہلا ساون بھادوں تھا۔ جب ماہم ہینڈ رائٹنگ نے ان کی ڈائری میں اپنے جذبات رقم کیے تھے۔

ایک بھولی بسری یاد ذہن کے دریچوں میں سے نکل کر نمی بن کر آنکھوں کی دہلیز پر چمکی۔ اس نے وہ نمی چپکے سے پوروں پہ اتارلی۔

بچے پاس ہی کھیل رہے تھے۔ اسے یوں آنکھیں صاف کرتے دیکھ کر گھبرا جاتے۔ موحد تو ابھی چھوٹا ہی تھا۔ لیکن نبیہ اپنی ماما کی غیر موجودگی سے بری طرح بکھر گئی تھی۔ اس کی اداسی کا سبب ایک حد تک سمجھتی بھی تھی اور پھر پریشان بھی ہوئی تھی۔

"بالکل تمہاری جیسی ہے۔ تمہاری بیٹی بھی ماہم! معصوم اور حساس۔" اس کی نظروں میں محبت کا ایک جہاں آباد تھا۔

سامنے کا منظر نامکمل تھا۔ بچے کھیل رہے تھے خوش تھے۔ اس کے ساتھ شرارتیں کررہے تھے لیکن اس بھرپور منظر میں فقط ایک ہی کمی تھی۔ ایک وجود، ایک احساس، نامکمل منظر نامے کو اکملیت کا درجے تک پہنچاتا اور وہ وجود کس کا تھا۔

پرسوچ نظروں میں کسی کی شبیہ ابھری۔ وہ چونک گیا۔ دھیان کہیں بہت دور سے واپس پلٹتا تھا۔ اور وہ بے یقینی سے بڑبڑایا۔

"غانیہ! غانیہ حسن۔" تیز ہوتی دھڑکنوں میں کسی نے بہت مدھم سروں میں اس کا نام لیا۔ وہ اس کی بازگشت بہت دیر تک سنتا محظوظ ہوتا رہا۔

✡ ✡ ✡

یادوں کی کونجیں قطار در قطار اپنی چونچیں پروں میں دبائے اداس بیٹھی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ذرا کی ذرا نمی نے اپنی چھب دکھلائی۔ اس نے نرمی سے آنکھیں صاف کیں اور الارم اٹھا کے بجنے سے پہلے بند کردیا۔

آج پھر پوری رات یادوں کے سہارے کٹ گئی تھی۔

"اور جانے کب تک یہ یادیں میرا دامن پکڑی رہیں گی۔"

فجر پڑھ کر دیر تک ابا میاں، بی اماں، بڑے ابا اور بڑی اماں کے ایصال ثواب کے لیے دعا کرتی رہی۔ جن کی یکے بعد دیگرے، جدائی کے غم پر گزرتے وقت نے مرہم رکھ دیا تھا۔

وقت بذات خود بھی بہت بڑا مرہم ہے۔ ہر واقعے پر چاہے وہ کتنا ہی تکلیف دہ اور اذیت ناک کیوں نہ ہو۔ دھول ڈال دیتا ہے۔

"ہزار بار کہہ چکی ہوں، مت ٹالا کرو میری بات۔ مگر تمہیں تو مجھے نیچا دکھا کے جانے کون سی خوشی ملتی ہے۔"

"یااللہ! اتنی صبح صبح۔" اس نے فکر مندی سے گھڑی دیکھی۔ صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔

"کیا ہوگیا ہے نازش کو۔ کم سے کم ٹائم تو دیکھے۔" اس نے خود کلامی کی۔ پھر صلوۃ الحاجات کی نیت باندھ لی۔

✡ ✡ ✡

"مرتضیٰ بہت پریشان ہے۔ اس کے بیٹے کو ٹائفائیڈ ہوگیا ہے۔" تابندہ اسے بتارہی تھی۔ اس نے تشویش سے تابندہ کو دیکھا۔

"اتنے چھوٹے سے بچے کو ٹائفائیڈ۔" صحیح معنوں میں اسے فکر نے گھیرا۔
"جو پرورش، جو دیکھ بھال ماں کر سکتی ہے۔ کوئی اور عورت نہیں۔"
"ہوں۔" اس نے ہنکارا بھرا۔ پھر کچھ سوچ کے بولی۔
"میں چلوں آج تمہارے ساتھ ان کے بیٹے کو دیکھنے۔" تابندہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ پھر کندھے اچکا دیے۔
"آنٹی سے بھی مل لوں گی۔ بہت دن ہو گئے۔" اس نے خواہ مخواہ توجیہہ پیش کی۔ تابندہ ہنس دی۔
"ایز یو وش۔"
مرتضیٰ، تابندہ کے فلیٹ کے اوپر والے فلور میں رہتا تھا۔ اسی نے اسے جاب دلوائی تھی۔ تابندہ اسی لیے اس کی اور بھی مشکور رہتی تھی۔ اور خیال بھی رکھتی تھی۔ خاص طور پر اس کے تنہا رہ جانے کے بعد۔
"بہت محبت کرنے والی بیوی تھی اس کی اور بہت خوب صورت بھی۔ بہت محبت کرتا تھا مرتضیٰ۔ بس پتا نہیں موحد کی پیدائش کے وقت کیا پرابلم ہوئی کہ چند مہینوں سے زیادہ جی نہیں سکی۔ بے چاری۔" وہ راستے بھر اسے مرتضیٰ کے بارے میں بتاتی رہی۔
اس نے دل میں اس کے لیے ہمدردی محسوس کی۔
"بے چارہ۔" دروازہ کھلنے تک یہ آخری لفظ تھا جو غانیہ نے اس کے بارے میں سوچا۔
بے چارہ سامنے ہی کھڑا تھا۔ خوش گوار حیرت میں گھرا اسے دیکھے گیا۔
"آپ غانیہ!" اس کے لبوں نے بہت خوش ہو کے اسے پکارا تھا۔
"میں بھی آئی ہوں۔" وہ پہلے ہی اس کے ارتکاز سے کنفیوز تھی۔ تابندہ کی بات سے اور پزل ہو گئی۔
"وہ آپ کے بیٹے کی طبیعت کے بارے میں بتایا تھا۔ تابی نے تو..." دروازے کے فریم میں فٹ اس کا لمبا چوڑا وجود دیکھتے ہوئے لگتا تھا یہیں سے عیادت کر کے پلٹنا پڑے گا لیکن اسے جلد ہی خیال آ گیا۔
"اچھا۔ اچھا۔ آئیں اندر آئیں۔" اس نے جھجکتے ہوئے قدم اندر رکھا۔ تابی اپنی جگہ پر جمی تھی۔
"تم بھی آؤ۔" اس نے بازو سے پکڑ کے تابی کو اندر گھسیٹا۔
غانیہ نے بغور ان کی بے تکلفی ملاحظہ کی۔ آفس میں ایسے مظاہرے کبھی دیکھنے کو نہیں ملے تھے۔
"میں تو سمجھی۔ تمہاری مہمان صرف یہی ہے۔" تابی کا منہ پھولا ہوا تھا۔ مصنوعی ناراضی۔ اسے وہیں بیٹھے بیٹھے الجھن نے گھیر لیا۔ ایسے معنی خیز فقروں کے تبادلے کی کیا ضرورت ہے آخر۔
"موحد کیسا ہے اور کہاں ہے؟" تابی اب سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔
"بہتر ہے پہلے سے۔ سو رہا ہے۔" مرتضیٰ کے چہرے پر بھی ذرا سی سنجیدگی چھا گئی۔
"میں اسے دیکھ لوں۔" تابی کہتی ہوئی اٹھی۔
"اوپس شیور۔" اس نے پاس ہی کا ایک دروازہ کھولا۔
یہ شاید مرتضیٰ کا ہی کمرہ تھا اسے ساز و سامان سے اندازہ ہوا۔
اخروٹ کی لکڑی سے بنا نفیس ڈیزائن والا فرنیچر اور اعلا ذوق کی نشاندہی کرتی ڈھیر ساری انگلش اور اردو کی مختلف موضوعات پر مبنی کتابیں۔
اس نے ایک طائرانہ نگاہ میں اچھا خاصا جائزہ لے ڈالا۔
بیڈ کے سرہانے لگی اس کی شادی کی بڑی سی تصویر وہ اور اس کی بیوی۔۔۔۔
"او میرا گڈا۔" تابی کی آواز نے اس کا تسلسل توڑا۔
موحد اٹھ گیا تھا اور منہ بسورتا تابی کی طرف ہمک رہا تھا اس نے فوراً اسے گود میں بھر لیا۔ غانیہ نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔
وہ قدرے زردی مائل رنگت کا کمزور سا بچہ تھا۔ مگر نقش خوبصورت تھے۔ مرتضیٰ سے کافی مشابہت تھی۔
"جب ان بچوں کی ماں زندہ تھی۔ تب یہ دونوں بہت صحت مند اور خوبصورت ہوتے تھے۔ اتنے پیارے کہ جو دیکھتا تھا پیار کیے بغیر رہ نہیں پاتا تھا۔" تابندہ کے لہجے میں محبت بول رہی تھی۔
وہ کچھ پوچھتے پوچھتے رہ گئی۔ مرتضیٰ کچن سے تابندہ کو آوازیں دے رہا تھا۔ وہ موحد کو اس کی گود میں دے کر لپک جھپک باہر نکل گئی۔
پتہ نہیں کیا ہوا تھا۔ موحد کچھ دیر تو اس کی گود میں بیٹھا پھر کسمسا کے رونے لگا۔ وہ اس کے رونے سے گھبرا گئی کیونکہ وہ ایکدم ہی چیخیں مارنے لگا تھا۔ مرتضیٰ تیزی سے بیڈ روم میں آیا۔
"پتا نہیں اسے کیا ہو گیا۔ ابھی تو اچھا خاصا تھا۔" وہ گھبراہٹ میں بلاوجہ صفائی دینے لگی۔
بچہ اس کی گود میں جاتے ہی اس کے شانے پر سر رکھ کر پرسکون ہو گیا تھا۔
"چلیں باہر۔ چائے پی لیں۔" وہ اسے دیکھ کے مسکرایا۔
"نئے اور انجان لوگوں سے گھبراتے ہیں بچے۔" اس نے یونہی ایک فضول سی بات کی۔
"حالانکہ آپ تو نہ نئی ہیں۔ نہ انجان۔" اس کا مسکراتا ہوا لہجہ صاف بھی تھا اور مضبوط بھی۔
"جی۔" وہ ایک بار پھر پزل ہونے لگی۔
"آیئے چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔" وہ آگے چل پڑا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے اس کی نظر ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی۔
وہاں اس کے فیورٹ پرفیوم کی کئی شیشیاں رکھی تھیں۔ وہ اس کی پشت پر ایک نظر ڈال کے رہ گئی۔
"تم بہت ہی بکواس چائے بناتے ہو۔" تابی فل فارم میں تھی۔
"تم اتنی بے دار چائے پی پی کے یوز ٹو ہو گئی ہو۔ آج مس غانیہ بتائیں گی۔ چائے کیسی ہے۔"
"بیبی کہاں ہے؟" تابی نے اس کی بات ان سنی کر دی۔ غانیہ نے شکر ادا کیا۔
"میں نے اسے بوا کے ساتھ ان کے گھر بھیج دیا ان کے پوتے پوتیوں میں دل بہل جاتا ہے اس کا۔" مرتضیٰ کا لہجہ ایکدم اداس ہو گیا۔ یا اسے ہی لگا وہ اندازہ نہیں کر سکی۔
اس نے چائے پیتے ہی واپسی کا ارادہ ظاہر کر دیا۔ مرتضیٰ کی گہری نگاہیں اس کی ہتھیلیاں نم کر رہی تھیں۔ چلتے وقت وہ ایک خوبصورت پنک کلر کی شیشی اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔
"ممہاری والدہ کہتی تھیں۔ پہلی بار مہمان گھر آئیں تو انہیں خالی ہاتھ واپس نہیں بھیجتے یہ ہمارے خاندان کی روایت کے خلاف ہے۔" وہ اتنا روایت پسند تھا نہیں جتنا اس وقت بن رہا تھا۔
"میں بنا کسی موقع کے یونہی ہر ایک سے گفٹ نہیں لیتی۔ یہ میرے اصولوں کے خلاف ہے۔" اس کی آواز میں کوئی لچک نہیں تھی۔ وہ خفیف سا ہو گیا۔ تابندہ کو بھی انکار کی امید نہیں تھی۔ وہ محض کندھے اچکا کے رہ گئی۔
"چلیں۔ پھر ہم کسی موقع کا انتظار کر لیں گے۔" اس نے برا مانے بغیر پلٹ کر وہ پرفیوم سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔
"آپ کے آنے کا بہت شکریہ، مجھے خوشی ہوئی۔" وہ موحد کو تابندہ کی گود سے لیتے ہوئے بظاہر اسی سے کہہ رہا تھا لیکن غانیہ سمجھتی تھی یہ آپ جناب کا تکلف تابی کے لیے نہیں تھا۔
واپسی میں سارا وقت اسے ایک بات چبھتی رہی۔
"اسے کس نے بتایا کہ میرا فیورٹ پرفیوم ہے۔"

☼ ☼ ☼

اسے گھر پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وقار آفس سے پہلے واپس گھر پہنچ گیا اور اس کے فلیٹ پر تالا پڑا دیکھا تو باہر ہی مل جائے گا۔ اور یہی ہوا۔
وہ باہر ہی ٹہل رہا تھا۔ بے چینی سے سیڑھیوں کی طرف دیکھتا یقیناً اس کا منتظر تھا۔ اپنے اندازے کی درستگی پر اسے چنداں حیرت نہیں تھی۔ اسے محسوس

ہوا وہ وقار کی رگ رگ سے واقف ہے۔

"لیکن یہ واقفیت کس کام کی بھلا۔" اسے اپنے لیے فکر مند دیکھ کر دل میں اترتے طمانیت کے موہوم احساس سے قطع نظر' اداسی سے سوچا۔

"کہاں تھیں آج تم اتنی دیر۔" تفکر اس کے چہرے پہ بکھرا تھا۔

"تابندہ ہے نا۔ میری کولیگ ان کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی تھی۔" اس نے تالا کھول کر اندر قدم رکھا۔

"اپنی کولیگ سے اتنی دوستی کب سے ہو گئی تمہاری۔" اس کی آواز میں طنز نہیں تعجب تھا۔ پھر بھی اسے ناگوار گزرا۔

"زندگی گزارنے کے لیے کوئی سہارا نہ ہو۔ تو یہ مصنوعی بیساکھیاں ہی کام آتی ہیں۔" وقار اس کی بات پر چپ سا ہو گیا۔

اسے محسوس ہوا۔ وہ برسوں پہلے والی نادان' سترہ اٹھارہ سالہ غانیہ نہیں ہے جس پر اس کی ماں بہنیں وقت بے وقت الفاظ کے تیر چلایا کرتی تھیں۔

"اور ویسے بھی وہ صرف میری کولیگ نہیں۔ بہت اچھی اور مخلص دوست بھی ہے۔ مجھے اس کی دوستی پر فخر ہے۔"

اس نے واش روم سے نکل کے بات کو بات سے جوڑا۔ اور وقار کسی دھیان سے واپس آیا۔ اس کا چہرہ اتنے غم اٹھا کے ایک مسلسل تنہائی کا عذاب سہہ سہہ کر بھی ماند نہیں پڑا تھا۔

شاید یہ اس کے اندر کی خوبصورتی تھی جو ہمیشہ اس کے معصوم چہرے پر نظر آتی تھی۔

سالوں پہلے اپنی بزدلی کو مجبوری کا لبادہ اوڑھا کے جو زیادتی اس کے ساتھ کر چکا تھا۔ اس کا ازالہ تو ممکن نہیں تھا۔ ہاں ضمیر کی چبھن میں کمی واقع ہو جاتی تھی۔

"کہیں جایا کرو تو مجھے انفارم کر دیا کرو۔ مجھے فکر ہونے لگتی ہے اور نازش کی عادت کا بھی پتا ہے نا تمہیں۔ میں نہیں چاہتا اسے' تمہارے بارے میں ایک لفظ بھی کہنے کا موقع ملے۔" چائے کے کپ کھنگالتی وہ رک سی گئی۔ پھر پلٹ کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"میں کسی کے کہنے کی پروا کرنی عرصہ ہوا چھوڑ چکی ہوں وقار! اور نازش تمہاری بیوی ہے۔ میں اس کی بیوی نہیں۔ بہتر ہو گا تم اس کے آنے جانے کی فکر کیا کرو۔"

اس کا پرتپش لہجہ وقار کے لیے نیا نہیں تو کوئی بہت پرانا بھی نہیں تھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا نرم ملامت و محبت بھری نظریں پھر چپ چاپ پلٹ گیا۔

اسے یوں جاتا دیکھ کر غانیہ کے دل میں افسوس نے سر اٹھایا۔

اس کی چائے جانے کیوں نکالی تھی اس نے۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اسے نازش کی موجودگی میں اتنی مہلت کبھی نہیں ملے گی کہ وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر ایک کپ چائے ہی پی لے۔

اس نے ایک تھکی ہوئی نگاہ ادھر ڈالی۔ جہاں سلیب پر چائے کے کپ رکھے تھے۔ بھاپ اڑاتی گرما گرم چائے دیکھ کر اس کی تھکن میں کمی کے بجائے ایکدم اضافہ ہوا اس نے دونوں کپ اٹھا کے سنک میں انڈیل دیے۔ چائے پینے کی شدید خواہش اچانک ہی مر گئی تھی۔

اس کے دل میں عرصہ دراز سے پلنے والے خوابوں کی طرح' جو ایک دن اچانک اپنی موت آپ مر گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

"وقار' نازش سے شادی کے لیے تیار نہیں تھا۔" اماں بی' ابا میاں کو بتا رہی تھیں۔ وہ دودھ کا گلاس لیے دروازے پر کھڑی رہ گئی۔

"مجھے معلوم ہے۔ اسے ہمیشہ سے ہماری گڑیا کے ساتھ کی خواہش تھی۔" ابا میاں کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

"لیکن اب احتجاج کا کیا فائدہ۔"

"بھابھی جان نے جان کی قسم دے کر منوائی بات۔ کل یہاں تک آ رہی تھیں چیخنے چلانے کی آوازیں۔" اماں کو سب خبریں تھیں۔ بظاہر اردگرد

سے کتنا بے خبر دکھتی تھیں۔

"ایک بار بھائی صاحب نے وقار کے سامنے غانیہ کو بہو بنانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وقار بھی راضی تھا۔ میں اگر چاہتا تو بھائی جان کی آخری خواہش کا واسطہ میں بھی دے سکتا تھا۔ مرے ہوئے باپ کی آخری خواہش بقید حیات ماں کی زبردستی کے آگے یقیناً" بھاری ہوتی مگر میں اتنی خود غرض فطرت کا نہیں۔" ابا میاں کی آواز میں کسی بہت اپنے کے پرائے ہو جانے کا غم بول رہا تھا۔

اس کا دل کھنڈر ہو گیا۔ خوابوں کی ٹہنیوں پر چٹکتے تعبیر کے پھول تو اسی دن راکھ ہو گئے تھے۔ جس دن اس نے صاف الفاظ میں ابا میاں سے کہا تھا کہ میں آپ کی عزت کو اپنی عزت نہیں بنا سکتا۔

خواہش خوش فہمی میں بدل گئی تھی۔ اسے اپنی حالت پر بیک وقت غصہ بھی آیا اور ترس بھی۔ "کیوں اس بے وفا' بزدل میں دل اٹک گیا میرا' کیوں؟"

ساری رات اشکوں کی جھڑی' پلکوں کی دہلیز پھلانگ کر تکیے کے نم نرم سطح سے چہ مگوئیاں کرتی رہی۔ انہیں روکنا اس کے بس میں نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

حال مت پوچھو عشق کرنے کا
عمر جینے کی' شوق مرنے کا

آج اسے کسی کام سے اکاؤنٹس سیکشن کی طرف آنا پڑا۔ کافی دن بعد تقریباً" پندرہ دن کے بعد مرتضیٰ کو دیکھا۔ شیشے کی دیوار کے اس طرف وہ پوری طرح مگن تھا۔

گھنے سیاہ بال اور تازہ شیو کی چمک لیے روشن چہرہ' ستواں ناک' کمپیوٹر اسکرین پر نظریں جمائے' کسی سوچ میں گم تھا۔

اف! محبت کی احتیاط کے دن
ہائے موسم وہ خود سے ڈرنے کا

آج عاصم صدیقی وہاں پایا جاتا تھا اور محفل زعفران زار سی۔ لولہ وہ غزل سنا رہا تھا۔ وہ بنا دستک دیے ہی اس کے کمرے میں چلی آئی اور سامنے جا کے کھنکھاری۔ جانتی تھی وہ کبھی برا نہیں منا سکتا۔ جانے کیوں۔ ادراک کے در اس پر اچانک ہی وا ہوئے تھے۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا اور ایکدم ہی مسکرا دیا۔

"زہے نصیب! آج اس روکھے پھیکے ڈیپارٹمنٹ کو رونق بخش ہی دی آپ نے۔"

"مجھے انصاری صاحب نے بھیجا ہے۔ یہ واؤچر پے منٹ سلپ انہیں چاہئیں' ارجنٹ۔" اس نے ایک چٹ اس کی طرف بڑھائی۔

"اوکے۔" اس نے چٹ لے کر سنجیدگی سے دیکھا۔ "بیٹھیں پلیز۔" وہ سر پر اسکارف جماتی ہوئی بیٹھ گئی۔

اس نے فون پر کسی سے بات کی۔ پھر فون رکھ کے اسے دیکھا۔

"انصاری صاحب مجھے کال بھی تو کر سکتے تھے۔"

"کیا آپ کو میرا آنا برا لگا۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا وہ اتنی ہی بے ساختہ پچھتائی بھی۔

"کیا آپ کو لگتا ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے۔"

سوال حاضر تھا۔

"وہ بزی تھے۔ آج ان کا سیل گھر پر رہ گیا۔ کام ارجنٹ تھا۔ تو میں نے کہا کہ آپ اتنی دور کہاں جائیں گے میرا کام تقریباً" ختم ہو گیا ہے۔ میں کروا دیتی ہوں۔" اس نے جھکی جھکی نظروں سے تفصیل پیش کی۔

مرتضیٰ کے سامنے اس نے شاید پہلی بار اتنی لمبی بات کی تھی۔ وہ دلچسپی سے اسے دیکھتا رہا۔

"لنچ تو لیتی نہیں آپ۔ کچھ لیں گی۔ چائے' ٹھنڈا۔"

"نہیں شکریہ۔ بس آپ ذرا جلدی سے۔۔۔"

وہ اپنی نرم دل فطرت سے مجبور ہو کر' انصاری صاحب کی جگہ خود آ تو گئی تھی لیکن اب اس کی پرتپش

نظروں کے حصار میں بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔

"واؤچر بنے گا۔ پرنٹ آؤٹ نکلے گا۔"

"کتنی دیر لگے گی۔" اس نے بے چینی سے بات کاٹ دی۔

"اونلی سیون ٹو ٹین منٹس۔" اس کے منع کرنے کے باوجود اس نے دو کافی آرڈر کردیں۔ برا ہوا کہ واؤچر پہلے آگئے۔ کافی نہیں آئی۔

وہ واؤچر تھامتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اور میں نے جو کافی منگوائی تھی اس کا کیا۔" وہ اس کے شکایتی لہجے پر ہنس دی۔

"میں نے تو منع ہی کیا تھانا۔ او کے میں تابی کو بھیجتی ہوں۔"

"میں نے تابی کے ساتھ نہیں آپ کے ساتھ پینے کے لیے منگائی ہے۔" اس کا جتا تا ہوا لہجہ گمبھیر ہوگیا۔ اس سے کوئی بات نہیں بن پڑی۔

مرتضیٰ کی آنکھوں اور لہجے سے جھلکتی پسندیدگی اس سے مخفی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی وہ اس کے ساتھ وقت گزارنا چاہتا ہے۔

مرد کی نگاہوں کا مفہوم سمجھنا کسی بھی عورت کے لیے مشکل نہیں ہوتا لیکن وہ سمجھ کے بھی سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس کی مرضی بھی تھی اور مجبوری بھی۔ گلاس ڈور کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کے اس نے ذرا کی ذرا اس کے پرامید چہرے کو دیکھا۔

"میں تابی کو بھیجتی ہوں۔" وہ جاچکی تھی۔ اپنی پاکیزہ خوشبو اس کے پاس چھوڑ کر۔ وہ دیر تک اس کی موجودگی کو اردگرد محسوس کرتا رہا۔

☼ ☼ ☼

"تو کیوں جاتے ہو بھاگ بھاگ کے۔ اور تو کسی کو دینے کا خیال تک نہیں آیا تمہیں۔۔۔"

دونوں فلیٹوں کے بیچ موجود روشن دان کو وہ عرصہ ہوا بند کرچکی تھی۔ پھر بھی کہیں نہ کہیں سے کوئی درز' کوئی جھری پھلانگ کر نوک دار بات اس کی سماعتوں کو زخمی کرنے پہنچ ہی جاتی تھی۔ اپنی پسند کی خوش ذائقہ اور خوش رنگ مٹھائی اس کے حلق میں پھنس گئی۔ وقار نے اپنی پروموشن کی خوشی میں مٹھائی لاکے دی تھی۔

غانیہ کو کبھی اسے بتانا نہیں پڑا تھا کہ اسے کیا پسند ہے۔ کیا ناپسند ہے۔ عجیب رشتہ تھا۔ ادھورا۔ مانوس۔ بے نام۔ نادیدہ۔

وہ مہینوں میں کبھی اس کے فلیٹ میں قدم رکھتا تو بھی نازش کے سینے پر سانپ لوٹ جاتے۔

یوٹیلٹی بلز سے لے کر گھر کے مینٹی نینس تک اپنا ہر خرچہ وہ خود اٹھا رہی تھی۔ کیونکہ ابا میاں نے اسے کبھی حصول تعلیم سے روکا نہیں تھا۔ یہی تعلیم ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد اس کے کام آئی تھی۔ ابا میاں کی دکان سے حاصل شدہ کرائے اور اپنی نوکری کی بدولت اسے کبھی ایک پیسے کے لیے بھی وقار کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑا تھا۔

پھر بھی وقار کا ایک جملہ "وہ میری ذمہ داری ہے۔" کئی دن کے لیے جھگڑے کی بنیاد بن جاتا۔

نازش کا موقف تھا کہ وقار کے دل میں ابھی بھی غانیہ کے لیے نرم گوشہ موجود ہے۔

وقار نے کبھی اس بات کی تردید کی نہ تائید۔ وہ بھی جان نہیں سکی کہ وقار کے دل میں اس کے لیے وہ نرم گوشہ 'گوشہ محبت ہے۔ جہاں اس کی نامراد محبت زندگی بھر کے لیے پچھتاوؤں کی مٹی' خوابوں کے ملبے سے اٹھا اٹھا کے اپنے مرقد پر اڑاتی رہتی ہے۔

غانیہ جانتی تھی۔ نازش کے مزاج کی چڑچڑاہٹ میں بہت بڑا حصہ اس کا بھی تھا۔ بہت عرصے اپنے آپ میں چور رہنے کے بعد اس نے پروا کرنی چھوڑ دی۔ وہ مزاج کی پہلے سے ہی بہت کڑوی تھی۔

وقار کی مرضی اور پسند سے ٹی وی دیکھنے پر بھی پابندی تھی۔ خاص طور پر وہ پروگرام جس میں اس کی پسندیدہ خواتین منظر کا حصہ ہوتیں۔ فلمی ہیروئنز اور ٹی وی ایکٹرز۔۔۔ تو ایک طرف وہ نیوز کاسٹرز کی تعریف پر بھی جل جاتی تھی۔

اس کی چھوٹی ذہنیت اور فسادی فطرت سے صرف وقار ہی نہیں اس کے بھائی بھاوج (جو کہ اس کی سگی نند تھی۔) بھی تنگ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے میکے بہت کم جاتی' جاتی بھی تو ایک یا دو گھنٹے یا زیادہ سے زیادہ ایک دن رک کر واپس آجاتی تھی۔

ہر گھنٹے' دو گھنٹے بعد وقار کو فون کر کے پوچھتی کہ کہاں ہو کیا کر رہے ہو۔

ایسے میں غانیہ کو وقار کے اوپر جی بھر کے ترس آتا۔ وقار نے اسے محبت' توجہ اور تحفظ دینے کی ہر ممکن اور پوری کوشش کی تھی اور کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن۔۔۔

"اس عورت نے خوش اور مطمئن ہونا سیکھا ہی نہیں۔"

کبھی کبھی جھوٹے بھرم کا خول چٹخ جاتا اور وہ زمانے بھر سے نالاں' زندگی کی برگشتگی' ہر درد کی شکایت لے کر اس کے پاس آجاتا۔ حالانکہ اس نے کبھی وقار کے زخموں پر پھاہے نہیں رکھے تھے۔ اسے اپنی محبت کے سبز باغ نہیں دکھائے تھے۔ خدمت اور خلوص کا لالچ دے کر اپنی ویران زندگی سے تھک کر تنگ آکر کبھی اسے نازش سے چھیننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"بھلا جو شخص ہمیشہ سے میرا تھا۔ میرا ہے۔ اسے میں چھین کر کیا کروں گی جو کسی اور کا ہو کر بھی کسی کا نہیں۔"

اسے یہ بات اپنی نیک اور سچی فطرت کے رکھنے کی وجہ سے' دل میں خوشی کے ساتھ ساتھ دکھ بھی دیتی تھی۔ نازش کا حق تھا کہ اسے پورا شوہر ملتا۔ جسم کے ساتھ ساتھ دل اور دماغ سے بھی۔ اور اسے ملا بھی صرف جسم ہی نہیں' دماغ سے بھی' زبان سے بھی وہ پورا کا پورا اسی کا تو تھا۔ سب سے خوبصورت اور معتبر رشتے کے حوالے سے اگر نہیں تھا تو بس پورے دل سے نہیں تھا اور دل پر اس کا زور نہیں تھا۔

بچوں کی کمی بھی ان کے درمیان 'نا اتفاقی کی ایک وجہ تھی لیکن وقار نے کبھی نازش کو نہیں جتایا کہ وہ ایک ادھوری عورت ہے۔ کبھی نازش کی خامی کا فائدہ اٹھا کے دوسری شادی کے بارے میں سوچا تک نہیں اور کتنے ہی سال اللہ کی رحمت کا انتظار کرتے امید کا دامن تھامے گزار دیے۔

"ہاں ہاں۔ سب سے زیادہ سگی تو وہی ہے۔ اسے نہ دیکھو تو دن نکلے نہ شام ڈھلے تمہاری۔" موضوع گفتگو ابھی بھی اس کی ذات تھی۔ اور یہ بات اس کے لیے سخت تکلیف کا باعث تھی۔

"بکواس بند کرو۔" وقار ہمیشہ کی طرح دھیما تھا۔

"میں کوئی بکواس نہیں کررہی۔ اس دن تمہارے سامنے میں نے اسے منع کیا تھا کہ تم آفس جاچکے ہو۔ پھر بھی! پھر بھی تم نے اسے آفس چھوڑا۔" وہ دونوں جتنا سمجھتے تھے وہ اس سے کہیں زیادہ باخبر تھی۔

"اور مجھے تو بس اس دن کہیں سے پتا چل گیا۔ تم روز لے کر گھومتے پھرو' میں کر ہی کیا سکتی ہوں۔ تمہارے یارانے' تم جانو۔"

نازش کی گفتگو کبھی کبھی اخلاقیات کی حدیں پھلانگ کے' اسے کانوں پر ہاتھ رکھنے پر مجبور کردیتی تھی۔

اس وقت بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی' وہ بہت گھٹیا انداز میں ایک بہت پرانی بات یاد دلا رہی تھی۔ وقار معاملے کو رفع دفع کرنا چاہتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کی زبان بڑھتی جارہی تھی۔

"تمہیں تو خیر وہ ہمیشہ سے بے چاری اور مجبور لگی۔ کوئی خامی' برائی نظر آئے بھی تو کیسے' بچپن کی بندھی ہوئی پٹی ہے آنکھوں پر۔" اس نے فل والیوم میں ٹی وی چلا دیا اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں کل مرتضیٰ نے کافی کی آفر کی اور تم نے مجھے بھیج دیا اس کے پاس' مجھے بتایا تک نہیں۔"

دوسرے دن صبح ہی صبح تابندہ نے اسے جا پکڑا۔

"ہاں تو کیا کرتی۔ میں اکیلے اس کے ساتھ بیٹھ کر کافی انجوائے کرتی۔" اس نے انجوائے پر خاصا زور دیا

تابندہ کو ہنسی آگئی۔

"تم بھی نا۔ کمال ہو بس۔" وہ تابندہ کی بات پر مسکرادی۔

تابندہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔

"ایک بات پوچھوں غانیہ! سچ بتانا بالکل۔" اس کا لہجہ غیر معمولی تھا۔

"خیریت! صبح صبح یہ سنجیدگی۔" اس نے زیادہ اہمیت نہیں دی۔

"تم نے کبھی اپنے فیوچر کے بارے میں سوچا ہے۔"

اس کے ہاتھ ذرا کی ذرا تھم گئے۔ وہ جانتی تھی تابندہ بات کو کس رخ پر لے کر جانا چاہ رہی ہے۔

"بندہ سوچنے بیٹھ جاتا ہے۔ جبھی تو غلطیاں ہوتی ہیں۔ اللہ ہے نا سب کرنے والا۔" اس کے چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ تابندہ چڑ گئی۔

"تو نوکری کیوں کر رہی ہو۔ گھر بیٹھ جاؤ نا۔ من و سلویٰ اترنے لگے گا۔" غانیہ کے منہ سے قل قل کرتا ہنسی کا فوارہ ابل پڑا۔

پاس موجود کولیگز نے پلٹ کے اسے یوں ہنستے ہوئے دیکھا۔ اس نے فوراً" ہی خود کو سنبھالا۔

"ایسا لطیفہ تو نہیں سنایا میں نے۔" تابندہ بھی مسکرادی تھی۔

"تو۔ ہنسنے پر پابندی ہے کیا۔" وہ ہنوز غیر سنجیدہ تھی۔

"غانیہ! بات کو ٹالو مت۔ میں تابندہ ہوں۔ وقار نہیں۔ جس کے آگے اپنے آنسو ہنسی کے پردے میں چھپا کر تم' خوش رہنے کی دن رات کامیاب ایکٹنگ کرتی ہو۔"

غانیہ کے ہونٹ سکڑ گئے۔ نظریں سامنے رکھی فائل پر گڑ گئیں اور تابندہ کی اس کے چہرے پر۔

"مجھے وقار کے سامنے کسی کامیاب اور ناکام ایکٹنگ کی ضرورت نہیں۔ میری آنکھیں پڑھ سکتا ہے۔ دل میں جھانک سکتا ہے۔" اس کے لہجے میں بلا کی ٹھنڈک تھی۔

تابندہ کچھ دیر اس کی جھکی نظریں دیکھتی رہی پھر گہری سانس لے کر چیئر کی بیک پر ٹک گئی۔

"تو کیا تم ساری زندگی اس خاموش معاملے کی نذر کردو گی۔"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"تو پھر اور کیا کہنا چاہتی ہو۔" تابندہ نے اس سے بھی تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"تابندہ! کیوں مجھے پریشان کر رہی ہو۔"

"میں پریشان کر نہیں رہی۔ تم ہو پریشان اور تمہاری پریشانی مجھے دکھ دیتی ہے۔" غانیہ کو لگا اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا۔

"تمہیں جو کہنا ہے کہہ ڈالو۔ مجھ سے کچھ مت پوچھو۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ زندگی کا ان چاہا لیکن سب سے پرسکون راستہ ہے۔ میں نہیں چاہتی اب اس میں کوئی اور موڑ آئے۔"

"ہاں' ان چاہا' پرسکون لیکن دل کی خوشی سے خالی' محبت کے بغیر' صرف فرض کی طرح آگے پیچھے گزرتے ہوئے خاموش' تنہا راتیں اور اداس صبحیں۔ یہ زندگی ہے تمہاری اور یہ ہے زندگی کا راستہ۔"

وہ تابندہ کو دیکھتی رہ گئی۔ جانے وہ کیا ٹھان کے آئی تھی آج۔ ایسا آئینہ پہلے تو کبھی نہیں دکھایا۔

"تابی تم۔" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ انٹرکام کی بیل ہو رہی تھی۔

"باس کی کال ہے۔ آئی ہیو ٹو گو۔" اس نے جان بچنے پر' جلدی جلدی فائلیں سمیٹیں۔

"بریک میں بات کریں؟" تابندہ اتنی آسانی سے چھوڑنے والی نہیں تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر اثبات میں سر ہلایا۔

☼ ☼ ☼

لنچ بریک تک وہ تابی کو مطمئن کرنے کے لیے بہت سے دلائل گھڑ چکی تھی۔ لیکن اس ٹائم اس نے ایک نئی بات چھیڑ دی۔

"امی چاہتی ہیں اس سال کے اینڈ تک میری شادی ہو جائے۔" اس کے چہرے پر خوشگوار حیرت بکھر گئی۔

"صبح سے بکواس کر رہی تھیں۔ گڈ نیوز اب دے رہی ہو۔" سچ مچ خوش ہو گئی۔

تابندہ کی منگنی خاندان میں ہی ہوئی تھی۔ تقریباً" دو سال پہلے۔

"لیکن میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی کیونکہ ہو سکتا ہے شادی کے بعد فرحان مجھے جاب نہ کرنے دیں۔"

"تو کیا مطلب ہے تمہارا۔" وہ سمجھی نہیں۔

"میری ایک بات مانو غانیہ! اگر میں تمہارے نزدیک ایک ذرا سی بھی اہمیت رکھتی ہوں تو پلیز۔" اس نے غانیہ کے ہاتھ تھام لیے۔ غانیہ کو حیرت ہونے لگی۔ صبح کے برعکس اس وقت وہ بالکل ہی بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔

"ہاں ناں بولو تابی! ایسے منت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"تم! تم بھی شادی کرلو نا۔ کب تک وقار کے لیے بیٹھی رہو گی۔" غانیہ نے نرمی سے اپنے ہاتھ چھڑائے۔

"تم سے کس نے کہا کہ میں وقار کے لیے بیٹھی ہوں۔ آئندہ ایسی بات مت کرنا۔"

"آئی ایم سوری! اگر تم ہرٹ ہوئیں اس کا مطلب ہے کوئی ڈھنگ کا پرپوزل ملے تو تم غور کرو گی۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو تابی۔" وہ ہار مان رہی تھی۔

"مرتضیٰ تمہیں پرپوز کرنا چاہتا ہے۔"

"کیا؟" اس نے بمشکل اپنی آواز کو کنٹرول کیا۔

"اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟" وہ کوئی جواب نہیں دے سکی۔ بس الجھی الجھی اسے دیکھتی رہی۔

"کوئی نہ کوئی تو تمہارا ہم سفر بنے گا نا۔"

"تو مرتضیٰ ہی کیوں؟" اسے خود اپنی بحث کا جواز پتا نہیں تھا۔

"تو مرتضیٰ کیوں نہیں۔" وہ چند لمحے بے بسی سے اسے دیکھتی رہی پھر الجھ کے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

"میں نے فیوچر کے لیے شادی کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تابی! میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟" تابی جھنجلا گئی۔

"بس میں نہیں کرنا چاہتی شادی۔ وقار کو کیا ملا شادی کرکے۔ ناخوشی' نامرادی۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ تابندہ کو تاؤ آگیا۔

"تم اپنی زندگی کے اتنے بڑے فیصلے کو' وقار کی ناکام ازدواجی زندگی کے آئینے میں دیکھتی ہو۔ غانیہ! کیوں' کیوں تم اس کی زندگی کو' اس کی خوشیوں کو' اس کے غموں کو اپنے اوپر رکھ کے دیکھتی ہو۔ وہ ناخوش ہے تو تم بھی خوش نہیں رہ سکتیں۔ وہ دکھی ہے تو تم بھی دکھی ہو۔ وہ پریشان ہے تو تم پریشان۔ پروموشن اس کی ہوئی' خوشی تمہارے چہرے پر۔ خود فریبی کے حصار سے نکل آؤ۔ غانیہ حسن! تم آج بھی اس سے محبت کرتی ہو مانو یا نہ مانو۔ اور یہ جو وہ اپنی تشنگی اور محرومی کی کہانیاں تمہیں ہر تھوڑے دن کے بعد آکے سناتا ہے نا تو صرف اس لیے کیونکہ وہ تمہارے دل کے حال سے واقف ہے۔ اسے لطف دیتی ہے یہ بات کہ ایک عورت اس کے نام کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے اور دوسری محض اس کے نام پر' زندگی میں کھلنے والا خوشی کا ہر دروازہ بند کیے بیٹھی ہے۔ اور تم مانو یا نہ مانو۔ وہ کبھی اس دروازے پر دستک نہیں دینے والا۔"

تابندہ آج اس سے کیا کیا منوانے والی تھی۔ نہ جانے۔

"اپنے دل کے دروازے کھولے اس کا انتظار کرتی عورت۔ مردانہ فطرت کی تسکین کا بہترین ذریعہ ہوتی ہے۔" اس نے ایک لمحہ رک کر غانیہ کا چہرہ دیکھا۔

دھواں دھواں آنکھوں میں کرب کی کیفیت رقم تھی۔

"دھوکا دے رہی ہو تم اپنے آپ کو یہ سوچ کر کہ وہ آج بھی تم سے محبت کرتا ہے۔ اس نے کبھی کہی یہ بات تم سے۔ بولو نہیں نا۔ کیونکہ محبت وہ نہیں تم کرتی ہو اس سے۔ انتظار وہ نہیں تم کر رہی ہو اس کا۔ تمہارے شعور کو احساس نہیں ہے۔ وہ منزل پاچکا

ہے۔ نامراد وہ نہیں، تم ہو۔ یکطرفہ محبت، انتظارِ لاحاصل کا نتیجہ آبلہ پائی کے سوا کچھ نہیں۔ ایسے راستے پر چل رہی ہو تم جس کا اختتام کسی منزل پر نہیں، بند گلی پر ہوگا۔ ایک اندھیری بند گلی۔ جہاں تمہارا ہاتھ تھامنے کے لیے کوئی سہارا تمہارے پاس نہیں ہوگا۔ وقار بھی نہیں۔"

اس کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر چکی تھیں۔ وہ کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ پھر جھٹکے سے اٹھ کر بیگ کندھے پر ڈالا۔

تابندہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ مڑتے مڑتے ٹھہر گئی۔

"ناراض ہو گئیں۔" اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اذیت کی شدید لہر جسم و جاں میں سرائیت کر چکی تھی۔ وہ کسی کا سامنا کرنے کے قابل نہیں تھی۔

"میری باتوں پر غور ضرور کرنا۔"

تابندہ نے بات مکمل کر کے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ چھڑا لیتی۔ غانیہ پلٹے بغیر کینٹین کی حدود سے نکلتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

پورا راستہ وہ چپکے چپکے پلکوں سے جھڑتے شفاف موتی اپنی انگلیوں کی پوروں پر سنبھالتی ہوئی آئی تھی۔

وقار کے فلیٹ پر تالا لگا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے دیکھ لیا۔ اور یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ضبط کے بندھن ٹوٹے تو ایک عرصے کے بعد وہ دل کھول کے روئی۔ گھنٹوں بیتا وقت، گزرے زمانے۔ ابا میاں اور اماں بی کو یاد کرتے گزر گئے۔ وہ ان کی تصویریں سینے سے لگائے سسکتی رہی۔ ماں باپ جیسی انمول دولت مٹ جانے کا ماتم کرتی رہی۔

در و دیوار سے وحشت برس رہی تھی۔ اداسی، مایوسی اور تنہائی، سکھی سہیلیوں کی طرح ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اس کے چاروں اور گھیرا بنائے کھڑی تھیں، اور بیچ میں وہ خود تھی۔ خالی ہاتھ۔ تہی داماں اور نم آنکھیں لیے۔

کیا کچھ نہیں کہا تھا تابندہ نے۔ اسے حقیقت کے آئینے میں اپنی شکل بہت مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔

خوش فہمی اور بے وقوفی کی انتہاؤں سے رنگا اس کا چہرہ، جس پر نظر پڑتے ہی کسی کو بھی ہنسی آجائے کیا وقار، وقار بھی ان رنگوں کو دیکھتا اور اس کی ہنسی اڑاتا ہوگا۔

نوک در نوک خیالات اس کا دل چھیرتے رہے۔ اس کی زخمی سماعتیں مزید کسی طعنے مزید کسی سچائی، مزید آگہی کے عذاب کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔

"کوئی یوں بھی گزارتا ہے زندگی۔ سارے رنگوں سے الگ، بس سیاہ و سفید دائرے میں مقید، ہر خوشی کا راستہ خود پر بند کر کے۔" اسے یاد آرہا تھا۔

تابندہ نے بہت بار اسے اپنے خول سے باہر نکالنے کی کوشش کی تھی۔

"زندگی بہت خوبصورت ہے غانیہ! خود ساختہ اداسی کا جو لبادہ اوڑھے بیٹھی ہو اس سے باہر نکلو۔"

"ایک محبت نہ مل سکنے کا ماتم کب تک کرتی رہوگی۔ صرف ایک قدم بڑھاؤ۔ کتنی ہی محبتیں تمہیں اپنی منتظر ملیں گی۔" اسے تابندہ کے خلوص پر رتی برابر شک نہیں تھا۔

وہ سچی تھی۔ مخلص تھی۔ وہ جانتی تھی۔

"وقار کے اندر تمہاری آنکھیں، تمہارا دل پڑھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ تمہارا چہرہ آئینہ ہے۔ جسے ہر کوئی پڑھ سکتا ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ اس جیسے کم فہم شخص کے پڑوس میں رہتے رہتے، تم بھی آنکھیں اور لہجے پہچاننے کی صلاحیت کھوتی جا رہی ہو۔"

اسے یاد آیا۔ صبح اس کے پاس سے اٹھنے سے پہلے اس نے یہی کہا تھا۔ اسے ایک بار پھر ٹوٹ کے رونا آیا۔

"کیا میں اتنی نادان ہوں کیا میں اتنی کم عمر ہوں، بے وقوف۔ اتنی کم عقل کہ مجھے تم سے سیکھنے کی ضرورت پڑے۔ اب لوگوں کو پرکھنے کے لیے مجھے تمہارے کھینچے گئے حاشیوں کی حدود میں جانا ہوگا۔

میں بچپن سے بس جس کی محبت کے فریب میں مبتلا، اسی بہانے کے سہارے زندگی گزار رہی ہوں۔ تم وہ آخری بہانا بھی مجھ سے چھیننا چاہتی ہو۔ پھر میں زندہ کیسے رہوں گی۔ بچے گا ہی کیا میرے پاس۔ زندگی کرنے کو اس سے تو اچھا ہے۔ میں خود فریبی کے دائرے میں ہی ساری زندگی گزار دوں۔"

"یہ خود فریبی کا دائرہ نہیں۔ یہ تنہائیوں کا وہ خلا ہے جہاں تشنگی، نامرادی کے مہیب سناٹے تمہارے اندر کی بچی کچھی زندگی نچوڑنے کو تیار بیٹھے ہیں۔"

تکلیف وہ سوچوں کے تھپیڑے اس کے دھیان کو ادھر سے ادھر پٹختے اسے نڈھال کر رہے تھے اور آج ایک بار پھر وہ بالکل اکیلی، تنہا اندھیرے کمرے کی دیواروں سے لپٹی گریہ کناں تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں نے تم سے کچھ کام کہا تھا۔"

ان کے ڈیپارٹمنٹ اور اکاؤنٹس سیکشن میں بنے اس کے آفس میں کافی فاصلہ تھا۔ وہ خود چل کے وہاں آیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ فرصت سے تفصیلی بات کرنے کے موڈ میں ہے۔

"بیٹھو۔" تابندہ نے پین ٹیبل پر ڈال دیا۔

"بولو اب۔" وہ بیٹھنے کے بعد منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں نہیں کر سکی۔ سوری۔"

تابندہ اسے دیکھ نہیں رہی تھی۔ وہ چپ سا ہو گیا۔ اسے اتنے دوٹوک انکار کی امید نہیں تھی۔

"وجہ بتا سکتی ہو۔"

"ہاں۔ پہلے تم ایک بات بتاؤ۔"

"پوچھو۔" وہ تابندہ کے انداز پر الجھ سا گیا۔

"غانیہ! ہی کیوں۔ تمہارے لیے لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔"

"میں اسے پسند کرتا ہوں۔"

"کوئی وجہ بھی تو ہو۔"

"میرے خیال میں ہم بہت سارے لوگوں کو بے وجہ بھی تو پسند کرتے ہیں۔ یا شاید ہمیں پسندیدگی کے ادراک پہلے ہو جاتا ہے، وجہ بعد میں پتا چلتی ہے۔"

اس کا خیال تھا تابندہ اس کے جواب سے مطمئن ہو جائے گی۔ اور یہ خیال غلط بھی نہ تھا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ صرف پسند ہی کیوں۔ زندگی میں بہت ساری باتوں کا علم ہمیں پہلے ہو جاتا ہے وجہ بعد میں پتا چلتی ہے۔"

"کیا بات ہے۔ اتنی اداس کیوں ہو؟"

اس نے کھڑکی سے باہر پھیلی دھوپ پر نظریں جمائے۔ تابندہ کو غور سے دیکھا۔ وہ ہمیشہ ہنسنے مسکرانے والی لڑکی تھی۔

"غانیہ.....! ناراض ہے مجھ سے۔ پچھلے کئی دن سے۔ آئی مس ہر ویری مچ۔"

"اوہ!" مرتضٰی کے ہونٹ سکڑ گئے۔ "تم سے ناراضی۔ وجہ یقیناً" خاص ہوگی۔"

"خاص تو ہے لیکن اتنی بڑی نہیں۔ میں نے بس چند ایک سچائیوں کا ادراک دینے کی کوشش کی تھی اسے۔ کڑواہٹ نگل نہیں سکی۔ بدہضمی ہو گئی بے چاری کو۔" وہ الجھا الجھا سا اسے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ پرسوچ نظروں سے اپنے سامنے ٹیبل کی چکنی سطح کو۔

"اینی ہاؤ۔" سر جھٹک کر وہ حال میں واپس آئی۔

"اگر سچے دل سے اسے پانا چاہتے ہو تو تھوڑا انتظار کرو۔"

"کس بات کا انتظار؟"

"اس کے زندگی کی طرف لوٹنے کا۔ اس کا اضطراب بتاتا ہے کہ میری کوشش سست رفتار ہے بے اثر نہیں۔"

مرتضٰی کچھ سمجھا کچھ نہیں۔ لیکن زیادہ کرید نہیں کی۔ تابندہ نے اس کے ہاتھ میں امید کا سرا تھمایا تو تھا۔ اور وہ خود بھی ناامید نہیں ہونا چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

تابندہ سے ناراض ہونا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ خاص طور پر اس صورت حال میں جبکہ اسے دن رات

اس کے ساتھ کی عادت پڑ چکی تھی۔ لیکن اس کے باتیں اتنی تکلیف دہ تھیں کہ وہ کسی صورت اسے معاف کرنے کو تیار نہیں تھی۔

"کتنی آسانی سے کہہ دیا۔ بھول جاؤ اسے وہ جھوٹا ہے۔ ساری زندگی جس شخص کی ہر بات پر آنکھ بند کر کے یقین کیا اسے اتنی آسانی سے جھوٹا کیسے مان لوں۔ جس خواب کو اپنی آنکھوں کا لہو دے کر ساری زندگی سینچا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی ہم سفری میرا مقدر نہیں۔ اسے دل کے کسی کونے میں دفن کردوں۔ اتنا آسان نہیں ہے تابی۔ تمہیں کیا پتا۔"

وہ دن میں متعدد بار اسے مخاطب کر کے اس سے باتیں کرتی رہتی۔ اوپر سے ناراضی کا مظاہرہ پوری آب و تاب کے ساتھ جاری تھا۔

آفس میں بھی تابندہ سے سامنا ہونے پر بے نیازی سے اس کے سامنے سے گزر جاتی۔ لنچ تو وہ کرتی ہی نہیں تھی، پتا نہیں تابندہ اکیلی ہی کرتی تھی یا مرتضیٰ کے ساتھ۔

اور یہ مرتضیٰ! وہ بھی تو تابی کے ساتھ اس کی سوچوں میں برابر کا حق دار بنتا جا رہا تھا۔ وہ جتنا سر جھٹکتی دھیان کی پتنگ اڑ اڑ کے اسی سے پیچ لڑائے جاتی۔

وہ دل نہ لگنے کے باوجود پوری دیانت داری سے آفس کے کام نبٹاتی۔ سوچ کے پرندے شرارت سے اڑ کر کبھی اس شاخ پر، تو کبھی اس ٹہنی پر جھولتے رہتے۔

سیدھے سادے کام میں بھی غلطیاں نکل آتیں۔ کئی دن اس کے آفیسرز نے اگنور کیا۔ لیکن کب تک، ایک زبردست قسم کی جھاڑ اس کے حصے میں آئی۔

وہ کئی سال سے اس آفس میں نوکری کر رہی تھی۔ اور وقت کی پابند اور محنتی ایمپلائی کی حیثیت سے پہچانی جاتی تھی۔ لیکن کچھ دنوں سے اس قدر غیر حاضر دماغی کا ثبوت دینے لگی کہ سب کی نظروں میں آگئی اور اسے باس کے ہاتھوں بے عزتی کا مزا چکھنا پڑا۔

وہ سرخ چہرہ اور نم آنکھیں لیے اندر سے برآمد ہوئی تو پیون ایک چٹ لیے کھڑا تھا۔

"تابی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، آج آپ اس کے گھر جا کے مل لیجیے۔ اس نے آپ کو بلایا ہے۔"

بے حد مختصر سا پیغام تھا۔ بے عزتی کی کوفت کی جگہ، پیشانی پر تفکر کی لکیروں نے لے لی۔

"کمال ہے وہ، آج آفس تک نہیں آئی اور مجھے پتا ہی نہیں۔" اس نے خود کو ملامت کی۔

اور جب وہ دل ہی دل میں اپنی بے خبری پر خود کو کئی بار لتاڑ چکی تو پتا چلا کہ وہ تو تابی سے ذرا سی بھی خفا نہیں۔

"میں ضرور آؤں گی میری جان۔" وہ مسکراتے ہوئے دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھی۔

☼ ☼ ☼

موسم میں قدرے خنکی کا سا احساس تھا۔ تابندہ سے ملنے کی خوشی اس کے گھر تک کے سفر کی تھکن کی سوچ پر غالب تھی۔

آسمان کے کناروں سے اٹھتی سرخی، سرمئی وسعتوں میں پھیلنا شروع ہوئی تھی۔ وہ تیز قدموں سے پارکنگ ایریا سے نکلتی باہر کی طرف جا رہی تھی۔ جب کسی نے پیچھے سے پکارا۔

"میں بھی تابی کے پاس جا رہا ہوں، پلیز آپ میرے ساتھ چلیے۔" اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔ بات ماننے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا، لیکن وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔

"پلیز، میں آرڈر دے رہا ہوں، آفر نہیں۔" غانیہ کا منہ کھلا رہ گیا۔

وہ اپنی بات مکمل کر کے رکا نہیں تھا۔ پارکنگ میں سے گاڑی نکال کے لایا اور فرنٹ ڈور کھول دیا اس کے لیے وہ کچھ جھجکتی ہوئی بیٹھ گئی۔

"یوں بھی جب منزل ایک ہے تو الگ الگ راستوں پر کیوں چلیں۔ اور وہ بھی آسان چھوڑ کر دشوار راستے کا انتخاب۔"

"جی!" آج اسے حیران کرنے کا دن تھا۔ گاڑی تابندہ کے گھر کے بجائے ایک سپر مارکیٹ میں رکی۔

"میں ایک منٹ میں آتا ہوں، ڈونٹ مائنڈ، بیٹے کا برتھ ڈے ہے تو اس کا گفٹ۔"

مرتضیٰ اتر کے جا چکا تھا۔ اسے یاد آیا آج اس کا بھی تو برتھ ڈے ہے۔

"کمال ہے، وقار جانے کہاں ہے صبح سے، ایک میسج تک نہیں کیا۔ حالانکہ سب سے پہلے وہی وش کرتا ہے مجھے، پھر آج کیا ہوا؟"

نازش چار دن سے اپنی امی کے گھر تھی اور ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے دل میں کسی غیر معمولی احساس نے کروٹ لی۔

تبھی اس نے گاڑی کے ونڈ اسکرین سے بالکل سامنے وقار اور نازش کو ایک شاپ سے نکلتے دیکھا۔ ان دونوں کے ہاتھ میں شاپنگ بیگز تھے۔ اس میں کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں تھی۔ وہ بے شمار بار ایک دوسرے کے ساتھ شاپنگ کے لیے جا چکے تھے۔ میاں، بیوی تھے۔ اس میں عجیب کیا تھا۔ لیکن کچھ تو عجیب تھا۔ ہاں "ان کا رویہ۔"

وقار کے چہرے پر ایک آسودہ مسکراہٹ تھی۔ اور نازش کسی بات پر زور سے ہنس رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ عجیب تھا وہ کریڈل، جو وقار نے اپنے دائیں ہاتھ میں تھاما ہوا تھا۔

بے حد خوب صورت سفید رنگ اور گلابی پھولوں کے امتزاج سے بنا وہ بے بی کریڈل ہی ——— اس کی توجہ کا مرکز تھا۔ اور وہ شاپ، جس سے ابھی ابھی وہ لوگ باہر آئے تھے۔

نومولود بچوں کے استعمال اور ضرورت کی اشیا سے سجی ہوئی تھی۔ غانیہ کو ان کی وہاں موجودگی کا سبب جاننے میں دیر نہیں لگی۔

"تو وقار! زندگی کی یہ واحد کمی بھی اب پوری ہونے جا رہی ہے۔" اداسی کی ایک ہلکی سی لہر اسے چھو کے گزری۔

"تو یہ وجہ تھی نازش اور تمہاری اتنے دن اپنے سسرال میں قیام کی۔"

اس نے سر جھٹک کے اپنے ہاتھوں کی خالی لکیروں کو دیکھا۔

"خدا تمہیں ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔" آنکھوں میں اترتی نمی کو اس نے پلکیں جھپک کے دہلیز پر بانٹ لیا۔ اور مرتضیٰ کو آتے دیکھ کر یوں ہی بے خیالی میں مسکرا دی۔

مرتضیٰ کے لیے اس کی یہ مسکراہٹ بھی بہت تھی۔ وہ بھی جواباً" مسکرا کے گاڑی ریورس کرنے لگا۔ سنجیدگی سے اپنے ہاتھوں پر جمائی نظریں اٹھا کے اس نے سامنے کسی شناسا کو کھوجا، وہاں اب کوئی نہیں تھا، اور دوبارہ سے نظریں ہاتھوں پر جمادیں۔

اس بات سے بے خبر کہ وہ چند لمحے پہلے کسی کی نظروں میں آچکی ہے۔

☼ ☼ ☼

تابندہ بخار میں تپ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بے تابی سے لپٹ گئی۔

"میں سمجھی تھی تم نہیں آؤ گی۔"

"اب اتنی بھی بے مروت نہیں ہوں۔" اس کے لپٹنے پر شرما سی گئی۔ مرتضیٰ سامنے ہی تو بیٹھا تھا۔

تابندہ کی امی اور چھوٹی بہن بہت محبت سے ملیں۔ وہ اسے ہمیشہ تابی کی طرح ہی اہمیت دیتی تھیں۔

"کتنی گرم ہو رہی ہو، لگتا ہے میڈیسن کے معاملے میں لاپروائی برتی ہے۔" وہ تفکر سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"میڈیسن ہی تھیں نا، تم تو زندگی کے معاملے میں بھی ـــ"

"تابندہ پلیز! کیا مجھے اس لیے یہاں ـــ" اس سے بات مکمل نہیں کی گئی۔ دل پتا نہیں کیوں اچانک بھر آیا تھا۔

"آئی ایم سوری غانیہ پلیز! ریلیکس کیا ہوا۔" وہ پریشان ہوگئی۔

"کچھ نہیں۔" اس نے جلدی سے چہرے پر ہاتھ پھیر کر اپنے آپ کو کمپوز کیا۔ وہ دونوں اس وقت تابندہ اور اس کی بہن کے مشترکہ کمرے میں بیٹھی تھیں۔

تابندہ کچھ لمحے اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتی رہی۔

"تم!" غانیہ نے کچھ کہنا چاہا' لیکن بات گلے میں اٹک گئی۔

"ہاں بولو کیا میں۔۔۔ میں بہت بدتمیز ہوں۔" تابندہ بے تابی سے بولی۔

"نہیں۔" اس نے گہرے گہرے سانس لیے' اعتراف شکست اتنا بھی آسان نہ تھا۔

"تم ٹھیک کہتی تھیں' میں خود فریبی میں جی رہی تھی اور مجھے اب اس کے حصار سے نکل آنا چاہیے۔" وہ آگے پیچھے اندر آتے مرتضیٰ کے دونوں بچوں سے ہاتھ ملانے لگی۔

اس کی بات مکمل ہوچکی تھی اور تابی کا مقصد بھی۔ وہ مرتضیٰ کی بیٹی سے اس کا تعارف کروانے لگی۔

"موحد سے تو تم مل چکی ہونا' یہ ہیں نبیہ مرتضیٰ۔" وہ گلابی رنگت اور کرنجی آنکھوں والی معصوم سی چار سالہ بچی تھی۔ غانیہ سراہے بنا نہ رہ سکی۔

"یہ بالکل اپنی ماما پہ گئی ہے۔"

"پھر تو ان کی ماما بہت پیاری ہوں گی۔" اس نے کہتے ہوئے بچی کے گلابی گال چھوئے۔

"مرتضیٰ کہتا ہے ۔۔۔ تم اس سے ملتی ہو۔" تابندہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ غانیہ کتنی دیر اسے دیکھتی رہی۔

اس بات کا کیا مطلب تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔

"ایکچوئیلی تم جو پرفیوم لگاتی ہو' وہ بہت یوز کرتی ہے' ہوسکتا ہے اس وجہ سے فیل ہوتا ہے۔" تابندہ بے وجہ وضاحتیں دینے لگی۔

اس نے نبیہ کو گود سے اتار کر باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

تابندہ سمجھ نہیں سکی کہ جو وہ جتانا چاہ رہی تھی غانیہ نے محسوس کیا یا یہ اس کی ناراضی کا اظہار تھا۔ تابندہ تھکے تھکے انداز میں بستر پہ لیٹ گئی۔

وہ بیمار تھی۔ اس کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ وہ فوری طور پر اس کے پیچھے نہیں جاسکتی تھی۔ کھانے کے وقت بھی بمشکل باہر آئی۔ اور باہر کا منظر دیکھ کر بے اختیار مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

غانیہ ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کے نبیہ کے منہ میں ڈال رہی تھی اور وہ اسے اپنے اسکول کی جانے کون کون سی کہانیاں سنا رہی تھی۔ غانیہ کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور انداز میں دلچسپی۔

تابندہ نے ایک امید کو بہت تیزی سے سبز ہوتے دیکھا۔ چلتے سمے اس نے غانیہ کو بھی گفٹ دیا۔

"مجھے پتا ہے آج تمہارا بھی برتھ ڈے ہے۔ میں نے بہت دن پہلے سے لے کے رکھا ہوا تھا۔"

غانیہ کو اس کی محبت اور اس سرپرائز نے خوش کردیا۔

آتے وقت دل اداس تھا' لیکن تابندہ کے گھر سے نکلتے وقت دور' دور تک اداسی کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہ ہنس رہی تھی' بول رہی تھی' مرتضیٰ کی نظروں سے جھینپ رہی تھی اور تابندہ اس کی بلائیں لے رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وقار اسے فلیٹ کے سامنے ہی کھڑا ہوا مل گیا تھا۔ آج دیر بھی تو بہت ہوگئی تھی۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ تابندہ بخار کی حالت میں بھی' اسے مرتضیٰ کے ساتھ گھر تک چھوڑنے آئی تھی۔ اس نے ان کو اوپر فلیٹ تک آنے سے منع کیا تھا۔

اسے پتا تھا وقار اس کا منتظر ہوگا۔ اگر اپنے گھر واپس آگیا تو۔۔۔

وہ مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی تھی' لیکن اس کے تیور الگ تھے۔

"کہاں سے آرہی ہو؟"

"میں آفس سے صرف تابندہ کے گھر ہی جاتی ہوں۔" اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی جتایا اور تالا کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

"اندر آئیں' دیکھ کیا رہے ہیں؟" اسے ہنوز وہیں کھڑا دیکھ کے اسے تعجب ہوا۔

"دیکھ رہا ہوں تم جھوٹ بولتے ہوئے کیسی لگتی ہو۔" وہ واش روم کی طرف جاتے ہوئے پلٹی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں' میں کیوں جھوٹ بولوں گی۔"

"اچھا تو وہاں مارکیٹ میں کس کی گاڑی میں بیٹھی تھیں' تابندہ کی گاڑی میں۔" اس کا مشکوک لہجہ اسے اندر تک کاٹ گیا۔ اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

"بولو' میں تو سمجھتا تھا کہ تابندہ کسی لڑکی کا نام ہے' مگر یہ تو۔۔۔"

"بس وقار! اب آگے ایک لفظ نہیں بولیے گا۔"

"کیوں نہیں بولوں گا' میں تو بولوں گا اور ضرور بولوں گا' ایک غیر مرد کے ساتھ اس کی گاڑی میں' آفس ٹائم کے بعد کیا کررہی تھیں تم' بتاؤ' یہ پوچھنا میرا حق ہے۔"

"میں آپ کو بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔" اس کا لہجہ برف ہوگیا۔ "اور کس حق کی بات کررہے ہیں آپ' کیا لگتے ہیں میرے بولیں۔"

"غانیہ!" وقار کا منہ کھل گیا۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ کس نے دیا آپ کو یہ حق کہ آپ میرے روزمرہ معمولات کے بارے میں پوچھ گچھ کرتے پھریں۔"

دو قدم آگے بڑھ کے اس کے مقابل آگئی۔

"کیا رشتہ ہے آپ سے میرا۔ شوہر ہیں آپ میرے۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"یا بھائی ہیں۔" وقار کے سر پر کسی نے ڈھیروں برف انڈیل دی۔ اسے لگا اس کے وجود میں جیسے بھانبھڑ جل اٹھے ہیں۔

"اور چلیں اگر میں مان بھی لوں کہ بچپن سے آج تک جس جھوٹی محبت کے کھوکھلے رشتے کو لفظ دوستی میں لپیٹ کر میں نے سنبھال سنبھال کے رکھا۔ وہ کہاں گیا اس وقت جب بیوی کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے۔ مستقبل کی خوشیاں خریدنے آپ اسی مارکیٹ میں ہٹر گشت کررہے تھے۔"

وقار کی قوت گویائی سلب ہوچکی تھی۔ اور وہ زندگی میں پہلی بار وقار سے اس لہجے میں بات کرکے ہانپ سی گئی تھی۔

"میں نے تو نہیں پوچھا آپ سے' کیوں نہیں پوچھا میں نے' اس لیے نہیں کہ نازش اور آپ ایک دوسرے پر کوئی حق رکھتے ہیں' بلکہ اس لیے کیونکہ مجھے آپ سے پوچھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اب بھی بول رہی تھی۔ وقار پتھر کے بت کی مانند ساکت تھا۔

"اور جس قدر غلیظ باتیں آپ کی بیوی میرے بارے میں دن رات کرتی رہتی ہے۔ میری کردار کشی کرتی ہے اور جس طرح آپ منہ بند کرکے سنتے ہیں۔ محبت؟ دوستی؟ اعتبار؟ حق؟ مجھے تو لگتا ہے ہمارے بیچ انسانیت نام کا بھی کوئی رشتہ نہیں ہے وقار صاحب۔"

وقار پھٹی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ پلٹنے کو تھی۔ جب اس نے دونوں بازوؤں سے تھام کے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

"تم اس طرح اپنی غلطی کو لفاظی کے پردوں میں نہیں چھپا سکتی' غانیہ' مان لو کہ تمہاری نظر میں اب میری کوئی حیثیت نہیں رہی۔ کوئی مقام' کوئی اہمیت نہیں' میری تمہارے نزدیک' تمہاری محبت' تمہارا پیار سب ایک جھوٹ' ایک ڈھونگ تھا۔ ایک دکھاوا' تم دنیا والوں کی نظر میں صرف وفا کی دیوی بن کے سب سے شاباشی لینا چاہتی تھیں۔ بولو یہ سچ ہے کہ نہیں۔"

اس کی انگلیاں اس کے بازوؤں میں گڑ سی گئیں۔ وہ خوف زدہ ہوگئی۔

"چھوڑیں مجھے' کیا پاگل ہوگئے ہیں آپ۔"

وہ دہشت زدہ ہو کے چلائی' اور اس سے پہلے کہ وقار کچھ اور کہتا' اسے اپنے پیچھے نازش کی آواز آئی۔

"وقار!" نازش بے یقینی سے انہیں گھور رہی تھی۔ دونوں اپنی جگہ پر تھم سے گئے۔ غانیہ خوف سے سفید پڑگئی۔ اب تک جتنی بہادری وہ دکھا چکی تھی یہی اس کی فطرت کے بہت خلاف تھا۔ اور اب متوقع ذلت کا خوف ہر چیز پر حاوی ہوگیا تھا۔

نازش کچھ کہنے کے بجائے چپ چاپ واپس پلٹ گئی۔ وقار بھی اسے چھوڑ کر نازش کو پکارتا اس کے پیچھے باہر نکل گیا۔

غانیہ کچھ لمحے ساکت کھڑی بے یقینی سے دروازے کی سمت دیکھتی رہی۔ ایک طوفان جو اپنے ساتھ بہت کچھ بہا لے جاتا۔ معمولی سے نقصان پر پلٹ گیا تھا واپس۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر چاروں اطراف نظر ڈالی۔ پورے گھر پہ سناٹا چھا چکا تھا۔ خاموشی کسی اندھیرے کونے کھدرے سے نکل کر چاروں اور پھیل گئی تھی، سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ لیکن اب ایک ویرانی تھی، جو گھر کی ہر شے سے ٹپک رہی تھی۔

درخت سے جھڑنے والے سوکھے پتوں کے چہروں پر لکھی ویرانی۔ وہ درخت جو محبت کے قدیم، شکست خوردہ مرقد کے سرہانے لگا۔ اس کی بربادی پر ماتم کناں تھا۔

وہ بند دروازے سے ٹیک لگا کے سسک پڑی۔

کیا کچھ ان آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔ دل سے نکل کے آنسوؤں میں پگھل کے، سسکیوں میں ڈھل کے۔ اس کا وجود جھلس رہا تھا۔ آنکھوں سے بہتے گرم سیال کی تپش سے۔ وقار کے الفاظ کی سختی اس کا دل پگھلا رہی تھی۔ لگتا تھا سماعتیں ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو گئی ہیں۔

"بس یہ سننا تھا وقار! یہی باقی رہ گیا تھا۔ تمہارے منہ سے اپنے کردار پر ایسے گھٹیا الزامات اور خلوص کے منہ پر اتنے رکیک طمانچے، میں کیسے برداشت کروں وقار! میری محبت کی آخری ہچکیوں کا بھی گلا دبا دیا تم نے۔ کسی قابل نہیں چھوڑا۔ زندگی بھر کے لیے میری محبت کو ایک نمائش، ایک دکھاوا بنا کے رکھ دیا۔"

وہ قطرہ قطرہ پگھلتی رہی، ذرہ ذرہ بکھرتی رہی، مگر وہاں اسے سمیٹنے سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا، کوئی بھی نہیں۔

☼ ☼ ☼

جلتی ہوئی آنکھوں کو دھیرے سے مسل کر اس نے بمشکل کھول کر سامنے دیکھنے کی کوشش کی۔ بالکل سر پہ جلتا ہوا بلب کسی انگارے کی طرح دہکتا، تکلیف اور درد میں اضافے کا باعث لگ رہا تھا۔ آنکھوں میں شدید جلن اور بھاری سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔

فضا میں تیز نوکیلی آواز گونج رہی تھی۔ موبائل کی بیل سے سماعتوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ اس نے سر اٹھا کے دائیں دیکھنا چاہا، لیکن ناکام رہی، پورے جسم میں درد کی شدید ٹیسیں تھیں۔

"شاید! شاید بخار ہے۔" کانپتا ہوا ہاتھ اٹھا کے اس نے خود ہی پیشانی پہ رکھا۔ ایک سی حرارت، ماتھے پر بھی، ہاتھ میں بھی۔

جلن زدہ آنکھیں موندے اس نے ہلنے کی کوشش ترک کر دی۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کا جسم حرکت کرنے کے قابل نہیں ہے۔ ہاتھ ڈھیلے ڈھالے انداز میں لٹک کے زمین چھونے لگے۔

وہ صوفے پر سر رکھے، زمین پر بیٹھی سو رہی تھی، جانے کتنی دیر گزری تھی، دن ڈھل چکا تھا، یا ابھی نکلا ہی نہیں تھا۔ وقت کا کوئی اندازہ تھا، نہ حساب۔

آنکھیں موندے وہ رنگ برنگے دائروں میں قید، سیاہ و سفید بگولوں اور خوف ناک ہیولوں سے ڈر کے بھاگتی رہی، کبھی کسی سائے کا پیچھا کرتی رہی۔

دور کہیں کوئی شناسا چہرہ اسے آواز دے رہا تھا۔ وہ اس تک پہنچنا چاہتی تھی، اسے آواز دینا چاہتی تھی، چھونا چاہتی تھی، لیکن وہ جھلک دکھا کے اندھیروں میں چھپ جاتا تھا۔

بدقت تمام اس نے آنکھیں کھولیں، اور فوراً ہی چندھیا کے بند کر لیں۔ موبائل پھر بج رہا تھا۔ پر شور آواز اعصاب جھنجھوڑ رہی تھی۔

اس نے تین چار بار آنکھوں کو مسلا۔ پھر سامنے نظر ڈالی۔ صوفے کے کشن پر رکھے رکھے اس کی گردن بری طرح اکڑ چکی تھی۔

سر سیدھا کرتے ہوئے اس کی کراہ نکل گئی۔ اور ایک دم جیسے سب یاد آتا چلا گیا۔ اس نے سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر دو تین جھٹکے دیے۔ سیل پھر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

صوفے پر ہاتھ ٹکا کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی جسم شدید اینٹھن اور غبار کی لپیٹ میں تھا۔

"اف! اوہ!" کانپتے قدموں پر مشکل کھڑے ہو کر اس نے موبائل کی تلاش میں نظریں دوڑائیں حلق میں کانٹے سے پڑے ہوئے تھے۔

وہ سیل کی تلاش ترک کر کے پانی پینے کے ارادے سے کمرے سے نکلی۔ تو کال بیل چیخ پڑی۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ بیل پر ہاتھ رکھ کے ہٹانا بھول گیا تھا۔

ڈولتے بے ترتیب قدموں پر گھسٹتی وہ دروازے تک آئی اور پوچھے بغیر وا کر دیا۔

"مرتضیٰ!"

بکھرے بال سرخ چہرے، سوجی آنکھوں میں بغیر دوپٹے کے وہ حال سے بے حال کھڑی تھی۔

"آپ!" دیواریں، دروازے چاروں سمت گھوم گئے۔

اس نے ہوا میں ہاتھ لہرا کے سہارا ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ آنے والے نے ایک قدم آگے بڑھا کے تھام لیا۔ سر جھٹکتی سنبھلنے کی ناکام کوشش کرتی وہ شدید نقاہت کا شکار ہو کے مرتضیٰ کا بازو پکڑے وہیں بیٹھتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"تابی! تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں کیوں کیا ہوا؟" تابندہ کو اس کا لہجہ غیر معمولی لگا۔

"پانچ منٹ میں ریڈی ہو جاؤ میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔" وہ حد درجے سنجیدہ تھا۔

"خیریت تو ہے۔ تم ہو کہاں۔ آفس میں نہیں ہو کیا۔"

"میں غانیہ کے فلیٹ پہ ہوں۔"

"واٹ۔" تابندہ کو کرنٹ لگا وہ تیزی سے ایک دم کھڑی ہو گئی۔

مرتضیٰ نے فون بند کر دیا۔ وہ اس وقت تفصیل بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

بیڈ روم سے تکیہ لا کے اس کے سر کے نیچے رکھا۔ دوپٹہ اس کے اوپر ڈالا۔ اور دروازہ باہر سے بند کر کے تیزی سے سیڑھیاں اترتا گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔

"اس کی سیلری تھی میرے پاس۔ میں نے سوچا خود جا کے دے آتا ہوں۔ یا اسے کال کر لیتا ہوں۔ اینولپ لے کر میں وہاں گیا تو پتا چلا آج آفس نہیں آئیں۔ میں سیل ٹرائی کرتا رہا۔ صبح سے یہ ٹائم ہو گیا۔ کوئی اٹھا بھی نہیں رہا فون بزی بھی نہیں ہے۔ آف بھی نہیں ہے۔ میں نے سوچا پتا نہیں کیا بات ہے۔ جا کے پتا کروں۔"

وہ تابندہ کو اس کے فلیٹ پر لے جاتے ہوئے راستے میں بتاتا رہا۔ تابندہ اس کی لاپرائی پر کڑھتی برابر میں بسنے والے رشتے داروں کو برا بھلا کہتی رہی۔

"برابر والے گھر میں نہیں تھے۔ تالا لگا ہوا تھا۔" مرتضیٰ نے اسے بتایا۔

تابندہ اس کی حالت دیکھ کر سر پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔ دہلیز سے ذرا آگے اس کا بے سدھ وجود شدید بخار میں تپ رہا تھا۔

"غانیہ! غانیہ اٹھو یہاں سے۔" اس نے اس کے رخسار تھپتھپا کر، نیم غنودگی میں اسے وہاں سے اٹھایا اور سنبھال کے بیڈ پہ لائی۔ مرتضیٰ ڈاکٹر کو لے کر آیا۔ اس نے دوائیں، انجکشن اور چند ضروری ہدایات دیں۔ وہ ڈاکٹر کے جانے تک وہاں رکا۔ پھر تابندہ کو اس کا بہت خیال رکھنے کی تاکید کے ساتھ واپس چلا گیا۔

اسے زیادہ دیر وہاں رکنا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ گھر پر بچے بھی منتظر تھے۔

☼ ☼ ☼

"مرتضیٰ!" بے یقینی میں ڈوبی، کمزور نقاہت بھری

آواز دن بھر اس کا پیچھا کرتی۔ اسے تنگ کرتی۔ اور من مندر میں اس کی یاد کی گھنٹیاں بج اٹھتیں۔

ان لبوں سے اپنا نام سننے کی خواہش تو تھی لیکن اس طرح نہیں اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی وہ اس کے گھر جائے گا اور وہ یوں دروازے پر بیماری کے ہاتھوں بکھری بے حال' چکراتی ملے گی۔

اپنے بازو پر اس کے ہاتھ کا لمس وہ ابھی بھی محسوس کرتا تھا۔ اور کئی بار دوسرا ہاتھ پھیر کے دیکھ چکا تھا۔ تابندہ اسے اس کے ماضی کے بارے میں کافی کچھ بتا چکی تھی۔ اسے غانیہ سے محبت تو تھی۔ پر یہ جذبہ' محبت و انسیت میں کب بدل گئی اسے پتا ہی نہیں چلا۔

وہ جانتا تھا۔ وہ اس سے شادی کرنے سے انکار کر چکی ہے مگر اسے یقین تھا اس کا یہ انتظار' انتظار لاحاصل نہیں رہے گا۔ وہ ایک نہ ایک دن اپنے جذبوں کو اس سے منوا ہی لے گا۔

اب انتظار تھا تو بس اس دن کا' جب وہ اپنے ماضی کی تلخیوں سے پیچھا چھڑا کے اس کا ہاتھ تھام لے گی۔ اور وہ جانتا تھا۔

ماضی کو بھول کر مستقبل کی طرف قدم بڑھانا اتنا بھی آسان نہیں' خاص طور پر جب ماضی سے جڑی یادیں خوبصورت بھی ہوں اور کڑوی بھی۔

کسی کا سراپا چھم سے نگاہوں میں اتر آیا۔ اور ایک نم مسکراہٹ لبوں پہ بکھر گئی۔ ساتھ ہی آس پاس وہی مانوس خوشبو۔

تیری یادیں کسی مفلس کی پونجی ہیں
جنہیں ہم پاس رکھتے ہیں
جنہیں محفوظ رکھتے ہیں
جنہیں سب سے چھپاتے ہیں
جنہیں ہم روز گنتے ہیں

☼ ☼ ☼

تیسرے دن صبح اس کی حالت کافی بہتر تھی۔ تابندہ رات میں اس کے پاس رکی۔ مرتضیٰ نے اس کے گھر پہ انفارم کر دیا تھا۔

"کیا ہوا تھا۔ پرسوں رات میں۔" تابندہ کے سوالات کے جواب دینا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اور اسے بہلانا بھی آسان نہ تھا۔

ضبط کے وعدے' آنسوؤں کے بند اور برداشت کے ارادے سب بھربھری ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔ وہ تابندہ کے سامنے پرت پرت دل کے اوراق پڑھتی چلی گئی۔

بچپن سے سنبھال کر رکھا گیا ایک وعدہ
راتوں کی نیندیں حرام کر کے سینچا گیا ایک خواب
اور کبھی نہ ملنے کے یقین کے باوجود' عذاب' تنہائی میں خوش خیال منظر سجاتی تعبیر۔

وقار کی باتیں' اس کے انداز' اس کی ازدواجی زندگی میں گھلنے والی تلخیوں کی وجوہات اور ابھی تازہ بہ تازہ ملنے والی خوش خبری اور وقار کے بدلتے تیور۔

تابندہ تحمل کے ساتھ سب سنتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ تھک کے چپ ہو گئی۔ تابندہ صرف اس کا ہاتھ تھپتھپا کے رہ گئی۔ ساری بات سننے کے بعد اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ اور اس کے خیال میں ضرورت بھی نہیں تھی۔ غانیہ کو عقل آ رہی تھی' یہی بہت تھا وہ مزید کچھ اور کہہ کر اس کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اس کے خیال میں سب سے بہترین سبق وہ ہوتا ہے جو ہم خود چوٹ کھا کے حاصل کرتے ہیں۔ کتابوں اور مشاہدوں سے انسان سیکھتا ضرور ہے۔ لیکن جو بات خود تکلیف سہہ کر سمجھ میں آتی ہے۔ وہ کوئی دوسرا نہیں سمجھا سکتا اور شاید انسان سمجھنا چاہتا بھی نہیں۔ تلخ حقیقت سے فرار کا ایک راستہ' خود فریبی کے پرستان سے بھی جا کے ملتا ہے۔ انسان ساری زندگی محض' چند خوش گمان خواب بن کے بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن یہ زندگی گزارنے کا طریقہ نہیں۔ زندگی بھگتانے کا انداز ہے۔

اور زندگی بہر حال اتنی گئی گزری نہیں کہ اس بیش بہا نعمت کو یوں ضائع کیا جائے۔

چار دن کی چھٹی کے بعد تابندہ نے آفس میں قدم رکھا تو تقریباً" ہر کولیگ اس کی اور غانیہ کی خیریت معلوم کرنے آتا رہا۔ بعض کے نزدیک ان دونوں کا ساتھ بیمار پڑنا بھی گہری دوستی کی نشانی تھا۔ وہ ہنستی رہی۔ اتنی محبتوں پر سب کی شکر گزار بھی ہوتی رہی اور ممنون بھی۔

لنچ ٹائم میں ہمیشہ کی طرح مرتضیٰ کے ساتھ بیٹھ کر اس نے لنچ کیا۔ مرتضیٰ اس کی شکل دیکھتا رہا۔ وہ اس پر پھبتیاں کستی رہی۔ اور آخر میں یہ خوش خبری سنائی اٹھ گئی۔

"انتظار کی گھڑیاں اختتام پذیر ہونے کو ہیں۔ غانیہ کل سے آفس آنے لگے گی اور تمہیں بہت جلد اپنے پرپوزل کا مثبت جواب مل جائے گا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" مرتضیٰ کے دل سے دعا نکلی تھی۔

☼ ☼ ☼

ریپنگ پیپر میں لپٹا گفٹ ابھی تک جوں کا توں پڑا تھا۔ اسے کل سے آفس جوائن کرنا تھا اور وہ صبح کی تیاری کر رہی تھی جب اس کی نظر پڑی۔

گرما گرم چائے کا مگ لے کر وہ اسے کھولنے بیٹھی ہی تھی۔ جب کال بیل پر اٹھنا پڑا۔

"اس وقت کون آسکتا ہے؟" مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ دروازے پر وقار کھڑا تھا۔ وہ وہیں تھم گئی۔

نظریں اس کے بے حال حلیے پر جمی تھیں اور لبوں نے بے آواز اس کا نام پکارا تھا۔ بڑھی ہوئی شیو' مسلا ہوا لباس' بے ترتیب بکھرے بال۔

اس نے خاموشی سے ایک طرف ہو کے راستہ دیا اور معمول کی طرح چلتا ہوا اندر آگیا۔ وہ کمرے میں گئی اور بنا کچھ کہے اپنا چائے کا کپ لا کے میکانکی انداز میں اس کی طرف بڑھا دیا۔

"بہت دل چاہ رہا تھا۔ بہت طلب ہو رہی تھی چائے کی۔" اس کے خشک لبوں پر پھیکی مسکراہٹ آئی اور چلی گئی۔

"میں تو آپ کی ہر ضرورت بنا کہے ہی جان لیتی ہوں۔" الفاظ ٹوٹ کر اس کے لبوں سے نکلے۔

"تو پھر! اب بھی جان لو نا۔" وہ مگ رکھ کے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ تھام لیے۔

وہ زخمی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ان خوبصورت آنکھوں کے سامنے زندگی کے بہت سے دور گزرے تھے۔

کبھی وہ ان آنکھوں میں جھانک تک نہیں سکتی تھی۔

کبھی ان میں ایک نظر دیکھ کر' پلکیں جھکا لیتی۔

پھر ایک وقت ایسا آیا جب' ان سے نظریں چرانی پڑیں۔

اور آج وہ ان آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔

بنا پلکیں جھپکائے۔ بغیر کسی ڈر خوف' شرم کے۔

آج اسے یہ آنکھیں بالکل معمولی سی دکھ رہی تھیں۔ جو کبھی زمانے بھر سے زیادہ اہم تھیں اس کے لیے کیونکہ اب اس کی اپنی آنکھوں میں ان کے لیے کوئی خواب نہیں رہا تھا' کوئی خواہش نہیں تھی' کوئی تشنگی' کوئی رنگ' کوئی ماضی کی میٹھی یاد' کچھ بھی تو نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں خالی تھیں۔

اور جب وہ بولی تو لہجہ اس سے بھی زیادہ خالی اور سپاٹ تھا۔

"میں نے آپ کو معاف کیا۔"

"غانیہ!" وقار کے دل میں دور تک اس کے خالی لہجے کا سناٹا بولنے لگا۔

"اب آپ یہاں سے جاسکتے ہیں۔" اس کی آنکھوں میں ذرا کی ذرا نمی چمکی اور اس نے رخ پھیر لیا۔

"ایک۔ ایک کام کر دو میرا۔ آخری"

اس نے جواب نہیں دیا۔ رخ پھیرے کھڑی رہی۔ لیکن وقار کو اس سے انکار سننے کی عادت تھی ہی نہیں۔

"نازش ناراض ہو گئی ہے۔ وہ گھر آنے کو تیار نہیں۔ اس کے دل میں میرے لیے بہت سے شکوک

بھر گئے ہیں۔ تم ہم اسے منالو۔"

"میں؟" وہ حیرت سے پلٹی۔

"میں کیسے منا سکتی ہوں اسے۔ وہ تو میری شکل بھی دیکھنے کی روا دار نہیں ہوگی۔"

"کچھ بھی کرکے غانیہ! پلیز۔۔۔ وہ بہت سنگدل ہے۔ خدا نے اتنے عرصے بعد میری دعائیں سنی ہیں۔ اس کا کچھ بھروسہ نہیں۔ وہ مجھے اس خوشی سے محروم بھی کر سکتی ہے۔" وقار کا لہجہ بہت عاجزانہ تھا۔

"کوئی ماں اتنی سنگدل نہیں ہوتی کہ اپنے ہاتھوں سے اپنی کوکھ اجاڑ دے۔" اس نے سوچا ضرور مگر کہا تو صرف اتنا کہ "میں کوشش کروں گی۔"

"میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔" جاتے جاتے وہ رک کر بولا پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔

"گویا باقی سب بھلا دیا تم نے۔ افسوس، بہت جلدی کی۔"

وہ کتنی دیر اس کے پیچھے، خالی دروازے اور ہلتے ہوئے پردے دیکھتی افسردگی سے سوچتی رہی۔

"زندگی کی راہ گزر پر چمکتے تمہارے قدموں کے نشانوں پر قدم جما کے چلنا، کبھی منزل تک پہنچنے کا یقین دلاتا تھا۔ تمہیں پتا تھا۔ میں آرہی ہوں تمہارے پیچھے تمہارے نقش پا دیکھتی، اپنے کھو جانے کا ڈر کہیں بہت پیچھے چھوڑ کر، پر تم نے کیا کیا۔ تم خود تو آگے چلے ہی گئے لیکن اپنے پیچھے اپنے نشان بھی مٹا ڈالے۔ اب باقی کا سفر میں کس سہارے طے کروں گی۔ کوئی زاد راہ نہیں، کوئی سنگ میل نہیں اور تمہیں کوئی فکر بھی نہیں۔ تمہارے پاس منزل بھی ہے اور ہم سفر بھی۔ گویا ایک باب زندگی تمام ہوا۔"

گہری سانس بھر کے اس نے گفٹ پیک پر سے ریپر اتارا۔ اندر دو گفٹ تھے اور دونوں ہی بزبان خود دینے والے کا تعارف تھے۔

ایک خوبصورت بریسلیٹ جو یقیناً" تابندہ کی طرف سے تھا۔

اور دوسرا۔۔۔ گلابی رنگ کی کانچ کی بوتل اور مخصوص خوشبو۔ "پلی کینس۔ (پاکیزگی)۔"

لبوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ ہی کسی کا خیال پوری شدت سے ذہن و دل پر حاوی ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

فراز اب کوئی سودا کوئی جنوں بھی نہیں
مگر قرار سے دن کٹ رہے ہوں یوں بھی نہیں
لب و ذہن بھی ملا گفتگو کا فن بھی ملا
مگر جو دل پہ گزرتی ہے کہہ سکوں بھی نہیں
میری زبان کی لکنت سے بدگمان نہ ہو
جو تو کہے تو تجھے عمر بھر ملوں بھی نہیں

وہ کافی دیر سے ٹیبل کی چکنی سطح پر سر جھکائے نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ بہت ہمت کرکے یہاں تک آتو گئی تھی لیکن بات کرنے کا حوصلہ کہاں سے لاتی۔

مرتضیٰ بہت صبر سے اس کے بولنے کا انتظار کرتا، چھوٹے چھوٹے کام نبٹاتا، فون کالز اٹینڈ کرتا رہا۔

وہ سمجھ رہا تھا۔ سمجھتا تھا۔ اسے اپنی کہنے میں مشکل پیش آرہی ہے۔ لیکن اتنی دیر سے وہ جس ہمت کو مجتمع کرنے کی کوشش میں تھی۔ وہ اس کوشش میں دخل اندازی کرکے اسے ناکام نہیں بنانا چاہتا تھا۔ اس نے گلا کھنکھار کے سر اٹھایا۔

"وہ۔" وہ ایک بار پھر رکی۔

"وہ اس دن جب آپ گھر آئے تھے تو۔" اس نے تھوک نگلا۔ مرتضیٰ اسے دیکھتا رہا۔ اسے دیکھنا اچھا لگتا تھا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور۔۔۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ہم اس کے علاوہ کوئی اور بات کریں۔" اس نے نرمی سے اسے اس دن کی شرمندگی سے نکالا۔

وہ خود بھی ڈسکس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے ایک گہرا سانس لے کر خود کو کسی نادیدہ بوجھ سے نکالا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کافی منگواؤں۔ آج تو پی لیں گی نا۔" اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے پھر سر ہلا دیا۔ مرتضیٰ نے بے اختیار ایک گہری سانس بھری۔

"شادی کریں گی مجھ سے۔" اس نے جس قدر روانی سے پوچھا تھا۔ وہ اسی روانی سے سر ہلاتی گئی۔ پھر ایک نظر اسے دیکھا۔

"جی۔" مرتضیٰ کی بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔

"سر ہل رہا تھا آپ کا۔ آج کسی بات پر نا نہیں ہوئی۔" اس نے کہتے ہوئے سر کو دائیں بائیں گھمایا۔

"میں نے سوچا موقع اچھا ہے۔ یہ بھی پوچھ لوں۔ جو اب مل گیا ہے۔ اب مکر مت جائیے گا۔"

وہ مزے سے بول رہا تھا۔ غانیہ کو بھی دھیرے سے ہنسی آگئی۔

اس کی بہت سی باتیں ماہم سے بہت ملتی تھیں۔ آغاز سفر میں ہی بچھڑ جانے والی من پسند رفیقہ حیات، ہمدم اور آج پتا چلا اس کی ہنسی بھی بالکل ماہم جیسی تھی۔ مدھم، نرم پھوار جیسی۔ مرتضیٰ ایک جذب کے عالم میں اسے دیکھے گیا۔

غانیہ کی نظر پڑی تو ایک دم جھینپ گئی۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔

"اب اپنی بات سے پھرو گی تو نہیں۔" اس نے دھیمی آواز میں اسے چھیڑا۔ انداز تخاطب میں استحقاق در آیا تھا۔

غانیہ نے بہت دھیرے سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

☼ ☼ ☼

اپنے قدموں پر ایک آخری نگاہ ڈال کے اس نے چند جملوں کو دل میں دہرایا اور کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ دروازہ کھولنے والی بسمہ تھی۔

"غانیہ تم۔" وہ بے حد محبت سے گلے ملی۔ اسے حیرت تھی کہ بسمہ اسے دیکھ کر اتنی خوش کیسے ہے۔

"کیا بتاؤں یہاں آکے بیٹھ گئی ہے۔ وقار بھائی معافیاں مانگ مانگ کے تھک چکے ہیں۔ اچھا ہوا۔ تم آگئیں۔ تم ہی بتاؤ کیا ہوا تھا اس دن۔"

اس کی گرم جوشی کی وجہ اچھی طرح سمجھ میں آگئی تھی اس نے گہری سانس لے کر پرس میں سے کارڈ نکالا۔

"اگلے مہینے کی بیس کو میرا نکاح ہے۔ تم ضرور آنا۔ تم سب لوگ۔" اس نے بسمہ کے حق دق چہرے کو دیکھا۔

نازش اور اس کی والدہ' بسمہ کی ساس گھر پر نہیں تھیں۔

"غانیہ۔" بسمہ کی کیفیت نے پہلی بار غانیہ کو محظوظ کیا۔ "تم نے اتنا بڑا فیصلہ اتنے اچانک۔ اکیلے کیسے کرلیا۔" اس کے لبوں پر بے ربط جملے اٹکے تھے۔

"میں نے اکیلے نہیں۔ ہم دونوں نے مل کر کیا ہے۔ میں اور میرے ہونے والے شوہر مرتضیٰ نے۔"

اس کے لہجے میں نہایت درجہ اطمینان اور کمال احساس تحفظ ابھرا تھا

"کیا کہہ رہی ہو تم۔ یہ سب اکیلے کیسے کرسکتی ہو۔ کوئی سرپرست نہیں رہا تمہارا۔ کوئی پوچھنے والا۔ میں' تمہاری بہن تو زندہ تھی۔ مجھے ہی پوچھ لیتیں۔ کم سے کم۔"

"پہلی بات تو یہ کہ میرا واقعی کوئی سرپرست نہیں۔ یہ تم نے ٹھیک کہا۔ اماں بی کے جانے کے بعد اپنی زندگی کے تمام تر فیصلے میں نے اکیلے کیے ہیں اور دوسری بات یہ کہ اب جب میں نے اپنی تنہا زندگی سے گھبرا کر ایک سہارا ڈھونڈ لیا ہے۔ تو تمہیں خیال آیا ہے کہ میں تنہا نہیں تھی۔ اور کوئی کیا پوچھے گا مجھ سے۔ شادی اور زندگی کی خوشی حاصل کرنا میرا حق ہے اور میں اپنا حق استعمال کررہی ہوں۔ چوری کررہی ہوں نہ ڈاکہ ڈال رہی ہوں۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ اگر تم واقعی میری بہن ہی تھیں تو تم نے میری تنہائی دور کرنے کی کبھی کوشش کیوں نہیں کی۔ فکر کیوں نہیں کی۔ اتنی بڑی بات تو دور۔ تم تو کبھی اپنے بھائی کے گھر سے اٹھ کے' میرے ویران گھر کے سناٹے کو ایک نظر دیکھنے بھی نہیں آئیں ۔ بسمہ! تمہاری شکایت بہت بے محل ہے اور بے تکی بھی۔"

اس کا لہجہ ٹھنڈا تھا۔ لیکن الفاظ بہت گرم۔ بسمہ کو اچانک ہی اندازہ ہوا کہ وہ کئی سال پہلے والی ڈرپوک غانیہ نہیں ہے۔ جو ان کے بے بنیاد الزامات کے جواب میں اپنی صفائی تک پیش کرنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔ جو دیوار میں ایک کونے سے لگی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ یہ غانیہ تو کوئی اور ہی تھی۔

نفیس لباس' پروقار اور مضبوط لہجہ بسمہ کو بہت اچھی طرح اس کی بدلی ہوئی حیثیت کا ادراک ہوا۔

"اور تیسری اور سب سے اہم بات یہ کہ جیسے تمہیں میری بات سن کر غصہ آیا۔ خیر۔۔۔" اس نے کندھے اچکائے اور کھڑے ہوکے بسمہ کو دیکھا۔

"اپنا پن ہے تم لوگوں کا۔ تم نے بھی جتایا اور تمہارے بھائی نے بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تم اس اپنے پن کی حقیقت اور اپنے دعوے کے کھوکھلے پن سے واقف ہو۔ لیکن تمہارے بھائی کا انداز بہت بھونڈا تھا۔ جو صرف نازش کو ہی نہیں' مجھے بھی بہت ناگوار گزرا تھا۔ نازش اسی لیے ان سے ناراض ہوگئی ہے۔"

بات مکمل کرکے اس نے سامنے میز پر رکھا شربت کا گلاس لبوں سے لگا کر ایک سانس میں خالی کردیا۔

اسے کسی کو یوں بے رحمی سے آئینہ دکھانے کی عادت نہیں تھی۔ بسمہ جو احساس ذلت اور شرمندگی محسوس کررہی تھی۔ وہ اس مقام سے بارہا گزری تھی۔ اس لیے اس کی کیفیت محسوس کرسکتی تھی۔

خشک حلق کو تر کرکے اس نے گلاس واپس رکھا۔ اور بسمہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"آنا ضرور۔ میں انتظار کروں گی۔ میری بہن ہونا۔" بسمہ کی نظریں جھک گئیں۔ پھر بھی اس نے ان میں نمی کی جھلک دیکھ لی تھی۔

وہ دل پر ایک نادیدہ بوجھ لیے باہر نکل گئی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے سامنے سے وقار کو آتے دیکھا۔

"کیسی ہو غانیہ۔" اس کے لبوں پر بے جان مسکراہٹ تھی۔ چہرہ بے رونق تھا۔

"ٹھیک ٹھاک۔ الحمدللہ بہت خوش۔" اس نے رک کر چند لمحے اپنے ناخن دیکھے پھر سر اٹھا کے بولی۔

"آپ کا گھر ٹوٹنے سے بچانے کی پہلی اور آخری کوشش کی ہے۔ اللہ اسے کامیاب کرے۔ امید ہے۔ احسان مندی کی جذبات سے لبریز ہوکر آپ آئندہ میرے سامنے آنے سے گریز کریں گے۔ اللہ حافظ۔" وہ بات مکمل کرکے رکی نہ ہی پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ فائدہ بھی کیا تھا۔

اسے گھر جانے کی جلدی تھی۔ باہر گاڑی میں مرتضیٰ اس کا منتظر تھا۔ ابھی اسے اپنے فلیٹ پر جاکے سامان سمیٹ کے تابندہ کے گھر شفٹ ہونا تھا۔ رخصتی کی رسم وہیں سے ہونا قرار پائی تھی۔ یہ تابندہ کی والدہ کا محبت بھرا اصرار تھا۔

وہ انکار کی تاب نہیں رکھتی تھی۔ تابندہ نے اسے خوشیوں کا جو نیا راستہ دکھایا تھا اور مرتضیٰ نے جس طرح سہارے کے لیے اپنا ساتھ' اور اعتبار دیا تھا۔ وہ جتنا بھی شکر ادا کرتی کم تھا۔ خدا نے اسے اندھیروں میں بھٹکنے سے بروقت بچالیا تھا۔

اس نے تیزی سے سیڑھیاں اترتے باقی رہ جانے والے کاموں کو ذہن میں دہراتے ہوئے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں اس کے قدموں کی رفتار سے کہیں زیادہ تیزی سے نم ہورہی ہیں۔ دل ہی دل میں کہیں نامعلوم سا درد ــــــ کروٹیں لے رہا ہے۔

"کیا رشتہ تھا میرا اس کے ساتھ۔ جو مرا نہیں۔ شاید اب بھی زندہ ہے۔۔۔ کیا محبت؟؟"

"یااللہ!" گاڑی تک پہنچتے پہنچتے وہ ہانپ گئی۔ اس نے ہونٹ تھام کر دو تین لمبے لمبے سانس لیے اور تیزی سے پلکیں جھپکیں۔

"کیا ہوا غانیہ! خیریت ہے۔ تم ٹھیک ہو؟" مرتضیٰ پریشان ہوکے باہر نکلا۔

اس کی آواز نے اسے ہوش دلایا۔ وہ دھیان کی کن بھول بھلیوں میں جا نکلی تھی۔

"کچھ نہیں۔" وہ اسے دیکھ کر بدقت مسکرائی۔

"میں کھونے لگی تھی۔ راستہ بھٹک رہی تھی۔ اچھا ہوا آپ مل گئے۔"

ایک خواب کے عالم میں بڑبڑائی وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی۔

خواب کی مسافت سے
وصل کی تمازت سے
کیا ملا محبت سے
ایک ہجر کا صحرا
ایک شام یادوں کی
اک تھکا ہوا آنسو

اور اس نے وہ ایک آنسو بہت چپکے سے دل میں سنبھال لیا۔

مرتضیٰ ناسمجھی سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے لگا غانیہ کو اس کی ضرورت ہے۔ اس نے اس کے کانپتے ہاتھوں پر اپنا گرم ہاتھ رکھا۔ پرحدت' پرجوش۔

اس نے چونک کر مرتضیٰ کو دیکھا' پھر طمانیت سے مسکرادی۔ دل کے بہت ہی اندرونی گوشے کو چھوڑ کر سب جگہ اطمینان اور سرخوشی لہرا رہی تھی۔ گاڑی میں وہی معطر' مخصوص خوشبو بھرنے لگی تھی۔

اپنائیت کی مسیحائی کی خوشبو

☆ ☆

ناولٹ

مہ وش گل

بھول

"یار اسعدی اب مان بھی جا۔۔۔ اتنی منتیں اگر میں واپڈا والوں کی کروں تو وہ لوڈشیڈنگ کرنا ختم کر دیں۔" مدثر نے جھنجلاتے ہوئے اسعدی کے ہاتھ سے بک لیتے ہوئے کہا وہ لوگ اس وقت یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں بیٹھے تھے اور پچھلے آدھے گھنٹے سے مدثر' ضیا اسعدی سے اصرار کر رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ گرلز کمپس میں جائے کیونکہ وہاں کے ایک لیکچرار اسعد کے والد کے دوست تھے اور وہ کبھی کبھار ان سے ملنے چلا جاتا تھا۔

آج مدثر کا وہاں جانے کو اس لیے بھی دل مچل رہا تھا کیونکہ آج وہاں کی ایک سینئر ٹیچر کی برتھ ڈے پارٹی لڑکیوں نے ارینج کی تھی اور صبح سے ہی وہاں سے میوزک اور ہلے گلے کی کافی آوازیں آ رہی تھیں اور سدا کا حسن پرست اور دل پھینک مدثر کا دل بھی آج قدرت کی رعنائیوں اور ہوشربا حسن کو سامنے دیکھ کر داد تحسین دینے کو چاہ رہا تھا۔ لیکن جس بہانے سے وہ وہاں جا سکتا تھا ضیا اسعدی پروں پہ پانی نہیں پڑنے دے رہا تھا۔

"دیکھ مدثر اگر روٹین کا دن ہوتا تو میں تمہیں ساتھ لے کر وہاں جا نکلتا لیکن آج جو ہلا گلا اور انجوائے منٹ وہاں ہو رہی ہے میں منہ اٹھا کر وہاں نہیں جا سکتا۔ اس لیے میری منتیں کرنے کے بجائے کوئی اور راہ نکالو۔" ضیا اسعدی نے مدثر کو صاف ہری جھنڈی دکھاتے ہوئے کہا۔

"ہونہہ۔۔۔ اب تو میں تجھے اکیلا وہاں جا کر دکھاؤں گا بیٹا جی۔۔۔" مدثر نے چیلنجنگ انداز میں منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور کرسی پیچھے دھکیل کر غصے سے کیفے ٹیریا سے نکل گیا۔

"جا بچے۔۔۔ تجھے پتا ہی نہیں آج صبح نوٹس بورڈ پر اسپیشل وارننگ تھی کہ کوئی لڑکا گرلز کالج کے قریب نظر نہ آئے بصورت دیگر بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔" ضیا اسعدی نے مسکراتے ہوئے کہا اور بک دوبارہ کھول لی تھی۔

"اف اللہ انیلا جتنی تیاری تم نے میم حمیرا کی برتھ ڈے پر آنے کے لیے کی ہے اگر اس کا دس فیصد بھی ان کے مضمون کو وقت دے دو تو تمہیں پیپرز میں دوسروں سے مدد کی ضرورت نہ پڑے۔" بریرہ نے انیلا کو زرق برق کپڑے اور میچنگ جیولری اور تیز میک اپ کیے ہوئے دیکھ کر تنقیدی لہجے میں کہا۔ جسے انیلا نے ہمیشہ کی طرح در خور اعتناء نہیں جانا تھا۔

"یار کتنی فضول بات کی تم نے۔۔۔ یہ تیاری تو ایک دن کے لیے کرنی تھی سو دل لگا کر تیار ہوئی اور مضمون پر توجہ تو روزانہ کا کام ہے اور میں وقت سے پہلے اپنے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں ڈالتی۔ یونو کہ دماغ پر بوجھ ہو تو اس کا اثر ڈائریکٹ دل پر ہوتا ہے اور میرا دل تو پہلے ہی کمزور سا ہے۔" انیلا کے لہجے اور آنکھوں سے شرارت ٹپک رہی تھی۔

"ویسے تم ذہن پر بوجھ تو نہیں ڈالتیں لیکن ایک مزے کی بات بتاؤں تمہیں کہ ابھی تمہارے آنے سے چند منٹ پہلے ایک اناؤنس منٹ ہوئی ہے۔"

بریرہ نے پر تجسس لہجہ بناتے ہوئے کہا۔

"اناؤنس منٹ..... کیسی اناؤنس منٹ۔"

"صبح مجھے سیماب سے بھی اس کا پتا چلا تھا لیکن میں مذاق سمجھ رہی تھی لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے میم اسماء نے آکر وارننگ بھرے انداز میں تمام گرلز سے کہا تو مجھے یقین ہو گیا کہ خبر واقعی ہی سچی تھی۔" بریرہ انیلا کے تجسس کو مزید ہوا دے رہی تھی۔

"اب آگے بکو..... میم اسماء نے کہا کیا ہے؟" انیلا نے جب دیکھا کہ بریرہ اصل بات کی طرف نہیں آ رہی تو جھنجلا گئی۔

"او..... ہو اتنی جلدی کیا ہے۔ بس ایک تنبیہہ کی گئی ہے کہ چونکہ گرلز اور بوائز کا گراؤنڈ مشترکہ ہے اور کیمپس بھی کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں ہیں اس لیے لڑکیاں جو اتنے ہتھیاروں سے لیس ہو کر آئی ہوئی ہیں اپنے کیمپس تک ہی محدود رہیں اور گراؤنڈ میں چہل قدمی آج منسوخ کر دیں ورنہ میم رخشندہ کے عتاب کی مستحق قرار پائی جائیں گی۔" بریرہ نے آخر کار تمام تفصیل سے انیلا کو آگاہ کر دیا تھا جس کا منہ ایسا بنا تھا بس کڑوے کریلے منہ میں ڈال لیے ہوں۔

"دفع دور..... تو کیا ہم نے اتنی تیاریاں ان دادی نانیوں کی عمر کی لیکچرارز کو یا پھر مالی بابا کو دکھانے کے لیے کی تھیں..... " انیلا نے شاک کی کیفیت سے نکلتے ہی غصیلے لہجے میں کہا۔

"مائنڈ اٹ ڈیئر..... ہم نہیں تم یا تمہارے قبیلے کی دوسری لڑکیاں' ویسے مالی بابا بھی اپنے نام کی طرح ہر ایک پر فدا ہو جاتا ہے....." بریرہ نے ہنستے ہوئے مالی بابا کا نام فدا خان کو ٹارگٹ کیا۔

"ویسے بھی دل ہونڈا چائی دا جوان عمراں چے کی رکھاے اے (دل جوان ہونا چاہیے عمروں میں کیا رکھا ہے۔) اور وہ کیا مشہور گانا ہے نا..... جو مالی بابا گا رہے ہوتے ہیں۔"

"ابھی تو میں جوان ہوں..... ابھی تو میں جوان ہوں۔" بریرہ انیلا کے — منہ کو دیکھ کر مزید دل جلانے والی باتیں کر رہی تھیں کہ ماریہ وغیرہ کلاس روم میں داخل ہوئیں۔

"ہائے گرلز....." ماریہ نے اپنے شولڈر کٹ بالوں کو ادا سے جھٹکتے ہوئے کہا۔

"واقعی آج تم گرلز کے منہ سے ہائے ہائے ہی نکل رہی ہے۔" بریرہ نے ماریہ کے ہائے کے جواب میں پنجابی لہجے میں ہائے بول کر کہا۔

"تمہاری بہت ہنسی نکل رہی ہے مولانی صاحبہ....." انیلا نے مسلسل بریرہ کو ہنستے اور بولتے دیکھ کر دانت پیس کر کہا۔

"ہوا کیا ہے..... آخر ہمیں بھی تو پتا چلے؟" نادیہ کے گروپ کی ایک اور تیز طرار لڑکی رینا نے حیرت سے انیلا اور بریرہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہونا کیا تھا اور ہو گیا گیا ساری بات ہی یہی ہے۔"

بریرہ آج واقعی ہی فل فارم میں تھی۔

"لگتا ہے آج بریرہ بہت خوش ہے ویسے خوش ہونا بھی بنتا ہے کیونکہ آخر اس کی پسندیدہ ٹیچر اپنی پچاسویں سالگرہ منا رہی ہیں۔" ماریہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اللہ کا نام لو ماریہ..... مس حمیرا شکل سے 25 سال سے بھی کم کی لگتی ہیں۔" انیلا نے صاف گوئی سے کہا۔

"شکل سے نا' عمر سے تو نہیں....." ماریہ نے لقمہ دیا تھا اور اس کے گروپ کا مشترکہ قہقہہ گونجا تھا۔

"جو بات میں تمہیں بتانے لگی ہوں۔ دیکھنا وہ سنتے ہی کیسے منہ پر نحوست اوہ۔ میرا مطلب ہے اداس بلبلوں کی طرح بیٹھ جاؤ گی۔" انیلا نے ان کو ہنستے دیکھ کر کہا اور پھر انتہائی غمناک لہجے میں اناؤنس منٹ کے متعلق بتانے لگی۔ جس کو سنتے ہی ماریہ اور اس کی فرینڈز کے منہ ویسے ہی بن گئے جیسے کچھ دیر پہلے انیلا کا اپنا تھا۔ جبکہ بریرہ نے افسوس بھرے انداز میں ان کی طرف دیکھا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

☆ ☆ ☆

"اب بس بھی کر یار مدثر..... پچھلے ایک گھنٹہ سے تمہیں منا رہا ہوں اور تو ہے کہ پھیلتا ہی جا رہا ہے۔" ضیا اسعدی نے جھنجلا کے مدثر کے ہاتھ سے کتاب کھینچی۔ وہ لوگ اس وقت یونیورسٹی کے گراؤنڈ میں بیٹھے تھے اور مدثر جو کل ہر ممکن کوشش کے باوجود گرلز کیمپس میں نہ جا سکا تھا۔ اپنی ناکامی کا اور اتنے بڑے موقع کے ہاتھ سے نکل جانے کا ذمہ دار اسعدی کو سمجھ رہا تھا۔ اس لیے ضیاء اسعدی کی منتوں اور وضاحتوں کو سن کر بھی ان سنی کر رہا تھا۔

"میں نے تجھے کہا ہے منانے کے لیے؟ ارے جا یار ایک دوست کے لیے تم پانچ منٹ نہیں نکال سکے یہ سامنے کیمپس تھا بس جانا اور آنا تھا۔" مدثر نے پہلے غصے اور پھر گرلز کیمپس کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھری۔ یہ اور بات کہ اسعدی نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی تھی وہ ہنسا اس لیے تھا کہ نارمل روٹین میں گرلز بوائز مشترکہ گراؤنڈ استعمال کرتے تھے جب کہ اس وقت.....

"مدثر ایک بات سچ سچ بتاؤ....." اسعدی نے یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا جبکہ مدثر جو حسرت بھری نظروں سے کیمپس کی طرف سے آنے والی گرلز دیکھ رہا تھا۔ یکدم اپنی نگاہیں اسعدی کی طرف استفہامیہ انداز میں کیں وہ اسعدی کی سنجیدگی پر حیران ہوا تھا۔

"تمہارے نزدیک زندگی کا مقصد کیا ہے؟" ضیاء اسعدی نے اس کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے نزدیک زندگی کھیل کود اور انجوائے کرنے کا نام ہے۔ زندگی ایک بار ملتی ہے اسے الجھنوں' گناہ ثواب کے چکر میں الجھ کر برباد نہیں کرنا چاہیے۔" مدثر نے آخر میں آنکھ مارتے ہوئے اسعدی کو جواب دیا۔

"بہت افسوس ہوا مدثر! تمہاری سطحی سوچ کو سن کے۔" ضیاء اسعدی نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے ویسے بھی سطح پر نظر آنے والی چیز کی ہی اہمیت ہوتی ہے۔ جو ڈوب جائے اسے کون دیکھتا ہے۔ اسی طرح سطحی سوچ ہی کامیابی کا پہلا زینہ ہے اور....." مدثر نے مزید بے تکا فلسفہ جھاڑنا چاہا۔ وہ اسعدی کی بات کو مذاق کے پیرائے میں لے رہا تھا۔

"بس بس..... تجھے سمجھانا یا کچھ عقل کی بات کی توقع رکھنا عبث ہے۔" ضیا اسعدی نے خفگی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور بکس اٹھا کر کلاس کی طرف جانے لگا۔

"ارے سن تو یار..... کیا ہر وقت مولانا اسعدی بنا رہتا ہے۔ زندگی کو جینا سیکھو..... اللہ نے یہ رنگ' یہ رعنائیاں ہم جیسوں کے لیے ہی تو بنائی ہیں۔" مدثر نے اسعدی کو یوں ناراض ہو کر جاتے دیکھ کر پیچھے سے ہانک لگائی۔ مگر اسعدی نے پیچھے مڑ کر دیکھنا تھا نہ دیکھا۔

"ہائے ری قسمت۔ مجھے بھی کس پاگل..... اوہ نہیں نہیں..... کس بے وقوف نے مشورہ دیا تھا کہ ایک ہی دوست بنانا ہے اور وہ بھی مولویوں کے خاندان سے۔" مدثر جو بے دھیانی میں تشبیہ دینے لگا تھا ایک دم اپنے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا اور کتابیں اکٹھی

کرنے لگا کہ کلاس میں جائے اسی دوران اس سے چار قدم کے فاصلے پر دو لڑکیاں آپس میں تکرار کرتی ہوئی گرنے کے سے انداز میں گراؤنڈ میں بیٹھیں اور کتابیں جو ان میں سے ایک لڑکی کے ہاتھ میں تھیں۔ زمین پر پٹخی تھیں۔ جس پر اس کے ساتھ والی لڑکی نے اسے غصے سے ڈانٹا مدثر جو بکس اٹھا کر جارہا تھا انجانے خیال کے تحت وہیں بیٹھ گیا۔

"انیلا جو ہمیں شعور دیں ہمیں دنیا میں جینا سکھائیں ہماری راہیں روشن کریں اور سب سے بڑی بات ہماری بہترین ساتھی ہوں۔ انہیں یوں بے دردی کے ساتھ زمین پہ نہیں پٹختے۔ علم کا ادب کرنا چاہیے۔" بریرہ نے پہلے غصے سے اور پھر رسانیت سے انیلا کو سمجھاتے ہوئے کہا جو کہ اپنے ہاتھوں کی کیوٹکس ایسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے کلاس میں ٹیچر نے اسی چیز کے مارکس دینے تھے۔ جبکہ دوسری طرف مدثر نے بے ساختہ قہقہہ لگایا جس پر دونوں نے بے اختیار اس کی طرف حیرانی سے دیکھا۔ جبکہ مدثر یکدم احساس ہونے پر خجل ہو گیا اس کا قہقہہ بے ساختہ اس لیے تھا کہ اسے لگا یہ لڑکی بھی شاید ضیا اسعدی کے خاندان سے ہے جو مخلوط تعلیمی اداروں میں آکر بھی اپنی سوچوں کو آزاد نہیں کرسکتے۔ اب اس کا ارادہ یہاں سے اٹھنے کا نہیں تھا۔ وہ انیلا اور اس لڑکی کی گفتگو سے لطف اندوز ہونے کا فیصلہ کیے بظاہر بک کھول کر بیٹھ گیا مگر دھیان ان لڑکیوں کی طرف ہی تھا۔

"بس کرو بریرہ... یہ تمہیں کیا ہر وقت لیکچر دینے کا بخار چڑھا رہتا ہے۔ کبھی یہ بھی دیکھ لیا کرو۔ اگلا کس حال میں ہے۔ ارے میرے یونیورسٹی کے حوالے سے دیکھنے جانے والے تمام خواب چکنا چور ہو گئے۔ یہ کوئی مخلوط تعلیمی ادارہ ہے۔ نہ بندہ پوچھے اگر ایسی یونیورسٹی بنانی تھی تو درمیان میں دیوار چڑھا دیتے۔ یہ کیا؟ آمنے سامنے رہتے ہوئے بھی کھل کر بات نہ کر سکو۔ انجوائے نہ کرسکو اور باہر بورڈ لگا ہوا ہے۔ یونیورسٹی بوائز اینڈ گرلز اور اندر پاک انڈیا سرحدی نظام چل رہا ہے۔" انیلا نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

وہ مڈل کلاس کی لڑکی تھی جو لڑ جھگڑ کر یونیورسٹی تک صرف تفریح کے لیے آئی تھی۔ مگر یہاں آکر اسے احساس ہوا کہ اس سے تو بہتر کالج تھا جہاں کم از کم ہر حرکت پر نظر تو نہیں ہوتی تھی۔

"انیلا... کچھ خوف خدا کرو۔ یونیورسٹی کا مطلب تم نے یہی سمجھا ہے جہاں آکر لڑکوں سے دوستیاں کی جائیں ماں باپ کی عزت کو سر عام نیلام کیا جائے اور تمہیں پتا ہے تم جیسی لڑکیوں کی ایسی حرکتوں سے کتنی لڑکیوں کے لیے تعلیمی راستے بند ہو جاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں سجے خواب کبھی تعبیر نہیں پاسکتے۔ تم جیسوں کے قصے جب انہی لڑکوں کی زبانی باہر لوگوں تک پہنچتے ہیں تو بہت سے باپ اور بہت سے بھائی اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو ان اداروں تک نہیں آنے دیتے۔" بریرہ نے غصے سے انیلا کو کھری کھری سنا کر اپنی بکس اٹھا کر کلاس کی راہ لی جبکہ انیلا مارے شرمندگی کے کچھ بول نہیں سکی... بدمزا تو مدثر بھی ہوا تھا مگر اس کے شیطانی دماغ میں آنے والے خیال نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔

انیلا باقی کے پیریڈز میں بریرہ کو چاہ کر بھی مخاطب نہیں کرسکی اور اسٹاپ پر بھی اکیلی ہی آگئی تھی اور مدثر جو ضیا اسعدی کے ساتھ یونیورسٹی کے گیٹ سے باہر نکلا۔ انیلا کو اسٹاپ پر اکیلے کھڑا دیکھ کر اسعدی سے انتظار کرنے کا کہہ کر بھاگ کر اس کے پاس آیا۔

"ایکسکیوز می... کیا ہم تھوڑی دیر بات کرسکتے ہیں۔" مدثر نے گلا کھنکھارتے ہوئے انیلا کے پاس جا کر بہت ادب سے کہا تھا۔

انیلا جس کے دماغ میں ابھی تک بریرہ کی باتیں گونج رہی ہیں مردانہ آواز بہت قریب سے سن کر چونک سی گئی۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" اس نے غائب دماغی سے اس کی جانب دیکھا تھا۔

"نہیں تو... یہ جو آپ سے دس قدم دور آنٹی نما لڑکی کھڑی ہے نا... انہیں کہا ہے۔" مدثر نے مسکراتے ہوئے اس سے تھوڑی دور کھڑی لڑکی کے

ہونا ہے پہ چوٹ کی تھی انیلا منہ کھولے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کچھ نہ بولی تو مجبوراً اسے دوبارہ مخاطب کرنا پڑا۔

"دیکھیا ... آپ کے قیمتی لمحات میں سے چند لمحے مستعار لے سکتا ہوں جب تک آپ کی شاہی سواری میرا مطلب ہے پوائنٹ نہیں آجاتا۔" مدثر نے دوبارہ ڈھیٹ پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے درباری انداز میں جھک کر کہا تو انیلا اس کے طرز تخاطب پر بے ساختہ مسکرا اٹھی۔

"مسٹر آپ ہیں کون... یونین کونسل کے ممبر بھی نہیں۔ ہاں بکس اور حلیہ دیکھ کر لگ رہا ہے کہ یونیورسٹی کے چشم و چراغ ہیں مگر آپ کو تو کبھی پہلے نہیں دیکھا پھر بات کرنے کی وجہ؟ جبکہ آپ کو تو کبھی غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی کبھی منظر عام پر نہیں آئے۔" انیلا نے بھی بڑے میٹھے انداز میں مدثر کو ہری جھنڈی دکھائی۔

"اچھا جی... اگر یہ بات ہے تو یونیورسٹی کے باہر تو بات ہو سکتی ہے نا اور بات کے بعد پہچان بھی کیونکہ میں بھی آپ جیسے ہی خواب اور خیالات کے ساتھ اس یونیورسٹی میں آیا تھا مگر گنجے اور خشک مزاج پروفیسوں کو دیکھ دیکھ کر اور سن سن کر دل اوب گیا ہے۔ زندگی میں کچھ رنگینی کچھ تبدیلی کا خواہاں ہوں اور یقین مانیے دوست بھی آپ کی کریلا دوست کی طرح ملا۔ جسے کسی مسجد میں مولوی ہونا چاہیے تھا۔ مگر غلطی سے یونیورسٹی میں آگیا۔"

مدثر نے انتہائی درد بھرے انداز میں اپنی حالت زار کی تصویر کشی کی کہ انیلا کو ہنسی آگئی۔

"ارے واہ... آپ تو ہنستی بھی ہیں اور کیا خوب ہنستی ہیں جیسے کسی خوب صورت وادی میں کوئی جھرنا بہتا ہے تو آواز پیدا ہوتی ہے جو سننے والے کو مسحور کر دیتی ہے اور 'اور...'" مدثر نے ایک دفعہ ہی جال پھینکنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس کی بات سن کر انیلا کے دماغ میں جھماکا ہوا۔ یہ صبح والا لڑکا تھا جو اس کی اور بریرہ کی بحث میں بے ساختہ ہنسا تھا۔

"بس بس..... مسٹر؟"

"مدثر..... خادم کو مدثر کہتے ہیں۔" مدثر نے ایک بار پھر درباری انداز میں جھکتے ہوئے کہا۔

"جی تو مدثر..... آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگا اور واقعی آپ کے اور میرے خیالات بہت ملتے جلتے ہیں مگر یہاں کی انتظامیہ کے خیالات ہم سے بالکل نہیں ملتے۔ سو اب آپ یہاں سے نو دو گیارہ ہو جائیں تو بہتر ہے۔" انیلا نے ہنستے ہوئے کہا وہ بھی اتنی جلدی باتوں میں آنے والی نہیں تھی۔

"بے شک یہ اسٹاپ ہے مگر دیکھنے والے قیامت کی نگاہ رکھتے ہیں۔ پھر میری دوست بریرہ مجھے آتی دکھائی دے رہی ہے آپ سے بات کرتے دیکھ کر ..... مجھ سے واقعی بات کرنی چھوڑ دے گی۔" انیلا نے بریرہ کو آتے دیکھ کر فوراً" مدثر کو وہاں سے ہٹانے کی جلدی کی۔

"او کے..... او کے لیکن میں کل آپ کا یہیں انتظار کروں گا اور مجھے یقین ہے آپ اپنی استانی دوست سے بچ بچا کر مجھ سے چند لمحے بات کر لیں گی۔" مدثر نے کچھ اس انداز میں اس سے کل کی ملاقات کا ٹائم سیٹ کیا کہ انیلا نے فوراً" اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ اور مدثر اس کی طرف دوستانہ مسکراہٹ اچھال کر فوراً" ضیاء اسعدی کی جانب بھاگا جو کہ بکس پکڑے 'ادھر ادھر دیکھتے دیکھتے گاہے گاہے اس پر بھی ایک نظر ڈال رہا تھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ مدثر کیسے اس لڑکی کو جانتا ہے اور پھر لڑکی بھی دو تین جملوں کے بعد اس سے بہت دوستانہ موڈ میں بات کر رہی تھی۔ اس کی نظر میں دونوں کے لیے تاسف ہی تھا۔

وہ مدثر کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ کالج کے دو سال بھی اس نے ان سرگرمیوں میں گزارے تھے۔ وہ مستقل مزاج بندہ نہ تھا۔ ہر خوب صورت چہرے سے اسے محبت ہو جاتی تھی اور یہ محبت چار دن کا خمار ثابت ہوتی۔ پھر اس کی زندگی اور اس کے سیل سے وہ لڑکی اور اس کا نمبر Delete ہوتے چند لمحے ہی لگتے وہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکا تھا۔ مگر وہ کیا کہتے ہیں کہ فطرت کبھی بدلتی نہیں تو مدثر پہلے دن کی طرح اپنی زندگی میں مگن تھا اور ضیاء اسعدی اپنے کام میں بہلا چاہ کر بھی مدثر سے دوستی ختم نہ کر سکا۔ کیونکہ اسے لگتا تھا کہ ایک وقت آئے گا جب مدثر اس کا نقطہ نظر سمجھے گا اور ان حرکتوں سے باز آجائے گا۔

اب بھی انیلا اور اس کو باتیں کرتے دیکھ کر اسے اس لڑکی پہ افسوس ہوا کہ لڑکیاں کتنی بے وقوف ہوتی ہیں۔ چند تعریفی جملوں سے ہی زیر ہو جاتی ہیں۔ انہی خیالوں میں اس کا پوائنٹ آگیا اور وہ سر جھٹک کر اس طرف متوجہ ہوا جبکہ مدثر بھی اس کے پاس آکر ادھر ادھر کی ہانکنے لگا۔

☼ ☼ ☼

انیلا اور بریرہ کالج فرینڈز تھیں۔ بریرہ تھوڑی موڈی لڑکی تھی۔ زیادہ تر پڑھائی پر توجہ رکھتی اور مطلب کی بات کرتی کالج کے آغاز کے دنوں میں وہ لڑکیوں کی نیچر کو سمجھ چکی تھی۔ اس لیے اس نے کسی کی طرف پیش رفت نہیں کی اور جس مقصد کے لیے کالج جوائن کیا اس طرف لگ گئی۔ اس کے برعکس انیلا ہنس مکھ اور چلبلی لڑکی تھی۔ اسے کالج 'یونیورسٹی کی لائف بہت فیسی نیٹ ———— کرتی تھی۔ اسکول ٹائم سے ہی رسالوں اور ٹی وی ڈراموں میں جو تصوراتی دنیا دیکھتی رہی تو کالج اور یونیورسٹی کے حوالے سے اس کے ذہن میں بہت سے خواب بن گئے تھے۔ کالج میں آکر چند لڑکیوں کو دیکھا دیکھی وہ بھی پڑھائی سے بھاگتی اور کوشش کرتی کہ ادھر ادھر سے کمک حاصل کر کے پاس ہو جائے۔ ایسے میں اسے کلاس میں بریرہ واحد ایسی لڑکی لگی جو مکمل طور پر پڑھائی کی طرف متوجہ تھی اس نے اپنی ہنس مکھ اور چلبلی طبیعت کے باعث چند دنوں میں ہی بریرہ کو دوستی کے لیے راضی کر لیا۔

شروع شروع میں تو بریرہ اس کی باتوں سے الجھن کا شکار ہوتی تھی اور بعض اوقات دوستی ختم کرنے کا بھی سوچتی مگر پھر انیلا کی آنکھوں میں بسی معصومیت اور باتوں میں چھپی سادگی اور تھوڑی تھوڑی بے وقوفانہ

حرکتوں کی وجہ سے باز رہتی۔ وہ انیلا کو سمجھ گئی تھی۔ اس کا حال ویسا ہی تھا۔ بعض جو مڈل اور لوئر مڈل کلاس لڑکیوں کا ہوتا ہے۔ جو اپنے اردگرد کے ماحول سے فرار چاہتی ہیں اور خوابوں کی دنیا بسا لیتی ہیں اور پھر ان خوابوں کا تعاقب کرتے کرتے اپنے پاؤں چھلنی کر لیتی ہیں۔ وہ سراب سے حقیقت تک کے سفر میں بہت کچھ کھو دیتی ہیں اور یوں دو سال کی کالج لائف میں بریرہ اور انیلا کی دوستی کب پختگی کی منزلیں طے کر گئی۔ پتا ہی نہیں چلا انیلا 'بریرہ کو بہت عزیز ہو گئی۔

کالج کے بعد جب بریرہ نے یونیورسٹی جوائن کرنے کا بتایا تو انیلا اپنے گھریلو حالات کو دیکھتے ہوئے بھی نظریں چرا کر یونیورسٹی جوائن کرنے کے لیے مچل گئی اور خوب شور واویلا کر کے اور بھوک ہڑتال کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ لے کر رہی۔ اس کے والد سرکاری ملازم تھے اور ان کی تنخواہ میں بمشکل سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہوئے گزارہ ہو رہا تھا۔ مگر انیلا نے اپنی ضد کی خاطر ان کو مجبور کر دیا کہ وہ اوور ٹائم ———— بھی لگائیں اور اس کی والدہ جو پہلے کبھی کبھی لوگوں کو کپڑے سلائی کر دیتی اور اضافی خرچے کے پیسے نکال لیتی تھیں تاکہ مہینے کا بجٹ خراب نہ ہو۔ اس کے یونیورسٹی جوائن کرنے پر دن رات اس مشقت میں بھی لگ گئیں۔

انیلا بہت اونچے اونچے خواب دیکھ رہی تھی وہ شارٹ کٹ کے ذریعے کسی اونچے مقام تک جانا چاہتی تھی اور اس کے لیے اس کے ذہن میں ایک ہی حل تھا کسی امیر کبیر لڑکے سے شادی..... انیلا سے چھوٹی رباب آویز تھی۔ بڑی بہن کے برعکس وہ بہت حساس اور ماں باپ کا خیال رکھنے والی لڑکی تھی۔ میٹرک کے بعد ہی اس نے ٹیوشنز پڑھانا شروع کر دیا تھا اور اپنی پڑھائی کا خرچا وہ خود اٹھا رہی تھی بلکہ کبھی کبھی انیلا کو اگر کسی فرینڈ یا اپنے لیے کوئی چیز لینی ہوتی تو وہ پیسے بھی وہ چھوٹی بہن سے لیتی یوں انیلا ان ناشکری لڑکیوں میں سے تھی۔ جو کبھی بھی اللہ کے دیے ہوئے پہ خوش نہیں رہتیں۔

اس کی پھپھو شروع سے ہی اس کو اپنی بہو کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھیں انیلا سے دو سال بڑا اس کا پھپھو زاد قلب علی بہت ہی سلجھا ہوا لڑکا تھا اور MBA کرنے کے بعد ایک بنک میں جاب کر رہا تھا۔ اس کا جھکاؤ بھی انیلا کی طرف تھا۔ اسے اپنی یہ بے وقوف سی کزن بہت عزیز تھی۔ انیلا کی آنکھوں میں چھپے خواب اس سے پوشیدہ نہ تھے۔ اس لیے وہ پوری تندہی سے آگے بڑھنے کے راستے تلاش کر رہا تھا۔ اس کے برعکس انیلا کبھی بھی قلب علی کو دیکھ کر خوش نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ کوفت کا اظہار ہی کرتی اور پھپھو کی محبت اور لگاوٹ سے بے زار ہو جاتی جبکہ رباب آویز جو انیلا کی طرح ظاہری خوب صورتی میں تو یکتا نہیں تھی۔ مگر باطن بہت خوب صورت تھا۔ اسے اپنی اکلوتی پھپھو اور ان کے اکلوتے بیٹے سے بہت لگاؤ تھا اور ان کی آؤ بھگت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی۔ مگر کبھی بھی پھپھو یا قلب علی کی نگاہوں کا مرکز نہ بن سکی۔

دوسری طرف بریرہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے والد آرمی آفیسر تھے اور والدہ ہاؤس وائف۔ اس کی شخصیت کا اعتماد اس کے والد کا دیا ہوا تھا وہ چاہتے تھے کہ بریرہ زندگی کے کسی میدان میں بھی ہار نہ کھائے۔ انہوں نے کبھی اس پر اپنی مرضی نہیں تھوپی۔ جو اس نے چاہا وہ ملا کالج 'یونیورسٹی میں بھی جو اس نے پڑھنا چاہا وہی مضامین لیے۔ بریرہ کے والد صفدر کیانی کے مطابق بچوں کو ان کا راستہ خود منتخب کرنے دینا چاہیے اور راستے میں لگنے والی ٹھوکریں انہیں زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھاتی ہیں اور ان کی شخصیت میں اعتماد آتا ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے تھے۔

آج جب بریرہ اپنی تعلیمی کیریر کو مکمل کرنے کے آخری مراحل میں تھی۔ اس کی شخصیت میں پایا جانے والا اعتماد اور آنکھوں سے جھلکتی ذہانت اس کے والد کا دیا تحفہ تھا۔ یوں دو مختلف بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ دونوں آہستہ آہستہ ایک

اجارہ داری میں دخل دینے کی کوشش کی شاید اللہ نے سب محبتیں اس کے حصے میں لکھی ہیں۔ مگر چند دنوں سے مجھے صرف ایک شخص کی محبت اس کے لیے اچھی نہیں لگ رہی۔ کیوں ،کیوں ؟رباب آویز تم کہاں اور انیلا کہاں ...... انیلا کو اللہ نے حسن کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ تم میں کیا ہے، جو وہ تمہاری طرف دیکھے تمہارے نخرے برداشت کرے۔ ایک عام شکل وصورت کی مالک عام سی لڑکی۔" رباب آویز کے اندر سے آواز آئی۔ اس نے بے خیالی میں اپنا ہاتھ گال پہ رکھا تو آنسوؤں کی نمی نے اسے چونکا دیا کہ وہ بے آواز روئے جارہی تھی اور اسے معلوم ہی نہیں تھا۔

"میں پاگل تو نہیں ہوں۔ کیوں ایسی سوچیں میرے ذہن و دل کو پریشان کررہی ہیں میں تو اپنے والدین کی پیاری بیٹی ہوں جو ان کی پریشانیوں کو سمجھتی ہے۔ جو وہ کہتے ہیں فورا" مان لیتی ہے۔ کیا ہوا...... جو وہ مقام گھر میں نہیں۔ میں لوگوں کو اگر خوشی میں یاد نہیں آتی تو ضرورت اور دکھ میں تو یاد آتی ہوں نا...... اس سے بڑھ کر اللہ کی مجھ پر کیا رحمت ہوگی۔ اگر میرے دل میں اس کا خیال آگیا ہے اور محبت کی کونپلیں پھوٹ پڑی ہیں تو اللہ اسے میرے نصیب میں بھی لکھ دے گا۔" رباب آویز کے ضمیر نے اسے سمجھاتے ہوئے ہلکی سی سرزنش بھی کی۔ جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اپنے آنسو صاف کرکے مسکراتے لبوں کے ساتھ چولہے پر چائے کا پانی رکھا تاکہ پھپھو اور قلب علی جو کھانے کے بعد چائے پینے کے عادی تھے بنا کہے ان کی طلب پوری ہوجائے۔

☼ ☼ ☼

مدثر کی باتیں جنہیں ضیاء اسعدی نے شغل کے طور پر لیا تھا۔ چند دنوں میں ایک سچائی کے طور پر سامنے آگئیں۔ میڈم کو الوداعی پارٹی دی گئی تھی اور نئے پرنسپل نے چارج سنبھالا تھا۔ سر ذیشان علی چوہدری کی پرسنیلٹی کی تعریف تو لڑکوں تک نے کر دی۔ بہت ڈیسنٹ اور ہینڈسم تھے اور عمر کے لحاظ سے ابھی جوانوں میں شمار کیے جاسکتے تھے۔ ان کی پہلی تقریر نے لڑکیاں تو لڑکیاں لڑکوں کو بھی ان کا دلدادہ کردیا تھا۔ وہ بہت Ambitious انسان تھے اور زندگی کے ہر شعبے میں لڑکوں اور لڑکیوں کو ساتھ ساتھ آگے بڑھتا دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی باتوں میں جھلکتی شگفتگی ان کا طرز تخاطب ان کی پرسنالٹی کا منہ بولتا ثبوت تھا اور جب انہوں نے کہا۔

"آج سے یونیورسٹی میں وہی رولز فالو کیے جائیں گے جو باقی شہروں کی یونیورسٹیاں کررہی ہیں اور امید ہے کہ نظم وضبط کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ ماحول کو بھی پر امن رکھا جائے گا اور بوائز اینڈ گرلز مل کر اس یونیورسٹی کا نام روشن کریں گے۔"

مدثر نے اپنی سیٹ پر چڑھ کر تالیاں بجائی تھیں۔ اسعدی نے اسے بازو سے پکڑ کر نیچے کھینچا۔ جبکہ بہت سے اسٹوڈنٹس نے اس کی بے ساختگی کو سمجھتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ وہ اپنی خجالت چھپاتے ہوئے دوبارہ سر ذیشان کی طرف متوجہ ہوا۔ جو یونیورسٹی کی بہتری اور بہترین انداز تعلیم کے متعلق اپنے منصوبے اور ارادے شیئر کررہے تھے۔

یوں مدثر اور انیلا جیسے بہت سے اسٹوڈنٹس کی دبی خواہشوں کو راہ ملی اور انہوں نے سکھ کا سانس لیا۔

☼ ☼ ☼

"یار میں تو دیوانی ہوگئی ہوں پرنسپل کی...... واہ کیا شخصیت ہے۔ بندے پر سحر طاری کردیتے ہیں۔ دل چاہتا ہے بندہ سنتا ہی جائے۔" انیتا نے لہک کر بات کی ابھی وہ اور بھی کچھ کہتی مگر ماریہ کے ٹھوکے نے اسے روک دیا۔

"بس بس...... زیادہ امپریس نہ ہو۔ پرنسپل ہیں۔ تم خود پر ان کا سحر طاری کرنے کے بجائے دائیں بائیں والوں کو یہ موقع دیتا۔" ماریہ نے اسے آنکھ دبا کر ہنستے ہوئے اسے احساس دلایا کہ اوپر نظریں کرنے کے بجائے مقابل میں نظریں دوڑائے۔ ابھی وہ لوگ یہی باتیں کررہی تھیں کہ انیلا اور بریرہ بھی کلاس میں داخل ہوئیں۔

"ہائے گرلز...... مبارک ہو۔ تم لوگوں کی نا آسودہ خواہشات اب حقیقت کا روپ دھارنے والی ہیں بلکہ دھار چکی ہیں۔" بریرہ نے مسکراتے ہوئے ان پر طنز کیا تھا۔ جبکہ اس کی بات پہ انیلا نے خوشی سے کھنکتی ہوئی آواز میں اقرار کیا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔

"ویل...... ہمیں پہلے کوئی تکلیف تھی اور نہ اب کوئی تکلیف ہے۔ ہاں بے جا پابندیاں ختم ہونے پر شکر کیا ہے۔ ویسے بھی وہ رولز ان لڑکیوں کے لیے تھے۔ جس کے پاس انجوائے منٹ کا صرف ایک یہی ذریعہ ہو۔ ہمارے لیے نہیں۔ ہم پہلے بھی آزاد اور خود مختار زندگی گزار رہی تھیں اور آگے بھی کوئی مسئلہ ہی نہیں۔" ماریہ نے بریرہ کے طنز کو سمجھتے ہوئے نخوت سے اپنے بال جھٹکے۔

"یس...... یو آر رائٹ تمہاری آزادی پہ تو بہت سے لڑکیاں رشک کرتی ہیں۔" بریرہ نے در پردہ اس کی حرکتوں اور اس کے متعلق ہمہ وقت یونیورسٹی کی لڑکیوں کی زبانی اس کے قصوں کا حوالہ دیتے ہوئے بات کی اور اپنے بیگ میں پین تلاش کرنے لگی۔ انیلا نے دیکھا کہ اس کی بات نے ماریہ کا چہرہ غصے سے سرخ کردیا تو بات آگے نہ بڑھے۔ فورا" بریرہ کو ٹوکا تھا۔

"بس کرو بریرہ۔ کیا فضول باتیں لے بیٹھی ہو چلو اٹھو کلاس شروع ہونے والی ہے۔"

☼ ☼ ☼

"ایکسکیوزمی...... میں غلطی پہ نہیں تو...... آپ کا نام انیلا ہے۔" مدثر کافی دنوں سے انیلا کو فالو کررہا تھا۔ یہ لڑکی اس کے خیال کے برخلاف کافی تیز یا محتاط نکلی تھی کہ اگلے دن انتظار کے باوجود اسٹاپ پر نہیں آئی اور کافی دیر بعد بریرہ کے ساتھ ہی آئی اور اسے یوں نظر انداز کیا جیسے اسے جانتی ہی نہ ہو۔ وقتی طور پر تو وہ چپ ہوگیا۔ پھر یونیورسٹی میں ہونے والی تبدیلیوں نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔ آج جب کیفے ٹیریا میں انیلا کو اکیلے بیٹھے دیکھا تو فورا" چلا آیا کیونکہ اب کسی کو یہ ڈر نہ تھا کہ کون کیا گفتگو کررہا ہے...... سو وہ آرام سے انیلا کے پاس کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اور یوں تھوڑی دیر تک وہ ایک دوسرے کا مکمل تعارف حاصل کرچکے تھے۔ آج خوش قسمتی سے بریرہ یونیورسٹی آئی ہی نہیں تھی اور انیلا کا یہ دن جو بور گزر رہا تھا۔ اس کی زندگی میں ایک نیا راستہ بنا گیا۔ اسے نہیں پتا تھا کہ آگے چل کر یہ قہقہے اس کے لیے کیا سامان تیار کرنے والے ہیں ...... وہ صرف حال میں جینا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

جہاں یونیورسٹی میں آنے والی تبدیلی نے اسٹوڈنٹس کو کانفیڈنس دیا تھا وہیں بہت سے اسٹوڈنٹس نے اس کا ناجائز فائدہ بھی اٹھانا شروع کردیا تھا۔ پھر جو چیز حاصل کرنا چاہتا تھا کر رہا تھا۔ بہت سے اسٹوڈنٹس ایک دوسرے کی قابلیت سے فائدہ اٹھا رہے تھے اور پڑھائی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی خواہش نے بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں میں تعلیمی میدان میں مقابلے کا میدان گرم کردیا تھا۔ وہاں بہت سے طلبہ اور طالبات ایسے بھی تھے۔ جو غیر نصابی سرگرمیوں میں الجھ گئے تھے۔ مختصر یہ کہ ہر بندہ اپنی سوچ اور خواہشات کے مطابق آگے بڑھ رہا تھا۔

پرنسپل ذیشان بھی گاہے بگاہے اسٹوڈنٹس کے ساتھ ان کے مسائل سننے اور ان کے حل کے لیے کوشاں تھے۔ سمسٹر قریب تھا۔ جہاں ضیاء اسعدی مدثر کو نظر انداز کیے پوری طرح اپنی پڑھائی پہ توجہ دے رہا تھا۔ وہیں بریرہ بھی انیلا سے غافل تھی اور یہ وقت انیلا اور مدثر کے لیے گولڈن پریڈ ثابت ہوا۔ انیلا وقتی طور پر اپنے خوابوں کو بھلائے بس مدثر کی لچھے دار گفتگو سے لطف اندوز ہورہی تھی اور غیر محسوس طریقے سے اس کی عادی ہوتی جارہی تھی۔

وہیں مدثر یونیورسٹی میں انیلا اور رونگ نمبرز پہ بھی بہت سے لڑکیوں کے جذبات سے کھیل رہا تھا وہ انیلا کے ساتھ وقت گزار رہا تھا۔ اس کے دل میں انیلا اور اس جیسی کسی لڑکی کے لیے عزت نہیں تھی جو دو بول

محبت کے سن کر آپے سے باہر ہو جاتی ہیں۔ وہ رات گئے تک انیلا سے گپ شپ کرتا اور یونیورسٹی میں بھی جتنی دیر دور رہتے پیغامات ایک دوسرے سے جاری رکھتے اور موبائل کی اسکرین پر نظریں جمائے رکھتے۔ انیلا کے لیے صرف مدثر اہم ہوتا جارہا تھا۔ جبکہ مدثر اس کے بڑھتے ہوئے التفات دیکھ کر مزے لے رہا تھا۔

ان کی انہی مصروفیات میں امتحانات کے دن آ گئے اور وہی ہوا۔ انیلا کا رزلٹ بہت خراب آیا تھا۔ بمشکل پاس ہوئی تھی اور مدثر بھی ہمیشہ کی طرح جیسے تیسے کر کے سمسٹر کلیئر کر ہی گیا۔ ہاں بریرہ کی یونیورسٹی میں سیکنڈ پوزیشن آئی تھی اور یونیورسٹی میں ٹاپ کرنے والا بندہ ضیاء اسعدی تھا۔

بریرہ نے انیلا کی ٹھیک ٹھاک کلاس لی۔ مگر اس کی سمجھ میں پہلے کچھ آیا تھا نہ اب آیا۔ ہاں بریرہ اس کے بدلے اطوار سے بہت کچھ سمجھ گئی۔ اور بہتر یہی جانا کہ اسے اس کے حال پہ چھوڑ دے اور بریرہ کا یہی فیصلہ غلط تھا کیونکہ بریرہ کا منہ موڑنا انیلا کو بالکل ہی بے پروا کر گیا اور وہ کھلم کھلا مدثر کے ساتھ وقت گزارنے لگی کسے خبر تھی کہ آنے والا وقت اس کے لیے کتنے پچھتاوے لے کر آرہا ہے۔

☼ ☼ ☼

"ایک بات بتاؤ رباب..." قلب علی نے رباب کو سنجیدہ آواز میں پکارا تو وہ جو اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چائے بنانے کچن کی طرف جارہی تھی۔ فوراً" مڑی وہ اس کی غیر معمولی سنجیدگی پہ چونک اٹھی۔

"جی... پوچھیں علی..." رباب واپس پلٹ آئی۔

"انیلا مجھ سے اس قدر روڈ لہجے میں بات کیوں کرتی ہے۔ کیا وہ امی کی خواہش سے ناواقف ہے یا یہ بات جان کر ناخوش ہے۔" قلب علی کو جو بات کتنے عرصے سے پھانس کی طرح دل میں چبھ رہی تھی۔ اسے آج زبان دے ہی دی۔

"میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرنا۔ آج کل امی باقاعدہ انیلا اور مجھے ایک رشتے میں باندھنا چاہ رہی ہیں وہ ماموں لوگوں سے بات کرنا چاہتی ہیں کہ چھوٹی سی تقریب رکھ کر ہماری منگنی کر دی جائے اور شادی اس کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد کرلی جائے گی۔ لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ انیلا شاید ہماری اس خواہش کا مثبت جواب نہ دے۔" قلب علی نے اپنی الجھن رباب آویز سے شیئر کی تھی۔ اس بات سے انجان کہ اس کی باتوں نے رباب کے اندر بے چینی پھیلا دی تھی۔ وہ مسلسل قلب علی کے چہرے پہ محبت کے بچھڑ جانے کا خوف دیکھ رہی تھی۔

قلب علی نے جب اپنی بات کا کوئی رد عمل نہ سنا تو سر اٹھا کر رباب کی طرف دیکھا اور اک لمحے کے لیے چونک گیا۔ رباب کے چہرے پہ لکھی تحریر کچھ اور کہہ رہی تھی یا وہ سمجھ غلط رہا تھا اس نے سر کو جھٹک دیا۔ شاید میرے دل و دماغ پہ سوچوں کی یلغار نے الٹا اثر کر دیا ہے اس نے دل ہی دل میں خود کو ڈپٹا...

"رباب آویز... تم تو میری سویٹ کزن ہو... یار میری پریشانی کا حل بتاؤ۔ یہ کیا "صم" "بکم" بیٹھ گئی ہو۔" قلب علی نے لہجے کو بشاش کرتے ہوئے شگفتگی سے کہا۔

"جج... جی... میں انیلا سے اس کے دل کی بات اس کی مرضی معلوم کرنے کی کوشش کروں گی ویسے تو وہ مجھ سے کم ہی کچھ شیئر کرتی ہے۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتی ہوں۔ اس معاملے میں آپ کی پوری مدد کروں گی۔ آگے جو ہوا۔ وہ آپ کا نصیب۔" رباب نے کھوئے کھوئے لہجے میں بات مکمل کی اور اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔

اور قلب علی جو اسے دوبارہ پکارنے ہی والا تھا۔ اس کے رویے پہ چپ سا ہو گیا۔ وہ دل میں پریشان ہو رہا تھا کہ رباب کو ہوا کیا ہے۔ اس کزن کو وہ ہمیشہ خاموش اور بے ضرر سی لڑکی سمجھتا تھا۔ جس کی اپنی مرضی، اپنی خواہش اپنے کوئی خواب نہیں مگر۔ آج رباب آویز کچھ بدلی بدلی لگ رہی تھی یا اس کا وہم تھا۔ فی الوقت وہ اس کے بارے میں زیادہ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ وہ صرف یہ دعا کر رہا تھا کہ جو خدشے، وہم اس کے دل میں انیلا کے آرہے ہیں وہ جھوٹے ثابت ہوں اور انیلا کے دل کی خواہش اور اس کے دل کی مسند پہ بھی صرف قلب علی ہی براجمان ہو۔

☼ ☼ ☼

"مدثر... ہم کب تک یونہی فون پہ باتیں کرتے رہیں گے اور چھپ چھپ کر ملاقاتیں... تم گھر میں بات کرو نا..." انیلا جو کب سے یہ بات کرنا چاہ رہی تھی۔ آج جب مدثر نے معمول کے مطابق رات کو کال کی تو انیلا نے دل کی بات کو زبان دے دی۔ وہ سمجھ رہی تھی رباب، ہمیشہ کی طرح سو چکی ہے۔ دونوں ایک ہی کمرہ شیئر کرتی تھیں۔ مگر بیڈ الگ الگ تھے۔ رباب دن بھر کی تھکن کی وجہ سے جلد ہی نیند کی وادی میں اتر جاتی تھی۔ مگر انیلا آدھی رات کے بعد مدثر کے ساتھ محبت بھری باتیں کرنے کے لیے جاگ رہی ہوتی۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ آج قلب علی کی دن کی باتوں نے رباب آویز سے نیندیں چھین لی ہیں۔ وہ سونے کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔ مگر حقیقتاً" جاگ رہی تھی اور جب انیلا نے کال پک کی اور آہستہ آواز میں گفتگو شروع کی تو رباب آویز اس کی باتوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

اسے انتہائی دکھ اور صدمہ ہوا تھا کہ ان کے والدین ان کے لیے کیا کیا کر رہے تھے اور انیلا کیا کر رہی تھی۔ اس نے دو دن پہلے انیلا کی چیزیں درست کرتے ہوئے اس کے سمسٹر گریڈز بھی دیکھے تھے۔ مگر موقع نہیں ملا کہ انیلا سے پوچھتی۔ مگر اس وقت اس کی گفتگو نے اسے ساری صورت حال سمجھا دی تھی۔ اس نے آنکھیں بند ہی کیے رکھیں تاکہ انیلا کو شک نہ ہو۔ وہ پرسکون اور مطمئن ہو کر اپنی باتوں میں لگی ہوئی تھی۔

"ہوں... چلو ٹھیک ہے۔ مگر زیادہ دیر مت کرنا۔ میں نے تم سے ذکر کیا تھا نا... اپنے اسٹوپڈ کزن اور اس کی پینڈو ماں کا... مجھے لگ رہا ہے کہ وہ جلد ہی امی ابو کے سامنے رشتے کی بات کریں گے۔ انہیں تو خیر میں دیکھ لوں گی۔ مگر آگے کیا ہو۔ یہ نہیں جانتی اس لیے تمہیں کہہ رہی تھی۔" انیلا نے انتہائی حقارت آمیز لہجے میں پھپھو اور علی کا ذکر کیا تھا۔ رباب اس کی باتیں سن کر حیران رہ گئی تھی اسے انیلا پر غصہ بھی آیا اور دل چاہا کہ ابھی اٹھ کر اس کی طبیعت صاف کر دے کہ وہ اپنے خاندان اور اپنے پیاروں کے بارے میں کیسی رائے رکھتی ہے مگر کچھ سوچ کر چپ سادھ لی اور جان بوجھ کر کروٹ لی اور اس کے کروٹ بدلنے پہ انیلا نے فوراً" موبائل آف کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اسعدی میں نے کبھی تمہاری ذاتی باتوں اور زندگی میں مداخلت کی ہے۔ نہیں نا... تو تم بھی نہ کرو... اچھا ہو یا برا... میں اپنے کیے کا خود ذمہ دار ہوں گا۔" مدثر نے جھنجلا کر ضیاء اسعدی کو جواب دیا۔

"سچ ہے جب انسان بھٹک جائے تو پھر اسے کچھ راستہ سجھائی نہیں دیتا اور اپنے اچھے برے کی تمیز بھی نہیں رہتی۔" یہی حال مدثر کا تھا۔ اس کے دوستوں میں اضافہ ہو چکا تھا اور دوست بھی وہ جو اسی کی طرح کے خیالات کے مالک اور سرگرمیوں میں ہر وقت مصروف عمل رہتے تھے۔ ایسے میں اب مدثر کو ضیاء اسعدی کی نصیحتیں چبھنے لگی تھیں۔ اسے ضیاء اسعدی کے ساتھ وقت گزارنا اور بیٹھنا بور کرنے لگا۔ محسوس تو ضیاء اسعدی بھی کر رہا تھا۔ مگر وہ مدثر کو اس انجام سے بچانا چاہتا تھا جو ایسے لوگوں کا نصیب ٹھہرتا ہے۔

"مدثر میں تمہارے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں چاہتا۔ ایک اچھے دوست کی طرح تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں کہ جس رستے پہ تم چل پڑے ہو۔ وہ ٹھیک رستہ نہیں پہلے میں تمہاری حرکتوں کو لڑکپن اور جوانی کی دہلیز پہ کھڑے لڑکے کی نادانیاں سمجھ کر اگنور کر دیتا تھا۔ مگر جب سے تم نے پاشا لوگوں کے گروپ کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع کیا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم بری طرح پھنس جاؤ گے۔ اس کے گروپ کے بارے میں تو پوری یونیورسٹی بلکہ علاقہ جانتا ہے کہ کس قدر آوارہ

اور بدمعاش ٹائپ لڑکے ہیں اور پھر وہ برائی کی کوئی حد نہیں دیکھتے۔ لڑکیوں کی عزت سے کھیل کر بھی دندناتے پھر رہے ہیں تم پلیز ان سے بچ کر رہو۔ تمہاری شوخ مزاجی اور شرارتیں ابھی شیطانی چالوں اور حیوانی حرکتوں میں نہیں بدلیں۔ پلیز مدثر میرا کہا مانو اور پاشا کے گروپ کو خیرباد کہہ دو۔"

اسعدی نے ہر ممکن طریقے سے مدثر کو سمجھایا اور آخر کار بے چارگی سے اس کے سامنے التجا کی۔

"بس ہو گئی تمہاری بات ختم مجھے اکیلا چھوڑ دو مجھے ایک ضروری کال کرنی ہے۔" مدثر نے ایسی بے گانگی سے اسعدی کی محبت بھری نصیحتوں کا جواب دیا کہ وہ بے بسی اور دکھ سے چپ کر کے اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ وہ لوگ اس وقت یونیورسٹی کے گراؤنڈ میں تھے اور مدثر نے لاپرواہی سے کندھے اچکاتے ہوئے روزی کو کال ملائی یہ لڑکی اپنی بے باک باتوں اور حرکتوں کی وجہ سے جلد ہی یونیورسٹی کے تمام لڑکوں کی نظروں میں آ گئی تھی حالانکہ اسے یونیورسٹی جوائن کیے چند دن ہوئے تھے۔

☆ ☆ ☆

"یار اگر وہ لڑکی تمہارے لیے اتنا ہی مر رہی ہے تو اسے بلاؤ۔ اسے کہو کہ محبت امتحان مانگتی ہے اور اگر وہ تمہارے امتحان میں کامیاب ٹھہری تو تم اگلے روز ہی اس کے گھر رشتہ لے کے چلے جاؤ گے۔" پاشا نے مدثر کی زبانی انیلا کے شادی کا اصرار سن کر خباثت سے ہنستے ہوئے کہا اور مدثر اس کی بات سن کر ایک لحظے کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس نہج پہ تو اس نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ لڑکیوں سے دوستی کرتا تھا۔ مگر کبھی نوبت یہاں تک نہیں آئی کہ وہ یا دوسری لڑکی کسی دائمی رسوائی کا نتیجہ بھگتے۔ یہ پاشا اسے کس طرف لے کے جا رہا تھا۔

"نن..... نہیں یار..... میں کسی لڑکی کو ایسی سزا نہیں دے سکتا کہ وہ تمام عمر خود سے بھی منہ چھپاتی پھرے۔" مدثر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے پاشا کو جواب دیا۔

"اوئے ہوئے..... تو تو بالکل ممی ڈیڈی بچہ نکلا۔ ابے اگر انہیں اپنی عزت' بے عزتی کا اتنا ہی خیال ہو تو یوں لڑکوں کے ساتھ چوری چھپے تعلقات قائم ہی نہ کریں۔ یہ سب لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ کچھ ذرا اپنی شرافت کا ڈھنڈورا پیٹنے کے لیے شادی شادی کی رٹ لگائے رکھتی ہیں۔" پاشا نے نفرت سے عورتوں کا تمسخر اڑایا تھا۔ وہ جس معاشرے سے تعلق رکھتا تھا اور جس کلاس میں پروان چڑھا تھا۔ وہاں ایک ہی سبق ملا تھا کہ ماں اور بہن کے علاوہ کسی عورت کو عزت نہیں دینی کسی کے کردار کی صاف ہونے پر یقین نہیں کرنا۔

"مجھے تمہاری بات سے اتفاق ہے پاشا یار..... مگر انیلا ان لڑکیوں سے مختلف ہے یا ہماری دوستی کو دو سال ہونے کو آئے ہیں۔ مگر آج تک وہ ایک حد سے آگے نہ بڑھی نہ مجھے بڑھنے دیا ہے۔" مدثر نہ چاہتے ہوئے بھی انیلا کی طرف داری کر رہا تھا۔

"تو بڑا ہی معصوم بچہ ہے مدثر..... یار بڑا ہو جا تیری باتوں سے تو لگ رہا ہے۔ تو بھی بزدل لڑکوں کی طرح ہی دور دور سے مداح سرائی کرنے والا ہے۔ تو نے کبھی خود پہل ہی نہ کی ہو گی ورنہ جو — آدھی آدھی رات تک فون پہ گفتگو کر سکتی ہیں وہ اور بھی بہت کچھ قبول اور برداشت کر سکتی ہیں۔" پاشا اپنی بات پر قائم تھا اس لیے بے ہودگی سے بات کرتے ہوئے آنکھ ماری تھی۔

☆ ☆ ☆

"انیلا میرے گھر آج کچھ لوگ آ رہے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم یونیورسٹی سے واپسی پہ میری طرف آؤ۔ میں بہت کنفیوز ہو رہی ہوں۔" بریرہ نے ساری ناراضی ایک طرف کرتے ہوئے انیلا کو کال کی تھی انیلا ناشتا کر رہی تھی بریرہ کی کال آتے دیکھ کر حیران ہوئی مگر جب کال کی وجہ پتا چلی تو وہ بھی سب بھول بھال اپنی ایکسائٹمنٹ چھپا نہیں سکی۔

"ارے واہ..... بہت چھپی رستم نکلی ہو۔ بتایا بھی نہیں کون ہے وہ۔ موصوف کرتے کیا ہیں۔" انیلا نے روایتی دوستوں کی طرح ایک ہی سانس میں سب پوچھ ڈالا۔

"ارے مجھے خود معلوم نہیں۔ ممی کے جاننے والے ہیں یہاں آنا رسمی ہے۔ کیونکہ وہ مجھے کسی تقریب میں دیکھ چکی ہیں۔ مگر میری لاعلمی کہ میں نہیں جانتی حالانکہ ان کے بقول وہ مجھے ملی تھیں۔ ان کا بیٹا ہے ابھی پڑھ رہا ہے۔ مگر وہ منگنی کرنا چاہتی ہیں تاکہ زندگی میں تھوڑی تبدیلی آئے۔ میری بہنیں ان کے..... اچھا باقی باتیں بعد میں۔ گھر آؤ گی تو سب بتاؤں گی امی مسلسل آوازیں دے رہی ہیں۔"

بریرہ نے جلدی جلدی میں اسے اہم باتیں بتا دیں وہ جانتی تھی انیلا نے آنے سے پہلے اس کا دماغ کھا جانا ہے اس لیے اس کو سکون دینے کے لیے مسلسل بولتی گئی اور امی کی پکار پر بات ختم کی اور ہنستے ہوئے موبائل آف کیا کیونکہ انیلا مسلسل ہیلو ہیلو کر رہی تھی۔ وہ اس کی بے چینی سمجھ گئی تھی کہ جب تک انیلا الف سے ے تک سب سن نہ لے گی آرام نہیں کرے گی اور یونیورسٹی میں بھی جلے پاؤں کی بلی کی طرح وقت کاٹے گی۔

انیلا یونیورسٹی جانے کے بجائے سیدھی اسی کی طرف آ گئی۔ اور آتے ہی اس کے سر ہو گئی۔ لگ نہیں رہا تھا کہ ان کے درمیان اتنے لمبے عرصے سے بات چیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ لوگ آج پرانی دوستوں کی طرح ہی لگ رہی تھیں۔ انیلا اور بریرہ کی نوک جھوک میں ہی مہمانوں کے آنے کا ٹائم ہو گیا اور ہمیشہ کی طرح انیلا خود پر قابو نہیں رکھ سکی اور ڈرائنگ روم میں جھانکنے چلی گئی۔ وہ لڑکا دیکھنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔ اور لڑکا دیکھ کر تو اس کے اوسان ہی خطا ہو گئے۔ وہ پلکیں جھپکنا بھول گئی اور سرپٹ بھاگی تاکہ بریرہ کے سامنے جا کر نیوز بریک کرے اور کچن میں سے نکلتی بریرہ سے جا کر ٹکرائی۔ دونوں کی ٹکر اتنی شدید ہوئی تھی کہ اوئی' اوئی کی آوازوں کے ساتھ ہی آنسو بھی نکل آئے بریرہ اپنے سر کو دباتے ہوئے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جبکہ انیلا چوٹ کو بھولے جو دیکھ کر آئی تھی اسے بتانا چاہ رہی تھی کہ بریرہ کی والدہ چلی آئیں۔

"کیا ہوا بیٹا..... ڈرائنگ روم تک تم لوگوں کی آوازیں آئی ہیں۔ میں نے کہا اللہ خیر ہی کرے۔ کوئی چوٹ ووٹ نہ لگ گئی ہو۔ کیا ہوا۔ مجھے تو لگ رہا ہے تم دونوں کی آپس میں ٹکر ہوئی ہے۔" نزہت بیگم نے ہنستے ہوئے بریرہ اور انیلا کو سر سہلاتے دیکھ کر کہا۔ جبکہ ان کی بات سن کر انیلا کھسیانی ہنسی ہنس دی جبکہ بریرہ خاموش ہی رہی۔ وہ فرحت بیگم کے واپس جانے کے انتظار میں تھی تاکہ آفت کی پرکالہ سے اس بھاگم بھاگ ٹکر کی وجہ تسمیہ معلوم کر سکے۔

"اچھا بیٹا تھوڑی دیر بعد چائے اور اس کے ساتھ لوازمات لے کر ڈرائنگ روم میں آ جانا سب اپنے ہی ہیں تم بچپن میں ان کے ہاتھوں میں کھیلی ہو۔ کیا ہوا جو ایک لمبے عرصے بعد مل رہے ہیں۔" نزہت بیگم نے پیار سے بریرہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا اور باہر نکل گئیں۔

"اب بکو..... کیا افتاد ٹوٹ پڑی تھی کہ اندھے بیل کی طرح سیدھی آ کے مجھے ٹکر دے ماری۔" بریرہ نے غصے سے انیلا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"چل دفع ہو۔ پہلی بات تو یہ میں بیل نہیں۔ دوسری بات یہ کہ میں نے ٹکر ماری نہیں تم میرے راستے میں آئی اور تیسری بات یہ کہ جو میں دیکھ کر آئی ہوں تم دیکھتیں تو وہیں چیخ مار کے بے ہوش ہو جاتیں۔" انیلا اصل بات کی طرف نہ آئی تھی۔

"تم بتاتی ہو یا یہ ٹرے میں تمہارے سر پہ دے ماروں۔" بریرہ کو اب اس کی باتوں سے بے چینی ہو رہی تھی کہ آخر حقیقت کیا ہے۔

"بتاتی ہوں۔ بتاتی ہوں۔ کیونکہ میرے دولہا بھائی کو دولہا بننے سے پہلے قاتلہ کا شوہر کہلوانے لگی ہو۔" انیلا نے شرارت سے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا جب دیکھا کہ بریرہ کا صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کو ہے تو اصل بات کی طرف آ گئی۔

"بریرہ تم جانتی ہو کہ تمہاری زندگی میں شامل ہونے والا شخص کون ہے۔" انیلا نے چہکتے ہوئے اس کے گلے میں بانہیں ڈالی تھیں۔

"مجھے کیا پتا..... آج پہلی دفعہ تو دیکھوں گی۔ ہاں امی کی کسی زمانے میں بہت اچھی دوست رہی ہیں، جب ابو کی پوسٹنگ کراچی تھی۔ اور کچھ عرصہ پہلے ہی واہ کینٹ شفٹ ہوئی ہیں بیٹا کون ہے کیا کرتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم۔" بریرہ کو جتنا معلوم تھا انیلا کے گوش گزار کردیا۔

"ارے بدھو..... ایک ڈیشنگ بندہ تمہاری لائف میں آرہا ہے۔ ذہین فطین، سنجیدہ لڑکیوں سے دور، سحرانگیز گفتگو کرنے والا..... اور تم سے ذہانت میں ایک نمبر آگے رہنے والا۔" انیلا نے پھر بھی نام نہیں بتایا تھا۔

"انیلا کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔ کون ہے اور تم کیسے جانتی ہو اسے؟" بریرہ انیلا کی باتوں سے کنفیوز ہو رہی تھی۔

"ارے میں کیا پوری یونیورسٹی جانتی ہے۔ اپنے پرنسپل کا چہیتا یونیورسٹی کا ہیرو دوسروں کو مات دینے والا سنجیدہ اور خوبرو نوجوان عرف عام میں جسے جونیئر سر ذیشان علی چوہدری کہتے ہیں۔ آ..... ہاں، آ..... ہاں، جی ہاں ضیاء اسعدی ڈرائنگ روم میں براجمان ہیں۔" انیلا نے آخر کار بریرہ کے سامنے ہلا دینے والی خبر سنا ہی دی تھی اور یہ بات سن کر بریرہ ___ شاکڈ رہ گئی تھی۔ کیسا اتفاق تھا۔ اللہ نے بن مانگے اس کے نصیب میں بہت اچھا جوڑ لکھ دیا تھا۔ حیرت اور خوشی سے اس کے منہ سے کوئی لفظ ہی نہیں نکلا۔ بس انیلا ہی اول فول بکے جا رہی تھی اور دوسری طرف بھی جھٹکا کم نہیں لگا تھا۔

ضیاء اسعدی، بریرہ کو دیکھ کر بے اختیار صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر اپنی بے اختیاری پہ خود ہی شرمسار ہو گیا۔ وہ جو دل ہی دل میں ماں باپ سے ناراض ہوئے بیٹھا تھا کہ بالا ہی بالا رشتہ دیکھ لیا اور اس کی تعلیم مکمل ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا کم از کم اس کے آن جاب ہونے تک کا انتظار کرتے۔ بریرہ کو دیکھ کر اللہ سے اپنے خیالات کی معافی مانگی اور ماں باپ کے لیے پیار امڈ آیا کہ جیسی شریک سفر وہ چاہتا تھا۔ بریرہ اس سانچے میں پوری اترتی تھی۔

بس یوں چند اور ملاقاتوں کے بعد ضیاء اسعدی اور بریرہ ایک بندھن میں بند گئے بظاہر یہ کچا رشتہ تھا مگر جہاں دلوں میں محبتیں موجزن ہوں وہاں پھر کسی چیز کا ڈر نہیں ہوتا۔

☆ ☆ ☆

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا انیلا۔ کیا ضرورت تھی علی سے بدتمیزی کرنے کی۔" رباب نے غصیلے لہجے میں اس کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"کیوں تمہیں کیوں اتنی تکلیف ہو رہی ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کیسے اپنا حق جتا رہا تھا جیسے میں اس کی زرخرید غلام ہوں۔ ارے میں اسے کزن کے طور پر برداشت کرلوں یہی کافی ہے۔ اس سے بڑھ کر میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ ہونہہ رشتہ، محبت، بڑوں کی خواہشیں ___ مائی فٹ یہ میری زندگی ہے اور میری زندگی میں علی کے لیے نہ پہلے جگہ تھی نہ آگے بن سکتی ہے۔" انیلا نے نخوت سے سر جھٹکا۔

"تو پھر کس کی جگہ ہے۔ وہ جس سے ساری رات باتیں کرتی ہو اور یونیورسٹی کے بہانے ملاقاتیں کرتی ہو۔" رباب آویز نے بہت چبھتے ہوئے لہجے میں کہا جبکہ رباب کی بات پہ انیلا کو جھٹکا لگا مگر اس نے ___ خود پر کنٹرول کیا تھا اور ڈھٹائی سے اپنی بات پہ اڑ گئی۔

"اگر تمہیں پتا چل ہی گیا ہے تو ٹھیک ___ بلکہ بہت اچھا ___ ہاں میں مدثر سے ہی شادی کروں گی۔ امی ابو کو بھی بتا دینا اور اگر پھپھو کو اتنا ہی شوق ہے نا بھائی کی بیٹی کو بہو بنانے کا تو ___ تم ہو نا ___ اور تم ان کی خواہشات اور امیدوں پر پوری بھی اترتی ہو۔" انیلا کے لہجے اور لفظوں میں رشتوں کے لیے کوئی احترام نہ تھا۔

"انیلا علی تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ ٹوٹ [illegible] جائیں گے ان کے ساتھ [illegible] اور جس کے لیے تم اپنوں کو ٹھکرا رہی ہو۔ وہ تو تمہارے کئی بار کہنے کے باوجود اپنے گھر میں ابھی تک بات نہیں کر سکا۔" رباب نے ان کی باہمی گفتگو کو مدنظر رکھتے ہوئے انیلا کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی مگر انیلا جن ہواؤں میں تھی۔ وہ حقیقت کا سامنا کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

"تمہیں زیادہ ہمدرد بننے کی ضرورت نہیں اور علی کی وکالت کم کرو بلکہ میں تو کہتی ہوں۔ تم علی سے شادی کرلو۔ اتنی صابر شاکر بیوی چراغ لے کر بھی ڈھونڈے گا تو نہیں ملے گی۔" انیلا نے رباب کی صبر کرنے اور برداشت کرنے والی عادت پہ چوٹ کی تھی۔ اور بستر پر نیم دراز ہو گئی۔

"تم بہت پچھتاؤ گی۔ مگر افسوس اس وقت تمہارا پچھتاوا تمہیں کچھ نہیں دے سکے گا۔" رباب نے ترحم بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ اپنے ضمیر اور دل کے آگے مطمئن تھی کہ اس نے بنا ___ کھوٹ کے سچے دل سے قلب علی کی چاہت کے حصول کے لیے کوشش کی تھی۔ آگے جو رب کے فیصلے ___ شاید قلب علی جیسے مخلص شخص کے لیے انیلا جیسی خود غرض لڑکی رب کو منظور نہ تھی۔ لیکن ان دونوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ قلب علی جو ڈرائنگ روم میں انیلا کی جلی کٹی سن کر چپ کا چپ کھڑا رہ گیا تھا۔

ان دونوں کے وہاں چلے جانے کے بعد گیا نہیں تھا بلکہ انیلا کے پیچھے رباب کو جاتے دیکھ کر رک گیا تھا کہ شاید رباب کے احساس دلانے پہ انیلا اپنے رویے کی معذرت کے لیے واپس آئے۔ مگر تھوڑی دیر بعد خود ان کے کمرے کی طرف آیا۔ مگر کمرے سے آتی آوازیں سن کر وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔ تو یہ وجہ تھی انیلا تمہارے رویے کی۔

"میں ہی پاگل تھا جو سمجھا نہیں ___ تمہارے انداز، تمہارے تیور تو پہلے دن سے بتا رہے تھے کہ تمہارے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں مگر میں خود کو بہلاتا رہا۔ تم نے ٹھیک کہا۔ میں تمہارے لیے اور تم میرے لیے بنی ہی [illegible] نہیں ہو گا کہ کوئی تمہیں اتنا چاہتا تھا کہ سانس بھی تمہیں یاد کر کے لیتا تھا۔ میں نے اپنا رستہ بدل لیا ہے بلکہ اپنے دل پہ بھی بند باندھ لیا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ___" قلب علی نے فیصلہ کر کے واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔

☆ ☆ ☆

"تم نے تو بتایا تھا کہ تمہارا کزن تم میں انٹرسٹڈ ہے پھر اچانک رباب آویز کے ساتھ رشتہ بلکہ رشتہ ازدواج میں بندھنے کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔" بریرہ انیلا کی زبانی رباب کی عنقریب شادی اور وہ بھی قلب علی کے ساتھ شادی کی خبر سن کر حیران رہ گئی تھی۔

"اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا ضرورت ہے بھئی ___ انٹرسٹ بدلتے دیر نہیں لگتی میں نے تمہیں خوشخبری سنائی ہے اور تم منہ کھولے میرا منہ تک رہی ہو۔" انیلا نے ہنستے ہوئے بات کو بدلا وہ بریرہ کے ساتھ کلاس لے کر نکلی تھی اور کیفے ٹیریا جاتے ہوئے رباب آویز اور قلب علی کے رشتہ پکا ہونے کی خبر سنائی۔ اس دن قلب علی نے گھر جا کر ماں باپ کو نہ جانے کیا کہا پھپھو ان کی طرف آئیں تو رباب کے لیے جھولی پھیلائی۔ حیران تو انیلا کے والدین ہوئے ہی تھے۔ کم حیران انیلا اور رباب بھی نہیں ہوئیں۔ انیلا اتنی آسانی سے علی کے پیچھے ہٹنے پر حیران تھی تو رباب اپنی خوش قسمتی پہ کہ اللہ کتنا مہربان ہے کہ بنا کہے اس کے دل کی خواہش پوری کر رہا تھا۔

تنویر اور مبینہ بیگم کو کیا اعتراض ہونا تھا ایک بیٹی کی جگہ دوسری قدر دان لوگوں میں چلی گئی ویسے بھی رباب جتنی ادب احترام کرنے والی اور صابر بچی تھی۔ مبینہ بیگم اس کے لیے ایسی ہی خوش بختی کی دعا کرتی تھیں جو اس کے حصے میں انیلا کی خودسری اور بے وقوفی کی وجہ سے خود بخود آگئی۔

☆ ☆ ☆

"ضیاء آپ سے ایک بات کہوں۔ اگر برا نہ مانیں

لو۔" ضیا اسعدی نے شام میں بریرہ کے گھر کال کی تو بریرہ نے خیر خیریت دریافت کرکے ضیاء سے کچھ باتیں کلیئر کرنے کا سوچا۔

"جی ضرور..... کیوں نہیں کیا پوچھنا ہے آپ کو۔" ضیا اسعدی اس کے لہجے کی سنجیدگی پہ دل ہی دل میں حیران ہوتے ہوئے بولا۔

"آپ اپنے دوست مدثر کو کتنا جانتے ہیں۔" بریرہ انیلا کی زبانی مدثر کی خوبیاں سن چکی تھی مگر مدثر کے متعلق ماریہ' رینا لوگوں کی سرگوشیاں بھی سنتی رہتی تھی اس لیے یہ جانتے ہوئے کہ کسی زمانے میں ضیاء اسعدی اور مدثر بہترین دوست رہے ہیں۔ اسعدی ہی سے حقیقت معلوم کرنے کی ٹھانی۔

"ہونہہ..... میں جانتا ہوں کہ آپ یہ بات کیوں پوچھ رہی ہیں' بریرہ اپنی دوست کو سمجھائیں۔ مدثر ڈالی ڈالی گھومنے والا بھنورا ہے۔ وہ انیلا کے بارے میں تو کیا خود اپنے بارے میں بھی سنجیدہ نہیں۔ اور پھر اب جس گروپ کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا ہے وہ بدنام ترین گروپ ہے یونیورسٹی کا۔ بلکہ یونیورسٹی سے باہر بھی ان کی سرگرمیاں کوئی قابل تعریف نہیں' میں تو مدثر کو اپنے تئیں سمجھا سمجھا کر تھک چکا ہوں۔ وہ بنا ٹھوکر سبق حاصل نہیں کرے گا آپ انیلا سے کہیں کہ اس کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ مدثر سے کنارہ کش ہو جائے ورنہ ذلت اور رسوائی کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ آل ریڈی پوری یونیورسٹی میں ان کے افیئر کی باتیں گردش کر رہی ہیں۔" ضیا اسعدی نے تفصیلاً" جواب دیا۔

ضیاء اسعدی کی باتوں نے بریرہ کو مزید پریشان کر دیا تھا وہ انیلا کی بے وقوفیوں کو جانتی تھی وہ جس بات پہ اڑ جاتی۔ چاہے نقصان ہو پیچھے نہیں ہٹتی تھی اور بارہا ضد میں اپنا نقصان کروا چکی تھی۔ مگر اب ــــ بات کردار اور زندگی کی تھی بریرہ نے ضیا اسعدی کو یقین دلایا کہ وہ انیلا سے کھل کر بات کرے گی اور اسے ہر ممکن سمجھائے گی مگر خود ہزار وسوسے لے کر بیٹھ گئی اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ انیلا کو کیسے قائل کرے۔

☼ ☼ ☼

"مدثر ہم کہاں جارہے ہیں؟" انیلا' مدثر کے ساتھ کار میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کہانا..... سرپرائز ہے تمہارے لیے۔" مدثر نے ذومعنی سا جواب دیا تھا۔

"پھر بھی پتا تو چلے۔" انیلا اس کے پراسرار اور ذومعنی انداز سے پریشان ہو رہی تھی۔ رات مدثر نے اسے کہا تھا کہ صبح یونیورسٹی سے چھٹی کرنے کیونکہ وہ اسے کہیں لے کر جانا چاہتا ہے۔ اس نے بہت پوچھا کہاں اور کیوں..... مگر مدثر کا ایک ہی جواب تھا۔

"مجھ سے محبت ہے نا تمہیں..... بس اعتبار کرو۔ کہیں غلط جگہ نہیں لے کر جاؤں گا۔" تو وہ اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آگئی۔ وہ مدثر کے کہنے پہ کہ مجھ پہ اعتبار کرو۔ سب باتوں کو پس پشت ڈالی چکی تھی۔ کیونکہ اس کی محبت میں جس قدر آگے بڑھ چکی تھی وہ اس کے بارے میں کچھ غلط سوچ ہی نہیں سکتی تھی اور یہی اس کی بھول اور غلطی تھی کہ وہ ایک شخص کے لیے اپنے پیاروں کو دھوکا دے رہی تھی۔

دوسری طرف مدثر آخر کار پاشا کی پڑھائی پٹی میں آ چکا تھا۔ وہ انیلا کے ساتھ آخری گیم کھیلنا چاہتا تھا۔ وہ اسے آزمانا چاہتا تھا۔ اگر وہ اس کی بات مانتی تو وہ اس کے ساتھ سب کچھ کر کرا کے اسے چھوڑ دیتا۔ کیونکہ ایسی لڑکیوں کا یہی انجام ہونا چاہیے اور اگر وہ انکار کرتی ۔ تو چھوڑنا تو تب بھی اسے تھا۔ انیلا کا اس کے ساتھ چلے آنا۔ اس کے ذہن میں پاشا کے ڈالے گئے خیال کو پختہ کر رہا تھا کہ سب لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔

وہ انیلا کو اس وقت پاشا کے فلیٹ پہ لے جارہا تھا جو کہ اس مقصد کے لیے پاشا نے اسے آفر کیا تھا اور انیلا بےخبری میں کس دلدل میں دھنسنے جارہی تھی وہ نہیں جانتی تھی اور جانتا مدثر بھی نہیں تھا کہ پاشا اپنے ذہن میں کیا سوچے اس کا انتظار کر رہا ہے۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو ضیا پلیز پتا کروائیں کہ آپ کا دوست انیلا کو

لے کر کہاں گیا ہے۔ وہ یونیورسٹی کے گیٹ کے باہر سے ہی مدثر کے ساتھ کار پر بیٹھ کر کہیں گئی ہے۔" بریرہ نے انتہائی پریشانی میں ضیاء اسعدی کو کال کی۔ جو پیریڈ لے کر ابھی کلاس سے باہر نکلا تھا۔ بریرہ کو کلاس کی لڑکی سے پتا چلا کہ انیلا یونیورسٹی کے باہر سے ہی مدثر کے ساتھ کہیں گئی ہے اور ضیا اسعدی کی چند دن پہلے کی گئی باتوں نے بریرہ کے بدن میں خوف کی لہر دوڑا دی تھی۔

انیلا اپنی بے وقوفی اور سراب محبت کا پیچھے کرتے کرتے اپنا بہت نقصان کرنے والی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہ آیا تو ضیا اسعدی کو کال کر دی کیونکہ انیلا کا سیل آف جارہا تھا۔ اور ضیا اسعدی اس کی بات سن کر مزید پریشان ہوگیا۔ بریرہ کو حوصلہ دے کر اس نے سیل پاکٹ میں ڈالا اور لمحہ لگا اسے فیصلہ کرنے میں کہ اسے کیا کرنا ہے۔ کیونکہ آج پاشا ابھی یونیورسٹی نہیں آیا تھا اور مدثر اور پاشا کا ہر وقت کا ساتھ کوئی نئی کہانی سامنے لانے ہی والا تھا۔

وہ سیدھا پرنسپل آفس کی طرف بڑھا۔ وہاں جاکر اس نے سر ذیشان سے تمام معاملہ ڈسکس کیا۔ معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے انہوں نے فوراً" پاشا کے دوستوں کو آفس میں طلب کیا اور پاشا کا موجودہ ایڈریس لے لیا۔ کیونکہ پاشا آئے دن اپنی رہائش بدلنے کا عادی تھا۔ پہلے تو اس کے دوستوں ظفر اور شیراز نے آئیں بائیں شائیں کی کیونکہ آج کی متوقع واردات کا انہیں پتا تھا مگر سر ذیشان کے ڈرانے دھمکانے پہ فوراً" سچ اگل دیا کہ وہ اس وقت کہاں موجود ہے اور کس ارادے سے ..... یہ خبر ان کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھی۔ ضیا اسعدی اور سر ذیشان فوراً" پاشا کے گھر کے لیے نکلے۔

☼ ☼ ☼

"پاشا تم نے مجھ سے کیا کہا تھا اور اب کیا کہہ رہے ہو۔ دیکھو اس لڑکی کے ساتھ جو بھی معاملہ ہے میرا ہے۔ چاہے میں اس کے ساتھ مخلص نہ تھا مگر میں اسے تمہارے ہاتھوں کھلونا نہیں بننے دوں گا۔" مدثر پاشا کے ساتھ دوسرے کمرے میں تھا۔ پاشا کا مطالبہ سن کر چکرا گیا۔ پاشا اس وقت ڈرنک کر کے مکمل مدہوش ہوا بیٹھا تھا اور وہ انیلا کے حسن کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے بے چین تھا اسی لیے جس وقت مدثر' انیلا کے ساتھ وہاں پہنچا۔ تو پاشا نے جس انداز میں انہیں ویلکم کیا۔ مدثر کو ہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ انیلا کے چہرے سے نظریں چراتا ہوا اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر پاشا کو لے کر اس کے بیڈ روم میں آیا گیا۔ مگر وہاں پڑی خالی بوتلیں دیکھ کر اسے جھٹکا لگا کیونکہ جتنی ڈرنک پاشا کر چکا تھا اسے کل ہی ہوش آنا تھا۔ مگر پاشا نشہ کرنے کا عادی تھا۔ اس لیے ابھی اتنا بھی بے ہوش نہیں ہوا تھا بلکہ مدثر سے کہنے لگا۔

"چھوڑو کل کا اندیشہ..... آج اس وقت کو رنگین بنالیں۔" اور مدثر کے ذہن پر اس کی باتوں نے حیرتوں کے پہاڑ توڑ دیے۔ پاشا پہلے تو پیار سے اسے قائل کر رہا تھا پھر دھمکیوں پہ اتر آیا۔

"مدثر سیدھی طرح میری بات مان لو..... ورنہ پچھتاؤ گے۔ ظفر اور شیراز کے ذمے پہلے ہی میں نے یہ کام لگا دیا ہے وہ یونیورسٹی میں مشہور کر چکے ہوں گے کہ تم اس پھلجھڑی کو کس مقصد کے لیے کہاں لے کر گئے ہو۔ اب وہ مقصد تم پورا کرو یا میں..... نام تمہارا ہی آنا ہے۔" پاشا کی اس دھمکی نے مدثر کی رہی سہی قوت مزاحمت بھی ٹھنڈی کر دی۔ وہ پریشانی سے ادھر ادھر چکر لگا رہا تھا کہ کرے تو کیا کرے۔ اور انیلا جو ڈرائنگ روم میں مدثر کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی تو اس غرض سے کہ وہ واپس کیوں نہیں آرہا اندر کی جانب آئی وہ سمجھی تھی کہ پاشا کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اس کی سرخ آنکھوں کو وہ بخار سمجھ رہی تھی اور یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ بھیڑیا اس کے لیے یہ اہتمام کیے بیٹھا ہے۔

جب وہ بیڈ روم کے دروازہ پر دستک دینے ہی لگی پاشا کی آئی آواز نے اس کے قدموں تلے سے زمین کھینچ دی وہ بولنے کے قابل ہی نہیں رہی۔ مدثر کا مکروہ

چہرہ اس کے سامنے آیا۔ مگر اسے اس سے زیادہ خود سے گھن آرہی تھی کہ اسے آئے تقریباً" گھنٹہ ہوگیا تھا اور ظفر' شیراز نے اب تک پوری یونیورسٹی میں یہ بات پھیلادی ہوگی۔

وہ واپس پلٹی مگر عین اسی وقت باہر گیٹ پر کسی نے بیل دی اور شاید آنے والا بہت عجلت میں تھا کہ بیل پہ ہاتھ رکھ کر ہٹانا بھول گیا۔ انیلا کی ٹانگوں میں تو دم ہی نہیں رہا تھا کہ حرکت کرتی۔ مگر بیل کی آواز نے مدثر اور پاشا کو جگادیا تھا پاشا حیران ہوا کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے جب کہ ظفر اور شیراز بھی یونیورسٹی میں تھے اور مدثر پریشان اور خوف زدہ کہ آنے والا وقت اس کے لیے بہت کڑی آزمائش لا رہا تھا وہ نادانیوں میں دشمن کو دوست سمجھ بیٹھا تھا اور اس کے بہکاوے میں آکر بری طرح پھنس چکا تھا۔

دونوں اکٹھے بیڈ روم سے نکلے اور بیڈ روم کے تھوڑے فاصلے پر کھڑی انیلا کے خوف سے سفید پڑتے چہرے کو دیکھ کر مدثر بھاگ کر اس کی طرف آیا جب کہ پاشا گیٹ کی جانب بڑھا۔۔۔۔ پاشا کے گیٹ کھولنے پر باہر موجود دونوں نفوس بھاگ کر اندر داخل ہوئے تھے۔ سرزیشان نے پاشا کو دھکے سے پیچھے دھکیلا تھا جب کہ ضیا اسعدی اندر کی جانب بڑھا۔

☼ ☼ ☼

آفس میں اس وقت سرزیشان علی چوہدری' ضیاء اسعدی' پاشا' ظفر اور شیراز موجود تھے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر تھا کہ وہ لوگ بروقت وہاں پہنچ گئے تھے انیلا خوف سے بے ہوش ہو گئی تھی ضیا اسعدی فوراً" اسے ہسپتال لے گیا اور پاشا کی حالت اور گھر میں موجود چیزوں سے اس کی طرز زندگی کا بخوبی اندازہ کرنے کے بعد سرزیشان نے انہیں اگلے دن آفس میں طلب کیا تھا۔

مدثر تو مارے شرمندگی کے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہو چکا تھا کہ برے دوست برے انجام تک ہی لے جاتے ہیں اور ضیا اسعدی جیسے دوست کو کھونے کا دکھ بھی تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنی ذلت اور رسوائی کا خوف بھی تھا۔ جو اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اب اس کے پچھتاوے اسے کچھ نہیں دے سکتے تھے۔ اثر اگر نہیں ہوا تھا تو پاشا اور اس کے دوستوں پر۔

"میں چاہتا تو تم لوگوں کو پولیس کے حوالے بھی کر سکتا تھا۔ ڈی ایس پی جبران میرا بھائی ہے اور تم جیسے آوارہ لوگوں کو سیدھا کرنا جانتا ہے اور اگر میں چاہتا تو تم پر دو تین کیس ڈلوا کر ساری زندگی جیل میں سڑوا سکتا تھا۔۔۔۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔۔۔۔ جانتے ہو کیوں؟" سرزیشان کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ پاشا اور اس کے ساتھی بھی ان سے نظریں نہ ملا سکے۔

"اس لیے کہ وہ زندگی تم لوگوں کو مزید برائی کے رستے پر لے جاتی اور تم اپنی غلطیوں سے سیکھنے کے بجائے اس پر پکے ہو جاتے اور تمہارے والدین معاشرے میں کسی سے نظریں نہ ملا پاتے۔ کیا اس دن کے لیے انہوں نے تم لوگوں کو پڑھایا کہ تم لوگوں ان کے ہاتھوں پر بدنامی کی مہر لگاؤ اور پاشا میری معلومات کے مطابق تمہاری فیملی میں ایک بیوہ ماں اور دو جوان بہنیں ہیں کیا تم چاہو گے کہ کل کوئی ان کے ساتھ۔۔۔۔"

"سر۔۔۔۔ پلیز میری بہنوں کا ذکر مت کیجیے گا۔" پاشا کا چہرہ شرمندگی سے سرخ ہو گیا تھا۔ زیشان کے منہ سے اپنی بہنوں کا ذکر سن کے۔ اس نے تو آج تک کبھی اپنے دوستوں کے سامنے نام تک نہیں لیا تھا کہ اس کی بہنیں بھی ہیں۔

"بہت خوب۔۔۔۔ اپنی عزت کا نام ہی لیا گیا تو تڑپ اٹھے ہو اور جن کی عزتیں سرعام نیلام کرتے پھرتے ہو۔ ان کے بارے میں کیا خیال ہے۔ تم چاروں میری ایک بات یاد رکھنا۔ دنیا مکافات عمل ہے۔ تم جس کے ساتھ جیسا سلوک کرو گے ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کا بدلہ دیے بغیر قبر میں اتارے جاؤ۔ جو تکلیف تمہاری وجہ سے کسی کو ملی ہے وہ تمہیں ضرور ملے گی اور اگر وہ بدلہ تم سے نہ لیا گیا تو تمہارے حصے کا قرض تمہاری

بہنیں' بیٹیاں اتاریں گی۔" سرزیشان کے لفظ تھے یا انگارے۔۔۔۔ چاروں کے منہ پر تازیانے بن کر لگ رہے تھے۔

کہتے ہیں نا کہ زندگی کا ایک لمحہ ایسا ہوتا ہے جس میں انسان کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ آج تک ان کی برائی کا جواب برائی سے ہی دیا گیا تھا شاید اسی لیے وہ برائی میں اور شیر ہوئے گئے مگر آج جب سرزیشان نے انہیں تصویر کا دوسرا رخ دکھایا تو انہیں احساس ہوا تھا کہ وہ اندر سے کتنے کالے ہیں ہر ایک اپنے ضمیر کی عدالت میں جا کھڑا ہوا تھا اور یہی سرزیشان علی چوہدری کا مقصد تھا۔ وہ نوجوان نسل کو یوں بھٹکتا ہوا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ بس ان کے ضمیر کو جگانا تھا اور انہیں احساس دلانا تھا کہ جو وہ کر رہے ہیں وہ غلط ہے۔ باقی اللہ پہ چھوڑ دیں۔ وہ ہمیشہ اندھیرے میں اپنے حصے کی شمع جلانے کے عادی تھے اور انہوں نے وہ کام کر دیا تھا۔ چار گمراہی کے راستے پہ چلنے والوں کو بھٹکنے سے بچالیا تھا۔ اور یہ کم کامیابی نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

آج رباب آویز اور قلب علی کی بارات تھی۔ قلب علی' رباب کے سنگ۔ بہت مطمئن اور خوش نظر آرہا تھا اور رباب آویز کے دل کی خوشی اور چاہت اس کے چہرے پر نور بن کر برس رہی تھی۔ اس کی فرماں برداری اور صبر و شکر کی عادت نے آج اسے اس کی من چاہی منزل دے دی تھی۔ انیلا بظاہر تو اس فنکشن میں خوش خوش نظر آرہی تھی۔ مگر اس کے اندر جو قیامت برپا تھی وہ وہی جانتی تھی۔

اس دن کے بعد وہ یونیورسٹی نہیں گئی تھی۔ حالانکہ بریرہ' ضیا اسعدی اور سرزیشان علی چوہدری تک نے اسے سمجھایا تھا مگر وہ اس دنیا کو فیس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے اتنے بڑے دھوکے کے بعد کسی پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ یہ بھی سچ تھا کہ جب پاشا کے فلیٹ میں بے ہوش ہو کر وہ مدثر کی بانہوں میں گری تھی۔ مدثر اپنے کیے پہ نادم اور پشیمان تھا وہ انیلا کے ساتھ اپنے رشتے کو نام دینے کا خواہش مند تھا۔ مگر انیلا نے سرد مہری سے اس کی ہر بات' ہر صفائی سننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ خود کو اپنی خود سری اور لالچ اور خود پسندی کی سزا دینا چاہتی تھی وہ دوبارہ ان لوگوں کا نام بھی سننا نہیں چاہتی تھی جو اسے بدنامی کے گڑھے تک لے گئے تھے۔ اس پر حقیقتیں آشکار ہو چکی تھیں اور اسے احساس ہو گیا تھا کہ ماں باپ کی نافرمان اولاد کبھی بھی سکھ نہیں پاتی۔ اس نے تو ہر رشتے کو دکھ دیا تھا۔ ہر رشتے کو دھتکارا تھا اور قلب علی کو دیکھ کر اس کا احساس زیاں اور دوچند ہو جاتا۔

رباب آویز کی بات سچ ثابت ہوئی تھی۔ وہ احساس زیاں اور احساس جرم کے پچھتاووں میں گھری جا رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے وہ اپنے کمرے میں آکر زار و قطار رو پڑی۔ حقیقت ہے کہ انسان جب اپنے گرد موجود لوگوں کی محبتوں اور چاہتوں کی قدر نہیں کرتا۔ تو ان کے روٹھ جانے پہ وہ یونہی تہی داماں رہ جاتا ہے۔

انیلا نے اپنی آنکھوں میں سجے سب خواب نوچ ڈالے تھے اور وہ ایک نئی انیلا کو اس معاشرے کے سامنے لانا چاہ رہی تھی کہ اس جیسی بے وقوف لڑکیاں اس طرح کی غلطیاں دوبارہ نہ دوہرائیں۔

☼ ☼

صائمہ خان

کسک

"پھوپھو! دوپہر کے کھانے میں کیا بنانا ہے؟"
ماہم گھر کی صفائی کرنے کے بعد سائرہ بیگم کے کمرے میں آگئی۔ جہاں سائرہ بیگم کو استری کرتے دیکھ کر وہ چلا اٹھی۔

"پھوپھو! یہ کیا کررہی ہیں آپ' میں کرلوں گی نا' چلیں چھوڑیں یہ سب۔" وہ انہیں شانوں سے پکڑ کر وہاں سے ہٹانے لگی۔

"ارے' ارے ماہم۔" سائرہ گھبرا کر خود کو چھڑانے لگیں۔ مگر ماہم نے انہیں بیڈ پر بٹھادیا۔

"یہ میں لنچ کے بعد کرلوں گی۔ ویسے بھی اتنی لمبی دوپہریں ہیں کہ کٹتی ہی نہیں۔"

"تھک جاؤ گی اتنے سارے کام کرکے۔" سائرہ کے لہجے میں بھتیجی کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

"یہ کوئی اچھی بات تو نہیں کہ تم سارے گھر کے کام کرو اور میں فارغ بیٹھ کر پلنگ توڑتی رہوں' ساتھ میں بور ہوتی جاؤں۔"

"بور کیوں ہونے لگیں آپ' ٹی وی پر اپنے فیورٹ پروگرام دیکھیں۔ ڈرامے یا پھر کوکنگ شوز دیکھیں اور انجوائے کریں۔ جب تک میں یہاں ہوں تب تک کے لیے فل آرام اینڈ نو کام۔" ماہم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ماہم! مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تم سے یوں کام کراتے ہوئے۔ تم یہاں چند روز کی مہمان ہو اور۔۔۔"

"میں مہمان ہوں اور نہ ہی چند روز میں یہاں سے ٹلنے والی ہوں' میں تو ڈیڑھ' دو مہینے گزار کر ہی جاؤں گی۔ تب تک کے لیے آپ کو مجھے برداشت کرنا ہی ہوگا۔" ماہم' سائرہ کی بات کاٹتے ہوئے شوخ لہجے میں بولی۔

"میرا بس چلے تو میں تمہیں یہاں سے جانے ہی نہ دوں۔" سائرہ کے لہجے میں ماہم کے لیے جیسے دنیا بھر کا پیار سمٹ آیا۔ جواب میں ماہم مسکرادی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی پھوپھو اسے بے حد چاہتی ہیں۔

ماہم' سائرہ کے اکلوتے بھائی کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس لیے انہیں کچھ زیادہ ہی عزیز تھی۔ ان دنوں وہ پشاور سے یہاں رہنے کے لیے آئی تھی۔ اتفاق سے اس کے آتے ہی سائرہ بیمار ہوگئیں۔ اس وجہ سے گھر کے سارے کام ماہم نے اپنے ذمے لے لیے۔ اب وہ ٹھیک ہوچکی تھیں۔ مگر ماہم پھر بھی انہیں کوئی کام نہیں کرنے دے رہی تھی۔ سائرہ بہت کم ہی دوسروں کے کام سے مطمئن ہوتی تھیں' لیکن ماہم نے جس سلیقے اور ترتیب سے گھر سنبھالا تھا سائرہ حیران ہی رہ گئیں۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ ان کی لاڈلی اور چلبلی بھتیجی اتنی سلیقہ مند اور گھر کے کاموں میں ماہر ہوسکتی ہے۔ ان چند ہی دنوں میں ماہم نے سب کو اپنا عادی بنالیا تھا۔ عدیم' تیمور اور ثاقب جو پہلے ماں کے اکیلے پن کی وجہ سے اپنے کافی حد تک کام خود کرلیتے تھے۔ اب ذرا' ذرا سی بات پر ماہم کو آوازیں دیتے۔ خاص طور پر صبح کے وقت گھر میں ماہم کے نام کی صدائیں ہی بلند ہوتیں۔

دوپہر کے کھانے کے بعد سائرہ اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلی گئیں۔ وہ باقاعدگی سے دوپہر میں دو گھنٹے کی نیند لیتی تھیں۔ ماہم نے کچن سمیٹا اور کمرے میں آگئی۔ نماز پڑھ کر وہ بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ وہ اپنے گھر میں اس وقت سونے کی عادی نہیں تھی مگر چونکہ یہاں وہ صبح جلدی جاگ جاتی تھی' اس لیے کھانا کھاتے ہی اس پر نیند حملہ آور ہوجاتی۔

اسے سوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ دروازے پر ہونے والی بیل سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے وال کلاک پر نظر ڈالی جو چار بجارہی تھی۔

"اس وقت کون آگیا۔" اس نے جھنجلا کر سوچا۔ ثاقب اور تیمور گھر پر تھے۔ اس لیے اس نے اٹھنا ضروری نہیں سمجھا۔ دوبارہ سونے کی کوشش کی' لیکن نیند آنکھوں سے غائب تھی۔ اسے اپنی اس عادت سے سخت چڑ تھی۔ ایک بار آنکھ کھلتی تو پھر مشکل سے ہی نیند آتی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ کون آیا ہوگا' کیونکہ انکل اور عدیم تو اس وقت آفس میں ہوتے ہیں۔ وہ اس سوچ میں تھی جب ثاقب آوازیں دیتا ہوا آیا۔

"ماہم آپی۔" ماہم جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"آپ جاگ رہی ہیں؟" اسے دیکھ کر ثاقب نے پوچھا تو ماہم بے اختیار ہنس دی۔

"تمہیں کیا لگ رہا ہے۔" ثاقب جھینپ گیا۔

"وہ۔۔۔ وہ میرا مطلب تھا کہ میں نے آپ کی نیند تو خراب نہیں کی۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں، تم بتاؤ کوئی کام تھا؟" ماہم نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ میرے دوست آئے ہیں، اگر آپ چائے بنا دیں تو۔۔۔" ثاقب کو اب شرمندگی ہو رہی تھی یہ سوچ کر کہ اس نے ماہم کے آرام میں خلل ڈالا۔

"اچھا تو یہ تمہارے دوست تھے جن کی بیل سے میری آنکھ کھلی۔"

"ہمارے ٹیسٹ ہونے والے ہیں، تو ہم نے سوچا مل کر تیاری کریں گے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ آکر میرے موبائل فون پر مس کال کر دینا۔ میں دروازہ کھول دوں گا، مگر ان بے وقوفوں نے بیل بجا دی۔" ثاقب نے معصومیت سے کہا۔ اسے واقعی میں اپنے دوستوں پر غصہ آیا تھا، جس کا ثاقب نے اس کے سامنے اظہار بھی کر دیا۔ ثاقب کو ڈر تھا کہیں ماں کی نیند خراب نہ ہو جائے، ورنہ وہ بہت غصہ ہوں گی۔ باہر چھائی خاموشی سے لگ رہا تھا کہ بجنے والی بیل ان کی نیند پر اثر انداز نہیں ہو سکی، کیونکہ دوسری صورت میں وہ ثاقب کی کلاس لے رہی ہوتیں۔

"ٹھیک ہے، تم اپنے دوستوں کے پاس جاؤ، مگر اتنا بتا دو صرف چائے یا پھر ساتھ میں کچھ اور بھی؟"

"جیسے آپ کی مرضی۔" ثاقب مسکراتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ ماہم نے بال سمیٹ کر کیچر لگایا اور منہ ہاتھ دھو کر کچن کی جانب چل دی۔

☼ ☼ ☼

ماہم کو آئے ہوئے مہینہ ہونے کو تھا، لیکن وہ ابھی تک کہیں گھومنے کے لیے نہیں گئی تھی۔ اس بات پر سائرہ سخت برہم تھیں۔

"غضب خدا کا کسی کو ذرا سا احساس نہیں کہ کزن آئی ہے اسے ۔۔۔ کر تفریح کرا دیں۔ سب اپنے آپ میں مگن ہیں۔ بس کام کے وقت کزن یاد آئی ہے۔ ماہم یہ کر دو، ماہم وہ کر دو۔" سائرہ بہت غصے میں تھیں۔ یہ سب وہ خاص طور پر عدیم کو سنا رہی تھیں۔ کیونکہ ثاقب اور تیمور اپنی طرف سے ماہم کو کمپنی دے رہے تھے۔ تقریباً" روز ہی آئس کریم کھلانے بھی لے جاتے تھے۔

"ممی! میں خود ماہم سے کئی بار کہیں باہر جانے کے لیے کہہ چکا ہوں، مگر اس کا کہنا ہے کہ اسے سیر سپاٹوں کا کوئی شوق نہیں۔ باہر جانے کے نام سے ہی اسے الجھن ہونے لگتی ہے۔" عدیم بے حد سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ ماہم حیرت سے عدیم کو دیکھنے لگی۔

"میں نے یہ کب کہا تھا؟" سائرہ عدیم کی بات سن کر کچھ حیران ہوئی تھیں۔ مگر ماہم کے چہرے پر پھیلی حیرت دیکھ کر وہ فوراً" سمجھ گئیں۔ عدیم پھر سے کہنے لگا۔

"ماہم! اگر تمہیں کہیں آنا جانا پسند نہیں تو کم از کم ممی کا دل رکھنے کے لیے ہی مان جاؤ۔"

"عدیم! کہیں تم نے خواب تو نہیں دیکھ لیا؟" ماہم کو اس کے جھوٹ پر غصہ آ رہا تھا۔

"پھوپھو! نہ تو اس نے مجھے کہیں جانے کے لیے کہا ہے اور نہ ہی میں نے منع کیا ہے؟" اس نے سائرہ کو بتایا۔

ماہم کو یوں غصہ ہوتا دیکھ کر عدیم کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ثاقب اور تیمور بھی مسکرانے لگے۔ ماہم کو بہت جلد غصہ آ جاتا تھا۔ جبکہ عدیم اسے تنگ کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

"عدیم! یہ بتاؤ کب لے جا رہے ہو سب کو گھمانے؟" سائرہ نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں نے کب انکار کیا ہے۔ بس یہ ماہم راضی ہو جائے تو چلے چلیں گے۔" عدیم کو اسے ستانے میں مزا آ رہا تھا۔

"عدیم! جھوٹ اور ڈھٹائی کی بھی حد ہوتی ہے۔"

وہ جھینپ سے اسے دیکھنے لگی۔

"بھائی جان! آپ پروگرام سیٹ کر لیں۔ آپی کو ہم منا لیں گے۔" تیمور شوخی سے مسکرایا۔

"یار تیمور! اگر ماہم نہیں جانا چاہتی تو کوئی بات نہیں۔ ہم اسے سب جگہوں کے بارے میں تفصیل سے بتا دیں گے۔ پھر اسے یوں لگے گا جیسے اس نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رکھا ہو۔" عدیم نے اسے چھیڑنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے کچھ بتانے کی۔ تم مجھے نہیں لے جانا چاہتے تو مجھے بھی کوئی شوق نہیں تمہارے ساتھ جانے کا۔" وہ ناراض ہو گئی۔

"ممی! سنا آپ نے، یہ خود کہہ رہی ہے کہ اسے کوئی شوق نہیں۔"

"بہت ہو گیا مذاق، سیدھی طرح بتا دو، کب لے جا رہے ہو سب کو پکنک پر۔" اسے ناراض ہوتا دیکھ کر سائرہ نے سخت نظروں سے عدیم کو گھورا۔

سائرہ کے موڈ کو دیکھ کر عدیم سمجھ گیا کہ اب ذرا سی بھی ادھر ادھر کی بات کی تو وہ بھی ناراض ہو جائیں گی۔ اس لیے وہ ماہم کو مزید تنگ کرنے کے بجائے بڑی فرماں برداری کے ساتھ بولا۔

"جب آپ کہیں، بندہ حاضر ہے۔"

"اسی سنڈے کو چلتے ہیں، کتنا وقت ہوا ہے سب گھر والے مل کر پکنک کے لیے نہیں گئے اور اب تو ماہم آپی بھی ہیں۔ سچ بڑا مزا آئے گا۔" سائرہ کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ثاقب نے کہا۔

"پھوپھو! مجھے کہیں نہیں جانا۔" ماہم روٹھے روٹھے انداز میں بولی۔

"لیکن کیوں۔۔۔" ثاقب نے کہا۔ وہ اس پکنک کو لے کر کافی ایکسائٹڈ ہو گیا تھا۔

"یہ اتنے نخرے جو دکھا رہا ہے۔" اس نے خفگی سے کہا۔

"اور اب نخرے دکھانے کی باری تمہاری ہے۔" عدیم نے جھٹ سے کہا۔ سب بے ساختہ ہنس دیے۔

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔" ماہم

جھینپ گئی۔ ساتھ ہی ان کے پاس پڑا کشن اٹھا کر اسے مارا۔ ماہم کے آنے سے جہاں سائرہ بے حد خوش تھیں وہیں انہیں زندگی میں بیٹی کی کمی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔ سائرہ کی بہت خواہش تھی کہ ان کی ایک بیٹی ہوتی۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے تین بیٹوں کی ماں بنا دیا تو انہوں نے قسمت کے لکھے پر صبر شکر کرتے ہوئے اپنے دل میں بیٹی کے لیے موجود جذبات اور محبتوں کا رخ ماہم کی جانب موڑ دیا۔ انہوں نے ماہم کی صورت میں بیٹی کو تلاشا۔ یہ الگ بات کہ اس بیٹی کو وہ مہینوں یا سال بعد ہی دیکھ پاتیں۔

سائرہ کے شوہر جمال احمد کا بزنس کراچی میں سیٹ تھا، جبکہ بھائی اپنی جاب کے سلسلے میں پشاور میں مقیم تھے۔ البتہ ان کے درمیان موجود فاصلوں اور دوریوں نے ان کے پیار کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ سائرہ اب یہ سوچ سوچ کر ہی اداس ہو رہی تھیں کہ ماہم کے جانے سے گھر کتنا بے رونق اور سونا سونا ہو جائے گا۔ ماہم کے جانے کے تصور سے ہی وہ گھبرا جاتیں اور پھر ماہم چلی گئی۔ پتا ہی نہیں چلا اور دو مہینے گزر گئے۔ اسے وداع کرتے وقت سائرہ ایسے رو رہی تھیں گویا سچ مچ بیٹی کی رخصتی کر رہی ہوں۔ پھوپھو اور بھتیجی کو یوں روتا دیکھ کر عدیم نے انہیں چھیڑا۔

"آپ لوگ تو ایسے رو رہی ہیں جیسے یہ اپنے گھر نہیں گوانتاموبے جا رہی ہو۔" اس پر سائرہ نے اپنی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے بڑی سختی سے اسے گھورا۔ کیونکہ رونے کی وجہ سے ان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

سب ہی رو رہے تھے۔ ماہم نے انہیں اپنا عادی بنا دیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں اس گھر کا حصہ رہی ہو۔ اس کے بغیر گھر بہت خالی خالی لگنے لگا تھا۔ ثاقب اور تیمور جو دونوں اپنا فارغ وقت گھر میں گزارنے لگے تھے۔ ماہم کو بوریت سے بچانے کے لیے کبھی لڈو کھیلتے تو کبھی کرکٹ، تو کبھی دنیا جہان کے قصے سنتے سناتے۔ ماہم کے چلے جانے سے ان کی پرانی روٹین شروع ہو گئی تھی۔ کالج سے آتے ہی یا تو کمپیوٹر

کے آگے بیٹھ جاتے یا پھر دوستوں کے ساتھ باہر نکل جاتے۔ عدیم اور جمال صاحب وہ تو اپنے بزنس میں اس قدر مصروف تھے کہ گھر کے لیے ان کے پاس بہت کم وقت بچتا تھا۔ سارا دن سائرہ گھر میں اکیلی ہوتیں۔ خالی گھر انہیں کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ ایسے میں انہیں ماہم کی یاد ستانے لگتی۔ ان کی باتیں اس کے کانوں میں گونجتیں۔

اس روز سب کھانا کھا رہے تھے' جب ثاقب نے کہا۔

"میں ماہم آپی کو بہت مس کر رہا ہوں۔"

"صرف تم ہی نہیں۔۔۔ سب ہی انہیں مس کر رہے ہیں۔" پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے تیمور نے بھی حصہ لیا۔

"واقعی۔۔۔ مجھے خود بھی ماہم کی بہت یاد آتی ہے۔" سائرہ کے لہجے میں اداسی گھل گئی۔

"ماہم کی یا پھر اس کے کام کی۔" جمال صاحب مسکرائے۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ ماہم' سائرہ کو کوئی کام نہیں کرنے دیتی تھی۔

"میں اتنی خود غرض نہیں ہوں۔ مجھے ماہم سے محبت ہے' اس لیے مجھے اس کی یاد آتی ہے اور یہ اس کا بھی پیار ہی تھا جو اتنے دنوں مجھے آرام سے بٹھائے رکھا' ورنہ تمہاری وہ چہیتی بھانجیاں۔۔۔ انہیں ذرا سی توفیق نہیں ہوتی کہ بوڑھی ممانی جو اکیلے ہی ہماری خاطر داریوں میں لگی ہوئی ہیں ان کی کچھ مدد ہی کر دیں۔ آتے ہی ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتی ہیں۔ گویا انہوں نے ٹی وی کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔" جانے کیوں جمال صاحب کی بات پر انہیں غصہ آگیا۔

"چلو اس بہانے ہی سہی' تم نے اپنے بوڑھا ہونے کا اعتراف تو کر لیا۔" جمال صاحب شرارت سے بولے۔

"یہ میں نے بات برائے بات کہا' ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔" سائرہ نے جھٹ سے تردید کی۔ ہر عورت کی طرح وہ بھی اپنی عمر کے بارے میں کانشس تھیں۔

"اب میں سوچ رہی ہوں کہ کچھ دن اور اسے روک لیتی۔"

"تم اسے چاہے جتنے دن بھی روکتیں' آخر کار اسے گھر جانا ہی تھا۔" جمال صاحب نے کہا۔

"کیا اچھا ہوتا اگر آپی ہمیشہ یہاں رہتیں۔" ثاقب نے اداسی سے کہا۔

"ایسا ہو بھی سکتا ہے۔" سائرہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ بہت دنوں سے دل میں دبی بات زبان پر آہی گئی۔ جمال صاحب پل بھر میں سمجھ گئے کہ سائرہ کا اشارہ کس جانب ہے۔

"وہ کیسے ممی؟" ثاقب بہت ہی اشتیاق سے بولا۔ تیمور بھی کھانے سے ہاتھ روک کر سوالیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

"عدیم اور ماہم کی شادی کرا دیں تو۔" سائرہ نے اطمینان سے جواب دیا۔ ثاقب اور تیمور اچھل پڑے۔

"واؤ کیا آئیڈیا ہے۔"

"یہ خیال آپ کے ذہن میں پہلے کیوں نہیں آیا۔" تیمور خوش ہوتے ہوئے بولا۔

وہ دونوں اس نئے رشتے کا سن کر بے حد پر جوش ہو گئے تھے۔ جمال صاحب نے بھی رضامندی دے دی۔ سائرہ کی خوشی قابل دید تھی۔ اس کی ہمیشہ سے یہی خواہش تھی' لیکن ساتھ میں ڈر تھا کہ جانے جمال صاحب کیا کہیں گے۔ اب شوہر کی جانب سے گرین سگنل ملتے ہی وہ کہنے لگیں۔

"میں کل ہی بھائی جان اور بھابھی سے بات کرتی ہوں۔"

"میرے خیال میں ان لوگوں سے بات کرنے سے پہلے تم عدیم سے پوچھ لو تو زیادہ بہتر رہے گا۔" جمال صاحب نے کہا۔ عدیم اس وقت گھر پر نہیں تھا' اپنے کسی دوست سے ملنے گیا ہوا تھا۔

"عدیم کو بھلا کیا اعتراض ہونے لگا۔" سائرہ کے لہجے میں حیرانی در آئی۔

"اعتراض کی تو بظاہر کوئی بات نہیں' لیکن پھر بھی

احتیاط اچھی چیز ہے۔" سائرہ نے عجیب نظروں سے شوہر کی جانب دیکھا اور ایک گہری سانس لی۔

"ٹھیک ہے' وہ آتا ہے تو میں اس سے بات کرتی ہوں۔" سائرہ نے پر سوچ انداز میں کہا۔

☼ ☼ ☼

"امی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" سائرہ کی بات سن کر عدیم کو جیسے کرنٹ لگا۔ وہ ابھی ابھی ہی گھر آیا تھا۔ آتے ہی سائرہ نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔

"کیوں۔۔۔ کیا خرابی ہے ماہم میں۔" عدیم کے اس طرح ری ایکٹ کرنے پر سائرہ ناگواری سے بولیں۔

"ممی! ماہم میں کوئی خرابی نہیں' لیکن میں نے کبھی ماہم کے لیے ایسا نہیں سوچا۔ بلکہ میں نے ہمیشہ اسے بہن ہی مانا ہے۔" ماں کی بات سن کر وہ پریشان ہو گیا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے' وہ تمہاری کزن ہے' بہن نہیں۔ اکثر گھروں میں کزنز' بہن' بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ مگر اس سے وہ بہن' بھائی نہیں بن جاتے۔" سائرہ کو غصہ آگیا۔

"میرے اور بھی کزنز ہیں' لیکن جو احساسات میرے دل میں ماہم کے لیے ہیں وہ کسی اور کے لیے نہیں۔ بچپن سے میرے ذہن نے بہن کا جو خاکہ بنایا ہے ماہم اس پر پورا اترتی آئی ہے۔ میں اسے بہت پیار کرتا ہوں' بالکل اس طرح جیسے ایک بھائی اپنی بہن سے کرتا ہے۔" سائرہ گنگ سی کھڑی اسے دیکھنے لگیں۔ عدیم یہ کیا کہہ رہا تھا۔ ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ انکار بھی کر سکتا ہے۔

"عدیم! یہ تم کیا بے تکی اور بچکانہ سی بات کر رہے ہو۔"

"ممی! کیا آپ نہیں کہتیں کہ ماہم آپ کی بیٹی ہے۔" عدیم نے الٹا ان سے سوال کر دیا۔ پریشان سی کھڑی سائرہ نے بے اختیار اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر۔۔۔ جب میں اسے بہن مانتا ہوں تو یہ میرا بچکانہ پن کیسے ہو گیا۔۔۔ ممی! پلیز مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔ جو آپ چاہتی ہیں وہ پاسیبل نہیں۔ میرا ذہن اسے اس روپ میں کبھی بھی قبول نہیں کرے گا۔"

عدیم کا انکار سائرہ کے لیے بہت بڑا شاک تھا۔ انہوں نے عدیم کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی' لیکن اس کی الگ ہی سوچ تھی۔ اسے ماہم نئے رشتے کے ساتھ قبول نہیں تھی۔ سائرہ چاہتی تو زبردستی اپنی بات منوا سکتی تھیں' مگر وہ اپنی مرضی دوسروں پر مسلط نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی بچوں کی خوشی کو اہمیت دی تھی' جبکہ یہاں تو معاملہ ہی عمر بھر کا تھا۔

کئی دنوں تک وہ سخت اپ سیٹ رہیں۔ ان کی شروع سے ہی یہی خواہش تھی کہ ماہم ان کی بہو بنے' مگر جب ماہم نے یہاں آکر ان کے گھر کو بہت احسن طریقے سے سنبھالا تھا تب سے انہوں نے مصمم ارادہ کیا تھا کہ ماہم کو ہی بہو بنائیں گی۔ ان کی نظر میں عدیم کے لیے ماہم سے بہتر کوئی لڑکی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ماہم کی ساری خوبیاں ایک طرف کر کے بھی اس کا پلس پوائنٹ یہ تھا کہ وہ ان کی بھتیجی تھی۔ سب سے بے حد پیار کرتی تھی اور مخلص تھی۔ مگر افسوس ان کا یہ ارمان دل میں ہی رہ گیا۔ عدیم سختی سے اپنی بات پر قائم تھا' اس کا کہنا تھا۔

"ممی! آپ جس سے چاہیں میری شادی کر دیں' مگر پلیز۔۔۔ مجھے اس رشتے کے لیے مجبور نہ کریں۔"

سائرہ ابھی عدیم کو منا ہی نہیں پائی تھیں کہ ماہم کا رشتہ اس کے پاپا نے اپنے دوست کے بیٹے کے ساتھ کر دیا۔ جلد ہی شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔ یہ خبر سن کر ان کے اندر چھنا کے سے کچھ ٹوٹ گیا۔

"کیا ضرورت تھی بھائی جان کو اتنی جلدی کرنے کی۔ کیا پتا عدیم مان ہی جاتا۔" انہوں نے دکھ کے ساتھ سوچا تھا۔

ماہم جس کی قسمت تھی اس کے گھر چلی گئی۔ شادی میں شرکت کے لیے سائرہ اور عدیم گئے تھے۔ ان کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن بھائی اور بھتیجی کی خوشی کے لیے انہیں جانا پڑا۔ ثاقب اور تیمور کے ایگزام تھے۔ جس کی وجہ سے وہ لوگ نہیں جا سکے۔ وہاں جا کر

ماہم سے مل کر انہیں قدرے تسلی ہوئی۔ وہ اس رشتے سے بہت خوش نظر آرہی تھی۔ خوشیوں کے خوب صورت رنگ اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے تھے۔ وقاص سے مل کر بھی انہیں اطمینان ہوا' وہ ہر لحاظ سے ماہم کے لیے موزوں تھا۔ ان کے دل میں جو کسک تھی وہ کچھ کم ہوگئی۔

سائرہ اور عدیم واپس آچکے تھے۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا۔ سائرہ ایک بار پھر عدیم کی شادی کے بارے میں سوچنے لگیں۔ وہ اپنی تنہائی سے گھبرا گئی تھیں۔ ان کے خیال میں بہو کے آنے سے ہی گھر کی رونق بڑھ سکتی تھی۔ خود لڑکی دیکھنے کے بجائے انہوں نے عدیم سے اس کی پسند پوچھی تھی۔

"ممی! میری زندگی میں ایسی کوئی لڑکی نہیں۔ میری پسند وہی ہوگی جسے آپ منتخب کریں گی۔" عدیم نے سب کچھ ان پر چھوڑتے ہوئے کہا۔

"اگر میری ہی مرضی سے شادی کرنی تھی تو پھر اس وقت میری پسند کو جھٹلایا کیوں تھا۔" سائرہ نے ناگواری سے کہا۔

"پتا نہیں ممی! آپ میری بات کیوں نہیں سمجھ رہیں۔" عدیم کے لہجے میں بے بسی در آئی۔ سائرہ کو اس بات کا بے حد دکھ تھا کہ ماہم ان کی بہو بن نہ سکی اور اب عدیم کے لیے لڑکی ڈھونڈتے ہوئے یہ احساس اور بھی بڑھ گیا تھا ان کی نظر میں آج کل کی لڑکیاں لاپروا اور غیر ذمہ دار ہوتی ہیں اور پھر ایک دو ملاقاتوں میں کسی کے مزاج' عادت و اطوار کے بارمیں کچھ جاننا ناممکن سی بات تھی۔

دل میں طرح طرح کے اندیشے اور وسوسے لیے وہ مدیحہ کو بہو بنا کر لے آئیں یہ رشتہ ایک جاننے والوں کے توسط سے ہو رہا تھا۔ سائرہ پہلی ہی نظر میں مدیحہ کی من موہنی اور بھولی صورت سے متاثر ہوگئی تھیں۔ یہ الگ بات کہ ان کا دل مکمل طور پر مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ انہیں ڈر تھا کہ مدیحہ اس گھر میں کس طرح ایڈجسٹ کرے گی۔ وہ ان کی توقعات پر پوری اتر سکے گی بھی یا نہیں۔

مدیحہ ایک پیاری' سمجھ دار اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ اس نے چند ہی دنوں میں سب گھر والوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ وہ بڑی بہو ہونے کے ناتے اپنی ذمہ داریاں بہ خوبی نبھا رہی تھی۔ مدیحہ کے رویے کو دیکھتے ہوئے سائرہ کو اب مطمئن ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ غیر ارادی طور پر مدیحہ اور ماہم کا موازنہ کرتی رہتیں۔ ان کے خیال میں مدیحہ کچھ بھی کرلے وہ ماہم کی طرح نہیں ہوسکتی۔ اس سوچ کے ساتھ وہ مدیحہ کی چھوٹی سے چھوٹی غلطی پکڑ کر تنقید کرتے ہوئے اسے ماہم کی مثالیں دیا کرتیں۔ ایسے میں مدیحہ ان کی ہر تنقید کو خاموشی اور خندہ پیشانی کے ساتھ سنتی۔ سائرہ یہ بھول گئی تھیں کہ شوقیہ چند دنوں کے لیے کوئی کام کرنا الگ بات ہے اور حقیقی ذمہ داریاں اٹھانا اور بات۔۔۔

ماہم بھتیجی تھی اس لیے اس کی ہر ادا پیاری تھی وہ گھر کے کام کرتی یا پھر ثاقب اور تیمور کے ساتھ ہلا گلا مچائے رکھتی دونوں صورتوں میں سائرہ خوش تھیں۔ لیکن۔۔۔ اگر اب مدیحہ دیوروں کے ساتھ کھیلتی شور شرابا کرتی تو شاید سائرہ کو یہ سب برا ہی لگتا۔ بھتیجی اور بہو میں جو فرق ہے انہوں نے وہ فرق نظر انداز کیا ہوا تھا۔

گھر میں پوتی کی قلقاریاں گونجیں تو انہیں لگا کہ برسوں کی تمنا پوری ہوگئی' سب گھر والوں کی خوشی قابل دید تھی۔ خوب خوشیاں منائی گئیں' دعوتیں ہوئیں۔ ثاقب اور تیمور بھی چاچا بننے پر بے حد خوش تھے سارا دن ننھی بچی کے ساتھ کھیلتے رہتے۔ اس کے روئی کی طرح نرم گالوں کو چومتے تو کبھی اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دیکھتے رہتے تھے۔

ثمن کے آجانے سے مدیحہ کی ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں لیکن اس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ سائرہ کو کوئی شکایات نہ ہو۔ انہی دنوں ماہم کے شوہر وقاص کا تبادلہ کراچی ہوگیا اور وہ لوگ یہیں شفٹ ہوگئے۔

اس روز سائرہ اور مدیحہ کو ماہم کے گھر جانا تھا۔ سائرہ صبح صبح ہی تیار ہو کر بیٹھ گئیں ماہم سے عرصے بعد ملنے کی خوشی ان سے سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔ ماہم کی شادی کے بعد ان کی ملاقات نہیں ہو پائی تھی اور اب ماہم دو بیٹوں کی ماں تھی۔

"ممی! آپ عدیم کے ساتھ چلی جائیں۔ ثمن کی طبیعت ٹھیک نہیں اسی لیے میں نہیں جاسکوں گی۔" سارہ' مدیحہ کے تیار ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔ جب مدیحہ نے آکر بتایا۔

"کیوں، کیا ہوا ثمن کو؟" وہ ایک دم سے پریشان ہوگئیں۔

"اس وقت تو ہلکا سا ٹمپریچر ہے مگر بعد میں طبیعت زیادہ خراب نہ ہوجائے اس وجہ سے میں نے سوچا کہ گھر پر رک جاتی ہوں۔" انہیں یوں پریشان ہوتا دیکھ کر مدیحہ جلدی سے بولی۔

"میرے خیال سے میں بھی پھر کبھی چلی جاؤں گی۔" ثمن کے معاملے میں وہ کچھ زیادہ ہی حساس ہوگئی تھیں۔

"ممی! فکر کی کوئی بات نہیں۔۔۔ آپ چلی جائیں ماہم انتظار کر رہی ہوگی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔" وہ تذبذب میں پڑ گئیں۔

"میں نے کہا نا ایسا کوئی بڑا مسئلہ نہیں اور پھر میں ہوں نا۔" مدیحہ نے مسکراتے ہوئے انہیں تسلی دی۔ مدیحہ کا خود بھی بہت دل چاہ رہا تھا ماہم سے ملنے کو۔ اس نے ماہم کا اتنا ذکر سنا تھا کہ اسے دیکھنے کا شوق پیدا ہوگیا تھا۔ مگر ثمن کی طبیعت کی ناسازی کی بنا پر اس کا جانا ملتوی ہوگیا۔

☼ ☼ ☼

سائرہ' ماہم کے گھر میں اس کے ساتھ بیٹھی تھیں' عدیم کچھ دیر بیٹھ کر جاچکا تھا۔ وقاص بھی آفس گیا ہوا تھا۔

"ماہم! تم خوش تو ہو نا؟" اس نے جانچتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہاں پھوپھو! میں بے حد خوش ہوں۔ وقاص میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔" ماہم نے مان بھرے لہجے میں کہا۔

"تم واقعی ٹھیک کہہ رہی ہو؟" انہوں نے استفسار کیا جیسے ماہم کی بات پر انہیں یقین نہ آیا ہو کیونکہ وہ جب سے آئی تھیں ماہم کے حلیے کو دیکھ کر پریشان سی ہوگئی تھیں۔ الجھے بے ترتیب بال' ملگجا سا لباس اور اس پر بے ڈول سا جسم' دیکھنے میں وہ کہیں سے بھی پرانی ماہم نہیں لگ رہی تھی بس بات کرنے کا انداز اب بھی وہی تھا بلکہ بولنے کی اسپیڈ کسی حد تک بڑھ گئی تھی۔ پہلے تو اس کی حالت دیکھ کر شک ہوا کہ کہیں وقاص کے ساتھ جھگڑا نہ ہوگیا ہو مگر اس کے انداز اور چہرے کے تاثرات سے ایسا کچھ نہیں لگ رہا تھا۔

"ماہم! لگتا ہے تم اپنا بالکل بھی خیال نہیں رکھتیں۔"

"وقاص بھی یہی کہتے ہیں مگر آپ خود سوچیں کتنے کام ہوتے ہیں گھر کے۔ فرصت ہی کہاں ملتی ہے اور اب میں کسی ماڈل کی طرح بن ٹھن کر گھر میں تو نہیں رہ سکتی نا۔" بہت ہی لاپروا انداز میں کہہ رہی تھی۔

"پھر بھی بیٹا! انسان کو خود اپنے لیے بھی وقت نکالنا چاہیے۔"

"چھوڑیں پھوپھو! یہ بتائیں مدیحہ کیسی ہے۔ اس کے بارے میں بتائیں۔ مجھے بہت اشتیاق تھا اس سے ملنے کا۔" اس نے بات ہی بدل دی۔

یہ دیکھ کر سائرہ مسکرادیں اور اسے مدیحہ کے بارے میں بتانے لگیں۔ اسی اثنا میں ماہم کا گول مٹول سا بیٹا رونے لگا۔

"لگتا ہے اسے بھوک لگی ہے۔ پھوپھو! آپ اسے تھوڑی دیر کے لیے سنبھالیں۔ میں اس کے لیے سیریلیک بنا کر لاتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے ماہم نے صمد کو انہیں پکڑایا اور خود کچن کی جانب چل دی۔

صمد چپ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ سائرہ اسے گود میں اٹھائے ماہم کے پیچھے کچن میں آگئیں۔ وہاں کی حالت دیکھ کر سائرہ حیران رہ گئیں۔ سنک گندے برتنوں سے بھرا پڑا تھا۔ سلیب پر آٹے کے ذرات پھیلے ہوئے تھے۔

ایک جانب انڈے کے چھلکے پڑے تھے۔

"ماہم! یہ برتن رات کے پڑے ہوئے ہیں۔" سائرہ نے صمد کو اسے پکڑاتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

"جی پھوپھو! رات کو میرے سر میں درد تھا۔ اس لیے میں یہ دھو نہ سکی۔" کمال بے نیازی سے جواب دیا گیا۔

"رات تمہارے سر میں درد تھا تو صبح سے تم کیا کررہی تھیں؟" یہ سائرہ محض دل میں کہہ سکیں۔ ڈرائنگ روم میں بھی بہت بے ترتیبی تھی لیکن کچن کی تو حالت زیادہ خراب تھی۔ سائرہ بہت ہی صفائی پسند طبیعت کی مالک تھیں۔ گندگی اور بے ترتیبی ان سے بالکل ہی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے یہ سب دیکھ کرانہیں بہت عجیب لگ رہا تھا۔

"ماہم! تم صمد کو سیریلیک کھلاؤ، تب تک میں یہ برتن دھو دیتی ہوں۔" اس سے رہا نہ گیا۔

"ارے پھوپھو! میں یہ بعد میں دھولوں گی۔" اس کا فی الحال بھی برتنوں کو دھونے کا کوئی ارادہ نظر نہیں آرہا تھا۔

"کوئی بات نہیں، ہم باتیں بھی کریں گے اور ساتھ میں کام بھی ہوجائے گا۔" صمد کو کھلانے کے بعد مارے شرم کے ماہم بھی کچن کی صفائی میں ان کا ساتھ دینے لگی۔ کچھ ہی دیر میں وہاں کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔

ماہم سائرہ کو لے کر اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ وہاں کی حالت بھی باقی گھر سے مختلف نہیں تھی۔ گیلا تولیہ ابھی تک بیڈ پر پڑا تھا۔ سائرہ کو ماہم پر بے انتہا حیرت ہورہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ آج ان لوگوں نے آنا تھا پھر بھی اس نے نہ تو گھر صاف کیا اور نہ ہی خود پر کوئی توجہ دی تھی۔

کھانے کا وقت قریب ہونے کو تھا مگر ماہم کو جیسے کوئی فکر ہی نہیں تھی۔ سائرہ سے اس بار بھی صبر نہ ہوا تو انہوں نے پوچھ ہی لیا۔

"وقاص لنچ گھر پر کرتا ہے؟"

"نہیں پھوپھو! لنچ تو وہ آفس میں ہی کرتے ہیں لیکن آج میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ کھانا باہر سے لے آئیں۔ میری پھوپھو آرہی ہیں۔ میں ان کے ساتھ ڈھیر ساری باتیں کروں گی۔" ماہم ان سے پیار جتاتے ہوئے بولی۔

"اچھا... میرا تو خیال تھا کہ آج میں اپنی بیٹی کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھاؤں گی۔"

"چلیں پھر کبھی سہی... ویسے بھی میرے ہاتھ میں ذائقہ بالکل بھی نہیں۔ شاید اس لیے کہ مجھے کھانا پکانے میں ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے۔ وقاص اکثر باہر سے تیار کھانا ہی لے آتے ہیں۔" ماہم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن پہلے تو تمہیں بے حد شوق تھا کوکنگ کا..." وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

"وہ تو چند دنوں کا شوق تھا جس سے میں جلد ہی بور ہوگئی تھی۔" ماہم، صمد کا ڈائپر بدلتے ہوئے بولی۔ ساتھ میں اس نے گندہ ڈائپر بیڈ کے ساتھ نیچے کارپٹ پر رکھ دیا۔ آج اپنی ہر بات سے ماہم حیران کردینے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ ٹکر ٹکر اسے دیکھے جارہی تھیں۔

"ماہم! گندہ ڈائپر رکھنے کی یہ جگہ تو نہیں تھی۔"

"اس وقت میرا اٹھنے کا موڈ نہیں ہے۔ جب کسی کام سے اٹھوں گی تو اسے بھی دیکھ لوں گی۔" بہت ہی لاپروا انداز میں جواب ملا۔ سائرہ یہ سوچ کر ہی رہ گئیں کہ کم از کم ہاتھ تو دھولو۔ ساتھ میں انہیں ماہم کے موٹاپے کی طرف مائل جسم کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔ سارا دن ماہم کے ساتھ گزار کر جب شام کو وہ واپس جارہی تھیں تو ایک ہی بات ان کے ذہن میں تھی۔

"شکر ہے آج مدیحہ میرے ساتھ نہ آسکی ورنہ وہ دل میں کیا سوچتی کہ یہ ہے وہ ماہم جس کی میں اسے مثالیں دیا کرتی تھی۔" ایک بار پھر وہ ماہم اور مدیحہ میں موازنہ کرنے لگیں، مگر اب ان کے سوچنے کا انداز بدل گیا تھا۔ ماہم کی محبت جو ان کے دل میں تھی ہرگز کم نہیں ہوئی تھی وہ اب بھی اس سے بے انتہا پیار کرتی تھیں مگر اسے بہو نہ بنانے کی جو پھانس اب تک دل میں چبھی ہوئی تھی وہ نکل گئی تھی۔

فرحت شوکت

وفا میری ضد

"ہیلو۔" وہ ابھی ابھی آفس سے گھر لوٹا تھا اور گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے لاؤنج کی طرف بڑھ رہا تھا جب دائیں ہاتھ میں موجود سیل پر ماما کا نمبر دیکھ کر اس نے فوراً "فون کان سے لگالیا۔

"کیسے ہو عدید؟" دوسری طرف اس کی آواز سنتے ہی ماما نے بے تابی سے اس کی خیریت دریافت کی۔

"ٹھیک ہوں، آپ کیسی ہیں اور پاپا کا بلڈ پریشر لیول نارمل ہوا یا نہیں؟"

لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اس نے ہاتھ میں پکڑے کوٹ کو صوفے کی طرف اچھالتے ہوئے پوچھا پھر خود بھی سنگل صوفے پر گرنے والے انداز میں بیٹھ گیا اور ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرنے لگا۔

"میں ٹھیک ہوں بیٹا اور اللہ کا شکر ہے اب تمہارے پاپا بھی پہلے کی نسبت بہت بہتر ہیں۔ تم سناؤ تم تو ٹھیک ہو نا؟" ان کے انداز میں خالصتاً "ماؤں والی فکر نمایاں تھی۔

"کہا تو ہے میں ٹھیک ہوں پھر بار بار کیوں پوچھ رہی ہیں آپ؟" پتا نہیں کیوں اس وقت ان کی یہ تشویش اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"تمہاری ماں ہوں بیٹا اور تم ہم سب سے دور اکیلے ہو تو کیا میں پریشان نہیں ہوں گی؟" اس کے لہجے سے چھلکتی ناراضی کو وہ با آسانی محسوس کر سکتی تھیں تب ہی نرمی سے بولیں۔

"سوری۔" جلد ہی اسے اپنے رویے کا احساس ہو گیا تھا سو فوراً "معذرت کرڈالی۔

"عدید ایک بات کہوں؟" تھوڑی دیر بعد باتوں کے دوران انہوں نے استفسارانہ انداز میں محبت سے بھرپور لہجے میں کہا مبادا وہ ہمیشہ کی طرح ہتھے سے نہ اکھڑ جائے۔

"جی کہیے۔" وہ تھکی تھکی بند آنکھوں کو بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے دھیرے دھیرے سہلاتے ہوئے بولا۔

"تم جرمنی ہمارے پاس آجاؤ بیٹا اور یہیں آکر اپنا بزنس....." ان کی بات پر اس کی بند آنکھیں یکدم کھل گئیں۔ ہمیشہ کی طرح وہ ان کی اس بات پر چڑ سا گیا تھا تب ہی ان کی بات کاٹ کر تیزی سے گویا ہوا۔

"میں نے آپ سے پہلے بھی کئی بار کہا ہے میں پاکستان میں بالکل ٹھیک ہوں اور میں یہیں رہوں گا۔ اس کے علاوہ میرا بزنس یہاں اچھی طرح Stable ہو چکا ہے ایسے میں سب کچھ ختم کر کے جرمنی آجاؤں یہ کہاں کی عقلمندی ہے اینڈ یو نو ویری ویل ماما میں یہاں کس کی وجہ سے ہوں؟"

آخری بات کہتے ہوئے اس کا لہجہ کچھ ٹوٹ سا گیا تھا وہ مزید کچھ نہ بول سکا اور خاموش ہو گیا۔

یقیناً" ماما کو بھی اس کی کیفیت کا بخوبی علم ہو چکا تھا اسی لیے وہ بھی چپ ہو گئیں پھر چند ثانیے بعد وہ کمزور سی آواز میں گویا ہوئیں۔

"اس کا کچھ پتا نہیں ہے وہ کہاں ہے پھر بھی تم اسے۔"

"ماما پلیز کلوز دس ٹاپک ناؤ۔ میں آپ سے بعد میں بات کرتا ہوں۔"

اس نے اتنا کہہ کر فوراً" کال ڈس کنیکٹ کر دی اور پھر تھکتے سر کو صوفے کی پشت پر گرا کر آنکھیں موند لیں۔

اسے پاکستان آئے تقریباً" دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور ان دو سالوں میں کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں آیا تھا جب وہ اس کی تلاش میں ادھر ادھر نہ بھٹکا ہو لیکن نتیجہ وہی..... خالی نظر اور خالی ہاتھ۔

"صاحب جی کھانا لگادوں؟"

وہ اگلے کئی لمحوں تک صوفے کی پشت پر سر گرائے آنکھیں موندے بے ترتیبی سے ایک ہی پوزیشن میں نیم دراز تھا جب بشیر کی آواز پہ اس نے اسی حالت میں رہتے ہوئے بمشکل آنکھیں کھول کر اسے دیکھا جو اس کے بالکل سامنے مودبانہ انداز میں دونوں ہاتھ آگے کی جانب باندھے اس کے جواب کا منتظر تھا۔

خالی خالی نظروں سے کچھ دیر وہ بشیر کو تکتا رہا پھر ایک گہرا سانس لیتا سیدھا ہو بیٹھا اور کف لنکس کھولتے ہوئے گویا ہوا۔

"نہیں یار بھوک نہیں ہے مجھے۔ تم ایسا کرو میری گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ایک فائل رکھی ہوگی وہ لے کر آجاؤ۔" اس نے ٹیبل پر رکھی گاڑی کی چابی اس کی طرف بڑھائی جس کو بشیر نے آگے بڑھ کر تھاما اور لاؤنج سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح بیٹھا رہا پھر صوفے پر پڑا کوٹ اور سنٹرل ٹیبل پر رکھا موبائل اٹھا کر سست روی سے چلتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

"چائے پیو گے؟" آج صبح سے ہی وہ طبیعت میں عجیب سا بوجھل پن محسوس کر رہا تھا جس کے باعث آفس میں بھی وہ پوری توجہ سے کام نہیں کر پا رہا تھا اس لیے وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر احسن کی طرف چلا آیا کہ شاید طبیعت کچھ بہل جائے لیکن احسن کے ساتھ معمول کی طرح باتیں کرنے کے بجائے وہ بس ہوں ہاں میں جواب دے جا رہا تھا۔

"نہیں موڈ نہیں ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے کچھ زیادہ ہی ڈسٹرب دکھائی دے رہے ہو آج' رات بھر جاگتے رہے ہو؟" احسن نے نیند کی کمی کے باعث اس کی سرخ پڑتی آنکھوں اور تھکے تھکے سے وجود کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جواباً" اس نے محض ایک نظر اٹھا کر احسن کو دیکھا پھر دوبارہ ہاتھ میں پکڑے پیپر ویٹ کی جانب متوجہ ہو گیا جس کو وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرنے کے شغل میں مصروف تھا۔

"نسرین آنٹی نے جو ایڈریس دیا تھا وہاں گئے تھے؟"

اسے مستقل خاموش دیکھ کر احسن نے اگلا سوال کیا جس پر اس نے ہاتھ میں پکڑا پیپر ویٹ ٹیبل پر رکھا اور دھیمے مگر یاسیت بھرے لہجے میں گویا ہوا۔

"گیا تھا۔"

"کیا ہوا؟"

"دو ماہ پہلے وہ لوگ وہاں سے کہیں اور شفٹ کر گئے ہیں۔" وہ تفکر سے پیشانی مسلتے ہوئے بولا۔

"جو اب وہاں رہتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ انہوں نے کہاں شفٹ کیا ہے؟" احسن کمپیوٹر آف کر کے پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو چکا تھا۔

"نہیں۔ انہیں کچھ نہیں پتا۔" اس کے بتانے پر احسن بھی ایک لمحہ کے لیے مایوس سا ہو گیا۔ لیکن اس کی حالت دیکھ کر وہ قدرے عام سے لہجے میں بولا۔

"کوئی بات نہیں یار اور ویسے بھی مہران انکل نے بتایا تھا ناکہ پچھلے مہینے......"

"او کے میں چلتا ہوں۔" وہ احسن کی بات سنے بغیر تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ون منٹ عدید۔" احسن کے روکنے پر وہ پلٹ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا ہے یار یوں اچانک کیوں چل پڑے ہو' کوئی بات بری لگی ہے تو بتاؤ۔" احسن اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں ہے بس دل گھبرا رہا ہے اس لیے۔"

"جھوٹ مت بولو۔" احسن نے ٹوکا تو وہ ایک لمحہ کے لیے چپ ہو گیا پھر آزردہ لہجے میں گویا ہوا۔

"اور کیا کروں احسن' دو سال سے پاگلوں کی طرح پورے شہر کو چھان رہا ہوں لیکن..... لیکن کچھ اتا پتا نہیں ہے اس کا جس نے جہاں بتایا ہے وہاں سب سے پہلے پہنچ جاتا ہوں مگر خالی ہاتھ ہی گھر لوٹتا ہوں۔ کسی بھی رشتہ دار سے کانٹیکٹ میں نہیں ہے وہ۔ آخر ایسی کون سی جگہ ہے جہاں میں پہنچ ہی نہیں پا رہا ہوں۔" وہ بہت دلگرفتہ دکھائی دے رہا تھا۔ احسن نے تسلی آمیز انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور حوصلہ دیتے ہوئے بولا۔

"تمہاری لگن سچی ہے عدید اور تم دیکھنا ان شاءاللہ اسے ضرور پالو گے۔" احسن کی بات پر وہ ایک گہرا سانس بھر کر رہ گیا۔

"چلو باہر چلتے ہیں کھانا وانا کھاتے ہیں۔ تھوڑی واک بھی ہو جائے گی کم آن۔" اس کا موڈ بحال کرنے کی خاطر احسن زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر آفس سے باہر لے آیا۔

"تم جرمنی کب جا رہے ہو؟" کھانا کھانے کے دوران احسن نے پوچھا۔

"کل صبح کی فلائیٹ ہے۔" پانی کا گلاس منہ کی طرف لے جاتے ہوئے اس نے بتایا۔

"ہوں اور واپسی کب ہوگی؟" احسن نے اگلا سوال کیا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا بٹ مے بی مہینہ لگ جائے۔" اس نے جواب دیا۔

"اتنے دن' خیریت تو ہے نا؟" احسن ایک مہینہ کا سن کر حیران ہوا تھا۔

"ہاں خیریت ہی ہے جرمنی تو ماما کے بلانے پر جا رہا ہوں۔ وہ کئی دنوں سے مسلسل فون کر رہی تھیں اور جرمنی آنے پر اصرار کر رہی تھیں سو میں نے سوچا ان سے مل کر واپسی میں آسٹریلیا بھی چلا جاؤں گا وہاں سے کال آرہی ہے دو ہفتے بعد میٹنگ ہے تب تک ماما پاپا کے ساتھ وقت گزار لوں گا۔ بس دعا کرنا یار وہ انٹرنیشنل کمپنی آرڈر پاس کر دے۔"

وہ کھانا کھا کر فارغ ہو چکا تھا اور اب احسن کو اپنی نیکسٹ پلاننگ سے آگاہ کر رہا تھا۔ پہلے کی نسبت وہ اب کافی حد تک ریلیکس دکھائی دے رہا تھا۔

"ہاں بالکل یار۔ اللہ تمہیں ضرور کامیاب کرے گا ان شاءاللہ۔"

بل پے کرتے ہوئے احسن نے صدق دل سے دعائیہ انداز میں کہا تو وہ ممنون نظروں سے احسن کو دیکھنے لگا۔ جو اس کا سب سے بڑا خیر خواہ تھا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے احسن نے اسے گھر ڈراپ کر دیا۔

احسن اسے بہت اچھی طرح جانتا تھا تب ہی اس کی اداسی اور پریشانی کو بھانپ کر اسے دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا اور آج بھی اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ احسن اپنی اس کوشش میں اکثر ہی کامیاب بھی ہو جاتا تھا جیسے آج ہوا تھا۔

وہ جب بھی اس کو تلاش کرنے کے بعد تنہا گھر لوٹتا تھا تو دنوں تک اپنے ٹوٹتے دل اور وجود کو بکھرنے سے بچانے کی کوشش میں ہلکان رہتا تھا اور آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ جب سے وہ شیریں آنٹی کے بتائے ایڈریس پر گیا تھا اور وہاں سے بھی کوئی نشان نہ پا کر واپس آیا تھا دل عجیب سی کیفیت میں گھر گیا تھا۔

لیکن اب وہ پہلے کی نسبت خود کو بہتر محسوس کر رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں احسن کا شکریہ ادا کرتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا جو اسے مایوسی کی حد پر جانے سے پہلے واپس لے آتا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہمیشہ کی طرح گاڑی ڈرائیور کرتے ہوئے آج بھی وہ ارادی و غیر ارادی طور پر سڑک کے دائیں بائیں جانب دیکھ رہا تھا۔ اس امید پر کہ کہیں بالکل اچانک روڈ کراس کرتے ہوئے، شاپنگ مال سے نکلتے ہوئے یا پھر ٹریفک سگنل پر رکتی ٹیکسی میں سے کسی ایک میں بیٹھی وہ اسے نظر آجائے۔ لیکن ان دو سالوں میں ایک بار بھی وہ اسے دکھائی نہیں دی تھی۔

"کاش ایک بار...... صرف ایک بار وہ اسے مل جائے پھر چاہے اپنا آپ گنوا کر بھی اسے پانا پڑا تو وہ گریز ہرگز نہیں کرے گا۔ اس کے بغیر تو اسے اپنا وجود ویسے بھی بہت بے معنی سا لگنے لگا تھا۔ ایک اس کی تلاش ہی تھی جو اسے جینے اور سانس لینے پر مجبور کیے ہوئے تھی ورنہ...."

آفس آچکا تھا۔

سوچوں میں گم کب آفس آیا اسے پتا ہی نہ چلا۔ اس نے فوراً" گاڑی کو بریک لگایا اور ونڈ اسکرین سے دکھائی دینے والے اپنے آفس کی بلڈنگ پر ایک نظر دوڑائی۔ کتنی محنت اور لگن کے بعد وہ شہر کے اس مصروف ترین ایریا میں اپنا آفس اور ملک بھر میں بزنس اسٹیبلش کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ یہ وہی جانتا تھا لیکن جس کے لیے اس نے یہ سب کچھ پایا تھا اسے ہی کھو چکا تھا۔

"نہیں، میں نے اسے نہیں کھویا۔ وہ میرے پاس ہے اور رہے گی جیسے ہمیشہ سے تھی۔"

اس نے اپنے خیال کی سختی سے نفی کی۔ اسے کھونے کے احساس کو وہ اپنے اندر کہیں محسوس کرنا ہی نہیں چاہتا تھا سو جلدی سے اپنی سوچ کو رد کرتا فرنٹ سیٹ کی بیک پر رکھا اپنا کوٹ اٹھائے گاڑی سے باہر نکل آیا اور گاڑی لاک کر کے ڈرائیونگ ایریا کو کراس کرتا بلڈنگ کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔

لفٹ کے ذریعے تھرڈ فلور پر پہنچتے ہی اس نے بائیں ہاتھ میں بندھی رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی۔

صبح کے آٹھ بجے تھے۔

وہ شروع سے ہی بہت پنکچوئل تھا اسی لیے ٹائم پر آفس پہنچنا اس کی عادت میں شامل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا پورا اسٹاف آن دا ٹائم آفس میں موجود ہوتا تھا۔ آگے کی جانب بڑھتے ہوئے اس نے دائیں بازو پر رکھا کوٹ پہنا اور ٹائی کی ناٹ کو درست کرتا چند قدم کے فاصلے پر موجود اپنے آفس میں داخل ہو گیا۔

"گڈ مارننگ سر۔" جیسے ہی اس نے اپنے شاندار آفس میں قدم رکھا۔ دائیں اور بائیں جانب بنے کیبن میں کام کرتے ورکرز ایک دم حرکت میں آچکے تھے اور اپنی سیٹ سے اٹھ کر اسے سلام کرنے لگے۔

ایک سیکنڈ کے لیے اس نے آفس میں موجود تمام لوگوں پر ایک طائرانہ سی نظر دوڑائی پھر مضبوط قدموں سے چلتا ہوا پر اعتماد انداز میں سر کے اشارے سے سب کے سلام کے جواب دیتا اپنے روم کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر دائیں جانب رو میں بنے کیبن میں سے ایک کیبن پر جا پڑی۔ بے ساختہ اس کے قدم زمین پر جم گئے تھے وہ محض لمحہ بھر کو ہی اسے دیکھ پایا تھا اور اس ایک لمحے میں جتنی بار اس کا دل زور زور سے دھڑک سکتا تھا دھڑک اٹھا تھا۔ اسٹاف کی موجودگی کا احساس شدت سے غالب آچکا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس پر دوسری نظر ڈالے بغیر اسی رفتار اور پروقار انداز سے چلتا ہوا اپنے روم کا ڈور کھول کر اندر چلا آیا۔

دروازہ بند کر کے وہ کئی ثانیے تک دروازہ کے ساتھ لگ کھڑا رہا اور اس ایک لمحے کو سوچنے لگا۔ اس نے صرف چند قدموں کے فاصلے پر اسے اب سے چند منٹ پہلے دیکھا ہے خود کو یہ یقین دلانا اسے بہت دشوار ہو رہا تھا۔ مگر یہ ایک حقیقت تھی۔ خوب صورت حقیقت۔

بے ترتیب سانسوں اور سرشار وجود کو بمشکل سنبھالے وہ اپنی چیئر کی طرف بڑھ گیا اور کوٹ اتار کر سیٹ کی بیک پر پھیلا دیا۔ پھر خوشی سے بھرپور انداز میں چیئر پر بیٹھ گیا۔ دونوں کہنیاں ٹیبل پر ٹکائے، نظریں ایک نقطہ پر مرکوز کیے نہ جانے کتنی دیر تک وہ اس پل کو سوچتا اور محسوس کرتا رہا جب بالکل اچانک اس نے اسے دیکھا تھا۔ اسے اپنے بدن میں رواں خون تیزی سے دوڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسے ابھی اور اسی وقت اپنے سامنے لا کھڑا کرے اور خود پر گزری اذیت کا احوال اسے کہہ سنائے لیکن ابھی یہ ممکن نہیں تھا۔

وہ جانتا تھا اس کی شکایت اور ناراضی کو ایک دم دور نہیں کیا جا سکتا سو ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ اس سے بے حد خفا تھی اس کا اندازہ اسے تھوڑی دیر پہلے اس کے چہرے کے تاثرات سے بخوبی ہو چکا تھا۔ بہر حال کچھ بھی تھا اس کی روح کو تو جیسے اب قرار سا مل گیا تھا۔ سو جتن کر کے بھی اسے منانا پڑتا تو ہرگز پیچھے نہیں ہٹتا کہ اب وہ اسے خود سے دور کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ جو دو برسوں سے یہاں سے وہاں اسے ڈھونڈ رہا تھا وہ تو اس کے بے حد قریب تھی اس کے اپنے آفس میں... یہ احساس کس قدر خوشگوار تھا یہ تو وہی جانتا تھا۔

اس نے طمانیت بھرا سانس اپنے اندر اتارا اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر اسے سوچنے لگا۔ مسکراہٹ تھی کہ خود بخود اس کے چہرے پر بکھری جا رہی تھی۔ اپنی یہ کیفیت اسے بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

"ہو سکتا ہے تسمینہ آنٹی نے اس کی شادی کردی ہو اللہ نہ کرے۔ لیکن اگر ایسا ہوا تو کیا کرو گے؟" چند دن پہلے کہے گئے احسن کے لفظوں کی بازگشت نے اس کے ہلکے پھلکے ہوتے وجود کو یکدم بوجھ تلے دبا ڈالا تھا۔

جس وقت احسن نے یہ بات کی تھی تب بھی وہ اندر تک لرز اٹھا تھا اور اب تھوڑی دیر پہلے والا اطمینان اور اندر تک اترتی سرشاری کہیں معدوم ہو چکی تھی۔ لمحے بھر میں وہ حد درجہ پریشان اور مضطرب ہو کر رہ گیا تھا۔

اضطراب کے عالم میں وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بے چینی سے یہاں سے وہاں چلنے لگا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟

کیسے اس کے بارے میں معلوم کرلے؟

"مے آئی کم ان سر؟" اسی اثناء میں پینتالیس سالہ توقیر صاحب دروازے پر دستک دے کر اجازت طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

تو وہ خود کو سنبھالتا دوبارہ اپنی چیئر پر جا بیٹھا۔

"یس کم ان توقیر صاحب۔" وہ کل رات ہی آسٹریلیا کے ٹور سے واپس آیا تھا اور اب توقیر صاحب اسے آفس سے متعلق گزشتہ ایک ماہ کے دوران ہونے والی تفصیلات سے آگاہ کر رہے تھے جن کو وہ غائب دماغی سے سن رہا تھا۔

"اس کے علاوہ آپ کی غیر موجودگی میں میں نے دو ایمپلائیز کو کمپیوٹر سیکشن کے لیے اپائنٹ کیا تھا۔ ان میں سے ایک جبران خان ہیں جبکہ دوسری ایمپلائے ماہین عزیز ہیں اور فیکٹری کے......"

"دونوں ایمپلائیز کا ڈیٹا ہے آپ کے پاس؟" ماہین عزیز کے نام پر اس نے یکدم چونک کر سامنے بیٹھے توقیر صاحب کو دیکھا جو فائل میں درج تمام پوائنٹ کو باری باری پڑھ کر سنا رہے تھے۔

"یس آف کورس سر۔" توقیر صاحب نے خاصے پُراعتماد انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے آپ مجھے ان کا ڈیٹا بھجوا دیجیے میں ان ایمپلائیز کے بورڈنگ ریکارڈز کو چیک آؤٹ کرنا چاہتا ہوں۔ باقی تفصیل میں آپ سے بعد میں معلوم کرلوں گا۔"

اپنے چہرے کے تاثرات اور اندرونی حالت کو بمشکل چھپاتے ہوئے عام سے انداز میں کہا پھر ٹیبل پر رکھے اپنے لیپ ٹاپ کی جانب متوجہ ہوگیا۔ توقیر صاحب اٹھ کر جا چکے تھے جبکہ وہ اضطراری کیفیت میں چیئر کی پشت سے ٹیک لگائے توقیر صاحب کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ توقیر صاحب ہاتھ میں دونوں ڈیٹا فائلز اٹھائے اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے تو اس نے تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر فائلز تھام لیں۔

"تھینک یو توقیر صاحب۔" وہ اتنا کہہ کر ماہین عزیز کی ڈیٹا فائل کی جانب متوجہ ہوگیا۔

توقیر صاحب جا چکے تھے۔

"میں ایم سی ایس کر کے رہوں گی' دیکھ لینا۔" کوالیفیکیشن پروفائل میں درج ماہین عزیز کی کوالیفیکیشن پر نظر پڑتے ہی اس کے کانوں میں اس کی یقین سے بھرپور آواز سنائی دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ شروع سے ہی کمپیوٹر میں انٹرسٹڈ تھی اور اسی لیے ایم سی ایس کرنا چاہتی تھی لیکن پھپھو بالکل نہیں چاہتی تھیں کہ وہ ایم سی ایس کرے کیونکہ وہ تو پہلے ہی اس کی کمپیوٹر میں حد درجہ دلچسپی سے خائف رہتی تھیں۔ اگر وہ ایم سی ایس کرنے کا ارادہ کرتی تو یقیناً اس کی صورت کسی کو بھی دیکھنے کو نہ مل پاتی۔ لیکن وہ ماہین ہی کیا جو کہہ کر پیچھے ہٹ جاتی۔

اس کے ارادے کی مضبوطی پر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ پھر اچانک کچھ یاد آنے پر وہ انتہائی عجلت میں مطلوبہ پروفائل پر پہنچا۔ پرسنل پروفائل میں موجود Marital Status (ازدواجی درجہ) پر اس کی نظر ٹھہری گئی تھی۔ نہ جانے آگے کیا لکھا ہوگا؟ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ آگے پڑھنے کی سکت وہ خود میں ہرگز پیدا نہیں کرپا رہا تھا۔ اگر.... اگر وہ میرڈ ہوئی تو....؟

"نہیں' نہیں۔" اس خیال کے ساتھ ہی اس نے غیر ارادی طور پر ڈیٹا فائل بند کی اور تیز چلتی سانسوں کی رفتار کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"وہ صرف میری تھی اور میری ہی ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں خود سے مخاطب ہوا۔ پھر ٹیبل پر رکھی ماہین عزیز کی فائل کو اٹھا کر دیکھنے لگا اور اس بار بھی اس کا دل انجانے خدشے کے تحت زور سے دھڑک اٹھا تھا لیکن کبھی تو یہ عقدہ کھلنا تھا تو پھر ابھی کیوں نہیں؟

یہی سوچ کر اس نے فائل کے صفحے پلٹنے شروع کر دیے اور کوالیفکیشن پروفائل پر اس کی نظر ٹھہر گئی۔

Marital Status کی لائن میں Unmarried کا لفظ پڑھتے ہی گویا اس کا دل اپنی جگہ پر آرکا تھا اور بے ترتیب سانسوں کو یکدم قرار سا مل گیا تھا۔

اس نے انتہائی اطمینان بھرا سانس اپنے اندر اتارا پھر زیر لب مسکراتے ہوئے فائل بند کر کے ٹیبل پر رکھا پھر دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھتے ہوئے چیئر سے مطمئن انداز میں ٹیک لگائے اسے سوچنے لگا جس کو وہ کبھی بھی فراموش نہیں کرپایا تھا اب اچانک اسے اپنے سامنے دیکھنے کی خواہش اس کے سینے میں مچلنے لگی تھی۔

وہ بے تابی سے سیدھا ہو بیٹھا اور اس سے ملنے' اس سے باتیں کرنے اور اسے جی بھر کر دیکھنے کا طریقہ سوچنے لگا۔

"مس کرن ابھی پورے اسٹاف کو میٹنگ روم میں کلیکٹ کیجیے ایک ارجنٹ میٹنگ کرنی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد اس نے کچھ سوچ کر انٹر کام پر اسسٹنٹ کو ہدایت دی پھر اس کی فائل اٹھا کر پیپر پر لکھے اس کے نام کو محبت سے تکنے لگا۔

"ماہین عزیز۔" اگلے دس منٹ بعد جس وقت وہ میٹنگ روم میں داخل ہوا لمبی میز کے آمنے سامنے رکھی چیئرز پر کمپنی کا پورا اسٹاف براجمان اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کو میٹنگ روم میں داخل ہوتے دیکھ کر سب یک لخت اپنی اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"پلیز سیٹ۔" وہ سائیڈ پر رکھے ڈائس کی طرف بڑھتے ہوئے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا تو اس کے ڈائس پر پہنچتے ہی سب اس کی پرمیشن پر اپنی اپنی چیئرز پر بیٹھ گئے۔

"آپ سب کو اچانک کال کرنے کا مقصد آپ کو انفارم کرنا تھا کہ آسٹریلیا کی جس کمپنی سے ہماری کمپنی کا دو سالہ معاہدہ ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔" وہ بڑی روانی سے انگلش لب و لہجے میں باری باری سب کی جانب دیکھتے ہوئے مخاطب تھا۔ جبکہ اس کے بتانے پر سب کے چہروں پر خوشی پھیل گئی اور اس سمیت سب ایک دوسرے کو اتنی بڑی کامیابی پر مبارکباد دینے لگے۔ اس دوران اس نے اپنے بائیں رو میں تیسری سیٹ پر بیٹھی ماہین عزیز کو بڑی محتاط نظروں سے دیکھا جو ٹیبل پر رکھے پیپرز پر توجہ مرکوز کیے گردو پیش سے لاتعلق سی بیٹھی تھی۔

ایک نظر اسے دیکھنے کے بعد دوسری نظر اس نے پورے اسٹاف پر دوڑائی پھر دوبارہ اپنے سابقہ انداز میں گویا ہوا تو پورا اسٹاف اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"مجھے آپ کی محنت اور کمپنی سے آپ کی محبت آپ کے بہترین کام کی صورت میں نظر آجاتی ہے لیکن اس بار میں اگر ان دونوں چیزوں پر زور دے رہا ہوں تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آسٹریلیا کی کمپنی سے ہونے والا ہماری کمپنی کا یہ پہلا کانٹریکٹ ہے۔ فرسٹ امپریشن از دا لاسٹ امپریشن سو میری آپ سب سے بہت زیادہ توقعات ہیں جن پر آپ کا پورا اترنا میرے لیے اور کمپنی کے لیے نہایت اہم اور فائدہ مند ہے۔"

پندرہ منٹ کی اسپیچ دینے کے بعد اب وہ اپنی چیئر پر آبیٹھا تھا۔

بے اختیار اس نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب وہ بھی اس کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ وہ فوراً" نظریں جھکا گئی۔

"ماہین عزیز آئی وانٹ ٹو ٹیک یور انٹروڈکشن اینڈ

یور اوپنین اباؤٹ آر کمپنی پلیز۔" (میں آپ کا تعارف اور کمپنی کے بارے میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔)

اس کے مخاطب کرنے پر وہ لحہ کی تاخیر کیے بغیر اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور نہایت مطمئن انداز میں چلتی ہوئی اس کی چیئر کے بائیں جانب رکھے ڈائس پر جا کھڑی ہوئی اور دھیمے مگر پر اعتماد انداز میں اپنا انٹروڈکشن کرانے لگی۔

بولتے بولتے اس نے ایک سرسری سی نظر اس پر ڈالی جو اپنی ریوالونگ چیئر کا ہلکا سا رخ اس کی جانب موڑے دائیں ہاتھ کی کہنی ٹیبل پر ٹکائے بند مٹھی کو ٹھوڑی کے نیچے رکھے اس کے چہرے پر نظریں جمائے انتہائی وارفتگی سے اسے دیکھنے میں مصروف تھا۔ اسے یوں مسلسل اپنی جانب دیکھتا پاکر ______

ایک لحہ کے لیے اسے اپنی آواز میں ہلکی سی لرزش محسوس ہوئی مگر جلد ہی اس نے اس پر قابو پاتے ہوئے انٹروڈکشن کمپلیٹ کیا اور دوبارہ اپنی سیٹ پر جا بیٹھی تو اس نے فورا" میٹنگ اوور کردی۔

"ماہین عزیز۔" ایک ایک کر کے سب روم سے باہر نکل رہے تھے جب اس نے اسے پکارا۔

اس کی آواز پر بے اختیار اس کے قدم اپنی جگہ پر جم سے گئے تھے۔ چند ثانیے بعد اس نے پلٹ کر سوالیہ انداز میں اسے دیکھا جو ٹیبل پر رکھی فائل پر سائن کرنے میں مصروف تھا۔ اسی لمحے اس نے فائل بند کی اور سر اٹھا کر اسے دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی پھر چیئر چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے بالکل سامنے جا کھڑا ہوا۔

"کیسی ہو؟" اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں اس کی خیریت دریافت کی۔

"ٹھیک ہوں۔" اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے اس نے مختصر جواب دیا۔

"تمہیں یہاں اس طرح اچانک دیکھ کر مجھے اتنی خوشی ہوئی ہے کہ میں۔"

"تمہیں مجھے دیکھ کر خوشی ہوتی تو یوں سب کے سامنے مجھے کنفیوز کرنے کی کوشش نہ کرتے۔" وہ اس کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں بولی تو وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"میں تمہیں کنفیوز کیوں کروں گا بھلا میں تو جسٹ آفیشل فارملیٹی پوری کر رہا تھا کیونکہ۔"

"ڈائس پر کھڑے شخص کو مسلسل دیکھتے رہنا تمہاری کون سی فارملیٹی میں شامل ہے مسٹر عدید مہران۔"

ایک بار پھر اس کی بات پوری سنے بغیر وہ قدرے طنزیہ لہجے میں بولی۔ تو وہ اس کی بات پر یکدم امڈ آنے والی مسکراہٹ کو نہ دبا سکا اور خاموش ہو گیا پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد قدرے سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"تمہیں دیکھنے کا اور دیکھتے رہنے کا اختیار تو تم کیا خود میں بھی اپنے آپ سے نہیں چھین سکتا۔ کیونکہ تمہیں نہ دیکھوں تو سانس رک رک کر آنے لگتا ہے میرا۔" نہ جانے اس کے دھیمے لہجے میں کیا بات تھی کہ وہ ایک لمحے کے لیے کچھ بھی نہ کہہ پائی پھر خاصے چبھنے والے انداز میں بولی۔

"جن کو دیکھے بغیر سانس رک رک کر آنے لگتا ہے نا ان سے اتنا عرصہ دور نہیں رہا جاتا۔ مائنڈ اٹ۔" اتنا کہہ کر کہ وہ جانے کے لیے آگے کی جانب بڑھ رہی تھی جب وہ ایک بار پھر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تو وہ یکدم رک گئی اور ایک نظر اس کے چہرے پر ڈال کر اپنا رخ دوسری جانب پھیر لیا۔

"پانچ سال تم سے دور رہا ہوں تو وہ صرف تمہاری وجہ سے۔ تمہاری مرضی کے مطابق کیا جو بھی کیا۔ کیونکہ تم تم تو میری شکل ہی نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ یہی کہا تھا نا تم نے مجھ سے تو ایسے میں کیا کرتا میں کہاں جاتا میرا تو ہر راستہ تمہاری طرف ہی جاتا تھا اور تم نے میرے لیے تمام راستے بند کر ڈالے تھے۔ تم سے دور میں نہیں ہوا تھا بلکہ بلکہ تم نے مجھے خود سے دور کر دیا تھا۔" وہ ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا جبکہ لہجے میں دکھ پنہاں تھا۔

"میں نے کہا تھا تمہیں دور رہو اور تم ہو گئے تھے تو اب کیا پرابلم ہے کیوں بات کر رہے ہو مجھ سے اس ایک بار دور کیا تھا نا تو دور ہی رہو۔"

وہ قطعی انداز میں کہہ کر تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

اسے اس کے سخت رویے کی توقع تھی اس کے باوجود اس کے الفاظ نے بے حد تکلیف پہنچائی تھی۔ کئی لمحوں تک وہ اپنی جگہ پر ہی کھڑا رہا پھر آہستگی سے قدم اٹھاتا اپنے آفس کی طرف چل پڑا۔

☼ ☼ ☼

"ماہین۔" جب سے وہ آفس سے آئی تھی کچھ چپ چپ سی تھی۔ کسی سے بھی زیادہ بات نہیں کر رہی تھی اور اب پچھلے آدھے گھنٹے سے ٹیبل پر رکھے کھانے کو کھانے سے زیادہ غور سے دیکھنے پر اکتفا کر رہی تھی جب فاطمہ بجو کی آواز پر اس نے چونک کر سامنے کی جانب دیکھا۔ فاطمہ بجو زین کے لیے چولہے پر رکھے گرم دودھ کو گلاس میں انڈیل رہی تھیں۔

"جی۔" اس نے ہاتھ میں لیا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے جب سے آفس سے آئی ہو کھوئی کھوئی سی ہو' خیریت تو ہے نا۔" بجو نے تشویش سے اس کی طرف دیکھا۔

"بالکل خیریت ہے بجو آپ پریشان مت ہوں۔" وہ مسکرا کر کہتی دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"پریشان کیسے نہ ہوں پہلے تم آفس سے آنے کے بعد ایک ایک گھنٹہ زین اور ہانی کے ساتھ کھیلتی تھیں امی سے ڈھیروں باتیں کرتی تھیں لیکن آج ہاف ڈے تھا اس کے باوجود تم۔۔۔۔"

"وہ اصل میں بجو آج کام بہت زیادہ تھا میں تھک گئی تھی بس اسی وجہ سے ٹائم نہیں دے پائی۔" وہ ان کی بات پوری سنے بغیر جلدی سے وضاحت دینے لگی۔

"تو مت کیا کرو نا اتنا کام میری جان۔" انہوں نے محبت سے بھرپور لہجے میں اس کے معصوم سے چہرے کو دیکھ کر کہا۔ ان کی بات سن کر وہ محض مسکرا کر رہ گئی۔

"تم ایسا کرو تھوڑی دیر ریسٹ کر لو' شام کو فریش اٹھو گی۔ ٹھیک ہے؟"

انہوں نے نرمی سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پیار سے کہا تو وہ فورا" ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے یہ کیا پہلے کھانا تو مکمل کر لو۔" اسے ہاتھ میں لیے نوالے کو پلیٹ میں رکھتے دیکھ کر انہوں نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"نہیں بجو مجھے بھوک نہیں ہے اتنا بھی میں نے بہت مشکل سے کھایا ہے۔ رات کو فل ڈنر کر لوں گی آپ کے ساتھ' اوکے؟"

اس نے منانے والے انداز میں ان کا ہاتھ تھام کر کہا تو وہ چپ ہو گئیں۔

"اچھا تم اپنے کمرے میں جاؤ میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔" ان کے کہنے پر وہ خاموشی سے کچن سے باہر نکل آئی اور اپنے کمرے میں آ کر بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

جب سے اس کا سامنا عدید سے ہوا تھا وہ ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو کر رہ گئی تھی۔ اتنے برسوں بعد اچانک اسے دیکھ کر ایک دم سے وہ سب یاد آنے لگا تھا جس کو وہ کب سے بھلانے کی کوششیں کر رہی تھی۔ لیکن اسے دیکھ کر لگا کہ وہ تو کچھ بھی بھول نہیں پائی تھی۔ سب کچھ پہلے دن کی طرح اس کے ذہن کے خاکے پہ نقش تھا۔

عدید مہران کے ساتھ گزارا ایک ایک لحہ اس کی آنکھوں کے سامنے اسکرین کی مانند چل رہا تھا۔ کس قدر خوب صورت تھے وہ دن جب وہ اس کے ساتھ تھا اور صرف اس کا تھا لیکن پھر نہ جانے ایسا کیا ہوا تھا جس کے باعث وہ اس سے اتنی دور چلا گیا تھا کہ وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

وہ پژمردہ قدموں سے چلتی ہوئی کمرے میں موجود واحد کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی اور آسمان کو تکنے لگی۔

"ماہین کہاں ہو تم میں کب سے تمہارا نمبر ٹرائی کر رہی ہوں لیکن تم ہو کہ...... نہ جانے کن خیالوں میں گم ہو۔ میرا فون ہی ریسیو نہیں کر رہیں۔"

وہ بالکل خالی ذہن کے ساتھ آسمان پر نظریں جمائے ڈھلتی شام اور فضا میں پرندوں کی بجتی پازیب کو سننے میں محو تھی جب سویرا کی آواز پر اس نے گردن موڑ کر سویرا کی جانب دیکھا جو ہاتھ میں پکڑی چائے کی ٹرے کو ٹیبل پر رکھ رہی تھی جو بجو نے اسے تھمادی تھی۔

"یہیں ہوں اور مجھے کہاں ہونا ہے؟" وہ سویرا کی طرف بڑھتے یاسیت سے مسکرا کر بولی پھر اس کے گلے لگ گئی۔

"کیا ہوا' سب ٹھیک تو ہے نا؟" اسے یوں اپنے گلے لگتے دیکھ کر سویرا تشویش سے بولی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بہت پریشانی میں بے اختیار اس کے گلے لگ جاتی تھی۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" وہ سویرا سے الگ ہوتے ہوئے بمشکل مسکرا کر بولی۔

"لیکن مجھے تو لگ رہا ہے کہ کچھ ہے جو ٹھیک نہیں ہے۔" سویرا نے جانچتی نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم بیٹھو نا چائے پیو۔" وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور ایک مگ سویرا کی طرف بڑھا دیا جس کو اس نے خاموشی سے تھام لیا۔

"اب تم مجھے بتاؤ گی کہ کیا ہوا ہے تم ٹینس کیوں ہو؟"

وہ چائے کے گھونٹ اپنے حلق میں اتار رہی تھی جب سویرا کو کھدبد ہونے لگی۔ اس نے مگ ٹیبل پر رکھ دیا اور پھر دن بھر کی روداد اسے سنا ڈالی۔ جس پر سویرا حیرت سے اس کو تکنے لگی۔

"وہاٹ۔" سویرا بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"یو مین تم نے ابھی ایک ماہ پہلے جس کمپنی کو جوائن کیا ہے اس کو عدید مہران اون کر رہا ہے۔" سویرا نے استفسارانہ انداز میں اس کی جانب دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں اور مجھے یہ بات آج معلوم ہوئی ہے وہ پچھلے ایک مہینے سے آؤٹ آف کنٹری تھا اور اس کی غیر موجودگی میں توقیر صاحب جو کہ کمپنی کے ایم ڈی ہیں وہی سب دیکھ رہے تھے۔ مجھے اسی لیے یہ جاننے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی کہ کمپنی کا اونر کون ہے اور کہاں ہوتا ہے؟ اب جب مجھے پتا چل گیا ہے تو میں ...... یہ جاب چھوڑ دوں گی۔"

"وائے' تم' تم ایسا کیوں کرو گی ماہین۔" اس کا ارادہ جان کر سویرا نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ جو قدرے لاپرواہی سے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر لگی کیوٹیکس کو دیکھنے میں مصروف تھی۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اس وقت پورے گھر کی ذمہ داری تم پر ہے۔ اگر تم ہی جاب چھوڑ کر گھر پر بیٹھ جاؤ گی تو تمام گھر والوں کا کیا ہوگا۔ آنٹی' فاطمہ بجو ان کے بچے اور مریم۔ سب تم پر ڈیپینڈ کرتے ہیں اور تم ہو کہ......"

"تو میں کون سا اپنی ذمہ داریوں سے انکار کر رہی ہوں۔ میں تو اس جاب کو چھوڑنے کی بات کر رہی ہوں کیونکہ......"

"کیونکہ کیا؟" سویرا ایک بار پھر تیزی سے اس کی بات کاٹ کر بحث کرنے والے انداز میں بولی۔

"کیونکہ جس کمپنی میں تم جاب کر رہی ہو اس کو عدید مہران اون کر رہا ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا ریزن ہے تمہارے پاس اتنی اچھی جاب چھوڑنے کا تو بتاؤ۔" سویرا کی بات سن کر وہ ایک لمحے کے لیے بالکل خاموش ہو گئی۔ پھر آہستگی سے بولی۔

"تم مجھے نہیں سمجھ سکتیں سویرا۔"

"ہاں تمہاری بے وقوفیوں کو میں واقعی نہیں سمجھ سکتی۔ لیکن یاد رکھنا یہ جاب چھوڑ کر تم بہت بڑی غلطی کرو گی۔ تمہیں پتا ہے نا کتنی مشکل اور تگ و دو کے بعد تمہیں یہ جاب ملی تھی اب اتنی آسانی سے اس کو چھوڑنا عقلمندی نہیں ہے ماہین۔" اسے چپ دیکھ کر سویرا نے قدرے نرمی سے اسے سمجھایا۔ جواب الجھی

بھی سی لگ رہی تھی۔

"تمہارا پرابلم کیا ہے؟" اسے تذبذب کا شکار ہوتے دیکھ کر سویرا نے محبت سے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے پوچھا تو اس نے ایک نظر اس کی جانب دیکھا پھر آنکھوں میں آئی نمی کو ایک ہاتھ کی مدد سے صاف کرتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

"تم جانتی تو ہو میں اسے ہر روز فیس نہیں کر سکتی۔ میں ..... میں اپنا بھرم نہیں کھونا چاہتی اس کے سامنے۔"

"بی بریو ماہین۔ وہ وہی عدید مہران ہے جس کی موجودگی تمہیں Protect کرتی تھی۔" سویرا نے پیار سے اس کی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا لیکن اس نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ پرے کر دیے اور تیزی سے گویا ہوئی۔

"وہ وہی عدید مہران ہی تو نہیں ہے سویرا جبھی تو اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔ جس طرح اس نے میرا مان توڑا ہے میں کبھی نہیں بھلا سکتی۔ مجھے اس وقت بالکل تنہا۔ چھوڑ کر چلا گیا وہ جب مجھے اس کی ضرورت تھی۔ لیکن اب کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے اس کی۔"

آخری بات کہتے ہوئے اس نے سختی سے آنکھوں میں آئے آنسو ـــــ رگڑ کر صاف کیے اور خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

اس کی یہ کنڈیشن دیکھ کر سویرا فوراً کچھ بھی نہ بول سکی پھر تھوڑی دیر کے وقفے کے بعد سمجھانے والے انداز میں قدرے نرمی سے گویا ہوئی۔

"آئی انڈر اسٹینڈ ماہین۔ لیکن میں پھر بھی تمہیں یہی مشورہ دوں گی کہ اس وقت ان سب باتوں سے ہٹ کر صرف اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بالفرض تم یہ جاب چھوڑ بھی دیتی ہو تو کیا گارنٹی ہے کہ تمہیں اگلے ہی دن اچھی سی جاب مل جائے گی۔ ایسے میں گھر کا کرایہ' گھر کا خرچ' بچوں کی اسکول فیس اور مریم کی شادی یہ سب کس طرح پاسبل ہے پلیز سوچنا ضرور اس بارے میں۔ تم بھول جاؤ کہ تم کہاں جاب کر رہی ہو اوکے؟" سویرا کی بات سن کر وہ چپ ہو گئی تھی۔

وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ پچھلے کئی ماہ اس کے گھر والوں نے جتنی تکلیف میں گزارے تھے اس کا احساس اب بھی باقی تھا۔ جبکہ اس جاب کی سیلری اتنی اچھی تھی کہ ایک ماہ میں ہی بہت سی ضروریات پوری ہو گئی تھیں۔ بچوں کی اسکول فیس سے لے کر امی کی دوائیاں اور مریم کے لیے بھی وہ تھوڑا بہت پس انداز کر چکی تھی۔

"اچھا میں اب چلتی ہوں ماما انتظار کر رہی ہوں گی۔"

سویرا اسے سوچتا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی تو وہ اپنے آپ میں الجھ کر رہ گئی۔

کیا کرے' کیا نہ کرے کی پوزیشن میں وہ کافی دیر تک ایک ہی جگہ پر بیٹھی رہی۔ سویرا کی باتوں نے اسے شش و پنج میں مبتلا کر دیا تھا۔ جب وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی تو سر جھٹک کر بیڈ پر آلیٹی۔

"خالہ جانی۔" وہ اپنی ہی سوچوں میں غلطاں تھی جب چھ سالہ ہانی اور چار سالہ زین اسے پکارتے ہوئے اس کے پاس بیڈ پر آبیٹھے تو وہ فوراً ان کی جانب متوجہ ہو گئی اور انہیں اپنے قریب بٹھا لیا۔ انہیں دیکھتے ہی وہ تھوڑی دیر پہلے والی ساری کلفت دور ہو گئی تھی۔ ان کی معصوم سی باتوں نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

"خالہ جانی آپ میرے لیے ایروپلین لائیں گی نا۔"

"اور میرے لیے باربی۔" اچانک باتوں کے دوران زین اور ہانی باری باری اپنی فرمائشیں سنانے لگے تو وہ بے اختیار ان کے گالوں پر پیار کرنے لگی۔

"جی ہاں ضرور لاؤں گی میری جان۔"

"ماہین امی کی میڈیسن لیتی آنا کل آفس سے واپسی پر۔" اسی وقت بجو کمرے میں داخل ہوئیں اور اس کی طرف نسخہ بڑھایا اور مزید گویا ہوئیں۔

"ماہین تم ان کی فضول فرمائشوں پر ذرا کان مت دھرا کرو ان کا بس چلے تو یہ......"

"اونہہ بجو' ایسی باتیں مت کیا کریں پلیز ان کی چھوٹی چھوٹی سی خواہشیں پوری کر کے مجھے جتنی خوشی ملتی ہے اس کا آپ کبھی اندازہ نہیں لگا سکتیں۔" اس نے ان کی پوری بات سنے بغیر جلدی سے کہا۔ اس کے لہجے میں ان دونوں کے لیے جھلکتی محبت کو وہ با آسانی محسوس کر سکتی تھیں لیکن آئے دن کی فرمائشوں کے باعث وہ اسے اکثر منع کرتی تھیں پر اس بارے میں وہ ان کی ایک نہیں سنتی تھی۔

"میں اس لیے کہتی ہوں ماہین کہ....."

"جی نہیں آپ کچھ نہیں کہیں گی یہ بتائیں مریم کے سسرال والے کب آ رہے ہیں کھانے پر؟" اس نے بات کا رخ پلٹ دیا۔

"اسی جمعہ کو آ رہے ہیں میں نے چیزوں کی لسٹ بنا دی ہے صبح یاد سے لیتی جانا۔ میں چاہ رہی ہوں جمعہ آنے میں ابھی تین دن باقی ہیں تو کچھ تیاری پہلے سے ہی مکمل کر لوں تاکہ وقت پر کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔ آخر کو وہ لوگ پہلی بار آ رہے ہیں۔ سب کچھ بہت اچھا ہونا چاہیے نا۔" جب سے مریم کی بات پکی ہوئی تھی امی اور بجو بے حد خوش تھیں۔ رضوان ہر لحاظ سے مریم کے لیے بہترین لڑکا تھا۔ امی اور بجو دونوں جلد سے جلد مریم کی شادی کی خواہش مند تھیں۔ بجو کے چہرے سے چھلکتی خوشی کو دیکھ کر وہ اندر تک سرشار ہو گئی تھی۔

"آپ بالکل فکر نہ کریں بجو ان شاءاللہ سب کچھ بہت اچھا ہی ہو گا۔ آپ مجھے وہ لسٹ دے دیجیے گا میں سارا سامان لے آؤں گی۔" وہ انہیں تسلی دینے والے انداز میں بولی تو بجو محبت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

"اللہ تمہیں بہت خوش رکھے۔ میں سوچتی ہوں اگر تم نہ ہوتیں تو ہمارا کیا بنتا' کتنا مشکل ہو جاتا نا وقت گزارنا؟" بجو آبدیدہ ہو رہی تھیں۔ وہ بے چین ہو اٹھی۔

"بجو پلیز ایسا مت کہیں۔ اگر آج ہم خود کو اچھے طریقے سے اسٹیبلش کر پائے ہیں تو اس میں صرف میرا ہی نہیں' ہم سب کا ہاتھ ہے۔ میں وہ وقت نہیں بھولی جب آپ محض چند سو روپوں کی خاطر اسکول جاب کرتی تھیں جس کی پرنسپل اتنی سخت تھیں اس وقت اگر میری ایجوکیشن کمپلیٹ ہوتی تو میں کبھی بھی آپ کو وہ جاب کرنے نہ دیتی۔"

"تو اب کون سا کرنے دیتی ہو؟" بجو نے شکایتی انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"کیوں کرنے دوں۔ میں ہوں نا پھر کیا ضرورت ہے۔ کسی کو کچھ کرنے کی۔" اس نے محبت سے ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تو بجو دھیرے سے مسکرا دیں۔

وہ جانتی تھیں کہ وہ انہیں جاب کیوں نہیں کرنے دیتی۔ ان کی کمر میں مسلسل رہنے والے درد نے جہاں انہیں ادھ موا کر ڈالا تھا وہیں اسے بھی اپنی ذمہ داریوں سے باور کرا دیا تھا ورنہ ابھی تو وہ نہ جانے کیا کیا پڑھنا چاہتی تھی لیکن بدلتے حالات نے اس کے اندر پنپتے سارے خوابوں کو اس کی آنکھوں سے کوسوں دور کر ڈالا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہیں بجو؟" اس کی آواز پر وہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں پھر آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کچھ نہیں تم اب آرام کرو' صبح آفس بھی جانا ہے تمہیں۔ چلو ہانی' زین آجاؤ بیٹا خالہ کو ریسٹ کرنے دو اٹھو شاباش۔" وہ اسے کہہ کر ان دونوں سے مخاطب ہوئیں جو اس کے قریب ہی بیڈ پر ایک دوسرے کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھے۔ ان کے کہنے پر فوراً "بیڈ سے نیچے اتر آئے اور بجو کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

ان کے جانے کے بعد وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے ہاتھ میں پکڑے اس نسخے کو تکنے لگی جو تھوڑی دیر پہلے بجو نے اسے تھمایا تھا۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اس وقت پورے گھر کی ذمہ داری تم پر ہے۔ اگر تم ہی جاب چھوڑ کر گھر بیٹھ جاؤ گی تو تمام گھر والوں کا کیا ہو گا۔ آنٹی' فاطمہ بجو ان کے بچے اور مریم سب تم پر ڈیپنڈ کرتے ہیں اور تم ہو کہ۔" تھوڑی دیر پہلے کہے گئے سویرا کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجے۔

"خالہ جانی آپ میرے لیے ایروپلین لائیں گی نا۔"

"اور میرے لیے باربی۔"

زین اور ہانی کے معصوم سے چہرے اس کی نظروں کے سامنے آ ٹھہرے جو کہتے ہوئے بڑی آس سے اسے دیکھ رہے تھے۔ یکدم اس کے دل کو نہ جانے کیا ہوا وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

"ٹھیک کہتی ہے سویرا مجھے بھول جانا چاہیے کہ میں کہاں جاب کر رہی ہوں۔ مجھے تو اپنے کام سے غرض ہونی چاہیے ناں" وہ خود سے ہمکلام تھی۔

تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد مطمئن انداز میں بیڈ کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں موندے نیم دراز ہو گئی۔

✡ ✡ ✡

"چل یار' اب میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گا ابھی اٹھ اور مجھے میرے فیورٹ ہوٹل میں کھانا کھلا۔ اٹھ جا شاباش۔"

لاؤنج میں داخل ہوتے ہی احسن نے با آواز بلند جوش سے معنی خیز انداز میں کہا پھر آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا تو اس نے سوالیہ نظروں سے احسن کی جانب دیکھا۔

"کس خوشی میں؟"

"کمال کرتے ہو یار تمہیں تو میرے کہنے سے پہلے شاندار سی پارٹی کا اہتمام کر دینا چاہیے تھا میرے لیے۔ لیکن تم ہو کہ خوشی کی وجہ پوچھ رہے ہو؟" احسن شکوہ کرتے اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔

"چار سال بعد تمہیں ماہین ملی ہے اور تم خوشی کی وجہ پوچھ رہے ہو اسٹرینج۔" احسن نے باقاعدہ طور پر اسے گھورا۔

"وہاٹ یو مین ملی ہے؟" وہ ریموٹ سے ٹی وی آف کر کے احسن کی طرف دیکھ کر تصحیح کرنے والے انداز میں گویا ہوا۔

"وہ مجھے ابھی صرف دکھائی دی ہے' ملی نہیں ہے یار۔"

"دکھائی دی ہے تو ان شاءاللہ مل بھی جائے گی۔ تم دکھائی دینے کی تو ٹریٹ دو جب ملے گی تو اس کے بدلے میں تو دیکھنا میں تم سے کتنی بار ٹریٹ لیتا ہوں۔" احسن کی بات پر وہ آہستگی سے مسکرا دیا۔

"ہوں' تمہاری مسکراہٹ دیکھ کر لگتا ہے منزل قریب قریب ہی ہے' ہے نا؟" اتنے دنوں بعد اسے خوش دیکھ کر احسن کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"ہاں شاید۔" تھوڑی دیر پہلے والی مسکراہٹ اس کے چہرے سے معدوم ہو چکی تھی۔

"شاید کیوں' یقیناً" کیوں نہیں؟" احسن نے الجھے سے اسے دیکھا جس کے لہجے سے چھلکتی یاسیت کو وہ با آسانی محسوس کر سکتا تھا۔

"میں اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن وہ مجھے بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیتی۔ ایون وہ میرے روم میں آنے سے بھی گریز کرتی ہے۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا میں کیسے اسے کنوینس کروں؟" وہ حقیقتاً" پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

"آئی تھنک تمہیں کچھ زیادہ ٹائم spend کرنا پڑے گا اسے کنوینس کرنے کے لیے۔" احسن نے کہا۔

"کچھ زیادہ نہیں' بہت زیادہ۔" اس نے تپ کر ایک بار پھر احسن کی تصحیح کرتے ہوئے کہا تو احسن اپنی ہنسی نہ دبا سکا اور بے ساختہ ہنس پڑا۔ تو وہ اسے گھورے بغیر نہ رہ سکا۔

"تمہیں مجھ پر غصہ آ رہا ہے یا ماہین پر سچ بتانا یار۔" احسن دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے استفسارانہ انداز میں بولا۔

"بہت بہتر ہو گا اگر تم اس وقت مجھ سے بات نہ کرو تو۔" اس نے اپنے کندھے پر رکھے احسن کے ہاتھ کو ہٹاتے ہوئے ناراضی سے کہا۔

"سوری یار مذاق کر رہا تھا۔ غصہ نہ کھا چل کسی اچھی سی جگہ پر چلتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں غصے میں کیا رکھا ہے؟" احسن نے زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے آرام سے کہا پھر اسے باہر لے آیا۔

"عدید یار تم اسے کہیں باہر لے جا کر بات کرو۔ ہو سکتا ہے۔"

"بہت خوب احسن بہت خوب۔" اس نے جلے جلے سے انداز میں اسے سراہا۔

"وہ مجھ سے آفس میں بات کرنا پسند نہیں کرتی۔ غلطی سے اگر میں اسے نظر آجاؤں تو وہ مجھے اس طرح اگنور کرتی ہے جیسے مجھے جانتی ہی نہ ہو اور تم کہہ رہے ہو میں اسے کہیں باہر لے جاؤں۔ آئی ایم شیور وہ یہ سب میرے ساتھ باہر جانے کے لیے ہی تو کر رہی ہے۔"

وہ گاڑی مین روڈ پر ڈالتے ہوئے بولا۔ وہ بری طرح کھولا ہوا تھا احسن کی بات پر۔

"سوری یار میں نے تو بس یونہی کہہ دیا تھا۔" احسن اس کی حالت سے اچھی طرح محظوظ ہو رہا تھا۔ اسے یوں بات بات پر چڑتے دیکھ کر احسن کو خوامخواہ ہنسی آرہی تھی۔

"ارے یہ کیا یار یہاں گاڑی کیوں روک دی؟" احسن کی ہنسی کو یکدم بریک لگ گئے تھے۔

"تم نے کھانا نہیں کھانا؟" اس نے بدستور اسی انداز میں احسن سے پوچھا۔

"کھانا ہے یار لیکن تم جانتے ہو میں چائنیز شوق سے نہیں کھاتا پلیز تم کسی اچھے سے ہوٹل میں لے چلو۔" احسن نے التجا کی جس کو اس نے فوراً" نظرانداز کر دیا۔

"اتنی دیر سے لطف اٹھا رہے ہو میرے دوست تھوڑا سا لطف اور سہی۔" وہ جانتا تھا احسن کو چائنیز کھانے کچھ خاص پسند نہیں تھے لیکن اب وہ احسن کی حالت سے حظ اٹھا رہا تھا جس کی شکل اتر سی گئی تھی اور اب وہ اسے ترحم بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"ابھی تو وہ مجھے دکھائی دی ہے اس لیے یہاں لایا ہوں جب وہ مجھے مل جائے گی ناں تو پرامس یار شہر کے سب سے بہترین چائنیز ریسٹورنٹ میں لے کر آؤں گا۔ چلو باہر آؤ اب اس طرح بیویوں والی نظروں سے نہ دیکھو مجھے جو صرف شوہر کے رحم و کرم پر ہوتی ہیں۔ نکلو باہر۔"

احسن کی حالت دیکھ کر وہ اب قدرے پرسکون تھا جو پچھلے آدھے گھنٹے سے بات بے بات اس پر ہنسے جا رہا تھا جبکہ احسن مظلوم ــــ نظروں سے کبھی اسے اور کبھی اس ریسٹورنٹ کی بلڈنگ کو تک رہا تھا۔

"بہت برا لگ رہا تھا نا' میں تمہیں ہنستے ہوئے۔" احسن اس کے ساتھ اندر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے بے چارگی سے بولا۔ تو وہ کھل کر ہنس پڑا پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے شگفتہ لہجہ میں گویا ہوا۔

"تم پوچھ رہے تھے کہ مجھے تم پر غصہ آرہا ہے یا اس پر تو مجھے اب سمجھ میں آیا ہے کہ مجھے تم پر غصہ آرہا تھا۔" وہ اب کی بار ہنستے ہوئے احسن سے مخاطب تھا۔

"اگر میری حالت تمہیں خوش رکھ سکتی ہے تو ہو جاؤ خوش۔" احسن ٹیبل پر رکھے جگ میں سے پانی گلاس میں انڈیلتے ہوئے بولا۔ جبکہ وہ مسکراتے ہوئے مینو کارڈ دیکھنے لگا۔

☼ ☼ ☼

وہ کتنی ہی دیر سے ہاتھ میں پکڑی فائلز کو مسلسل دیکھے جا رہی تھی۔ جن پر سائن کرانا بے حد ضروری تھا لیکن وہ اپنے اندر اس کا سامنا کرنے کی ہمت مجتمع نہیں کر پا رہی تھی۔ اس وقت بھی شدید ضرورت کے باوجود وہ دوبار اس کے روم کے باہر سے ہی واپس پلٹ آئی تھی۔

"طوبیٰ۔" وہ پریشان پریشان سی اپنی سیٹ پر بیٹھی تھی جب اس نے اپنے کیبن ڈور کے سامنے سے گزرتی طوبیٰ کو پکارا جو غالباً" اسی کے آفس روم کی طرف جا رہی تھی۔

"ہاں۔" طوبیٰ رک کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"تم سائن کرانے جا رہی ہو؟" طوبیٰ کے ہاتھ میں پکڑی فائلز کو دیکھ کر اس نے پوچھا تو طوبیٰ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں بولو۔" طوبیٰ نے کہا۔

"یہ میری فائلز پر بھی سائن کرا دینا پلیز مجھے ابھی کچھ کام ہے اس لیے میں......"

"نو پرابلم میں لے جاتی ہوں۔" اس کی بات پوری سنے بغیر ـــ بھرپور خلوص کے ساتھ مسکرا کر کہا اور اس کے ہاتھ سے فائلز لے کر آگے کی جانب بڑھ گئی تو اس نے صد شکر ادا کیا اور اپنی سیٹ پر جا بیٹھی۔

"ماہین۔" کچھ ہی دیر بعد طوبیٰ کی آواز پر اس نے کمپیوٹر پر سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

"سوری ماہین میں سائن نہیں کرا سکی۔ ایکچوئیلی عدید سر بہت غصے میں ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں جس کا کام ہو وہ خود چیک کرائے آکر۔"

طوبیٰ نے فائلز اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا پھر اپنے کیبن کی طرف بڑھ گئی تو وہ شش و پنج میں مبتلا کافی دیر تک یونہی بیٹھی رہی پھر اپنے اندر اپنی ساری ہمت جمع کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

آخر کب تک وہ اس کا سامنا کرنے سے گریز کرے گی؟

جس وقت وہ ڈور ناک کر کے ادھ کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی وہ ٹیبل پر رکھے اپنے لیپ ٹاپ پر انتہائی محویت سے نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"مے آئی کم ان؟" اس نے اجازت طلب کی۔

"یس....." مصروف مصروف سے انداز میں اس پر ایک نظر ڈال کر وہ دوبارہ اپنے کام کی جانب متوجہ ہو چکا تھا۔

اس کی اجازت ملنے پر وہ متناسب قدم اٹھاتی اس کی ٹیبل کے سامنے آکھڑی ہوئی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے چیئر پر بیٹھنے کو کہا جس کو اس نے فوراً" نظرانداز کر دیا۔

"ان پیپرز پر سائن چاہیے تھے۔" اس کے سامنے ٹیبل پر فائلز رکھتے ہوئے اس نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو وہ لیپ ٹاپ پر سے نظریں ہٹا کر مکمل طور پر اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"بیٹھو۔" اس نے فائلز کھولتے ہوئے ایک بار پھر بیٹھنے کو کہا مگر وہ انکار کر گئی۔

"میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔" اس کا لہجہ قدرے خشک سا تھا۔ اس نے پیپرز پر سائن کرتے ہوئے ایک اچٹتی سی نگاہ اس پر دوڑائی۔

بلیک کلر کے جارجٹ سوٹ میں سلیقے سے دوپٹہ شانوں پر پھیلائے' سلکی بالوں کو کیچر میں قید کیے' جھکے سر کے ساتھ سیاہ لانبی گھنی پلکیں بچھائے' کسی بھی قسم کی مصنوعی آلائش سے پاک اس کے صبیح چہرے پر پھیلی ناراضی پر اس کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا تھا۔

وہ زیادہ دیر اس کی طرف نہ دیکھ سکا اور ایک گہرا سانس اپنے اندر اتارتا ایک کے بعد دوسری فائل میں موجود پیپرز کو چیک آؤٹ کرنے لگا۔

"پھپھو کیسی ہیں؟" پیپرز پر سائن کرتے ہوئے وہ اس کی طرف دیکھے بغیر اس سے مخاطب ہوا۔

"ٹھیک ہیں۔" اس نے ناچار جواب دیا۔

"فاطمہ بجو اور......"

"سب ٹھیک ہیں۔" اس کی بات مکمل سنے بغیر اس نے تیزی سے اکتائے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ اس کے اس طرح کرنے پر اس نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا جو یقیناً" اس سے ہرگز بات کرنے کی روادار نہ تھی وہ خاموشی سے دوبارہ پیپرز سائن کرنے میں مصروف ہو گیا۔

"ماہی۔" وہ فائلز چیک آؤٹ کر چکا تھا اور اب وہ فائلز سمیٹ کر پلٹ رہی تھی جب وہ بالکل اچانک اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ تو بے اختیار وہ اپنی جگہ پر رک گئی۔

"ڈونٹ کال می ماہی پلیز۔" اس کے لہجے میں سختی نمایاں تھی۔

"تمہیں ہمیشہ اسی نام سے پکارا ہے اور پکارتا رہوں گا تم یا کوئی اور مجھے اس حق سے دستبردار نہیں کر سکتا۔" وہ اس کے چہرے کو اپنی نظروں کی گرفت میں

لیتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولا۔

اس نے اس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور آگے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

"ون منٹ ماہی۔" وہ ایک بار پھر اس کے مقابل تھا۔

"میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"سوری۔" وہ اتنا کہہ کر آگے بڑھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے روکنا چاہا۔

"پلیز ماہی ڈونٹ بی ہیو لائک اسٹرینجرز تم جانتی ہو تمہارا یہ رویہ مجھے کتنی تکلیف دیتا ہے؟" اس نے دکھ سے کہا۔

"تو میں کیا کروں؟" اس نے تنک کر کہا۔

"تمہیں دوسروں کی تکلیف کا کتنا احساس ہوتا ہے جو دوسرے تمہارے درد کو محسوس کریں۔"

"ایسا کیا کیا ہے میں نے؟" وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر استفسارانہ انداز میں بولا۔

"تمہیں احساس ہی نہیں ہے کہ تم نے کیا کیا ہے؟" جواباً اس نے تاسف سے اس کی طرف دیکھا پھر سر جھٹکتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"ماہی پلیز مجھ سے بات کرو۔" وہ دو قدم تیزی سے آگے کی طرف بڑھا اور ڈور ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے روکنا چاہا۔

"مجھے جانے دو۔" اب کی بار اس کے لہجے میں قدرے سختی در آئی تھی۔

اس نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں صرف غصہ تھا۔ وہ یقیناً اس وقت اس کی کوئی بات سننے کے موڈ میں نہیں تھی لہٰذا اس نے خاموشی سے ہینڈل پر سے اپنا ہاتھ ہٹایا اور اسے راستہ دیتا ایک سائیڈ پر ہو گیا تو وہ فوراً باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

"امی کیا پکایا ہے آج؟" وہ ابھی ابھی آفس سے آئی تھی اور اب ہاتھ منہ دھو کر امی کے پاس صحن میں رکھے تخت پر آبیٹھی تھی۔

"آج کوفتے بنائے ہیں فاطمہ نے، تمہیں پسند ہیں نا؟" امی دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے محبت سے بولیں۔

"ہوں پھر تو مزا آجائے گا۔" اس نے چٹخارہ لیتے ہوئے کہا۔

"مریم کے سسرال والے آئے تھے آج۔" باتوں کے دوران امی نے اسے بتایا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور بغور ان کی باتیں سننے لگی۔

"وہ اگلے مہینے کی دس تاریخ تک شادی کرنے کے خواہش مند ہیں۔" ان کے بتانے پر خوشی کی لہر اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔

"سچ امی یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" وہ بہت پرجوش دکھائی دے رہی تھی۔

"میری تو خواہش تھی کہ تم دونوں ہی اپنے اپنے گھروں کی ہو جاؤ تاکہ میری ساری فکریں ختم ہو جائیں۔"

امی یکدم متفکر نظر آنے لگیں۔ ان کی بات سن کر وہ چپ ہو گئی تھی۔

"جی امی بالکل اگر ماہین راضی ہو جاتی تو دونوں ساتھ ہی اپنے گھروں کو رخصت ہو جاتیں اور......" بجو ابھی ابھی چائے کی ٹرے ہاتھ میں پکڑے وہاں آئی تھیں جب انہوں نے امی کی بات سن کر ان کا ساتھ دیا تو وہ خاموشی سے پاؤں میں سلیپر پہنے اندر جانے کی تیاری کرنے لگی۔ لیکن بجو نے اسے وہیں روک دیا۔

"ٹھہو ماہین۔" بجو کے روکنے پر وہ وہیں رک گئی۔

"تم اس موضوع پر بات کیوں نہیں کرتیں امی ٹھیک کہہ رہی ہیں اگر تم بھی شادی کے لیے راضی ہو جاتیں تو امی کو تمہاری طرف سے بھی بے فکری ہو جاتی۔" بجو آرام سے سمجھا رہی تھیں۔

"بجو ابھی جلدی کیا ہے۔ شادی ایک نہ ایک دن تو ہونی ہے نا، ہو جائے گی۔ آپ خود سوچیں اگر میں شادی کرنے کے چکر میں پڑ جاؤں تو گھر کے اخراجات اور ضروریات کیسے پوری ہوں گی۔" چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے وضاحت دی۔

"اللہ مالک ہے بیٹا۔" امی نے محبت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اللہ تو مالک ہے امی لیکن یہ بھی دیکھیں نا ابھی ہم لوگ پوری طرح اسٹیبلش نہیں ہوئے۔ گھر کی مختلف ضروریات کے علاوہ زین اور ہانی کی اسکول فیس اور اسکول کے دوسرے اخراجات کہاں سے پورے ہو سکتے ہیں؟ آپ کے پاس صرف زیور ہے جو آپ نے ہمارے لیے رکھا ہوا ہے جبکہ شادی میں صرف زیور کی ہی ضرورت نہیں پڑتی۔ دوسرے اور بھی کام ہوتے ہیں جن میں پیسہ چاہیے ہوتا ہے۔ ابھی جو کچھ آپ نے بتایا ہے وہ مریم کے لیے ہی ناکافی ہے پھر ایسے میں میرے لیے سوچنا کیا معنی رکھتا ہے؟ پلیز امی ابھی ڈیڑھ دو ماہ ہیں مریم کی شادی خیریت کے ساتھ ہو جائے اور زین ہانی اچھے اسکول میں اچھی تعلیم حاصل کر لیں۔ آپ کی میڈیسن وقت پر آجایا کریں۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی۔ سب کچھ دیکھتے ہوئے میں اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتی۔ پلیز بجو مجھے سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ میں کسی کو بنیادی ضروریات سے محروم نہیں دیکھ سکتی۔ اسے میری کمزوری سمجھ لیجیے گا۔ بس یہی وجہ ہے کہ میں اس ٹاپک پر بات نہیں کرتی کیونکہ ابھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ آپ کی پریشانی اپنی جگہ لیکن میری بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں جن کو میں احسن طریقے سے پورا کرنا چاہتی ہوں مجھے کرنے دیجیے پلیز۔" وہ بجو کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے التجائیہ انداز میں بولی۔

امی اور بجو اس کی باتیں سن کر چپ ہو گئی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے لیکن ان کی پریشانی بھی فطری تھی۔

"اگر بھائی جان نے میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکہ نہ کیا ہوتا تو آج ہم خالی ہاتھ ہرگز نہ ہوتے۔" امی آنکھوں کے گوشوں میں پھیلتی نمی کو دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے بولیں۔ وہ بہت غمزدہ دکھائی دے رہی تھیں۔

"ان لوگوں کی وجہ سے ہی تو ہم پر یہ دن آئے ہیں امی۔" اس نے امی کے گرتے آنسوؤں کو دیکھ کر تنفر سے کہا۔

"بس امی اب اس بات کو جانے دیں۔ بار بار یاد کر کے اپنا دل دکھانے سے کیا فائدہ۔ ایسا ہونا ہماری قسمت میں تھا اسی لیے یہ تمام مشکلات ہمیں برداشت کرنا پڑیں اس میں کسی اور کا کیا قصور؟" بجو نے کھلے دل سے ماموں جان کو مورد الزام ٹھہرانے کے بجائے اپنی قسمت کو اس کا سبب بنایا۔

"پلیز بجو آپ لوگوں کی کی گئی زیادتیوں کو قسمت پر ڈال کر مطمئن رہنے کی کوشش مت کیا کریں۔ جو کچھ ماموں جان اور مامی جی نے کیا ہے وہ آپ بھول سکتی ہیں لیکن ہم نہیں۔" ماموں جان اور مامی جی کا ذکر آتے ہی اس کے پورے جسم میں یونہی کڑواہٹ سی گھل جاتی تھی جبکہ بجو اتنے عرصے میں نہ اس کا ان کے لیے غصہ ٹھنڈا کر سکی تھیں اور نہ ہی اس کی سوچ بدل پائی تھیں۔ وہ اس کی اس شدت پسندی سے گھبرا جاتی تھیں۔

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ چائے پیو پھر میں کھانا لگاتی ہوں۔" بجو اسے اس موضوع پر سے ہٹانے کے لیے اس کی توجہ چائے کی جانب مبذول کرانے لگیں تو اس نے بے دلی سے چائے کا کپ اٹھا لیا۔ امی کو چائے کا کپ پکڑاتے ہوئے انہوں نے ایک نظر اس کو دیکھا جو بگڑے موڈ کے ساتھ چائے کے سپ لے رہی تھی۔ وہ محض سر ہلا کر رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

اپنے آفس سے نکل کر وہ باہر کی طرف بڑھ رہا تھا جب اس کے کیبن کی لائٹ آن دیکھ کر وہ غیر ارادی طور پر اس طرف چلا آیا اور کیبن ڈور کو ہلکا سا ناک کیا۔ وہ جو کمپیوٹر اسکرین پر نظریں جمائے اپنے کام میں مصروف تھی، اس نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ وہ دروازے میں ایستادہ تھا۔

"تم ابھی تک گھر نہیں گئیں، خیریت؟" اس نے

حیرت سے پوچھا۔
"تھوڑا سا کام رہتا تھا وہ مکمل کر رہی تھی۔" اسے بتا کر وہ دوبارہ کمپیوٹر اسکرین کی جانب متوجہ ہو گئی۔
"رات کے نو بج رہے ہیں پورا آفس خالی ہو چکا ہے۔ کام صبح بھی مکمل کیا جا سکتا تھا۔" اس نے بائیں ہاتھ کی کلائی پر بندھی رسٹ واچ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے تشویش سے کہا۔
"چلی جاؤں گی تھوڑی دیر تک۔" وہ کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔
"کوئی پرابلم ہے کیا؟" اسے پریشان دیکھ کر وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا اور آہستگی سے چلتا ہوا اس کی ٹیبل کے پاس جا کھڑا ہوا اور کمپیوٹر اسکرین کو دیکھنے لگا جہاں فائل Accept نہیں ہو رہی تھی اور وہ غالباً" اس کوشش میں غلطاں تھی۔
"کیا میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں؟" اس کا جواب نہ پا کر ایک بار پھر اس نے اجازت طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
وہ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے اس فائل میں الجھ رہی تھی مگر اتنی کوششوں کے باوجود بھی ناکام تھی اور اب اس کا دل اکتا رہا تھا لیکن صبح پہلی ہی شفٹ میں اسے فائل توقیر صاحب کو ہینڈ اوور کرنی تھی لہٰذا وہ جلد سے جلد مکمل کرنا چاہتی تھی اور اسی عجلت میں اسے اتنی دیر ہو چکی تھی کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا اور اب امی کی پریشانی کا خیال آتے ہی اسے یکدم فکر ستانے لگی تھی۔
بے اختیار ہی اس نے اپنے بائیں جانب اسے دیکھا جو منتظر نظروں سے اسے تک رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر میں کنفیوز ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی موجودگی اسے بری طرح نروس کر رہی تھی۔ کی بورڈ پر چلتی اس کی انگلیوں میں واضح ارتعاش پیدا ہو چکا تھا۔ اپنی اس کیفیت پر وہ جھنجھلا سی گئی۔ اگر اسے ذرہ برابر بھی علم ہوتا کہ وہ بھی آفس میں موجود ہے تو وہ کسی بھی فائل کی پروا کیے بغیر اس وقت گھر میں ہوتی لیکن...... واہ رے بے خبری۔
وہ جوں کا توں کھڑا تھا۔
اب وہ کیسے اسے اپنا مسئلہ بتائے؟ وہ سوچوں کا تانا بانا بن رہی تھی جب اس کی آواز سنائی دی۔
"میں دیکھتا ہوں کیا پرابلم ہے؟" ہمیشہ کی طرح اس کے کہے بغیر وہ آج بھی اس کے دل کی بات جان چکا تھا۔ پل بھر کو وہ بالکل ساکت ہو گئی لیکن جلد ہی نارمل ہونے کی کوشش کرنے لگی۔
اس نے کچھ سوچ کر کی بورڈ پر سے اپنے ہاتھ ہٹا لیے۔ جو یقیناً" اس کی طرف سے ملنے والی اجازت تھی وہ فوراً" ٹیبل پر جھک گیا۔
"تم بیٹھو میں ٹھیک ہوں۔" اسے جگہ دینے کے لیے وہ اٹھنے لگی تھی جب اس کے کہنے پر بلا ارادہ وہیں بیٹھی رہ گئی۔
وہ کمپیوٹر اسکرین کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ اس نے بھی اپنی نظریں اسکرین پر جما دیں تب ہی بالکل اچانک اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ اس پر دوڑائی۔
اسکائی بلیو شرٹ پر ڈارک نیوی بلیو اور بلیک کامبینیشن کلر کی ٹائی جو اب ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں گلے میں پڑی تھی کہنیوں تک فولڈ کی ہوئی آستینیں مضبوط ہاتھوں کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر متحرک تھیں جبکہ چہرے پر پھیلی سنجیدگی و متانت اس کے وقار کو مزید بڑھا رہی تھی۔
وہ اس سے محض بالشت بھر کے فاصلے پر تھا یکدم گھبرا کر وہ چیئر کی پشت سے چپک گئی تھی۔ وہ اٹھنا چاہ رہی تھی مگر۔
"اٹس ڈن۔" وہ کہتا ہوا سیدھا ہو گیا۔ اس کی آواز پر وہ فوراً" کمپیوٹر کی جانب متوجہ ہو گئی۔
وہ کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کر کے کیبن سے باہر نکل چکا تھا۔
"آئندہ سات بجے تک گھر چلی جایا کرو۔" وہ اپنا پرس سنبھالے کیبن کی لائٹ آف کر کے باہر نکل رہی تھی جب اس کی بات سن کر وہ لمحہ بھر کو رکی پھر اس کی جانب دیکھے بغیر خاموشی سے آگے کی جانب چل پڑی۔
"ماہی کم از کم تم مجھ سے بات تو کیا کرو۔ تمہاری

خاموشی سے میں یہ کیسے جان سکتا ہوں کہ تمہارے دل میں میرے لیے کیا ہے؟" وہ اس سے ذرا فاصلے پر قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے نرمی سے بولا۔
"تمہیں اب تک میرے رویے سے پتا نہیں چلا کہ میرے دل میں تمہارے لیے کیا ہے؟" جواباً" اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔
"جانتا ہوں، تمہارے دل میں میرے لیے غصہ ہے کیونکہ میں تمہیں انفارم کیے بغیر ملک سے باہر چلا گیا تھا۔" وہ بغور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔
"نفرت بھی ہو سکتی ہے۔" اس نے بے دردی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا پھر دوبارہ آگے کی جانب بڑھ گئی تو وہ اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔
"اتنی تکلیف دہ باتیں مت کیا کرو ماہی پلیز۔" اس کا لہجہ ملتجی تھا جسے وہ مکمل نظر انداز کر کے لفٹ کی طرف مڑ گئی تو وہ گہرا سانس لے کر رہ گیا۔
"لفٹ خراب ہے سیڑھیوں سے جانا پڑے گا۔" وہ ابھی لفٹ کے دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ اس کی آواز پر وہیں رک گئی پھر پلٹ کر نچلی منزل کی جانب اترتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی تو وہ بھی اس کی تقلید میں اس کے پیچھے چل پڑا۔
ابھی وہ دوسری منزل پر ہی پہنچے تھے کہ اچانک لائٹ چلی گئی جس کے باعث سیڑھیوں میں مکمل اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اس نے فوراً" موبائل ٹارچ آن کر لی تھی۔ اس وقت وہ اس سے آگے سیڑھیاں اتر رہا تھا جب اچانک اس کا پاؤں اگلی سیڑھی کے کنارے پر رکھے جانے کی وجہ سے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ اسی لمحہ اس نے فوراً" ریلنگ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ وہ گرتے گرتے بچ گئی تھی۔
اس کی لڑکھڑاہٹ پر اس نے فوراً" پلٹ کر اسے دیکھا۔
"تم ٹھیک تو ہو نا؟" اس کے لہجے سے چھلکتی تشویش کو وہ واضح طور پر محسوس کر سکتی تھی۔
"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔
"ہاتھ دو۔" اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ مگر اس نے اس کی کھلی چوڑی ہتھیلی کو نظر انداز کر دیا اور مزید ایک سیڑھی نیچے اتر آئی۔
"میں نے کہا ہاتھ دو۔" اب کی بار اس نے درشتگی سے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔ اس وقت وہ غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا جو اب بھی اس کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔
وہ اس کا ہاتھ تھامے بڑی احتیاط سے سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ تب ہی فون بجنے پر اس نے دائیں ہاتھ میں پکڑا سیل کان سے لگا لیا۔
"ہیلو۔" وہ فون پہ باتیں کرنے میں مصروف ہو چکا تھا۔
وہ خاموشی سے اس کی پیروی میں سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ جب آخری منزل کی آخری سیڑھی پر پہنچتے ہی اس نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا جو بڑے مگن سے انداز میں ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھامے اور دوسرے ہاتھ سے فون کان پر لگائے باتوں میں محو بلڈنگ سے باہر نکل رہا تھا اور وہ میکانکی انداز میں اس سے دو قدم کے فاصلے پر چل رہی تھی۔
بدستور باتیں کرتے کرتے وہ پارکنگ ایریا تک آ پہنچا اور اب رک کر دوسری طرف موجود شخص کی کسی بات پر ہنس رہا تھا۔ اس نے تپ کر ایک نظر اسے اور دوسری نظر اس کے ہاتھ میں موجود اپنے ہاتھ کو دیکھا جس کو اس نے مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ وہ ایک بار پھر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑانے کی سعی کرنے لگی مگر ندارد۔
"چلیں ٹھیک ہے اجمل صاحب پھر کل آپ سے آپ کے آفس میں ملاقات ہو گی ان شاءاللہ او کے اللہ حافظ۔"
مسکرا کر فون آف کرتے ہوئے اس نے ایک نظر اسے دیکھا جو اپنے غصے کو بمشکل دبائے اس کے ساتھ کھڑی تھی۔

"کیا ہوا؟" پتا نہیں وہ واقعی اس کے غصہ کی وجہ نہیں جانتا تھا یا انجان بن رہا تھا لیکن کچھ بھی تھا اس وقت وہ اپنے لہجے کی سختی پر قابو نہیں رکھ پائی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ قدرے بلند آواز میں بول پڑی۔

"ہاتھ چھوڑو میرا۔" اس کے کہنے پر اس نے ایک نظر اپنے ہاتھ میں موجود اس کے نرم ہاتھ کو دیکھا اور دوسری نظر اس کے تنے چہرے پر ڈالتے ہوئے آہستگی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا پھر فوراً" پلٹ کر ہاتھ میں موجود چابی سے پاس کھڑی گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولنے لگا۔

اسی دوران وہ دوسری جانب مڑ چکی تھی۔ اسے پلٹتے دیکھ کر وہ فوراً" اس کی جانب بڑھا اور اس کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے سوالیہ انداز میں گویا ہوا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" اس کے سوال پر وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی پھر اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے تیز لہجے میں بولی۔

"گھر جا رہی ہوں اور کہاں؟"

"گاڑی میں بیٹھو میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔" اس نے نرمی سے کہا۔

"تھینکس میں چلی جاؤں گی۔" اتنا کہہ کر وہ آگے کی جانب بڑھ گئی۔ لیکن وہ اس کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا۔

"رات کے دس بجنے والے ہیں اس وقت تم اکیلی کیسے جاؤ گی؟"

اس کے لہجے میں پریشانی واضح تھی۔

"تمہیں میری فکر کب سے ہونے لگی؟" جواباً" اس نے طنزیہ پوچھا۔

"کیا مطلب؟" وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔

"جو شخص رات کے دس بجے سنسان اور ویران سڑک پر تنہا چھوڑ کر چلا جائے اسے آج میری فکر کیسے لاحق ہو گئی؟" اس نے بدستور اسی انداز میں کہا تو وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قدرے دھیمے مگر سنجیدہ لہجے میں گویا ہوا۔

"تمہاری بات سن کر میری جو حالت ہوئی تھی اس کے بعد مجھے کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ مجھے کم از کم تم سے ایسی توقع نہیں تھی کہ تم مجھ سے ایسی بات کرو گی جو۔۔۔"

"کیا بات کی تھی میں نے؟" وہ اس کی پوری بات سنے بغیر ترش کر بولی۔

"وہی جو سب کہہ رہے تھے اگر میں نے کہہ دیا تھا تو کون سا برا کر دیا تھا۔"

"تم نے برا نہیں ماہی بلکہ بہت برا کیا تھا میرے ساتھ۔ کیونکہ دوسرا کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ میں تمہارے بغیر رہ سکتا ہوں یا نہیں لیکن تم، تم تو جانتی تھیں نا کہ میں تمہارے علاوہ کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور تم ہی مجھے مشورہ دے رہی تھیں کہ میں زریں سے شادی کر لوں جبکہ ایسا کرنا تو دور سوچنا بھی میرے لیے ممکن نہیں تھا اسی لیے تمہاری بات سن کر دکھ کے ساتھ ساتھ مجھے غصہ بھی آ گیا تھا اور میں نے ـــــ"

"اپنی گاڑی سے اتر جانے کو کہہ دیا تھا۔ ہے نا؟" اس نے تاسف سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی بات مکمل کی۔

"سوری فار ویٹ، مجھے اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

اس کا انداز معذرت خواہانہ تھا۔ جس کا اس پر مطلق کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ سر جھٹکتی وہاں سے ہٹ گئی۔

"ہے ماہین۔" وہ اس کی طرف بڑھنا ہی چاہ رہا تھا کہ پارکنگ ایریا کے بائیں جانب سے ان کی طرف آتی گاڑی نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لی۔ جس کو سویرا ڈرائیو کر رہی تھی۔ سویرا کی آواز پر وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی اور پھر تیزی سے اس کی جانب بڑھ گئی۔

"تم آفس سے اب فری ہوئی ہو؟" سویرا نے ایک نظر اس پر ڈالتے ہوئے ماہین سے پوچھا جو یاسیت سے اپنی گاڑی کی طرف پلٹ رہا تھا۔

"تھینکس تم آ گئیں ورنہ میں بہت پریشان ہو رہی تھی کہ اتنی رات کو کیسے گھر جاؤں گی؟" گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے تشکر آمیز نظروں سے سویرا کو دیکھ کر کہا پھر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"تمہیں عدید مہران کے ہوتے ہوئے پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی میری جان؟" سویرا معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھ کر بولی پھر گاڑی کو آگے بڑھا لے گئی۔

"وہاٹ ڈو یو مین؟" اس نے سویرا کو گھورا۔ جو بڑے مزے سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔

"ویسے ماہین ایک بات ہے۔" تھوڑی دیر بعد سویرا نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"عدید مہران اچھا انسان ہے اور وہ تمہارے ساتھ بہت جچتا بھی ہے اس کے علاوہ وہ تمہارے ساتھ بہت مخلص بھی ہے۔ اسے اگنور مت کرو پلیز۔" سویرا نے ناصحانہ انداز میں سنجیدگی سے کہا۔

"لیو اٹ، یہ بتاؤ تم اس وقت یہاں کیا کر رہی تھیں؟" اس موضوع پر بات کرنے سے بچنے کی خاطر اس نے اس کا دھیان دوسری طرف کرنا چاہا۔

"آفس کی طرف سے آئی تھی۔ کچھ ضروری کام تھا۔" سویرا نے بتایا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے میں مگن ہو چکی تھیں۔

✡ ✡ ✡

"ایکسکیوز می سر۔" آج اس نے ایک امپورٹنٹ میٹنگ کال کی تھی اور اب جب وہ میٹنگ اوور کر کے اپنی چیئر سے اٹھنے ہی لگا تھا تو طوبیٰ کی آواز پر وہ فوراً" اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"یس۔"

"سر آپ سے ایک بات کرنی تھی۔" طوبیٰ نے اجازت طلب کی۔ جبکہ ٹیبل کے گرد چیئرز پر بیٹھے تمام ایمپلائیز بھی طوبیٰ کو دیکھنے لگے۔

"جی کہیے۔"

"ایکچوئیلی سر ہم سب نے ڈیسائیڈ کیا ہے کہ اس دفعہ اینول آفس ٹرپ پر آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔"

"سوری مس طوبیٰ آپ سب تو جانتے ہی ہیں میں ٹرپس، پکنکس وغیرہ پر نہیں جایا کرتا، آپ لوگ جائیں اور انجوائے کریں پلیز۔" اس نے ٹالنا چاہا۔

"لیکن سر ہم سب کی خواہش ہے کہ اس سال ہم آپ کے ساتھ ٹرپ پر جائیں اور آپ کے ساتھ انجوائے کریں سو پلیز سر انکار مت کیجیے۔" جبران نے بھی طوبیٰ کی تائید کی۔

"یس سر ہم سب چاہتے ہیں کہ آسٹریلیا کے پروجیکٹ پر کام کر کے جو کامیابی ہمیں ملی ہے وہ ہم آپ کے ساتھ شیئر کریں۔"

اس کا خوشگوار موڈ دیکھ کر کے بعد دیگرے سب اس کو قائل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

"اس سال پہلی دفعہ آفس ٹرپ شہر سے باہر جا رہا ہے آپ ہمارے ساتھ ہوں گے تو ہمیں بہت حوصلہ ملے گا۔ پلیز سر مان جائیے۔" میٹنگ روم میں بیٹھے تمام افراد کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا وہ چیئر کی بیک سے ٹیک لگائے خاموشی سے باری باری سب کو دیکھنے میں مصروف تھا۔ پھر قدرے توقف کے بعد گویا ہوا۔

"ان فیکٹ میں اپنی فیملی کے بغیر کسی طرح بھی تفریحی غرض سے کہیں گیا نہیں اس لیے میرا جانا بہت مشکل ہے۔ آپ سے ریکویسٹ ہے کہ آپ سب لوگ ٹرپ پر جائیں اور خوب انجوائے کریں اگر ممکن ہوا تو اگلی بار ان شاء اللہ میں ضرور آپ کا ساتھ دوں گا۔"

اس کے انکار پر اسٹاف تقریباً" مایوس ہونے کو تھا کہ توقیر صاحب کی آواز پر سب ان کی جانب متوجہ ہو گئے۔

"سب لوگ اتنا زور دے رہے ہیں تو پلیز چلیے سر۔"

"آپ نے بھی میرا ساتھ نہیں دیا توقیر صاحب۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"یس سر کیونکہ سب یہی چاہتے ہیں۔ کیوں مس ماہین۔ پلیز آپ بھی اپنی رائے کا اظہار کر دیں تاکہ ایک ووٹ بھی سر کے حق میں نہ جائے۔"

صفدر نے ماہین کو مخاطب کر کے کہا تو وہ جو ارد گرد

سے بے نیاز سر جھکائے ٹیبل پر نظریں مرکوز کیے بیٹھی تھی، چونک کر بے ساختہ اسے دیکھنے لگی جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اپنی اس بے ساختگی پر وہ خود کو دل ہی دل میں سرزنش کرنے لگی۔

"ماہین تم بھی بولو نا کچھ کہ سر کو بھی ہمارے ساتھ چلنا چاہیے یا نہیں؟" نادیہ نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"آں ہاں..... بالکل۔"

وہ اپنے چہرے پر اس کی نظروں کی تپش کو با آسانی محسوس کر سکتی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ اس وقت اس کی نظروں کو خود پر بری طرح محسوس کر رہی تھی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہ اس وقت اس کو ہرگز نہیں دیکھ رہا ہو گا۔ کچھ بھی تھا وہ اسٹاف کی موجودگی کا ہر صورت خیال رکھتا تھا اور بلا ضرورت اسے کسی بات میں نہیں گھسیٹتا تھا۔ یہ بات اس کے لیے انتہائی قابل اطمینان تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ سب کی موجودگی میں کافی حد تک ایزی فیل کرتی تھی لیکن اب اچانک اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ کچھ گھبرا سی گئی تھی۔

اتنا کہہ کر اس نے دوبارہ سر اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔

"پلیز سر اب تو چلیے نا ہمارے ساتھ اب ایک ووٹ بھی آپ کے حق میں نہیں ہے۔" نصیر نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا تو وہ ایک لمحے کے لیے بالکل خاموش رہ گیا پھر قدرے توقف کے بعد گویا ہوا۔

"چلیے ٹھیک ہے اگر آپ سب کی یہی مرضی ہے تو مجھے بھی آپ کی بات ماننی پڑے گی۔"

اس کا جواب سن کر وہاں پر موجود تمام افراد کے چہرے کھل اٹھے جس کی وجہ اس کا اسٹاف کے ساتھ بہترین رویہ تھا۔ وہ اپنے تمام اسٹاف ممبرز کے ساتھ انتہائی نرمی اور محبت سے پیش آتا تھا۔ بلاوجہ کا سخت رویہ اسے شدید ناپسند تھا اسی لیے اسے خوامخواہ کا پریشر ڈالنا ہرگز گوارہ نہیں تھا۔ وہ اپنے ہر ایمپلائے کے ہر مسئلے سے بخوبی واقف رہتا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ ہر شخص اسے خود سے قریب سمجھتا تھا اور اس سے اپنا ہر پرابلم با آسانی ڈسکس کر لیتا تھا۔ جبکہ وہ ان کی ہر ممکن مدد کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ ان سب کے باوجود اس کی شخصیت میں ایسا کچھ ضرور تھا کہ اس سے بات کرنے سے پہلے مخاطب ایک بار سوچنا نہ بھولتا تھا۔ وہ اپنی حد میں رہنا اور دوسروں کو ان کی حدوں میں رکھنے کا فن بخوبی جانتا تھا۔ اگر وہ سب کے قریب تھا تو ایک نہ محسوس ہونے والا فاصلہ بھی اس نے قائم رکھا ہوا تھا۔ اس کی شخصیت کا وقار لہجے کی متانت اور بات کرنے کا انداز اسے دوسروں سے ممتاز کرتا تھا۔

"ایم ریڈی بٹ ایک شرط ہے۔" وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔

"پورا اسٹاف اس ٹرپ پر چلے گا کوئی Absent نہیں ہو گا۔ اگر آپ سب ایگری ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ ..... سوری۔"

اس نے ایک سرسری سی نظر اس کے جھکے سر پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"نہیں سر ہم سب تیار ہیں۔ آپ فکر مت کریں" توقیر صاحب نے یقین دلایا۔

"سر مقام بھی آپ ڈیسائیڈ کیجیے پلیز۔" زارا نے تجویز دی۔

"یہ تو بہت مشکل کام ہے مس زارا۔" اس نے تھوڑا پس و پیش سے کام لیا۔

"آپ سب مل کر کوئی بھی اچھی سی جگہ سوچ لیجیے وہیں چل پڑیں گے۔"

"تو سر ہم سب آپ کے فیورٹ مقام پر جائیں گے ہم نے یہی ڈیسائیڈ کیا ہے۔" ظفر کے کہنے پر وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد گویا ہوا۔

"پھر ایسا کرتے ہیں ہم لوگ کاغان چلتے ہیں آپ اپنی تیاریاں مکمل کر لیں۔" وہ اتنا کہہ کر مزید کچھ کہے بغیر آخری نظر اس پر ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا تو سب لوگ اس کی تقلید میں اپنی سیٹ چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

اس کے روم سے نکلتے ہی وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو چکے تھے۔ جبکہ وہ بالکل خاموش تھی۔ اس نے ایک طائرانہ سی نظر سب پر دوڑائی ہر شخص اپنی جگہ پر بے حد خوش و مسرور دکھائی دے رہا تھا۔

وہ سب مختلف باتوں اور پلانز میں مگن تھے جب وہ غیر محسوس طریقے سے وہاں سے چلی آئی اور اپنے کیبن میں آ بیٹھی یکدم دل کچھ بوجھل بوجھل سا ہونے لگا تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ میں بندھی نازک سی رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی۔

شام کے پانچ بجے تھے۔ آفس ٹائم ختم ہونے والا تھا۔ اس نے جلدی جلدی کام نبٹایا اور پرس سنبھالے بلڈنگ سے باہر نکل آئی۔

☼ ☼ ☼

"ماہین۔" وہ صحن میں رکھی چیئر پر پاؤں اوپر کیے آرام دہ انداز میں ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ جب بجو کی آواز پر ان کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"میں نے تمہارے کپڑے پریس کر کے بیگ میں رکھ دیے ہیں اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھی رکھ دی ہیں تم ایک دفعہ بیگ چیک کر لینا کچھ کم ہو تو بتا دینا۔" بجو اس کے قریب رکھی چیئر پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ جواباً وہ خاموش تھی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" اسے مسلسل چپ دیکھ کر بجو پوچھے بغیر نہ رہ سکیں۔

"کچھ نہیں بجو بس ویسے ہی۔" اس نے ٹالنا چاہا۔

"دور جانے کے خیال سے پریشان ہو؟" بجو نے محبت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں کہیں نہیں جا رہی۔" اس کی بات پر وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

"کیوں؟" انہوں نے پوچھا۔

"بس ویسے ہی بجو میرا ٹرپ پر جانے کو بالکل دل نہیں کر رہا۔" اس نے بجھے بجھے دل سے کہا۔

"لیکن کیوں، ابھی کل ہی تو تم اتنی ایکسائیٹڈ تھیں اب اچانک کیا ہوا ہے؟"

ان کے سوال پر وہ چند لمحوں کے لیے بالکل چپ ہو گئی۔

اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ کل تک اسے یہی پتا تھا کہ آفس ٹرپ پر عدید مہران نہیں جایا کرتا جبکہ اس دفعہ وہ بھی ٹرپ جوائن کر رہا ہے اور نا صرف یہ بلکہ ..... کاغان۔

اس کا دل یاسیت سے پر ہو گیا تھا۔

ایک عجیب سی کیفیت تھی جو اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ وہ خود نہیں جانتی تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟

"تم نے بتایا نہیں کیا بات ہے ماہین؟" بجو نے دوبارہ استفسار کیا تو وہ چونک سی گئی۔

"بجو ٹرپ کاغان جا رہا ہے اور آپ کو پتا تو ہے میں کاغان پہلے بھی جا چکی ہوں بس اس لیے میرا دل نہیں کر رہا۔" اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

"ارے واہ تمہارا ٹرپ کاغان جا رہا ہے اتنی خوب صورت جگہ پر اور تم انکار کر رہی ہو یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ تمہیں یاد ہے جب ہم سب لوگ کاغان گئے تھے تو کتنا مزا آیا تھا وہاں پر۔" اس نے گردن کو ہلکا سا موڑ کر بجو کو دیکھا جو کاغان کا نام سنتے ہی پر جوش دکھائی دینے لگی تھیں ان کا چہرہ پرانی یادوں کو یاد کر کے جگمگانے لگا تھا۔

"سچ ماہین وہ دن بہت خوب صورت اور یادگار تھے جب ہم سب ساتھ رہتے تھے اور ساتھ کھاتے تھے۔ تمہیں یاد ہے نا ہم کاغان عدید کی ضد پر گئے تھے۔ اسے بہت شوق ہوا کرتا تھا برف پوش پہاڑیاں دیکھنے کا جبکہ ماموں جان سخت خفا ہوئے تھے اس کی اس ضد پر۔ لیکن وہ بھی عدید مہران ہی کیا جو اپنی بات سے ایک انچ پیچھے ہٹ جائے۔" بجو گزرے دنوں کو بڑے پر لطف انداز میں یاد کر رہی تھیں۔ وہ محض ان کو دیکھتی رہی۔

"مجھے ماموں کا گھر اور عدید بہت یاد آتے ہیں ماہین۔ کتنی اپنائیت اور کتنی محبت ہوتی تھی نا ہم سب کے درمیان پھر پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی۔" ذکر کرتے کرتے بجو افسردہ سی ہو گئی تھیں۔ جبکہ اس کا ذہن ان کی پہلی بات میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ بجو کی بات ختم ہوتے ہی وہ ان کی طرف مڑ گئی۔

"بجو وہ صرف ماموں کا گھر نہیں تھا وہ ہمارا بھی تھا آپ یہ بات کیوں بھول جاتی ہیں؟" وہ زچ سی ہو گئی تھی بجو کی فراخ دلی سے۔

"ماہین پلیز چھوڑ دو یہ سب' تم آخر وہ سب بھلا کیوں نہیں دیتیں؟" بجو نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"میں کبھی بھی نہیں بھلا سکتی بجو جو کچھ انہوں نے ہمارے ساتھ کیا ہے۔ آخر ہمارا قصور کیا تھا جس کے نتیجے میں انہوں نے ہمیں یوں دربدر کر دیا۔ ماموں نے دھوکے سے ہمارا حصہ اپنے نام کرایا آخر کیوں کیا انہوں نے ہمارے ساتھ ایسا؟" وہ تقریباً" رو دینے کو تھی۔ بجو نے ایک نظر اسے دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اسے پیار سے چمکارنے لگیں۔ وہ بس ایسی ہی تھی رویوں اور تجوں کو شدت سے محسوس کرنے والی اور اس کی یہ شدت اب غصہ میں بدل گئی تھی۔ وہ جو بڑی سے بڑی بات کو آسانی سے نظرانداز کر دیا کرتی تھی اس بار اتنا سمجھانے کے باوجود وہ کچھ بھی سمجھنے کو تیار نہ تھی۔ اس سے زیادہ انہوں نے اس سے کوئی بات نہ کی مبادا اس کا موڈ مزید خراب نہ ہو جائے۔

"اچھا خیر چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ تم آفس ٹرپ پر جا رہی ہو یا نہیں؟" انہوں نے اس کا سر اوپر کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"میرا مشورہ ہے ماہین تم چلی جاؤ۔ اچھا ہے تھوڑی ہوا تبدیل ہو جائے گی جو تمہارے ذہن کو بالکل فریش کر دے گی۔" بجو نے مشورہ دیا۔ لیکن جواباً" وہ کچھ نہ بولی اور پھر جلد ہی اپنا موڈ درست کرتے ہوئے خوشگوار لہجے میں بجو سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی اور جلد ہی بجو بھی سب بھول بھال کر اس سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

"آئی تھنک ماہین تمہیں چلے جانا چاہیے۔" وہ آج کئی دنوں بعد سویرا سے ملنے اس کے گھر آئی تھی جب اس نے باتوں کے دوران آفس ٹرپ کا ذکر اس سے کیا تھا جواباً" سویرا اسے قائل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"تم بطور ایمپلائے ٹرپ پر جاؤ اس میں اتنا سوچنے یا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہیں اپنی جاب سے غرض ہونی چاہیے اور بس۔"

سویرا نے چائے کا مگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں کہا جو اس نے خاموشی سے تھام لیا۔

"کوئی پرابلم ہے کیا؟" سویرا نے مستقل اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا میں کیا کروں؟" وہ کچھ الجھی الجھی سی تھی۔

"کیا مطلب؟" سویرا نے پوچھا۔

"میں کاغان جانا نہیں چاہتی سویرا! اس جگہ کا نام سنتے ہی مجھے گزرا ہوا وہ وقت یاد آنے لگتا ہے جو سب سے حسین اور خوب صورت تھا جس کا ایک ایک پل میرے ذہن میں محفوظ ہے اور میں وہاں جا کر کسی کمزور لمحے کی گرفت میں نہیں آنا چاہتی سویرا! میں نے خود کو مشکل سے اس وقت سے نکالا ہے جب عدید سمیت ماموں اور ممانی کی محبت میرے پورے وجود میں سرائیت کرتی تھی جب میری پوری زندگی کا محور ان سب کی محبت تھی۔ لیکن جب اعتبار ٹوٹتا ہے نا تو پلٹ کر دوبارہ وہیں جانا مشکل ہو جاتا ہے اور میں پلٹنا نہیں چاہتی کیونکہ میرے دل سے ان سب کی محبت ختم ہو چکی ہے' میں کبھی ان سے ملنا نہیں چاہتی۔" کافی عرصے بعد وہ سویرا سے اس سے متعلق بات کر رہی تھی وگرنہ وہ اس موضوع پر نہ کوئی بات سننے کو تیار ہوتی تھی اور نہ دوسرے کو کرنے دیتی تھی۔ سویرا اسے ٹوکے بغیر سنتی رہی اور وہ بولتی چلی گئی۔

"میرے لیے پریشانی کی بات یہ ہے کہ اگر میں اس ٹرپ پر نہیں جاتی تو مجھے علم ہے کہ وہ یہ ٹرپ کینسل کر دے گا اور میں نہیں چاہتی کہ آفس کے باقی لوگ محض میری وجہ سے اس ٹرپ سے محروم ہو جائیں۔ وہ سب تو مجھے ہی قصوروار سمجھیں گے نا اب مجھے کچھ سمجھ

نہیں آ رہا کہ میں اسے کس طرح کنوینس کروں۔"

"ماہین تم خوامخواہ اس کو ایشو بنا رہی ہو۔" سویرا اس کی پریشانی کے خیال سے اس کی پوری بات سنے بغیر بول اٹھی۔

"تم وہاں جاب کرتی ہو اور تمہیں وہی سب کرنا پڑے گا جو وہاں پر موجود دوسرے لوگ کرتے ہیں۔ تم بالکل پریشان مت ہو۔ ہاں وہاں پہنچ کر اگر کوئی خوشگوار سا خیال دل کو ستانے لگے تو ایک نظر عدید پر ڈال لینا۔ یہ میرا مشورہ ہے تمہیں۔"

سویرا نے آخری بات شرارتی انداز میں مسکراہٹ دبا کر کہہ ڈالی مبادا وہ اکھڑ نہ جائے۔ جبکہ سویرا کی اس بات پر وہ اسے گھور کر دیکھنے لگی پھر مگ میں موجود چائے کے سپ لینے لگی۔ تو سویرا دل ہی دل میں اس کے لیے ڈھیروں دعائیں کرنے لگی جس کی حساسیت حد درجہ شدت اختیار کر چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ مضطربانہ انداز میں کبھی بائیں ہاتھ پر بندھی رسٹ واچ کو اور کبھی ونڈو سے نظر آنے والے اس راستے کو تک رہا تھا۔ جہاں سے اس کی آمد متوقع تھی۔

"پتا نہیں وہ آئے گی یا نہیں؟" یہ سوچ اسے پریشان کیے ہوئے تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سڑک کے کنارے کھڑی اس لگژری وین سے نیچے اتر کر بے قراری سے ادھر ادھر چکر لگاتے ہوئے اس کی راہ دیکھے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اسٹاف کی موجودگی کا خیال بہرحال ساتھ رہتا تھا۔

وہ بے چینی کے عالم میں کئی بار پہلو بدل چکا تھا۔ غالباً" سب ہی منتظر نظروں سے وین سے باہر دیکھنے میں مصروف تھے۔

"زارا تم ماہین کا نمبر تو ٹرائی کرو پلیز۔" طوبٰی نے زارا کو مشورہ دیا کیونکہ پورے اسٹاف میں زارا ہی اس کے بہت کلوز تھی۔

"وہ سیل نہیں رکھتی یار۔" زارا کی حالت بھی طوبٰی سے مختلف نہیں تھی۔

"ہو سکتا ہے ماہین کا ارادہ بدل گیا ہو۔" کرن نے اپنا خدشہ ظاہر کیا تو وہ جو غیر ارادی طور پر ان کی باتیں سن رہا تھا بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔

"اللہ نہ کرے کرن اگر ماہین کا ارادہ بدلا تو عدید سر کا ارادہ بدلنے میں بھی دیر نہیں لگے گی۔" طوبٰی نے کرن کو دھیمی آواز میں کہا تو کرن مزید کچھ کہنے سے باز ہی رہی۔

"اوہ تھینک گاڈ۔" زارا کی خوشی سے بھرپور آواز پر سب ہی نے اس کا ساتھ دیا اور اسے وین کی طرف بڑھتا دیکھ کر بے اختیار ان سب نے سکون کا سانس بھرا۔

اسے وین میں داخل ہوتے دیکھ کر اس نے طمانیت سے اپنا سر سیٹ کی پشت پر ٹکا دیا۔ تمام بے چینی اور بے قراری وجود سے گویا یکدم رفع ہو چکی تھی۔

اپنا پرس سنبھالتی وہ آہستگی سے چلتی ہوئی زارا کے پاس جا پہنچی جس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا تھا۔ زارا کو بہت سردی لگتی تھی۔ اس لیے اس کے کہنے پر وہ ونڈو والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"چلو نواز۔" اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی وہ سر پر دوپٹہ جمانے میں مصروف تھی جب قریب سے آتی اس کی آواز پر چونک کر اس نے اگلی سیٹ پر اسے بیٹھا دیکھا تو پل بھر کے لیے اس کے ہاتھ سر پر ہی رک گئے تھے۔ وہ فرنٹ سیٹ پر براجمان تھا اور وہ اس کے بالکل پیچھے والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

وین میں داخل ہوتے وقت وہ اپنے گردوپیش سے قطعی بے خبر تھی جبھی غور نہیں کر سکی تھی کہ وہ کہاں بیٹھا ہے؟ گویا اب تمام سفر وہ عجیب سی کیفیت میں ہی گھری رہے گی۔

بہرحال وہ سارے خیالات جھٹک کر آنکھیں بند کیے زیر لب قرآنی آیات کا ورد کرنے لگی۔

"میں کیا مانگوں یار' مجھے تو دعاؤں میں صرف تمہیں مانگنا آتا ہے اور ویسے بھی تم ہو نا میرے لیے دعائیں

مانگنے کے لیے اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ یہ جو تم اتنی ساری سورتیں آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں پڑھ رہی ہو تا یہ صرف میری حفاظت کے لیے پڑھ رہی ہو کیونکہ میں تمہارے لیے اس پوری کائنات میں سب سے زیادہ اہم ہوں۔"

دل ہی دل میں مختلف آیتوں کا ورد کر کے وہ اب دعا مانگ رہی تھی کہ اچانک اسے اپنے بہت قریب اس کی مدھم آواز سنائی دی۔ وہی انداز، وہی لب و لہجہ، وہی اپنائیت۔

جب وہ سب کاغان جا رہے تھے اور وہ شہزینہ آپی کو زبردستی اس کے پاس سے اٹھا کر خود اس کے قریب والی سیٹ پر جا بیٹھا تھا اور پھر تمام راستے مسلسل اسے تنگ کرتا رہا تھا۔

اسے لگا اس وقت بھی وہ اس کے بالکل قریب بیٹھا ہے، اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور گردن موڑ کر اپنے ساتھ والی سیٹ پر دیکھنے لگی جہاں زارا کانوں پر ہیڈ فون لگائے آنکھیں بند کیے انگلش گانوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

تب ہی اسے اپنے چہرے پر اس کی نظروں کی تپش محسوس ہوئی، بلا ارادہ اس نے ویو بیک مرر کی جانب دیکھا جہاں نہایت سنجیدگی سے بھرپور دو آنکھیں پورے استحقاق کے ساتھ اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ زیادہ دیر ان آنکھوں کو نہ دیکھ سکی اور کھڑکی کی طرف رخ کر گئی۔

دشوار گزار مگر حسین سفر خوب صورت راستوں کی بھول بھلیوں میں کھو کر کئی گھنٹوں کے بعد اب بالآخر مکمل ہو چکا تھا۔

وین سے اترتے ہی سب کو اپنے قدم گویا فرش جنت پر محسوس ہوئے تھے۔ فضا میں پھیلی ٹھنڈک اور بھینی بھینی خوشبو سے سب ہی لطف اٹھا رہے تھے۔ جبکہ سامان ہوٹل میں شفٹ کیا جا رہا تھا۔

شدید سردی کے باعث دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر گرم کرتی وہ سائیڈ پر کھڑی تھی۔

ایک سرسری سی نظر اس نے اپنے اطراف میں دوڑائی ہر منظر بہت شناسا سا تھا وہی برف سے ڈھکی بلند پہاڑیاں، وہی نیلگوں بہتا پانی، وہی آسمان سے اترتے ننھے ننھے برف کے ذرے، وہی سرسراتی گنگناتی ہوا، وہی خوشبوؤں میں بسی معطر فضا۔ سب کچھ پہلے جیسا تھا کچھ بھی نہیں بدلا تھا لیکن اگر کچھ بدلا تھا تو وہ وقت تھا۔ ایک ٹیس تھی جو اس کے دل میں محض پل بھر کے لیے اٹھی تھی اور وہ سسک کر رہ گئی تھی۔ درد کے باعث آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

اور یہی وہ لمحہ تھا جب توقیر صاحب سے بات کرتے کرتے اچانک اس کی نظر درخت کے ساتھ ٹیک لگائے دوپٹہ کے پلو سے آنکھوں کے کنارے صاف کرتی ماہی پر جا پڑی تھی۔ اسے یوں دیکھ کر وہ بے چین ہو اٹھا تھا اس نے اردگرد ایک طائرانہ سی نظر دوڑائی جہاں سب ایک دوسرے کے ساتھ گروپس کی صورت میں کھڑے ماحول سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ خوش گپیوں میں مگن تھے۔

بے اختیار اس کا دل چاہا کہ وہ اس کے پاس جائے اور اپنی انگلیوں کی پوروں میں اس کے تمام آنسوؤں کو جذب کر لے اور اس کے تمام دکھوں کو اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں قید کر لے تاکہ وہ پرسکون ہو جائے بالکل ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح غیر ارادی طور پر اس نے دو قدم اس کی جانب بڑھا دیے لیکن تیسرا قدم اٹھانے سے پہلے ہی وہ اپنی جگہ پر رک گیا۔

طوبیٰ اور زارا اس کے پاس جا پہنچی تھیں اور اب اس کا ہاتھ پکڑ کر سفیدے کے درخت کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ وہ وہیں سے واپس پلٹ آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

انہیں یہاں آئے تین دن گزر چکے تھے۔ وہ سب صبح ہی صبح سیر کے لیے نکل کھڑے ہوتے اور پھر شام ڈھلنے پر ہی لوٹتے تھے۔ پورا اسٹاف اس سفر سے خوب لطف اٹھا رہا تھا۔ ہر چہرہ کھلا کھلا اور ہر آنکھ خوش دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سب کتنے مطمئن اور مسرور تھے۔

اس نے ایک نظر سب پر دوڑائی اور ایک گہری

سانس لے کر رہ گئی۔ اس کے اپنے اندر اور باہر تو بس اداسی ہی اداسی تھی۔ جس کو یہ خوب صورت جگہ بھی دور نہیں کر سکتی تھی بلکہ یہاں آ کر تو وہ مزید خود کو اکیلا اور مضطرب سا محسوس کرنے لگی تھی۔

یہی وہ جگہ تھی جہاں آ کر اس نے خود کو بے حد خوش اور خوش نصیب تصور کیا تھا، شاید یہ اس شخص کی ہمراہی کا اعزاز تھا جو اسے چاہنے کا دعوے دار تھا تب ہی تو اس کی چاہت میں وہ پور پور ڈوب چکی تھی اور پھر اس نے اس وقت اس کا ساتھ چھوڑ دیا جب وہ اس کے بغیر ایک لمحہ سانس لینے کی بھی متحمل نہیں تھی۔ اسے بتائے بغیر کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے اتنی دور چلا گیا کہ کتنی دیر تک اسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ عدید میران اسے چھوڑ بھی سکتا ہے۔ جس کے لفظ لفظ سے یقین چھلکتا تھا جس کے حرف حرف میں سچائی گندھی محسوس ہوتی تھی وہ اسے چھوڑ کر محض اپنے برائٹ فیوچر کی خاطر اس کا اعتماد، بھروسہ اور مان سب کچھ توڑ کر خاموشی سے چلا گیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد اس نے خود کو کس طرح سنبھالا تھا، کیسے اپنے ٹوٹتے وجود کو بکھرنے سے بچایا تھا، کیا کیا جتن نہیں کیے تھے اس نے اپنے دل سے اس کی یاد کے ہر نقش کو مٹانے کے لیے لیکن جب وہ اس کوشش میں کامیاب ہونے لگتی تھی یونہی بالکل اچانک اس کی بات، اس کا انداز یا اس کا دھیما لب و لہجہ اسے کمزور کرنے لگتا تھا اور وہ خود کو مضبوط بنانے کی خاطر اپنے دل میں اس کے لیے کوئی نرم گوشہ رکھنے کی ہرگز روادار نہیں تھی۔

اس وقت بھی اس کا دل یونہی بھر آیا تھا نہ جانے کون سا احساس تھا جو اس کی آنکھوں کو بھگو دیا کرتا تھا کہ ہر منظر دھندلا دکھائی دینے لگتا تھا۔ اس نے پلکیں جھپک کر آنکھوں میں تیرتی نمی کو اندر دھکیلتے ہوئے اپنے اطراف میں دیکھا۔

ہر نظارہ نہایت دلکش تھا۔ بدن میں جھرجھری پیدا کرتی نرم ہوا، فضا میں محو رقص لچھے نما بادل، نیلے کنچوں جیسا شفاف پانی، ماحول کو پاکیزہ بناتی پورے چاند کی سفید شعاعیں اور اطراف میں پھیلا گہرا سکوت ماحول کو حسین بنا رہے تھے لیکن اسے کسی بھی منظر میں دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ہر شے میں افسردگی اور یاسیت کا عنصر بے طرح نمایاں ہو رہا تھا۔

"تمہیں پتا ہے ماہی، میں تمہیں بالکل اداس یا پریشان نہیں دیکھ سکتا بلکہ مجھ سے یہ بھی برداشت نہیں ہوتا کہ تمہارے اردگرد ایسا ماحول ہو جو تمہاری آنکھوں کو افسردہ کر دے۔" وہ بہت نرمی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بولا تھا۔

وہ جو اب فضا میں پھیلی معطر اور بھینی خوشبو کو آنکھیں بند کیے اپنے اندر اتار رہی تھی۔ اپنے قریب سے آتی اس کی آواز پر جھٹکے سے آنکھیں کھول کر دیکھنے لگی۔

وہ کہیں بھی نہیں تھا۔

وہ محض ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی۔

یکے بعد دیگرے ذہن پر جھلملانے والی اس کی باتیں اسے اضطراب میں مبتلا کر رہی تھیں۔ وہ سر جھٹک کر کھڑکی بند کر کے اپنے بیڈ کی طرف بڑھ گئی اور ایک نظر قریب ہی دوسرے بیڈ پر سوئی زارا پر ڈالی جو پرسکون سو رہی تھی۔ وہ حسرت سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ بھی تو اسی طرح ہر شے سے بے خبر طمانیت بھری نیند سونا چاہتی تھی لیکن وہ جب سے یہاں آئی تھی ایک لمحہ کے لیے بھی اطمینان سے نہیں سو سکی تھی۔

وہ اب مزید یہاں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے لگتا تھا۔ اگر وہ کچھ دن اور یہاں رہی تو اپنی انا، اپنی خودداری سب کچھ ختم کر ڈالے گی۔ وہ ایسے کسی کمزور لمحے کی زد میں آنا نہیں چاہتی تھی جو اسے خود سے دور کر دے اور اس کی شناخت کھو دے۔ وہ بہت مشکل سے خود کو سنبھال پائی تھی اب اتنی آسانی سے اپنی ذات کے غرور کو زمین بوس ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

سوچتے سوچتے اسے شدید گھبراہٹ ہونے لگی۔ خود کو ریلیکس کرنے کی خاطر سونے کی کوشش کرنے لگی اور پھر جلد ہی وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"سر ہماری واپسی کب تک ہے؟" ایک تفریحی مقام پر وہ سب کھانا کھانے میں مصروف تھے جب زارا نے اسے مخاطب کرکے پوچھا۔

"خیریت مس زارا" اتنی جلدی گھبرا گئیں آپ؟" جواباً" اس نے قدرے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"نو سر ایم آل رائٹ بٹ ماہین کچھ گھبرائی ہوئی ہیں رات بھی ٹھیک طرح نہیں سو پائیں اور پریشان سی رہتی ہیں' غالباً" یہ گھر والوں کو بہت مس کر رہی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کئی بار جلدی واپس چلنے کو کہا تو میں نے سوچا آپ سے پوچھ لوں تاکہ یہ ریلیکس ہو جائیں۔"

اس کے سوال کے جواب میں زارا نے تفصیل سے جواب دیا جس کو سن کر وہ اس کے جھکے سر کو دیکھنے لگا جو زارا کے قریب ہی بیٹھی تھی۔

"آر یو شیور کہ آپ گھر والوں کو مس کر رہی ہیں۔" اس نے لفظ "گھر والوں" پر زور دیتے ہوئے پوچھا تو مجبوراً" اسے سر اٹھا کر اسے دیکھنا پڑا۔ جو سوالیہ انداز میں اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

پتا نہیں اس کی مسکراتی آنکھوں میں ایسا کیا تھا کہ وہ جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکی اور دوبارہ سر جھکا گئی۔

وہ بھی کھانے کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ ٹیبل پر مکمل خاموشی تھی۔ یہ بھی شکر تھا کہ اس نے جواب دینے پر زور نہیں دیا تھا ورنہ۔۔۔۔ پتا نہیں وہ کیا کہہ دیتی؟ اور پھر شاید وہ اس اندرونی کیفیت کو ہمیشہ کی طرح بھانپ گیا تھا جبھی اگلے دن اس نے ایک امپورٹنٹ ڈیلی گیشن سے ملنے کا بہانہ بنا کر سب کو پیکنگ مکمل کرنے کا آرڈر دے ڈالا تھا۔

وہ اپنی تمام تیاری مکمل کرکے ہوٹل کے پچھلے حصے میں جہاں ایک چھوٹی جھیل بنی تھی وہاں چلی آئی۔ اسے یہ جگہ شروع سے ہی بے حد پسند تھی وہ الوداعی نظروں سے اس جھیل میں تیرنے والی بطخوں کو تک رہی تھی جب وہ غیر محسوس طریقے سے اس کے قریب آکھڑا ہوا اور اس کی تقلید میں سفید بطخوں کو دیکھنے لگا۔

"تمہیں یاد ہے جب ہم پہلے آئے تھے تو اس جھیل میں صرف چار بطخیں تھیں اور اب تیرہ ہو چکی ہیں۔"

اس نے چونک کر اپنے بائیں جانب دیکھا جو بطخوں پر سے نظر ہٹا کر اب اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ وہ یہاں کب آیا اسے پتا ہی نہیں چلا' کس قدر گم ہو گئی تھی وہ گزرے وقتوں کی خوب صورتی میں کہ اس کی آمد سے بے خبر ہی رہی تھی۔

"میں جانتا ہوں تم کچھ بھی نہیں بھولیں اور میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ تم یہاں آکر ان لمحوں کو یاد کرکے افسردہ ہو جاؤ جب ہم۔۔۔"

اس کی بات مکمل سنے بغیر وہ تیزی سے مڑی اور ہوٹل کی طرف چل پڑی۔

اس کے اس طرح کرنے پر وہ خاموشی سے اسے جاتا دیکھتا رہا جو اس سے بات کرنا تو دور بات سننا گوارہ نہیں کر رہی تھی۔ یہاں آکر بھی اس نے کتنی ہی بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اسے اس طرح نظر انداز کر دیتی تھی کہ اسے اپنی کم مائیگی کا احساس شدت سے ہونے لگتا تھا۔

کاش وہ ایک بار اس کی بات سن لے۔ لیکن وہ تو اسے دیکھتے ہی بے زار نظر آنے لگتی تھی۔

کچھ بھی تھا یہاں آنے کے بعد وہ یہ تو جان گیا تھا کہ بظاہر وہ جو بھی کرے اپنے اندر اس کے لیے بے چینی ضرور محسوس کرتی ہے۔ یہ سوچتے ہی وہ قدرے مطمئن ہو گیا اور ایک گہرا سانس بھرتا ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

☆ ☆ ☆

"سنایئے کیسا ٹرپ رہا جناب کا؟" احسن پچھلے کئی دنوں سے شہر سے باہر تھا اور اب کراچی پہنچتے ہی وہ اس سے ملنے اس کے آفس آپہنچا تھا۔ اس سے مصافحہ کے بعد چیئر پر بیٹھتے ہوئے احسن نے خوشدلی سے پوچھا۔

"اچھا تھا۔" اس نے مختصر جواب دیا تو احسن نے بغور اس کی جانب دیکھا جو کچھ اپ سیٹ دکھائی دے رہا تھا۔

"کیا مطلب تمہارا صرف اچھا تھا؟" احسن نے کریدا۔ وہ کچھ سیریس سا تھا۔

"کچھ نہیں یار۔ عموماً" جس طرح کے ٹرپ ہوتے ہیں یہ بھی ویسا ہی تھا۔" انٹر کام پر چائے کا آرڈر دیتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے کچھ بات نہیں بنی۔" احسن نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"میں وہاں بات بنانے گیا تھا؟" اس نے گھور کر احسن کو دیکھا۔

"پھر کس لیے گئے تھے؟" احسن پتا نہیں کیا سننا چاہ رہا تھا وہ ایک نظر اسے دیکھ کر گویا ہوا۔

"جانا تو ضروری تھا یار اور اس جگہ اس لیے گیا تھا تاکہ اس کے ساتھ اس خوب صورت وقت کو یاد کروں جب وہ صرف مجھے سوچتی تھی مجھے دیکھتی تھی۔ میں بس اتنا چاہتا تھا کہ وہ پہلے کی طرح وہاں صرف میری ہو کر رہے لیکن۔۔۔" وہ پتا نہیں کیا کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہیں پا رہا تھا سو خاموش ہو گیا۔ احسن نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ وہ بہت مضمحل۔ اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

"کیا بات ہے عدید' کچھ ڈسٹرب لگ رہے ہو۔" احسن پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"نہیں یار ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اس نے احسن کو ٹالنا چاہا مگر وہ بضد تھا۔

"کیا بتاؤں یار مجھے خود کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟" بالآخر وہ بول ہی پڑا تھا مگر کچھ الجھا الجھا سا تھا۔

"میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں' اسے منانا چاہتا ہوں' اس سب کے لیے جو میں نے اس کے ساتھ کیا جو میرے گھر والوں نے کیا لیکن وہ میری ایک بات بھی سننا پسند نہیں کرتی میں کس طرح اسے کنوینس کروں یار' میں بہت الجھن میں ہوں مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا ہر وقت ایک عجیب سی بے زاریت سوار رہتی ہے۔ میں اکتا گیا ہوں اس ساری سچویشن سے۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے بات کرے مجھے سمجھنے کی کوشش کرے۔ میں اتنا غلط نہیں ہوں جتنا وہ مجھے سمجھتی ہے یار' میرا خیال تھا وہاں جا کر اس کے رویے میں کچھ تبدیلی آئے گی لیکن۔۔۔" اس کے لہجے سے بے بسی چھلک رہی تھی۔ اس کی بات سن کر احسن خاموش ہو گیا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اسے کس طرح تسلی دے؟ جبکہ اب وہ پہلے کی نسبت مزید حساس ہو گیا تھا اور ماہین کو لے کر انتہائی حد تک سنجیدہ ہو رہا تھا۔ اس وقت اسے کچھ بھی کہنا یا سمجھانا بے معنی تھا۔

تقریباً" آدھے گھنٹے بعد احسن جا چکا تھا اس کے جاتے ہی اس نے تھکے تھکے انداز میں سر سیٹ کی بیک پر گرا دیا اور اسے سوچنے لگا جسے اس کے احساسات کی قطعاً" پروانہ تھی۔ وہ خود کو عجیب کیفیت میں گھرا محسوس کر رہا تھا بہت مجبور اور بے بس۔ ایک کوفت سی تھی جو اس کے اعصاب پر سوار اس کے حواس کھو رہی تھی۔

اس نے دکھتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور مسئلے کا حل سوچنے لگا مگر اسے کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا تب ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور کان سے لگایا اور کرن کو میسج دینے کے بعد سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنی سیٹ کی پچھلی جانب قد آدم گلاس ونڈو سے باہر نظر آنے والی لمبی کشادہ اور پر رونق سڑک پر تیزی سے چلتی ٹریفک پر نظریں جما دیں۔

"مے آئی کم ان؟" دروازہ کو ہلکا سا ناک کرکے اس نے اجازت طلب نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا جو پہلے دن کی طرح آج بھی اس کے دل میں بڑے کروفر سے براجمان تھی اور ہر شے سے زیادہ عزیز تھی۔ اس کی بے اعتنائی اور حد درجہ بے رخی کے باوجود وہ اس کا اسی شدت سے طلب گار تھا جس طرح پہلے تھا۔

کاش وہ اپنا دل اس کی طرف سے بالکل صاف

کرلے تو وہ خود کو کتنا ہلکا پھلکا سا محسوس کرے گا۔ اپنے دل اور کندھوں پر نظر نہ آنے والے بوجھ کو اتر جانے سے وہ اپنی نظروں میں کتنا معتبر ہو جائے گا لیکن

"مجھے بلایا تھا؟" اسے اپنی طرف مسلسل دیکھتا پا کر اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا تو اسے بھی اپنی بے اختیاری کا احساس ہوا اور فوراً" بول پڑا۔

"ہاں' بیٹھو۔" آہستہ آہستہ چلتا وہ ٹیبل کے پاس آ کھڑا ہوا اور چیئر کی طرف اشارہ کیا مگر وہ بدستور کھڑی رہی تو اس نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔

"ماہی تم جانتی ہو نا میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔" کچھ ہی فاصلے پر کھڑا وہ استفسارانہ انداز میں بولا تو اس کی بات پر اس نے تیز نظروں سے اسے دیکھا جو خطرناک حد تک سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ پل بھر کے لیے وہ کچھ بھی نہ بول سکی اور خاموش ہی رہی جبکہ وہ سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر جمائے جوں کا توں کھڑا تھا۔ وہ اپنے اندر موجود ساری ہمت کو جمع کر کے مضبوط لہجے میں گویا ہوئی۔

"میں تم سے یہاں اس قسم کی باتیں کرنے نہیں آئی اور اگر تم نے مجھے یہاں اس مقصد کے لیے بلایا ہے تو میں......"

"ہاں میں نے اسی مقصد کے لیے بلایا ہے تمہیں یہاں اور تمہیں بھی مجھ سے آج بات کرنی ہو گی ماہی۔" اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ دو ٹوک انداز میں بولا۔

اس کے تیور کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے تھے لہٰذا اس نے اس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور پلٹ کر دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے لیکن اسی لمحے اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر اپنے سامنے لا کھڑا کیا۔

اس کی اس حرکت پر وہ ششدر ہی رہ گئی اور کتنی ہی دیر تک حیرت سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اس نے پہلے کبھی اس کا اس طرح ہاتھ نہیں پکڑا تھا بلکہ وہ تو ہمیشہ اس سے ایک مخصوص فاصلہ رکھ کر بات کرتا تھا جبکہ آج وہ اس سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر کھڑا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس سے مخاطب تھا۔

"تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے' کیوں مجھ سے بات نہیں کرتیں تم۔ تمہیں شکایت ہے نا مجھ سے تو کرو ماہی۔ لیکن میرے ساتھ اس طرح بی ہیو مت کرو میں مزید تمہارا اس طرح کا رویہ برداشت نہیں کر سکتا۔" اس نے یاسیت سے کہا۔

"تم سے کس نے کہا کہ مجھے تم سے شکایت ہے؟" اس کے ہاتھ اپنے بازوؤں پر سے ہٹاتے ہوئے اس نے تڑخ کر مزید کہا۔

"اور اگر تمہیں میرا اس طرح کا رویہ برداشت نہیں ہے تو میں تمہیں مزید اس مشکل میں نہیں ڈالوں گی کہ تمہیں مجھے برداشت کرنا پڑے۔" وہ اتنا کہہ کر تنتناتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی مبادا وہ دوبارہ اس کے سامنے نہ آ کھڑا ہو۔

اس کا چبھتا ہوا انداز اسے تشویش اور الجھن میں مبتلا کر گیا تھا۔ کتنی ہی دیر تک وہ اضطراری کیفیت میں ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔ اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اس سے بات کرے اور کس طرح اس کے اندر موجود کڑواہٹ کو شیرینی میں تبدیل کرے؟ وہ تو اس کی کوئی بات بھی سننے کو تیار نہیں تھی۔

وہ متفکر سا چیئر پر آ بیٹھا اور خالی خالی نظروں سے لیپ ٹاپ کو تکنے لگا۔ اس کا کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا مگر ٹیبل پر فائلز کا ڈھیر دیکھ کر مجبوراً" وہ ہر خیال کو ذہن سے جھٹک کر خود کو فائل میں گم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

وہ جس وقت گھر پہنچی اس کی اندرونی حالت بہت بری تھی۔ عدید مہران کے ہاتھوں کا لمس اسے اب بھی اپنے بازوؤں پر محسوس ہو رہا تھا اس کی اس حرکت نے اسے اندر تک ہلا ڈالا تھا اور شاید وہ یہی چاہتا تھا کہ وہ

ٹوٹ جائے اور پھر اس کے آگے بکھر کر اپنی انا کھو دے' اپنی ذات کے غرور کو فنا کر دے۔ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتی تھی اس نے بہت مشکل سے اپنا آپ بچا کر رکھا تھا۔ خود کو کس طرح اس تکلیف سے نکالا تھا جو اس کے رویے نے اسے پہنچائی تھی یہ وہی جانتی تھی۔ اور اب وہ ایسے کسی لمحے کی زد میں آنا نہیں چاہتی تھی جو اسے خود سے اس حد تک بے گانہ کر دے کہ وہ اس اذیت کو بھلا دے۔ جو اس نے اسے دی تھی۔

وہ کچھ بھی کھائے پیے بغیر اپنے کمرے میں جا گھسی اور خود کو ریلیکس کرنے کی سعی کرنے لگی۔ اسی کوشش میں اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں پھر یکدم وہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

وہ اس کے سامنے خود کو جتنا مضبوط ظاہر کرتی تھی اندر سے اتنی ہی کمزور ہو رہی تھی لیکن وہ اپنا بھرم اس کے سامنے ہرگز کھونا نہیں چاہتی تھی اسی لیے اس سے بات کرنے سے حتی الامکان گریز کرتی ورنہ وہ بھربھری مٹی کی طرح بکھرتی چلی جاتی اور وہ اسے روندتا آگے بڑھ جاتا۔ پتا نہیں کیوں اب وہ اس پر اعتبار کرتے ہوئے ڈرنے لگی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو ایک بار پھر وہ اس کے بھروسے کو توڑتا آگے نکل پڑے اور وہ دوبارہ شاید اٹھ بھی نہ سکے اور پھر خود کو کہیں دفن ہی نہ کر ڈالے جبکہ ماہین عزیز کی ذات اور اس کا وجود اتنا ارزاں نہیں تھا کہ وہ جب مرضی اس کو تضحیک کا نشانہ بنا کر پلٹ جاتا۔

شاید یہی وہ خوف تھا جو اسے اس کے سامنے مضبوط بنائے رکھتا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ کر صاف کیں اور بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے پر سوچ نظروں سے چھت کو تکنے لگی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن وہ مقررہ وقت پر اپنے آفس میں داخل ہوا تھا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی معمول کے مطابق ای میلز چیک کر رہا تھا جب اس کی نظر ایک ٹائپ شدہ ریزیگنیشن لیٹر پر جا پڑی۔

اس نے یکے بعد دیگرے تین بار اس لیٹر کو پڑھا جو ماہین عزیز کی طرف سے تھا۔ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا اور اعصاب مکمل طور پر تن گئے۔ غصے سے اس وقت اس کا برا حال تھا۔ کتنی ہی دیر تک وہ اس کاغذ کو گھورتا رہا پھر زور سے چیئر پیچھے کی جانب دھکیلتا اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ میں کچھ پیپرز پکڑے تیزی سے باہر نکل گیا۔

"ایکسکیوز می اسٹاف۔" تمام ایمپلائز سر جھکائے اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے جب اچانک اس کی کرخت آواز اور سخت لہجے پر سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے اور یک لخت اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کیا سمجھتے ہیں آپ لوگ' یہ کمپنی آپ کے بغیر نہیں چل سکتی یا میں نہیں چل سکتا؟" وہ باری باری سب پر نظر ڈالتے ہوئے درشتگی سے مزید بولا۔

"جس کا جب دل چاہتا ہے وہ لیو (چھٹی) پر چلا جاتا ہے اور جب دل چاہتا ہے وہ آفس چھوڑ کر جانے کی دھمکی دے دیتا ہے' کیوں؟" اس کا انداز سوالیہ جبکہ لہجہ وہی تھا۔

"جاب کرنے کے کچھ رولز ہوتے ہیں کچھ ریگولیشنز ہوتی ہیں جن کے مطابق چلنا آپ کا فرض بنتا ہے کمپنی کے ساتھ کیے گئے ایگریمنٹس کی خلاف ورزی کی صورت میں میں آپ کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہوں لہٰذا احتیاط رہے گا اور ایک بات جو میں آپ سب کو بتا رہا ہوں کہ آپ کے اپنے ذاتی مسائل جتنے بھی ہوں ان کا اثر آپ کے کام یا آپ کی جاب پر نہ پڑے تو بہت بہتر ہو گا ورنہ جو چھوڑ کر جانا چاہتا ہے جائے۔"

آخری بات کہتے وقت اس نے محض ایک نظر اس پر ڈالی تھی پھر ہاتھ میں پکڑے پیپرز قریب رکھے کاؤنٹر پر پٹخنے والے انداز میں رکھتا واپس پلٹ گیا۔

اس کے جاتے ہی پورے اسٹاف میں چہ مگوئیاں

شروع ہو گئی تھیں۔ سب لوگ اس کے رویے کو لے کر بات کر رہے تھے۔ کیونکہ اب سے پہلے اس نے کبھی ان سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔ آفس میں موجود ہر شخص ہی حیران ہو رہا تھا اور وہ بظاہر کمپیوٹر اسکرین پر نظریں جمائے خاموشی سے اپنا کام کرنے میں محو ہو چکی تھی۔ لیکن ذہن اس کی باتوں میں اٹکا ہوا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ وہ شدید غصے میں اپنے روم سے باہر نکلا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا آفس چھوڑ آیا۔ اس کا دماغ بری طرح گھوم رہا تھا سو یہی بہتر تھا کہ وہ آفس سے ہی نکل آئے ورنہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے اس طرح کرنے پر وہ اس کی طبیعت ہی صاف کر دے۔ لیکن وہ آفس میں کسی قسم کا تماشا افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔

وہ اس وقت خود کو ریلیکس کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا سو لانگ ڈرائیو پر نکل کھڑا ہوا۔ اس دوران وہ مسلسل اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تب ہی یکدم ذہن میں در آنے والے ایک خیال نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔

"اگر واقعی وہ کل نہ آئی تو اسے کہاں ڈھونڈے گا"۔ نہ تو اسے اس کا ایڈریس معلوم ہے اور نہ کوئی فون نمبر۔ یہ بات پہلے اس کے ذہن میں ہی نہیں آئی اس نے جھٹکے سے گاڑی ایک سائیڈ پر روکی۔ اس کا دماغ سن ہو گیا تھا۔ وہ تو بے وقوفی کر رہی تھی لیکن اسے تو دانش مندی سے کام لینا چاہیے تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ کی کلائی پر بندھی رسٹ واچ کی جانب دیکھا۔

شام کے ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ آفس ٹائم بھی ختم ہونے کو تھا۔ یقیناً" بہت سے ایمپلائز آفس سے نکل چکے ہوں گے کچھ سوچتے ہوئے اس نے آفس کا نمبر ملایا۔

دوسری طرف کرن موجود تھی۔ وہ اس سے آفس سے متعلق دو تین باتیں پوچھ کر اصل مقصد کی طرف آگیا۔

"مس کرن مجھے یہ بتایئے کہ آفس میں موجود تمام ایمپلائز کے ایڈریسز اور فون نمبرز فیڈ کیے ہوئے ہیں آپ نے ؟" اس۔ نے اپنے اندر کی گھبراہٹ کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

"لیس سر سب کچھ فیڈ ہے۔" کرن نے مطمئن انداز میں جواب دیا۔

"اوکے تھینکس۔" وہ سکون کا سانس بھر کر رہ گیا۔ پھر دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا لے گیا۔ پتا نہیں وہ کل آفس آئے گی یا نہیں ؟ یہی سوچ اسے تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔

ہر روز اسے دیکھ کر' اس کی آواز سن کر اسے جو اطمینان اور سکون ملتا تھا وہ کسی طور اسے کھونے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے یقین تھا وہ یونہی کسی دن اسے ضرور منا لے گا لیکن اس کے جاب چھوڑنے کا سن کر تو اس کے حواس ہی گم ہونے کو تھے۔

اسے کل صبح کا بے چینی سے انتظار تھا' معلوم نہیں وہ آئے گی یا نہیں ؟

☼ ☼ ☼

"آئی ریئلی ڈونٹ نو ماہین کہ تم چاہتی کیا ہو ؟" سویرا قدرے تعجب اور پریشانی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"حالانکہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مریم کے سسرال والے کسی بھی وقت شادی کی ڈیٹ فکس کرنے پر زور دے سکتے ہیں پھر ایسے میں تم اتنی بڑی حماقت کیسے کر سکتی ہو ؟ مجھے واقعی تم سے ایسی امید نہیں تھی ماہین اور تمہیں پتا ہے آج صبح ہی مریم کے سسرال والے آئے تھے' مجھے فاطمہ بجو نے بتایا ہے۔" وہ چپ چاپ سویرا کی باتیں سن رہی تھی۔

اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ یوں اچانک مریم کے سسرال والے اگلے دو ہفتوں تک شادی کرنے کا عندیہ دے سکتے ہیں اور ایسے میں وہ یہ جاب بھی چھوڑ کر گھر بیٹھ جائے گی تو اتنا انتظام کیسے ہو سکے گا۔

اپنی جلد بازی پر وہ خود بھی پچھتا رہی تھی کیا تھا اگر کچھ عرصہ مزید وہ عدید مہران کو برداشت کر لیتی ؟ کم از کم

اتنی بڑی پریشانی کا سامنا تو نہ کرنا پڑتا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے تھے۔

"تم نے یہی سوچا تھا نا کہ تم مریم کی شادی سے پہلے کمپنی سے لون لو گی پھر تم نے یہ اسٹیپ لینے سے پہلے کیوں نہیں سوچا کہ جاب چھوڑ کر کرو گی کیا ؟" سویرا کو اس پر حقیقتاً" بہت غصہ آرہا تھا اور وہ غصے میں بولے جا رہی تھی اور وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنے جا رہی تھی کہ وہ صحیح ہی تو کہہ رہی تھی۔

"بائے داوے ماہین یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ تم اب بھی عدید کو پسند کرتی ہو اسے چاہتی ہو اور جو کچھ بھی اس نے کیا یا ہوا وہ اس سب کے لیے تم سے سوری بھی کر چکا پھر تمہاری ضد کیا معنی رکھتی ہے میں سمجھ نہیں سکی۔ عدید مہران جیسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں ماہین ورنہ پانچ سال کا عرصہ انگلش کنٹری میں گزارنے کے بعد کون واپسی کا راستہ اختیار کرتا ہے اور کون اپنی محبت کو یاد رکھتا ہے لیکن تم ہو کہ فضول سی ضد میں خود بھی تکلیف میں رہتی ہو اور اسے بھی۔"

"میں کسی تکلیف میں نہیں رہتی سویرا ! کیونکہ مجھے جتنی تکلیف ہونی تھی وہ بہت پہلے ہی سہہ چکی ہوں۔" وہ سویرا کی بات کاٹ کر تیزی سے بولی۔

"اوکے' اوکے پلیز ریلیکس' چھوڑو اس بات کو اور اب یہ سوچو تم نے کرنا کیا ہے۔" سویرا جانتی تھی وہ اس موضوع پر اس سے ٹھنڈے دل سے کبھی بات نہیں کرے گی اور اب بھی اصل بات اس کے مزاج کی نذر ہو جاتی سو اس نے بات ہی بدل دی سویرا کی بات پر وہ ایک بار پھر چپ ہو گئی تھی۔ اسے تو خود کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے ؟

"غلطی تو تم سے ہو گئی ماہین اور اس کا ازالہ بھی تم ہی نے کرنا ہے۔ اور ویسے بھی کمپنی نے تو تمہیں ایگزٹ نہیں کیا تھا نا' تم خود ہی چھوڑنا چاہتی تھیں لیکن اب دوبارہ جوائن کرنا چاہتی ہو اٹس سمپل' اور تھینک گاڈ کہ تم نے آفس میں کسی کو اپنے ریزیگنیشن کا نہیں بتایا اور یہ بات صرف عدید تک ہی محدود تھی تو تمہارے حق میں ہے یہ سب ورنہ دوسری صورت میں تمہیں سب کے سوالوں کے جواب دینے پڑتے۔ بہرحال فیصلہ تم نے کرنا ہے سوچ سمجھ کر کرنا پلیز۔ میں چلتی ہوں اب کل آؤں گی اوکے !"۔

سویرا اس کی اسکول فرینڈ تھی اور اس کی بہت خیر خواہ بھی سو جب بھی موقع ملتا اسے سمجھانے لگتی تھی اور وہ اس کی ہر بات خاموشی سے سن لیتی تھی لیکن عدید مہران کے نام پر وہ پل بھر میں بھڑک اٹھتی تھی۔ اسی لیے سویرا بہت سنبھل کر اس کا ذکر کرتی تھی۔ اس نے سویرا کو گیٹ تک چھوڑا پھر دوبارہ اپنے کمرے میں آگئی۔

اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ وہ اس وقت خود کو عجیب سچویشن میں گھرا محسوس کر رہی تھی۔ جس کا کوئی حل اسے سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اس وقت اسے بس مریم کی فکر ستائے جا رہی تھی۔ کاش ماموں ان کا تھوڑا سا تو خیال کرتے' ان کا حق انہیں دیتے تو آج اتنی پریشانی تو اٹھانی نہ پڑتی۔

ایک بار پھر اس کی ذہنی رو بھٹک گئی تھی اور اس کے دل میں ماموں کی فیملی کے خلاف عناد بھر آیا تھا۔ جس کے ہر فرد نے مل کر انہیں مجبور و بے بس کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

دوسری طرف اسے امی سمیت فاطمہ بجو اور مریم کی فکر ستائے جا رہی تھی جن کو اس نے مکمل اطمینان دلایا ہوا تھا کہ اس کی کمپنی اسے لون دے گی تو وہ آرام سے مریم کی شادی کر سکیں گے لیکن اب ۔۔۔ اب کیا جواب دے گی وہ انہیں ؟ اسے شدید گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ بڑی بے چینی سے آفس کی طرف بڑھ رہا تھا چند لمحوں کا فاصلہ اسے برسوں پر محیط لگ رہا تھا۔ دل کی دھڑکنیں بھی بے ترتیب ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ جلد سے جلد آفس پہنچنا چاہتا تھا۔

کاش ایسا ہو کہ وہ آفس میں قدم رکھتے ہی اسے نظر آجائے۔

لفٹ کا بٹن پریس کرتے ہوئے بے اختیار اس نے دعا مانگی پھر باہر نکل کر تیزی سے اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا۔

گلاس ڈور دھکیل کر جس وقت وہ اندر داخل ہوا حسب معمول تمام ورکرز اٹھ کھڑے ہوئے اور گڈ مارننگ وش کرنے لگے مگر وہ غائب دماغی سے چلتا ہوا آگے بڑھتا گیا اور پھر غیر ارادی طور پر دائیں جانب بنے کیبن کی طرف لحہ بھر کو نظر اٹھا کر دیکھا وہ بھی حسب معمول کھڑی اس پر ایک نظر ڈال کر سر جھکا گئی تھی۔

طمانیت بھرا سانس اپنے اندر اتار تا وہ مطمئن سا اپنے روم میں چلا آیا اور پرسکون انداز میں سیٹ پر جا بیٹھا۔

طبیعت میں جو بوجھل پن تھا وہ اب یکسر غائب ہو چکا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور پھر جس وقت اس نے لیپ ٹاپ آف کیا شام کے چار بجے تھے۔ وہ فوراً" اٹھ کھڑا ہوا اور آفس سے باہر نکل آیا تقریباً" آدھا گھنٹے بعد وہ تسمینہ پھپھو کے گھر پر موجود تھا۔

"عدید تم۔" دستک کے جواب میں دروازہ فاطمہ بجو نے کھولا تھا اور دروازہ کے دوسری طرف اسے دیکھ کر خوشی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات سمیت وہ نم آنکھوں سے کتنی دیر تک اسے دیکھتی چلی گئی تھیں۔

"السلام علیکم بجو۔" اس کے سلام کرنے پر انہوں نے اس کے جھکے سر پر ہاتھ پھیرا پھر اسے لیے اندر چلی آئیں اور امی کو آواز دے کر بلانے لگیں۔ تسمینہ پھوپھو کا حال بھی بجو سے کچھ مختلف نہ تھا بلکہ وہ تو اسے گلے لگا کر باقاعدہ رو ہی پڑی تھیں۔

"ترس گئی تھی میں تو اپنوں کو دیکھنے کو تمہیں دیکھ کر میری آنکھوں میں ٹھنڈک اتر آئی ہے بیٹا۔ بس اب اس طرح دور مت جانا۔" اور پھر باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا اور پتا تو اس وقت چلا جب وہ شام سات بجے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

نہ جانے کون کون سے راز و نیاز ہو رہے تھے کہ اسے دیکھتے ہی سب خاموش ہو گئے۔ یوں اچانک اسے یہاں پا کر وہ بوکھلا سی گئی تھی مگر جلد ہی اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے امی اور بجو کو سلام کر کے جھٹ کمرے سے باہر نکل آئی۔

پتا نہیں کیوں اسے دیکھتے ہی اس کا گلا خشک پڑ گیا تھا۔ وہ سیدھی کچن میں چلی آئی اور فریج سے پانی کی بوتل نکال کر گلاس میں پانی انڈیلنے لگی۔

"ماہین تم نے عدید کو نہ سلام کیا اور نہ دو گھڑی اس کے پاس بیٹھیں' یہ کیا طریقہ ہے۔ وہ کتنے برسوں یہاں آیا ہے اور نہ جانے کس طرح ہم تک پہنچا ہے؟ لیکن تم ہو کہ......"

"جانتی ہوں میں وہ کس طرح یہاں تک پہنچا ہے۔" وہ محض سوچ کر ہی رہ گئی۔ پھر مزید ان کی کوئی بات سنے بغیر کچن سے باہر نکل گئی۔

اس کے اس رویے پر فاطمہ بجو محض تاسف سے سر ہلا کر اسے دیکھتی رہیں جو اپنے کمرے میں جا گھسی تھی اور پھر اس کے جانے تک وہ کمرے میں بند ہی رہی۔ اس نے باہر آنے کی تکلیف کی تھی اور نہ کسی نے اسے بلانے کی۔

"آپی کھانا کھا لیجیے۔" وہ یقیناً" جا چکا تھا تب ہی مریم کھانے کی ٹرے سجائے کمرے میں داخل ہوئی تھی وگرنہ جب سے وہ آیا تھا مریم نے بھی اس کے پاس آنے کی زحمت کی تھی۔

پتا نہیں کون کون سے راز و نیاز ہو رہے تھے کہ کوئی بھی اس کے پاس سے ملنے کو تیار ہی نہ ہو رہا تھا۔ کچن سے آتی مختلف کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو سے اسے یہ تو پتا چل گیا تھا کہ وہ رات کا کھانا کھا کر ہی جائے گا۔

"آپ کو پتا ہے آپی عدید بھائی ہم سب کے لیے گفٹس لائے ہیں اور انہیں کھانا بھی بہت پسند آیا تھا وہ کہہ رہے تھے کہ وہ ان کھانوں کو ترس ہی گئے تھے۔"

مریم اس کی پلیٹ میں بریانی نکالتے ہوئے بڑے شوق سے اس کی باتیں بتا رہی تھی جن کو وہ بے دلی سے سنتی رہی پھر کھانے میں مصروف ہو گئی۔

اس کی عدم دلچسپی کے باعث مریم جلد ہی اس کے پاس سے اٹھ گئی جبکہ وہ کھانے سے فارغ ہو کر بلا ارادہ اسے سوچنے لگی جو اسے بتائے بغیر گھر تک آ پہنچا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور امی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

اس کی وجہ سے وہ آج امی سے ٹھیک طرح مل بھی نہیں سکی تھی۔

امی کا چہرہ خوشی اور مسرت سے جگمگا رہا تھا۔ کتنے ہی عرصہ کے بعد وہ ان کو اس طرح خوش دیکھ رہی تھی لہٰذا اس کے متعلق کچھ بھی غلط کہنے سے باز ہی رہی اور چپ چاپ ان کی سننے لگی۔ جن کی زبان پر ماموں جان اور مامی جی کے لیے محبت ہی محبت تھی۔ نہ کوئی شکوہ' نہ کوئی شکایت۔ وہ حیرت سے ان کے کھلتے چہرے اور مسکراتی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی اور اس کایا پلٹ پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

☼ ☼ ☼

اگلے ہفتہ مریم کا نکاح طے پا گیا تھا اور اب تیاریوں میں محض نو دن باقی تھے۔ وہ بوکھلا گئی تھی کہ اتنے کم دنوں میں کس طرح تمام تیاریاں مکمل ہوں گی۔ جبکہ کمپنی نے بھی لون ریجیکٹ کر دیا تھا۔

"کمپنی ایسا کیسے کر سکتی ہے؟" وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔ اس نے توقیر صاحب سے لون ریجیکٹ ہونے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کر دیا۔

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا مس ماہین یہ سب تو سر ڈیسائیڈ کرتے ہیں کہ کس کو لون دینا ہے اور کب دینا ہے؟ انہوں نے اگر ریجیکٹ کیا ہے تو یقیناً" کوئی وجہ ہو گی بہتر ہے آپ ایک دفعہ ان سے خود بات کر لیں اور اپنی مجبوری ان کو بتائیں ہو سکتا ہے وہ یہ لون پاس کر دیں یہ تو آپ کا حق ہے۔"

توقیر صاحب نے پروفیشنل طریقے سے اسے مشورہ دیا تو وہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔ لون کے لیے اس کے پاس جانا اس کے لیے سوہان روح ہی تو تھا وہ مزید ہل کر رہ گئی

"توقیر صاحب آپ ان سے بات کر لیجیے پلیز۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے ان کی طرف دیکھ کر کہا کہیں وہ بھی انکار نہ کر دیں۔

"میں کوشش کروں گا' آپ فکر نہ کریں او کے؟" اس کے پریشان چہرے کو دیکھ کر توقیر صاحب نے تسلی دینے والے انداز میں کہا تو وہ ان کا شکر ادا کرتی پژمردہ قدموں سے چلتی ہوئی اپنی سیٹ پر جا بیٹھی۔

"ماہین تمہیں عدید سر اپنے آفس میں بلا رہے ہیں۔" زارا نے گزرتے ہوئے اسے پیغام دیا تو ناچار اسے اٹھ کر جانا پڑا۔

اجازت طلب کر کے وہ اس وقت اس کے بالکل سامنے چیئر کے پاس جا کھڑی ہوئی جبکہ وہ یونہی سر جھکائے فائل میں گم تھا۔ اس نے غور کیا اب وہ پہلے کی طرح اس سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا اور نہ اسے بات کرنے پر فورس کرتا تھا۔ اس کا رویہ کچھ عجیب سا ہو گیا تھا اس کے ساتھ اب بھی اس نے ایک بار بھی اسے بیٹھنے کو نہیں کہا تھا جس طرح وہ پہلے کہا کرتا تھا اور نہ ایک نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

پتا نہیں کیوں وہ اس کے اندر آئی ان تبدیلیوں کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

"توقیر صاحب نے تمہارے لیے لون کی سفارش کی تھی مجھ سے۔" وہ بدستور فائل پر سر جھکائے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

اسے سمجھ ہی نہیں آیا کہ وہ جواباً" کیا کہے سو خاموش ہی رہی۔

"اگر تمہیں یہ لون نہیں ملتا تو؟"

اب کی بار وہ سر اٹھا کر اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے بولا تو اس نے تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھا جس نے اسے اس لیے اپنے آفس میں بلایا کہ وہ اس کے جذبات سے کھیلے' اس کی مجبوریوں کا مذاق اڑائے اور وہ۔ وہ اس سے گڑگڑا کر بید مانگے۔ لیکن چہ افسوس کہ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتی تھی۔

وہ خود پر ضبط کیے بمشکل اس کے سامنے کھڑی تھی

مگر مزید کھڑے رہنا نہیں چاہتی تھی۔

"تو اٹس اوکے۔" وہ کچھ بھی کہنا یا سننا نہیں چاہتی تھی سو اتنا کہہ کر ہٹ گئی اور ابھی وہ دو قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ وہ تیزی سے اٹھا اور آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے چیخ کر بولا۔

"کیا سمجھتی ہو تم خود کو ہاں؟" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ غرا کر اس سے مخاطب تھا۔

"پچھلے تین دنوں سے میں تم سے تمہاری ریزیگنیشن والی حرکت پر ناراض ہوں اور تمہیں کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔ میں خود روٹھتا ہوں خود مان جاتا ہوں تمہیں احساس ہی نہیں ہو پاتا۔ تم اتنا نہیں سمجھتیں کہ خود میں نے تمہیں عدید مہران پر کتنا حق دیا ہوا ہے کہ جب چاہو اور جتنا چاہو اسے استعمال کر سکتی ہو لیکن تم ہم نے تو بے حسی کی انتہا کردی ہے ماہی۔ تم تو اتنا بھی نہیں سمجھ سکتیں کہ میں نے لون ریجیکٹ کیا ہے تو کیوں؟" اس کا انداز سوالیہ تھا۔

"کیونکہ میں چاہتا تھا تم خود مجھ سے مریم کی شادی کا ذکر کرو تاکہ مجھے بھی یہ احساس ہو کہ میرا بھی تم پر کچھ حق ہے لیکن ...... تم نہیں جانتیں یہ احساس میرے لیے کس قدر قیمتی ہوتا اگر تم مجھ پر واضح کرنے کی کوشش کرتیں۔" اسے اپنے بازوؤں میں اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کی سختی بڑھتی محسوس ہو رہی تھی۔

"تم نے لون کے لیے اپلائی کیا تھا تو تمہیں لگا میں تمہیں لون دوں گا۔" اس کے لہجے سے افسوس چھلک رہا تھا۔

"بہت دکھ کی بات ہے ماہی کہ تم نے مجھے اتنا گرا ہوا سمجھا۔ میرے نزدیک میرا سب کچھ صرف تمہارا ہے اور میں تمہیں لون دوں گا یہ میرے لیے باعث شرم ہے۔"

وہ بہت آزردہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس اپنے اندر اتارا پھر آہستگی سے اس کے بازوؤں پر سے اپنے ہاتھ ہٹا لیے تو وہ کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی اور وہ اسے جاتا دیکھتا رہا۔

"مریم میری بھی بہن ہے۔ اس کے بارے میں کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے خاص طور پر تمہیں۔"

اس کا ہاتھ ہینڈل پر دھرا تھا جب اسے اپنی پشت پر اس کی مضبوط لہجے میں کہی بات سنائی دی۔ وہ اسی خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی اور وہ بند دروازے کو کتنی ہی دیر تک تکتا رہا۔

☆ ☆ ☆

"اللہ تیرا شکر ہے۔ تو نے میرے لیے عدید کو فرشتہ بنا کر اتارا ورنہ میرے اندر اتنی سکت کہاں تھی؟"

مریم بخیر و خوبی اپنے گھر رخصت ہو چکی تھی اور امی اٹھتے بیٹھتے عدید کے لیے دعا گو تھیں جس نے اخراجات کے علاوہ تمام انتظامات احسن طریقے سے سنبھالے ہوئے تھے اس دوران وہ خاموش ہی رہی تھی کیونکہ کچھ کام ایسے تھے جن کو واقعی وہ کرنے کی اہل ہرگز نہیں تھی اور ایسے میں کسی مرد کی ضرورت لازمی تھی۔

امی کی زبان پر اسی کے گن تھے جس نے اس مشکل وقت میں ان کا ہر طرح سے ساتھ دیا اور بیٹا ہونے کا فرض نبھایا۔ بلکہ نا صرف وہ اس کے اب تو ماموں جان اور مامی جی سے ملنے کو بھی بے تاب نظر آتی تھیں۔

وہ حیرت سے امی کو دیکھتی جنہوں نے اتنی آسانی سے وہ سب کچھ کیسے بھلا دیا جس کو یاد کر کر کے وہ رویا کرتی تھیں۔

اسے امی پر غصہ آتا تھا جس کا اظہار وہ دبے دبے لفظوں میں کر جاتی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے ملاحظہ کریں)

☆ ☆

فوزیہ یاسمین

دستِ کوزہ گر

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اس سے بات نہیں کرتی' جبکہ زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے چین ہے۔ اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو کالج میں اس کے ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے۔ زوبیہ اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے.... وہ روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رومیلہ' سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے۔ اور اسی خوشی میں نمل ان دونوں کو لنچ کی دعوت دیتی ہے... اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم' وکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول کرلیتا ہے' اور انہیں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے جبکہ رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے۔ وہ دونوں واپس جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے؟ اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کردیتا ہے۔

۲۶

چھبیسویں قسط

"کیا بات ہے مس زوبیہ! کیا میں نے کوئی نامناسب بات کہہ دی ہے, جو آپ اس طرح خاموش ہو گئی ہیں۔" خرم نے ٹوکتے ہوئے کہا تو زوبیہ چونک اٹھی۔

"نہ۔۔۔۔ نہ نہیں میں۔۔۔۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ میں کیسے آؤں گی۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔"

"میں آپ کو آپ کے گھر سے پک کر لیتا ہوں اور پھر میں خود ہی ڈراپ بھی کر دوں گا۔" خرم نے فوراً "مسئلہ حل کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن۔۔۔۔ اس طرح تو میرے گھر والوں کو پتا چل جائے گا۔" زوبیہ پریشانی سے بولی۔

"کیسے پتا چل جائے گا۔ آپ صبح کے ٹائم پر کہیں تو جاتی ہوں گی۔ میرا مطلب ہے آپ کیا کرتی ہیں۔ پڑھائی یا جاب؟ اگر گھر سے نکلنا مشکل ہے تو میں آپ کو آپ کے کالج یا آفس سے پک کر لیتا ہوں۔" خرم کے سکون سے کہنے پر زوبیہ خجل ہو کر رہ گئی۔

اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ اس سے کیسے کہے کہ وہ تو اپنی پڑھائی وغیرہ چھوڑ کر گھر میں پڑی ہوئی ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی مقصد ہے نہ اس کے وجود کا کوئی مصرف' وہ تو بس صبح کو شام اور شام کو صبح کر کے اپنی زندگی کا وقت پورا کر رہی ہے۔

"ہیلو مس زوبیہ آپ سن رہی ہیں نا۔" خرم نے اپنے لہجے کے چڑچڑے پن کو چھپاتے ہوئے بظاہر رسانیت سے پوچھا ورنہ دل تو چاہ رہا تھا صاف ٹوک دے۔

"تم کہاں کھو جاتی ہو بار بار۔ ذرا دماغ کو حاضر رکھ کر بات کرو۔"

"ایکچولی میں فی الحال گھر پر ہی ہوتی ہوں ابھی آگے کچھ پڑھنے کا ارادہ نہیں کیا ہے۔" زوبیہ یہ ذکر گول کر گئی کہ وہ کون سا امتحان دے کر فارغ ہوئی ہے۔

اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ خرم نے اسے کریدنے کی بجائے اپنے ہی موضوع پر بات جاری رکھی یعنی اسے زوبیہ کی ذات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ صرف اسے کسی اور مقصد سے بلا رہا تھا۔

"اگر آپ آج کل فارغ ہیں تو یہ تو اور بھی اچھی بات ہے اپنے پیرینٹس سے کہیں میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں اور اس کے لیے سبجیکٹس وغیرہ کا سروے کرنے یونیورسٹی جانا چاہتی ہوں۔

پھر تو مجھے پک بھی نہیں کرنا پڑے گا اور آپ کے فادر خود آپ کو ڈراپ کر دیں گے۔" خرم کو امید تھی اس مشورے پر وہ ضرور سوچ میں پڑ جائے گی اور دوسری طرف پھیلی خاموشی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اس کی امیدوں پر پوری اتر رہی ہے۔

اپنا تیر نشانے پر لگتا دیکھ کر خرم کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ ابھرنے لگی مگر زوبیہ کے سوال نے اسے گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب کر دیا۔

"آپ مجھے یونیورسٹی میں کیا دکھانا چاہتے ہیں۔" خرم کی سمجھ میں نہ آیا وہ اسے کیا جواب دے بات کوئی ایسی معقول ہونی چاہیے تھی جسے سنتے ہی زوبیہ آنے کے لیے نا صرف تیار ہو جائے بلکہ تڑپ اٹھے۔

"تمہیں جو دکھانا ہے وہ تو بعد کی بات ہے۔" خرم کو سوچنے کے لیے وقت چاہیے تھا تبھی بات گھماتے ہوئے بولا۔

"پہلے آپ یہ بتائیں کہ یہ آپ کی شائستہ خالہ کون تھیں اور ان کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"جی۔" زوبیہ حیران ہوئی۔

"جی' میرا یہ سب جاننا بہت ضروری ہے کیونکہ مجھے لگتا ہے شائستہ خالہ کی روح بہت بے چین ہے وہ ہم سے کچھ کہنا چاہتی ہے اور ہمیں کچھ سمجھانا چاہتی ہے۔" خرم کا ذہن پھرکی کی طرح چلنے لگا۔

ڈراؤنی فلمیں دیکھنے کا شوق اسے بچپن سے تھا ساری فلمیں کم و بیش ایک ہی فلسفے پر بنی تھیں ایک بھٹکتی ہوئی روح اس لیے بے چین ہوتی ہے کہ یا تو کسی نے اسے قتل کر دیا ہوتا ہے یا خودکشی پر مجبور کر دیا ہوتا ہے۔

دونوں صورتوں میں صورت حال ایک ہی ہوتی ہے اور وہ ہوتی ہے ایک مسکین کے اوپر ظلم کی بارش اور پھر اسی مظلوم کے دل میں اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے کا جذبہ جو اسے مرنے کے بعد بھی چین سے نہیں رہنے دیتا اور دنیا میں واپس بلا لیتا ہے۔

ایسے ہی موضوع پر بنی ان ایک فلموں میں سے کسی ایک کا مرکزی خیال چراتے ہوئے خرم نے اپنا لہجہ سنسنی خیز بنا لیا۔

"مجھے یقین ہے ان کے ساتھ کوئی انہونی ہوئی ہے جو وہ ہمیں بتانا چاہتی ہیں تاکہ ہم انہیں انصاف دلائیں ان پر ہوئے ظلم کا انتقام لیں۔" خرم کہتا چلا گیا۔

زوبیہ سانس روکے اسے سن رہی تھی اسے اکثر یہی لگتا تھا کہ شائستہ خالہ اسے کچھ سمجھانا چاہ رہی ہیں مگر وہ سمجھ نہیں پا رہی۔ تبھی وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔

"کیا ہوا تھا ان کے ساتھ اور اب ہم ان کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟" اس کے سوال پر جوش سے بولتے خرم نے اپنے لہجے میں سارے جہاں کی تھکن سموتے ہوئے کہنے کی کوشش کر کے کہا۔

"یہ تو میں بھی نہیں جانتا اگر جانتا ہوتا تو اب تک ان کی روح کو اس کرب سے نکال چکا ہوتا لیکن تمہاری تو وہ خالہ تھیں تمہیں تو پتا ہو گا ان کے ساتھ کیا ہوا تھا آئی مین! ان کی ڈیتھ کیسے ہوئی تھی؟" خرم ایک دم چونک کر بولا

آخر کو کوئی بھی کہانی گھڑنے سے پہلے تھوڑا بہت سیاق و سباق معلوم کر لینا اشد ضروری تھا مگر اس بار زوبیہ کے جواب نے اسے نا چاہتے ہوئے بھی حیران ہونے پر مجبور کر دیا۔

"میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی میں نے تو انہیں کبھی دیکھا بھی نہیں۔"

"دیکھا نہیں' لیکن سنا تو ہو گا اپنی مدر سے تم ان کے بارے میں پوچھ سکتی ہو۔" خرم کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"بہت بار پوچھ چکی ہوں مگر مما کچھ نہیں بتاتیں وہ کیسی تھیں؟ ان کی موت کیسے ہوئی تھی؟ مما اس ٹاپک پر بات ہی نہیں کرنا چاہتیں۔ وہ تو یہاں تک کہتی ہیں کہ میری تو کوئی بہن ہی نہیں ہے۔" زوبیہ کی آواز میں محسوس کی جانے والی بے بسی تھی خرم چند لمحوں کے لیے اداکاری بھلا کر بڑی گمبھیرتا سے کہنے لگا۔

"آپ کی ماں اپنی بہن کے وجود سے ہی انکار کر دیتی ہیں پھر تو معاملہ واقعی بہت سیریس ہے۔"

"کیا مطلب؟" زوبیہ اس کی غیر معمولی سنجیدگی پر ٹھٹک گئی۔

"مطلب ان کے ساتھ جو ہوا تھا وہ تمہاری ماں کے لیے اتنا باعث شرمندگی ہے کہ وہ اسے بیان کرنے سے بچنے کے لیے یہاں تک کہہ دیتی ہیں کہ میری کوئی بہن ہی نہیں تھی۔" خرم فکر مند نہیں ہوا تھا البتہ متجسس ضرور ہو گیا تھا۔

اسے روح بدروح پر تو یقین نہیں تھا لیکن اسے شائستہ خالہ کے ساتھ ہوئے سانحہ کی تفصیل جاننے میں دلچسپی ہو گئی تھی مگر زوبیہ کچھ جانتی ہی نہیں تھی بلکہ وہ تو خرم کی بات سن کر خجالت محسوس کر رہی تھی تبھی گم سم سی ہو گئی۔

خرم اس کی خاموشی پر بور ہو کر اپنے موضوع پر واپس آ گیا اور بہت سوچتے ہوئے بولا۔

"مجھے کئی بار ایسا لگا ہے کہ شائستہ خالہ کی روح یونیورسٹی کے اردو ڈپارٹمنٹ کے ارد گرد موجود ہوتی ہے ایک بار

میں نے انہیں فولو کرنے کی کوشش کی تو وہ ایک کمرے کے سامنے آکر رک گئیں اور اچانک غائب ہو گئیں۔
پہلے تو میری سمجھ میں نہ آیا کیا کروں آخر میں نے اس کمرے میں جانے کا ارادہ کرلیا۔" خرم بولتے بولتے رک گیا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا اب آگے کیا کہے۔
"پھر؟ پھر کیا ہوا؟" زوبیہ کے بے چینی سے پوچھنے پر اسے تھوڑا سا سکون ہوا کہ وہ اس کا تجسس جگانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔
لیکن اس وقت خوش ہونے کا ٹائم نہیں تھا وہ فوراً" ہی ذہن کو حرکت میں لاتے ہوئے کہنے لگا۔
"وہ کمرہ نہیں اسٹور روم تھا اس میں یونیورسٹی کا پرانا کاٹھ کباڑ بھرا تھا وہ کمرہ ہمیشہ بند رہتا تھا اس کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ لیکن میں ایک روشن دان کے ذریعے اس میں داخل ہو گیا وہاں.... اس کمرے میں ایک تصویر لگی ہے وہ تصویر وہاں سے نکالی نہیں جاسکتی اسی لیے مجھے تمہیں لے جاکر وہ تصویر دکھانی ہے۔" آخر کار خرم بات بنانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔
"کیسی تصویر؟ کون ہے اس تصویر میں؟" زوبیہ کی آواز تک فکر سے چور تھی اس کے چہرے کا اس وقت کیا عالم ہو گا وہ خرم دیکھے بغیر بھی آسانی سے اندازہ لگا سکتا تھا۔
"ایک تو شائستہ خالہ ہی ہیں لیکن ان کے ساتھ تصویر میں جو دوسرا شخص کھڑا ہے مجھے لگتا ہے ان کی موت میں اس شخص کا ہاتھ ہے۔" زوبیہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔
شائستہ خالہ کا عکس اس نے ہمیشہ بہت غیر واضح سا دیکھا تھا جب کبھی شکل واضح طور پر نظر آئی اس وقت زوبیہ پر خوف اتنا طاری ہو جاتا تھا کہ وہ ان کے چہرے کے خدوخال پر کبھی غور نہ کرسکی۔
کیونکہ شائستہ خالہ کا چہرہ بہت زخمی حالت میں نظر آتا تھا ایسا لگتا تھا ان کے چہرے کو کسی نے ناخنوں سے نوچ ڈالا ہو رخسار پر، ماتھے پر، گردن پر غرض یہ کہ ہر جگہ خراشوں کے ساتھ خون کی باریک لکیریں انہیں اتنا بھیانک بنا دیتیں کہ زوبیہ کی چیخیں نکل جاتیں۔
وہ تو اگر شائستہ خالہ کی تصویر دیکھ لیتی تو پہچان بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ شائستہ خالہ ہیں جبکہ خرم دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا یعنی اس نے شائستہ خالہ کا چہرہ واضح طور پر دیکھا ہے۔
زوبیہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ابھی اور اسی وقت یونیورسٹی کے اسٹور روم میں پہنچ جائے مگر پھر بھی وہ ضبط کرتے ہوئے تامل سے بولی۔
"لیکن آپ تو کہہ رہے ہیں وہ اسٹور روم لاک رہتا ہے۔ میں بھلا روشن دان سے کیسے داخل ہو سکوں گی اور وہ تصویر باہر آ نہیں سکتی۔"
"آپ کو روشن دان سے اندر جانے کی قطعی ضرورت نہیں۔ میری یونیورسٹی میں بازار لگنے والا ہے۔ مختلف اسٹالز کی ڈیکوریشن کے لیے اسٹور رومز سے پرانی ٹیبلز وغیرہ نکلوائی جائیں گی۔ اس دن اسٹور روم کا دروازہ کھلا رہے گا۔ آپ اسی دن آجایئے گا۔ اس دن یونیورسٹی میں اتنی چہل پہل ہوتی ہے کہ کسی کو خبر بھی نہیں ہو گی کہ آپ اسٹور روم میں گئی ہیں۔" خرم نے پورا پلان ترتیب دیتے ہوئے ساری راہیں ہموار کرلیں۔
عام دنوں میں سب اپنی اپنی کلاسز میں ہوتے ہیں وہ اگر زوبیہ کو اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو بھی گیا تو اسے گھنٹوں وہاں روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا جبکہ اسے اپنی اور نمل کی پوری کلاس کے تمام طالب علموں سے لے کر سمیر کے پورے گروپ کو زوبیہ کی آمد سے باخبر کرنا تھا جس کے لیے پڑھائی سے ہٹ کر کسی دن کا انتخاب کرنا سخت ضروری تھا۔
وہ زوبیہ کو اسٹور روم میں لے جانے کے بہانے پہلے پورا بازار گھماتا اور یہی کہتا کہ اسٹور روم کا دروازہ ابھی بند ہے میں لوگوں سے کہہ کر کھلوا رہا ہوں اس طرح دو ڈھائی گھنٹے آرام سے گزر جاتے۔
جس کے بعد خرم کسی بھی کباڑ والے اسٹور روم میں زوبیہ کو لے جاتا اور جاکر اداکاری کے جوہر دکھاتے ہوئے صدمے اور حیرانی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہہ دیتا کہ وہ تصویر یہاں سے غائب ہو گئی۔
یہ سب سن کر زوبیہ کو بوریت تو ہوتی مگر وہ بے وقوف سی لڑکی یہ نہ سمجھتی کہ خرم نے اسے الو بنایا ہے اور بالفرض اگر سمجھ بھی جاتی تو خرم کو کون سا اس کے ساتھ بہت لمبا فلرٹ کرنا تھا۔
ایک بار اسے یونیورسٹی کے لوگوں سے ملوا دیتا اس کے بعد وہ بھلے ہی خرم سے کنارہ کشی اختیار کرلے خرم کی بلا سے۔
"اس دن اگر اسٹور روم کا دروازہ کھلا رہے گا تو آپ تصویر باہر نکال لایئے گا۔ مجھے یونیورسٹی آنے کی کیا ضرورت ہے۔" خرم اس کی بات پر ٹھٹک گیا۔
وہ اتنی بھی بے وقوف نہیں تھی جتنا خرم سمجھ رہا تھا۔
کچھ لمحوں کے لیے اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا وہ کیا جواب دے لیکن ایک بار پھر اس کے دماغ نے بڑی تیزی سے کام کیا اور وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر بولا۔
"وہ تصویر فریم میں لگی ہے اور خاصی بڑی ہے میں لے کر باہر نکلوں گا تو سب چونک اٹھیں گے۔ خیر میں اگر یہ رسک لے بھی لوں تو وہ فریم میں آپ کو دکھاؤں گا کہاں؟ کیا آپ کے گھر لے کر آجاؤں یا آپ میرے گھر آجائیں گی۔" خرم کا لہجہ ہلکا سا طنزیہ ہو گیا زوبیہ ایک دم خاموش ہو گئی۔
وہ بھلا کیا کہتی خرم نے دونوں ہی باتیں ناقابل قبول کہی تھیں چنانچہ اسے ایک ہی سوال کرنا تھا۔
"آپ کی یونیورسٹی میں فیسٹیول کب لگ رہا ہے؟" اس کے تھکے ہوئے لہجے میں بالکل ہار مان لینے والا تاثر تھا خرم کو اپنے اندر ایک نئی تقویت کا احساس ہوا۔

☼ ☼ ☼

رومیلہ کی شادی کے ہنگامے کیا ٹھنڈے پڑے نمل اور سنبل کو سب کچھ ایک دم خالی خالی لگنے لگا حالانکہ وہ اس کی شادی کے فنکشنز کو انجوائے نہیں کر رہی تھیں بلکہ بھگتا رہی تھیں زیادہ تر وقت ان دونوں کا رومیلہ کے لیے پریشان رہ کر ہی گزرا تھا رشیدہ کے بات کرنے پر رومیلہ کو ایک دن کے لیے الیان کی دادی نے گھر بھجوا دیا تھا مگر رومیلہ، نمل کے گھر آنے کی بجائے اپنے گھر جانا چاہتی تھی تاکہ اپنا تمام اہم سامان رکھ سکے اور معمولی معمولی چیزوں کے لیے اسے ماسیوں کے سامنے اپنی حاجت بیان نہ کرنی پڑے ویسے بھی اگلے دن وہ ان سب کے ساتھ الیان کی نانی کے گھر جارہی تھی وہاں وہ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا چاہتی تھی۔
سنبل اور نمل کو جب پتا چلا کہ وہ اپنے ہی گھر آرہی ہے تو وہ بھی اس سے ملنے وہیں پہنچ گئیں۔ رومیلہ نے انہیں جو کچھ بھی بتایا اسے سن کر انہیں دکھ تو ہوا مگر وہ اس پر ظاہر کرنے کی بجائے اسے تسلی دیتی رہیں۔
اب اچھی امید رکھنے کے سوا ان کے پاس اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا وہ دونوں دل سے رومیلہ کی خوشیوں کے لیے دعاگو تھیں۔
رات تک وہ دونوں اپنے اپنے گھر واپس آگئیں کہ صبح رومیلہ کو اپنی سسرال لوٹ جانا تھا دوپہر تک ان کی روانگی جو تھی۔
البتہ رشیدہ کے پوچھنے پر نمل نے زیادہ تفصیل سے الیان کے گھر والوں کے رویے کا ذکر نہیں کیا۔ کیا فائدہ تھا انہیں دکھی کرنے کا نمل نے صرف الیان کی نانی اور ماموں وغیرہ کے بہترین اخلاق اور خوش مزاجی کا تذکرہ کرکے

الیان اور اس کے گھر والوں کی سرد مہری کو دو لفظوں میں سمیٹ دیا۔

"وہ سب بھی اچھے تو ہیں مگر رومیلہ کہہ رہی تھی ذرا کم گو اور لیے دیے رہنے والے ہیں شاید اسی لیے شادی اور ولیمے میں اتنے روڈ لگ رہے تھے۔"

"چلو خیر ہے۔ رومیلہ خود سمجھ دار ہے وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو مسئلہ نہیں بنائے گی۔" رشیدہ قدرے اطمینان سے بولیں تو نمل بھی بات کھپ جانے پر پرسکون ہو گئی۔

البتہ ایک بات اسے بہت کھٹک رہی تھی جس کا تذکرہ اس نے سنبل تک سے نہیں کیا تھا اور وہ تھا سمیر کو رومیلہ کی شادی میں بلانے کی حرکت پر پچھتاوا۔

اول تو اس کا رویہ رشیدہ کے ساتھ نمل کو سخت ناگوار گزرا تھا اس کے لیے پوری دنیا میں سب سے اہم اپنی ماں کے سوا اور کوئی نہیں تھا اور جس طرح سمیر نے اس کی ماں کی معذوری پر رد عمل کا اظہار کیا تھا وہ نمل کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

حالانکہ یہ سب وہ بچپن سے دیکھتی آرہی تھی ہر تقریب میں اس کی ماں کو پہلی بار دیکھنے والے لوگ کم و بیش اسی رد عمل کا مظاہرہ کرتے تھے بلکہ کچھ لوگ تو عجیب و غریب سوال جواب کر کے رشیدہ سمیت نمل تک کا دل چیر کر رکھ دیا کرتے تھے۔

لیکن سمیر کا انداز اسے سر تا پا سلگا گیا تھا یہ بات نہیں تھی کہ وہ سمیر سے بہت متاثر تھی یا رشیدہ کے ساتھ اس کے رویے نے نمل کو شاک پہنچا دیا تھا۔ بلکہ اس کی اس حرکت نے نمل کو سمیر سے بے زار کر دیا تھا وہ خرم کو جلانے کے لیے محض اس کا استعمال کر رہی تھی مگر اتنے ہلکے انسان کو وہ اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔

لیکن مجبوری تھی سمیر کے علاوہ کسی اور کو خرم کے مدمقابل لانا اتنا آسان نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس قسم کی لڑکی تھی کہ جس کو چاہتی اپنے دام میں پھانس لیتی۔

اس قسم کی حرکتیں کرنا اس کے لیے کوئی آسان کام نہیں تھا وہ تو خرم نے اسے اتنا مشتعل کر دیا تھا کہ وہ سمیر کے ساتھ کینٹین میں بیٹھنے پر تیار ہو گئی تھی مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ وہ آئے دن ایسی حرکتیں کر سکتی تھی وہ بھی ہرا رے غیرے کے ساتھ۔

اس لیے جب رشیدہ نے اس سے سمیر کے متعلق پوچھا تو اس نے صاف صاف بتا دیا جسے سن کر رشیدہ بھڑک اٹھیں حالانکہ وہ بہت ٹھنڈے مزاج کی تھیں مگر نمل کو خود اپنے ہاتھوں اپنا تقدس پامال کرتے اور زندگی کو کھیل بناتے کیسے برداشت کر لیتیں۔

"تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے تم کیا کر رہی ہو۔ اگر سمیر کوئی اچھا انسان ہوتا تب بھی خرم کو اس طرح جلانا خود تمہارے مستقبل کے لیے سخت خطرناک ہے دوسرے مجھے تو سمیر بھی کوئی ٹھیک لڑکا نہیں لگا ہے یہ تو بالکل وہی بات ہوئی نا ایک طرف کنواں دوسرے طرف کھائی۔"

"مت کریں ایسی باتیں۔" نمل جھنجلا گئی۔

"میرا مستقبل کوئی خرم کے ساتھ وابستہ نہیں ہے جو آپ مجھے اس طرح ڈرا رہی ہیں اور رہا سوال سمیر کا وہ کس قسم کا لڑکا ہے یہ میں بھی جانتی ہوں وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا آپ بے فکر رہیں۔"

"تمہارے یہ کہہ دینے سے کہ آپ بے فکر رہیں' میری فکر دور تو نہیں ہو سکتی اور یہ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو کہ تمہارا مستقبل خرم کے ساتھ وابستہ نہیں ہے تمہارے والد جو ٹھان لیتے ہیں وہ کر گزرتے ہیں اور ان کی کی گئی یہ منگنی کسی پتھر کی لکیر سے کم نہیں ہے۔" رشیدہ کا مقصد صرف اور صرف اسے حقیقت سے روشناس

کرانا تھا اسی لیے ان کا غصہ خود بخود سرد ہو گیا اور وہ رسانیت سے کہنے لگیں۔

"اگر وہ جو ٹھان لیتے ہیں وہ کر گزرتے ہیں تو میں بھی جو طے کر لیتی ہوں اس پر قائم رہتی ہوں اور میں نے خرم سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اللہ نہ کرے پھر بھی اگر حالات ایسا رخ اختیار کرتے ہیں کہ میرے پاس خرم سے شادی کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں بچتا تو میں خودکشی کر لوں گی مگر اس۔۔۔۔"

"خدا نہ کرے۔" رشیدہ نے دہل کر اس کی بات کاٹ دی پھر ڈپٹ کر کہنے لگیں۔

"کچھ ہوش بھی ہے تمہیں کہ کیا کہہ رہی ہو ایک حرام فعل اپناؤ گی تم' وہ بھی اتنی معمولی سی بات پر خرم کے ساتھ جن اختلافات کو تم آج بہت بڑا سمجھ رہی ہو کل کو تمہیں وہ سب بچکانہ دور کی بے وقوفیاں بھی لگ سکتی ہیں لیکن تمہیں شاید خرم سے اتنی نفرت ہے جتنی مجھ سے محبت بھی نہیں ہے ورنہ ایسی بات تم کبھی نہ کہتیں۔"

آخری جملے پر رشیدہ کی آواز بھرا گئی تو نمل کچھ شرمندہ سی ان کے پاس بیٹھ کر انہیں منانے لگی۔

"سوری امی! میرا یہ مطلب نہیں تھا صرف ایک آپ ہی تو ہیں جن کی مجھے فکر ہے اور جن کی وجہ سے میں نے یہ نام نہاد منگنی کی ہے اگر مجھے آپ سے محبت نہ ہوتی تو میں عین منگنی والے دن بھری محفل میں خرم کے منہ پر انگوٹھی مار کر شادی سے انکار کر دیتی پوری یونیورسٹی کو اس نے انوائیٹ کیا تھا سب کے سامنے اس کا غرور خاک میں مل جاتا جو یہ جانتے ہوئے بھی منگنی کرنے چلا آیا کہ میں اس شادی پر راضی نہیں ہوں۔ یہ ڈھٹائی نہیں ہے تو اور کیا ہے امی۔" نمل بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گئی اس کے چہرے پر بے بسی پھیلی دیکھ کر رشیدہ نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

"میری خاطر تم نے خاموشی سے منگنی کر لی مگر میری پریشانی تو بدستور برقرار ہے بلکہ تم دونوں کے بیچ بڑھتی ناچاقی دیکھ کر تو اس میں اضافہ ہی ہو رہا ہے آخر تم اس لڑائی کو ختم کیوں نہیں کر دیتیں۔"

نمل نے بے اختیار آنکھیں بند کر لیں جیسے جو وہ کہہ رہی ہیں وہ ناممکن ہو تبھی وہ وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

"مجھے معلوم ہے وہ تمہیں جان بوجھ کر غصہ دلاتا ہے مگر تم اس کے حریف سے دوستی کرنے اور اسے جلانے کی بجائے اس کی حرکتوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دو بلکہ ایسا کرو یونیورسٹی ہی چھوڑ دو۔"

"کیا بات کر رہی ہیں امی آپ؟" نمل نے ایک دم آنکھیں کھولتے ہوئے بدک کر کہا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہو اللہ کرے تمہاری شادی تمہاری پسند اور مرضی سے ہو اور اگر تم اپنے شریک حیات کے ساتھ ہمیشہ خوش رہو لیکن اگر خدانخواستہ ایسا نہیں ہوتا اور وہی ہوتا ہے جو مجھے لگ رہا ہے تو خرم کے ساتھ ہوئی یہ چھوٹی موٹی جھڑکیاں تمہیں آگے چل کر بہت مہنگی پڑ جائیں گی اس سے دوستی نہیں کر سکتیں تو دشمنی ہی ختم کر دو۔"

"امی مجھ سے وہ بات مت کہیں جو میرے اختیار میں نہیں ہے۔ آپ کے خدشات اور پریشانیاں میں سب سمجھ رہی ہوں۔ لیکن میں یونیورسٹی نہیں چھوڑ سکتی اور یونیورسٹی میں رہتے ہوئے میں خرم کی کتنی باتوں کو نظر انداز کر سکتی ہوں وہ تو مجھے چڑانے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔" نمل بالکل بے بس ہو کر رہ گئی تھی وہ رشیدہ کو انکار بھی نہیں کر سکتی تھی اور خرم سے ہار مان کر بھی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

رشیدہ اس کی کیفیت سمجھ رہی تھیں تبھی اس کا سر سہلاتے ہوئے کہنے لگیں۔

"خود کو ہلکان مت کرو۔ میں تو صرف تمہیں بیچ کی راہ بتا رہی تھی جو مصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور ہمیشہ آگے جا کر فائدہ پہنچاتی ہے لیکن اگر تمہیں اس پر عمل کرنا مشکل لگ رہا ہے تو چھوڑ دو' تمہیں مجبور نہیں کرنا چاہتی مگر میں یہ ضرور کہوں گی تم سمیر کو خرم کے مقابل لا کر بہت غلط کر رہی ہو ـــــ کوشش کر کے اس مسئلے کو حل کر لو۔"

نمل ان کی بات کے جواب میں کچھ بولی نہیں لیکن ان کی گفتگو نے اسے ہلکی سی مایوسی میں دھکیل دیا تھا کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ کچھ بھی کر لے آخر میں جیت خرم کی ہی ہونی ہے اور جب اسی کے ساتھ زندگی گزارنی ہے تو اسے اتنا زچ کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ آئندہ پوری زندگی اس ایک غلطی کا خمیازہ بھگتے گزر جائے۔
وہ عجیب طرح کے ذہنی اضطراب کا شکار تھی جس کے نتیجے کے طور پر وہ غیر شعوری انداز میں سمیر سے اجتناب کرنے لگی۔

سمیر جب بھی اس کے پاس آتا نمل خود کو مصروف ظاہر کر کے وہاں سے ایسے ہٹ گئی کہ سمیر کو محسوس نہ ہو۔
گویا وہ اس دروازے کو بند نہیں کرنا چاہتی تھی بس رشیدہ کی باتوں اور خود سمیر کے اپنے رویے نے نمل کو اس سے بے زار کر دیا تھا وہ پہلے ہی اس کی کوئی خاص شیدائی نہیں تھی چنانچہ رشیدہ کے ساتھ اس طرح پیش آ کر اس نے اپنے نمبرز خود ہی گھٹا دیے تھے۔
جسے سمیر تو محسوس نہیں کر سکا لیکن سنبل نے فوراً" تاڑ لیا اور اس کے پوچھنے پر نمل نے اسے سب سچ سچ بتا بھی دیا تو وہ خود بھی کچھ گم سم سی ہو گئی۔
"میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تم دونوں کے اس رشتے کا انجام کیا ہو گا ایک طرف رومیلہ کی شادی ہوئی ہے جو شادی کم اور سمجھوتہ زیادہ لگ رہا ہے۔ دوسری طرف تم سے تو یہ امید بھی نہیں ہے کہ تم رومیلہ کی طرح اتنے صبر سے سب برداشت کر لو گی۔" اس کی بات پر نمل بے ساختہ ہنس پڑی جس پر سنبل برا مانتے ہوئے بولی۔
"دیکھو میں تمہیں رومیلہ سے کمپیئر نہیں کر رہی مگر یہ بھی سچ ہے کہ اگر تم ذرا صبر اور ضبط کا مظاہرہ کرو تو خرم والا معاملہ کسی حد تک سلجھ سکتا ہے میں مانتی ہوں اس کی ساری حرکتیں تمہیں تپانے والی ہوتی ہیں لیکن تم تپنے کی بجائے۔۔۔"
"چلو چھوڑو یار جو تم کہہ رہی ہو وہ میں ماننے والی نہیں ہوں لہٰذا اس بحث کو یہیں سمیٹ دیتے ہیں۔
جب سے رومیلہ کی شادی ہوئی ہے عجیب بوریت سی ہو رہی ہے لہٰذا کل یونیورسٹی میں جو فیسٹیول لگ رہا ہے اس میں بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا ہے اور اس بوریت کو دور کرنا ہے او کے۔" نمل نے کہا تو سنبل بھی تائیدی انداز میں سر ہلانے لگی۔ واقعی وہ دونوں رومیلہ کی شادی سے لے کر اب تک مایوس کن باتیں سوچ سوچ کر تھک گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

خرم نے جب زوبیہ کو فون کر کے آنے کا دن اور وقت بتایا تو ایک پل کو اس کا دل چاہا صاف انکار کر دے مگر وہ اس موقع کو گنوا نہیں سکتی تھی اسی لیے بڑی مشکل سے دل کڑا کر کے عائشہ اختر کے پاس اجازت مانگنے چلی آئی۔
حالانکہ ان کی طرف سے اس پر کوئی پابندی نہیں تھی مگر اس نے کبھی اس طرح کا کوئی پروگرام بنا کر کہیں جانے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی چنانچہ عائشہ اختر کا اس فرمائش پر چونکنا یقینی تھا اور اس کے بعد ان کا جواب کیا ہو گا اس بارے میں وہ کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی البتہ امید تھی کہ وہ اپنی عادت کے مطابق اسے کریدیں گی ضرور۔

زوبیہ ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی چہرے کا نرم ہاتھوں سے آہستہ آہستہ مساج کر رہی تھیں زوبیہ کو آئینے کے عکس میں نمودار ہوتا دیکھ کر وہ سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگیں۔
"مما آپ بزی تو نہیں ہیں نا۔" زوبیہ نے جواب جانتے ہوئے بھی محض بات شروع کرنے کی غرض سے پوچھا۔

"نہیں! کہو کیا بات ہے۔"
"مما۔۔۔ وہ دراصل۔۔۔ پاپا کہہ رہے تھے نا کہ مجھے پڑھائی شروع کرنی چاہیے اور اس کے لیے کہیں ایڈمیشن لے لینا چاہیے۔" زوبیہ کہہ کر رک گئی۔
"ہاں تو۔" عائشہ اختر اب بھی اسے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں دیکھ رہی تھیں۔
"تو میں یہ سوچ رہی تھی کچھ کالجز اور یونیورسٹیز کا سروے کر کے دیکھوں اگر کسی جگہ کا ماحول مناسب لگتا ہے تو میں وہاں ایڈمیشن کے لیے اپلائی کروں۔" زوبیہ نے سہمے سہمے انداز میں کہا۔
زوبیہ کو بہوت بریت سے ہٹ کر کوئی بات کرتا دیکھ کر عائشہ اختر حیرت سے غش کھا کر رہ گئیں۔
وہ اپنے کیریئر کے متعلق سوچ رہی تھی ایڈمیشن ملتا یا نہ ملتا تو بعد کی بات تھی فی الحال تو انہیں زوبیہ کا خود کے لیے سوچنا شدید خوش گوار حیرت میں مبتلا کر گیا۔
"ہاں ہاں کیوں نہیں بالکل سروے کرو مگر تم ماحول کا اندازہ کیسے لگاؤ گی۔"
"مم۔۔۔ مما وہ۔۔۔ میری کالج کی کچھ لڑکیوں کے بہن بھائی جس یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں وہاں کی میں نے بہت تعریف سنی ہے اور پھر کل وہاں فیسٹیول لگ رہا ہے۔
میں سوچ رہی ہوں ایک دفعہ فیسٹیول کے بہانے یونیورسٹی کا جائزہ لے کر آؤں کہ آیا میں وہاں ایڈجسٹ ہو سکتی ہوں یا نہیں۔"
عائشہ اختر اسٹول سمیت زوبیہ کی طرف گھوم گئیں ان کے چہرے پر دو سو پاور کا بلب آن ہو گیا پھر بھی وہ اپنی خوشی چھپاتے ہوئے عام سے انداز میں کہنے کی کوشش کرنے لگیں۔
"یہ تو بہت اچھی بات ہے جاؤ جا کر سروے کرو لیکن فیسٹیول میں بھلا تم کیا اندازہ لگا سکو گی۔"
"مما یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم بس جاؤں گی تو کچھ دیکھ کر اگر سمجھ میں آ گیا یا دل مانا تو ایڈمیشن فارم لے آؤں گی نہیں تو جیسے ابھی گھر میں بیٹھی ہوں ویسے بیٹھی رہوں گی۔"
"نہیں نہیں ایسے کیوں سوچ رہی ہو جب تم وہاں جا کر ان لوگوں کو دیکھو گی تو بس ایک چیز ذہن میں رکھنا کہ یہ بھی تمہاری طرح انسان ہیں جب یہ لوگ یہاں آ کر پڑھ سکتے ہیں تو تم کیوں نہیں بھلا میری بیٹی میں کسی چیز کی کمی تھوڑی ہے بلکہ میری بیٹی جیسی حسین تو کوئی لڑکی ہے ہی نہیں۔" وہ زوبیہ کی بات سن کر اتنی خوش ہوئی تھیں کہ اٹھ کر زوبیہ کے قریب آ گئیں اور اسے کندھے سے تھام لیا۔
"میں وہاں کوئی اپنا حسن دکھانے تھوڑی جا رہی ہوں مما۔" زوبیہ کچھ جھینپ کر بولی۔
"یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔ مگر مجھے تمہاری عادت کا پتا ہے زیادہ کراؤڈ (رش) میں تم لوگوں کو دیکھ کر نروس ہو جاتی ہو حالانکہ تمہارے جیسی خوب صورت لڑکیاں تو بہت خود اعتماد رہتی ہیں کیونکہ انہیں پتا ہوتا ہے کہ وہ بہت حسین ہیں مگر تم نے تو اپنی خوبیوں پر کبھی دھیان ہی نہیں دیا۔" ان کا اتنا خوشگوار موڈ دیکھ کر زوبیہ بغور انہیں دیکھنے لگی۔

جب سے خرم کا فون آیا تھا اس کے ذہن میں ایک سوال سر اٹھا رہا تھا کہ کیا شائستہ خالہ یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں مگر یہ سوال لبوں تک لانے کی اس میں ہمت نہیں تھی ایک تو یہ سنتے ہی عائشہ اختر کا مزاج برہم ہو جاتا دوسرے اسے جواب میں یہی سننے کو ملتا کہ۔
"میری کوئی بہن نہیں ہے ہزار بار تو کہہ چکی ہوں آخر تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔"
اس کی سمجھ میں بخوبی آ گیا تھا کہ اس کے مما پاپا اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے اب جو کچھ کرنا تھا اسے خود ہی کرنا تھا اور پھر اب تو خرم کی مدد بھی شامل حال ہو گئی تھی پھر کیا ضرورت تھی عائشہ اختر کو اس وقت ناراض کرنے کی جبکہ

ان کے خوشگوار موڈ کے باعث اسے اپنی ایک بات اور بھی منوانی تھی۔

"تو مما آپ ڈرائیور سے کہہ دیجیے گا وہ مجھے لے جائے گا میں صبح گیارہ بجے نکل جاؤں گی۔"

"تم اکیلی جاؤ گی۔" عائشہ اختر نے تعجب سے پوچھا۔

"اک..... اکیلی کہاں۔ ڈرائیور کے ساتھ جاؤں گی۔" زوبیہ نے خود اعتمادی سے کہنے کی کوشش کی جبکہ عائشہ اختر ہنوز اسے حیرانی سے دیکھے گئیں۔

"صبح میں مجھے بھی کوئی کام نہیں ہے میں چل سکتی ہوں تمہارے ساتھ۔" ان کی شکل سے صاف ظاہر تھا انہیں زوبیہ کے منہ سے ایسی بات سننے کی قطعاً" امید نہیں تھی۔

حالانکہ وہ خود بھی چاہتی تھیں کہ وہ ان کے ماحول کی دوسری لڑکیوں کی طرح اکیلے آنے جانے کے قابل ہو۔ خود سے اپنی شاپنگ کرنے اور اپنے فیصلے کرنے کی سمجھ رکھتی ہو مگر اس وقت اچانک اس کے مزاج میں یہ تبدیلی انہیں الجھن میں مبتلا کر گئی۔

"آں..... نہیں مما..... اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

اصل میں 'میں خود اکیلے جا کر دیکھنا چاہتی ہوں کہ میں روز ایسے ماحول اور جگہ میں اکیلی آسکتی ہوں یا نہیں۔" زوبیہ نے ایک ایسا نکتہ ان کے سامنے رکھا کہ وہ اعتراض نہ کر سکیں۔

ویسے بھی اعتراض انہیں تھا بھی نہیں جو وہ اسے ٹوکتیں انہیں تو صرف حیرت تھی۔ ایک بے یقینی سی کہ زوبیہ میں یہ بدلاؤ کیونکر آیا۔

وہ اس کے چہرے پر کچھ کھوجنے کی کوشش کرنے لگیں۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح بالکل سادہ اور معصوم تھا چنانچہ انہوں نے ایک گہرا سانس کھینچتے ہوئے اپنی رضامندی دے دی۔

"ٹھیک ہے کل صبح گیارہ بجے چلی جانا اور اپنا موبائل ضرور لے کر جانا۔" زوبیہ کا دل چاہا بے اختیار ان کے گلے لگ جائے۔

لیکن اس نے خود کو روک لیا اور نارمل انداز میں "تھینک یو" کہتی ان کے کمرے سے نکل گئی۔

ان کے بیچ ایسی بے تکلفی یا والہانہ محبت تھی ہی نہیں کہ وہ ایسی بے اختیاری دکھاتی پھر دوسرے یہ کہ وہ اتنی خوشی بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ مشکوک ہو جائیں ویسے بھی یہ خوشی کوئی دیرپا نہیں تھی۔

اپنے کمرے میں جا کر جہاں ایک مرحلہ خوش اسلوبی سے طے پا جانے پر اسے سکون کا احساس ہوا تھا وہیں دوسرا مرحلہ اس اس سے بھی زیادہ مشکل لگ رہا تھا۔

حالانکہ اسے یونیورسٹی جا کر صرف ایک تصویر ہی تو دیکھنی تھی مگر اس کی گھبراہٹ پورے عروج پر تھی جیسے جانے کل کیا انہونی ہونے والی ہے۔

☼ ☼ ☼

رومیلہ، نمل اور سنبل سے بات کر کے قدرے بہتر محسوس کر رہی تھی ان دونوں کے ساتھ اپنی اس عجیب و غریب شادی کو ڈسکس کر کے اس نے اپنا بوجھ ہلکا نہیں کیا تھا بلکہ ان سے مشورہ مانگا تھا کہ اسے آئندہ کس طرح اور کیسے رہنا چاہیے۔

جس پر ان دونوں نے اس کی خوب ہمت بڑھانے کے بعد اسے صبر کی تلقین کی تھی حالانکہ نمل نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔

"تم مت سمجھنا کہ تم آج ان کے رویے کو نظر انداز کر کے ان کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آؤ گی تو وہ لوگ

تمہاری ایک دم سے قدر کرنے لگیں گے اور تمہیں بڑے ارمانوں کے ساتھ لائی بہو کی طرح محبت سے رکھیں گے۔

ہو سکتا ہے وہ ساری زندگی اسی طرح تمہیں ڈی گریڈ کرتے رہیں اور ساری زندگی تمہیں یہ جتانے کی کوشش کرتے رہیں کہ تمہاری بارات لوٹ جانے کے باوجود ہم نے تمہیں اپنا کر تم پر احسان کیا ہے یہ صورت حال اگر ہمیشہ قائم رہی تو تمہارے لیے بہت مشکل ہو جائے گی۔ تب اگر تم علیحدگی کا سوچو تو میں تمہیں غلط نہیں کہوں گی۔ لیکن بغیر کوشش کیے اگر تم نے ہار مان لی اپنی ہمت اور قسمت کو آزمائے بغیر ہتھیار ڈال دیے تو یہ واقعی تمہاری بہت بڑی غلطی ہو گی۔" رومیلہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی وہ جانتی تھی نمل یہ سب کیوں کہہ رہی ہے۔

رشیدہ شادی کے بعد معذور ہوئی تھیں اور اس کے بعد انہوں نے ساری زندگی خاموشی سے عظمت خلیل کی خدمت کرتے گزار دی لیکن عظمت خلیل نے کبھی رشیدہ کو اس انتھک محنت کا صلہ نہیں دیا۔

اسی لیے نمل اسے حقیقت پسندی سے میدان میں اترنے کے لیے کہہ رہی تھی یعنی جیت کی امید رکھتے ہوئے کوشش کرو مگر ہارنے کی صورت میں ٹوٹ کر بکھرنے کی بجائے اسے زندگی کا حصہ سمجھ کر قبول کر لو۔

ان کی یہ سب باتیں سن کر وہ واپس تو بڑے بلند حوصلوں کے ساتھ آرہی تھی لیکن پہلی ہی سیڑھی پر وہ جیسے منہ کے بل گری تھی۔

اگلے دن جب اسے واپس آنا تھا تو ناشتے کی میز پر ابرار بھائی نے اس پر نظر پڑتے ہی پوچھا۔

"الیان کتنے بجے لینے آئے گا تمہیں۔"

"جی..... پتا نہیں۔" رومیلہ سٹپٹا گئی ابرار بھائی بھی تو اسے بغور دیکھ رہے تھے جیسے اس کے چہرے سے اس کے ذہن تک رسائی حاصل کر رہے ہوں۔

اس کی جب سے شادی ہوئی تھی ابرار بھائی اسے کریدنے کی کوششیں کرتے عجیب کھوجتی نظروں سے اسے دیکھتے رہتے تھے اس وقت بھی وہ اس کے تاثرات ٹٹولتے ہوئے بولے۔

"الیان سے کوئی بات نہیں ہوئی تمہاری؟"

"نہ..... نہیں میں نے ایسا کچھ پوچھا ہی نہیں۔"

"اور جب تک تم پوچھتی نہیں وہ خود سے کوئی بات کرتا نہیں۔" رومیلہ حیرانی سے ابرار بھائی کو دیکھنے لگی۔ اتنا صحیح اندازہ انہوں نے کیسے لگا لیا۔

لیکن رومیلہ کو فوراً" ہی اپنی حیرت پر قابو پانا پڑا کیونکہ وہاں بابا جانی اور بھابھی بھی موجود تھیں اور وہ دونوں ہی ابرار کے سوال پر رومیلہ کو جانچتی نظروں سے دیکھنے لگے تھے بھابھی کی آنکھوں میں تجسس بھرا تھا جبکہ بابا جانی فکر مندی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"نہ..... نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔" رومیلہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا بولے۔

"چلو خیر۔ تم الیان کو فون کر کے پوچھ لو وہ کب تک آئے گا۔"

"میں۔" رومیلہ بے ساختہ بولی۔

"ہاں تم۔ کیوں کیا ہوا؟" ابرار بھائی کا لہجہ بظاہر عام سا تھا مگر ان کی آنکھوں میں شک و شبہات ابھرے تھے۔

رومیلہ ایک بار پھر بے بس ہو گئی۔

"وہ..... میرے پاس تو الیان کا نمبر نہیں ہے۔" اسے امید تھی اب بھابھی ضرور بولیں گی مگر حیرت انگیز طور پر وہ بالکل خاموش رہیں۔

رومیلہ کی شادی سے لے کر اب تک انہوں نے الیان یا اس کے گھر والوں پر کوئی تبصرہ رومیلہ کے سامنے

نہیں کیا تھا جہاں اس بات سے رومیلہ کو اطمینان تھا کہ وہ بے سروپا ہانک نہیں رہیں وہیں وہ ان کے تاثرات جاننے کے لیے بے چین بھی تھی۔

"کوئی بات نہیں نمبر میں دے دیتا ہوں تم ابھی بات کر لو۔" انہوں نے صرف کہا نہیں بلکہ اس کا موبائل اٹھا کر اس میں الیان کا نمبر فیڈ کرتے ہوئے اس کی طرف بڑھا دیا۔

ان کا انداز ایسا تھا لو ابھی بات کرو رومیلہ الجھن بھری نظروں سے موبائل کو دیکھنے لگی کہ بابا جان بول پڑے۔

"اسے ناشتا تو کرنے دو۔ رومیلہ ناشتے کے بعد بات کر لینا۔" بابا جانی نے اس کی مشکل آسان کر دی لیکن الیان سے بات کرنے کے خیال سے اس پر گھبراہٹ سوار ہو گئی تھی اور اس سے ناشتا ہی نہیں کیا جا رہا تھا آخر وہ صرف چائے پی کر موبائل لیے کمرے میں آگئی۔

ابرار بھائی ہر دس سیکنڈ بعد اس کی طرف ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں "جلدی کرو" آخر رومیلہ کو اٹھنا ہی پڑا۔

کمرے میں آکر الیان کو فون کرتے ہوئے اس کی انگلیاں واضح طور پر کانپ رہی تھیں وہ دعا کر رہی تھی الیان کا فون بزی ہو مگر اس نے دوسری ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی تو رومیلہ دل مسوس کر رہ گئی اور الیان کے تیسری بار ہیلو کہنے پر دل کڑا کرتے ہوئے بولی۔

"السلام علیکم۔ میں رومیلہ بول رہی ہوں۔" دوسری طرف توقع کے عین مطابق خاموشی چھا گئی۔

"الیان..... آپ مجھے لینے کب آئیں گے؟" رومیلہ نے اس ڈر سے جلدی سے کہہ دیا کہ کہیں وہ خاموشی سے فون بند نہ کر دے پھر اس کے لیے دوبارہ کال کرنا سوہان روح ہو جائے گا دوسری طرف اس کے سوال پر ایسے خاموشی چھائی رہی جیسے الیان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس سے یہ سوال پوچھا جائے گا۔

"ہیل..... ہیلو۔ آپ سن رہے ہیں نا۔" رومیلہ کو لگا لائن کٹ گئی ہے اور وہ خالی فون کان سے لگائے کھڑی ہے۔ پھر اس نے الیان کو واضح طور پر گہرا سانس خارج کرتے سنا جیسے بڑی مجبوری سے بول رہا ہو۔

"آجاؤں گا دو تین گھنٹے میں۔" الیان نے یہ کہہ کر کھٹ سے فون بند کر دیا۔

رومیلہ کے سارے ارادے بھر بھری مٹی کی طرح ڈھیر ہونے لگے نمل اور سنبل کی تسلیاں اور حوصلہ بڑھانا سب پر ایک دم پانی پھر گیا۔

الیان اس کے سامنے نہیں تھا لیکن اس کے چہرے پر کتنی بے زاری ہو گی یہ رومیلہ صرف اس کے سانس کھینچنے کے انداز سے ہی سمجھ گئی تھی۔

خود کا اس طرح زبردستی کسی کے سر پر مسلط ہونا اس کے لیے برداشت سے باہر تھا پھر کہاں سے لاتی وہ صبر اور حوصلہ جس کی تلقین نمل اور سنبل کر رہی تھیں۔

دل تو چاہا ابھی الیان کو فون کر کے کہہ دے کوئی ضرورت نہیں ہے آنے کی میں خود ہی آجاؤں گی۔

اس نے دل کی نہ سنتے ہوئے خاموشی سے فون کان سے ہٹا کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا اسی وقت ابرار بھائی کمرے میں داخل ہو گئے۔

"کیا کہا الیان نے۔" رومیلہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی اسے شک سا گزرا جیسے ابرار بھائی دروازے سے لگے اس کی گفتگو سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس لیے رومیلہ کے فون رکھتے ہی وہ کمرے میں آگئے۔

"وہ..... انہوں نے کہا ہے دو تین گھنٹے میں آجائیں گے۔" رومیلہ کے کہنے پر ابرار بھائی ایسے کھڑے رہے جیسے مزید کچھ سننا چاہ رہے ہوں۔

"کیا بات ہے بھائی؟" رومیلہ کی سمجھ میں نہ آیا وہ ان سے کیسے پوچھے کہ کیا آپ میری بات سن رہے تھے۔

"الیان کا رویہ کیسا ہے تمہارے ساتھ۔" انہوں نے بڑی صاف گوئی سے پوچھا۔
"کیا ہو گیا ہے بھائی بار بار ایک ہی سوال کیوں پوچھے جا رہے ہیں۔" رومیلہ حقیقتاً" چڑ گئی تھی۔
"کیونکہ تم مجھے صحیح طریقے سے بتا نہیں رہیں۔"
"کیا بتاؤں۔ کیا سننا چاہتے ہیں آپ۔ ابھی میری شادی کو ٹائم ہی کتنا ہوا ہے۔" رومیلہ برہمی سے بولی۔
"ٹائم کی ضرورت ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے پڑتی ہے جبکہ رویہ کا اکھڑ پن' پانچ منٹ کی گفتگو میں ہی سمجھ میں آجاتا ہے۔" ابرار بھائی نے بڑے نپے تلے انداز میں کہا۔
رومیلہ صرف انہیں دیکھ کر رہ گئی اسے خاموش دیکھ کر ابرار بھائی تھوڑے تیز لہجے میں بولے۔
"دیکھو تمہارے ساتھ اس گھر میں جو بھی ہو مجھے فوراً" بتا دینا آج کل وہ زمانہ نہیں ہے جہاں عورت اپنی خدمت سے لوگوں کے دل جیت لیا کرتی تھی۔ آج کل لوگوں کو سیدھا رکھنے کے لیے خدمت کی نہیں دھونس کی ضرورت ہوتی ہے فلموں اور افسانوں کی ہیروئن کی طرح زیادہ پتی ورتا بننے کی ضرورت نہیں ہے صاف صاف بتاؤ وہاں سب تمہارے ساتھ ٹھیک تو نہیں نا۔" رومیلہ بری طرح زچ ہو گئی ان کی باتوں پر۔
"میں کوئی ہیروئن نہیں بن رہی ہوں۔ اگر کوئی بات ہو گی تو میں آپ کو بتا دوں گی لگتا تو نہیں کہ آپ کو میری اتنی فکر ہے لیکن اگر آپ یہ سب میری خاطر کر رہے ہیں تو بھی میری باتیں چھپ کر سننے کی ضرورت نہیں ہے۔"
رومیلہ غصے میں کہہ تو گئی مگر ابرار کو چونکتا دیکھ کر اسے احساس ہوا اسے اس طرح نہیں کہنا چاہیے تھا۔
"الیان دو تین گھنٹے میں آجائیں گے میں تھوڑا آرام کرنا چاہتی ہوں۔" رومیلہ نے صرف اور صرف انہیں یہاں سے ہٹانے کے لیے کہا تو وہ بھی بغیر کچھ کہے کمرے سے نکل گئے۔
البتہ رومیلہ ان کے پیچھے دروازے کو ایسے دیکھتی رہی جیسے ان کے رویے تو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔
"آج کل لوگوں کو سیدھا رکھنے کے لیے خدمت کی نہیں دھونس کی ضرورت ہوتی ہے۔" ابرار بھائی کی کہی بات کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجنے لگی تو اس کا ذہن جانے کس ادھیڑ بن میں لگ گیا مگر کوئی سرا ہاتھ نہ آنے پر صرف ایک سوال اس کے ذہن میں ابھرا تھا۔
"کہیں اس شادی کے لیے ابرار بھائی نے کوئی دھونس پر مبنی ہتھکنڈا تو نہیں اپنایا؟"
اس سوال کا جواب تو اسے نہیں ملا البتہ دو گھنٹے بعد جب الیان اسے لینے آیا تو وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ کزنز جو کہ بریرہ کے سسرالی بھی تھے وہ بھی تشریف لائے تھے۔
حالانکہ رومیلہ سوچ رہی تھی کہ الیان اکیلا آئے گا تو وہ اس کے اور ابرار بھائی کے بیچ ہونے والی گفتگو سے ان کے تعلقات کو پرکھنے کی کوشش کرے گی مگر شاہد اور نوید کی موجودگی میں ایسی نوبت ہی نہیں آئی کہ الیان یا ابرار کو ایک دوسرے سے بات کرنی پڑتی۔
پھر وہ سب بیٹھے بھی بہت مختصر سے وقت کے لیے تھے شاہد اور نوید کو کچھ شاپنگ کرنی تھی شام تک وہ سب گاؤں کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔
الیان ان کے ساتھ ہی کہیں سے آ رہا تھا کہ راستے سے رومیلہ لے کر گھر پر ڈراپ کرے گا اور ایک بار پھر ان لوگوں کے ساتھ نکل جائے گا۔
اب یہ سب سچائی تھی یا وہ واقعی کترا رہا تھا زیادہ دیر یہاں رکنے سے رومیلہ سمجھ نہ سکی۔
البتہ بابا جانی ضرور سمجھ گئے تھے۔ کیونکہ آج الیان نے انہیں سلام کرنے کے بعد بڑے ہی رسمی سے انداز میں ان کی خیریت بھی پوچھی تھی لیکن کیونکہ بابا جانی اتنی بھی امید نہیں کر رہے تھے اس لیے وہ سمجھ گئے کہ ابرار نے انہیں دھمکایا ہے، جو یہ تبدیلی دیکھنے کو مل رہی ہے ورنہ شادی اور ولیمے والے دن تو الیان نے اتنی بھی بات

نہیں کی تھی البتہ جب ابرار' ریاض غفار کے ساتھ کھڑا کچھ گفتگو کرتا نظر آیا اس کے بعد ریاض غفار خاص طور پر ان کے پاس آ کر ان کی خیر خیریت پوچھنے لگے تھے اور یہ اچانک ان کے رویے میں اتنا تغیر دیکھ کر وہ اسی وقت مشکوک نظروں سے ابرار کو دیکھنے لگے تھے جانے اب اس نے کیا کہہ کر ان لوگوں کو پریشان کیا ہو گا۔
بابا جانی تو مارے شرمندگی کے سر نہیں اٹھا پا رہے تھے اسی لیے انہوں نے الیان یا اس کے کزنز کو چائے پر روکنے کے لیے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا اور ایک ہی دفعہ اجازت مانگنے پر الوداع کر دیا۔
البتہ رومیلہ کو انہوں نے سینے سے لگا کر ہمیشہ خوش رہنے کی دعائیں دی تھیں رومیلہ ان کا یکسر بدلا انداز دیکھ کر یہی سمجھی تھی کہ وہ بریرہ کے ولیمے میں شرکت کرنے اتنی دور جا رہی ہے اسی لیے وہ جذباتی ہو رہے ہیں۔
حالانکہ وہ تو اس کی اس شادی کو لے کر فکر مند تھے دھمکیوں پر مبنی یہ زبردستی کا رشتہ کب تک چلے گا اور اگر چلے گا بھی تو کیا رومیلہ کو خبر نہیں ہو گی کہ اس شادی کے پیچھے کون سے عوامل کار فرما تھے تب اس پر کیا بیتے گی۔

☼ ☼ ☼

زوبیہ نے یونیورسٹی کے گیٹ پر پہنچ کر جیسے ہی خرم کو فون کیا خرم اسٹال پر ہی آدھی کھائی چاٹ چھوڑ کر اسے لینے چل پڑا۔
ہارون وغیرہ نے پوچھا بھی کہ وہ کہاں جا رہا ہے مگر خرم نے کچھ بھی نہیں بتایا اور صرف مسکرا کر۔
"دیکھتے جاؤ۔" کہا اور چلا گیا زوبیہ کے ڈرائیور کو اپنی رہنمائی میں وہ پارکنگ تک لایا اور گاڑی پارک کرانے کے بعد زوبیہ اتر کر جانے لگی تو ڈرائیور پوچھنے لگا۔
"کتنا ٹائم لگے گا؟"
"بس آدھا گھنٹہ۔" زوبیہ اطمینان سے بولی تو خرم نے ٹوک دیا۔
"نہیں' نہیں آدھا گھنٹہ کہاں۔ دو گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔" زوبیہ نے حیرانی سے خرم کو دیکھا مگر خرم نظر انداز کر گیا۔
"دراصل میں گاڑی میں تھوڑا سا کام کرانا ہے اگر دو گھنٹے لگنے ہیں تو میں ابھی کرا لیتا ہوں۔" ڈرائیور نے کہا۔
"ہاں ہاں جاؤ۔ جا کر آرام سے کرو۔" زوبیہ سے پہلے خرم نے فراخ دلی سے اجازت دے دی۔
زوبیہ صرف خرم کو دیکھ کر رہ گئی اب بھلا وہ کیا بولتی وہ تو پہلے ہی گھبرائی ہوئی تھی۔

اس طرح جھوٹ بول کر یونیورسٹی آنا پہلے ہی اسے بہت عجیب اور نامناسب لگ رہا تھا اس پر دو گھنٹے بعد واپسی کا سن کر اسے اپنا آنا کچھ غلط لگنے لگا تھا ڈرائیور خرم کی اجازت پر ایسے گاڑی اسٹارٹ کر کے نکل گیا جیسے خرم کا ہی ملازم ہو۔

"آؤ نا۔" زوبیہ دھول اڑاتی گاڑی کو دیکھ رہی تھی جب خرم نے ٹوکا اور اس کے چہرے پر لکھے سوال کا خود ہی جواب دیتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں تمہیں فوراً" اسٹور روم میں لے جا کر تصویر دکھا دیتا لیکن کیا کروں اسٹور روم ابھی بند ہے جن اسٹوڈنٹس کو سامان نکالنے کے لیے چابی دی گئی تھی وہ اسٹال کی کچھ چیزیں وغیرہ لینے گئے ہیں ان کو آنے میں آدھا پون گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا۔" زوبیہ کے چہرے پر الجھن پھیلتی دیکھ کر خرم نے بظاہر بڑے مودب انداز میں کہا۔

"آپ آدھا پون گھنٹے کے لیے اگر کہیں جانا چاہتی ہیں تو چلی جائیں اور ڈرائیور کو فون کر کے بلا لیں ورنہ اس سے بہتر آپشن یہ ہے کہ آپ کچھ دیر اسٹالز وغیرہ گھوم لیں تھوڑا سا وقت بھی گزر جائے گا اور دیکھنے والوں کو یہی لگے گا کہ آپ فیسٹیول دیکھنے آئی ہیں۔ اصل میں جن اسٹوڈنٹس سے میں چابی لے رہا ہوں انہیں بھی یہ نہیں بتایا کہ میں اندر کیوں جانا چاہتا ہوں ایسی باتوں پر کوئی یقین نہیں کرتا اور الٹا دوسرے کی ذہنی حالت پر شک کرنے لگتے ہیں اس لیے میں کسی کو کچھ بتاتا ہی نہیں۔" زوبیہ کے چہرے کے تاثرات بدلتے ہوئے خرم نے واضح طور پر دیکھے۔

اس کے چہرے پر پھیلی الجھن میں خاطر خواہ کمی آگئی تھی خرم کو یہ تو علم تھا کہ اس کا نفسیاتی علاج چل رہا ہے یقیناً" اس نے "تم پاگل ہو" اور "تمہارا دماغ خراب ہے" جیسے جملے ضرور سنے ہوں گے لہٰذا اس نے ایسی بات کہی جو سیدھی زوبیہ کے دل کو لگی اور واقعی تھوڑی دیر بعد وہ پہلے سے قدرے بہتر انداز میں مگر ہنوز نروس سی خرم کے ساتھ فیسٹیول میں داخل ہو گئی۔

خرم کو ایک انجان اور ایک بے حد حسین لڑکی کے ساتھ دیکھ کر ہر نظر جو اس پر اٹھی وہ اس پر ٹک گئی سب کو حیران اور متجسس دیکھ کر خرم کے لبوں پر خود بخود مسکراہٹ ابھرنے لگی۔

وہ اس طرح لڑکیوں کے پیچھے پھرنے والے لڑکوں میں سے نہیں تھا اس کا تاثر کافی مضبوط کردار کے حامل شخص کا تھا یہاں تک کہ نمل سے منگنی ہو جانے کے باوجود وہ اس کے ساتھ بھی لوبرڈز کی طرح نہیں رہا تھا۔

ایسے میں اس کا کسی لڑکی کے ساتھ ہونا ایک اچنبھے والی بات تو تھی اور پھر لڑکی بھی وہ جو اس یونیورسٹی میں بھی دیکھی نہیں گئی اور جس کا حسن بھی ایسا ملکوتی کہ دیکھنے والا مجسمہ بن جانے پر مجبور ہو جائے پھر اگر لوگ متوجہ نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔

خرم اسے اسٹالز دکھاتا بلا آخر وہاں تک پہنچ گیا جہاں نمل اور سنبل کتابوں کے اسٹال پر کھڑی ورق گردانی کر رہی تھیں۔

"زوبیہ تمہیں ریڈنگ کا شوق ہے کیا؟" خرم ایسے بولا تھا جیسے بہت پرانی بے تکلفی ہو نمل اور سنبل دونوں نے ہی چونک کر انہیں دیکھا تھا۔

سنبل کی تو منہ اور آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں جبکہ نمل ایک ہی نظر میں خرم کے چہرے پر پھیلے تفاخر کو دیکھ پل میں اپنی حیرت چھپا گئی تھی۔

اسے کون سا شاک لگا تھا خرم کو کسی کے ساتھ دیکھ کر جو اسے اپنے تاثرات چھپانے میں وقت ہوتی البتہ اسے حیرت زوبیہ کو دیکھ کر ہوئی تھی اگر کوئی اور ہوتی تو یہ ذرا سی حیرانی بھی اس کے حصے میں نہ آتی۔

"نہ ...... نہیں۔" زوبیہ کا انداز صاف ٹالنے والا تھا وہ خرم کی رہنمائی میں چلی جا رہی تھی خرم کو اسٹال پر رکتا

دیکھ کر وہ بھی مجبوراً" ٹھہر گئی تھی۔

ورنہ اسے تو کچھ لینا تھا نہ ہی دیکھنا تھا بلکہ جس طرح لوگ اسے دیکھ رہے تھے اسے محسوس کر کے اس کی فطری گھبراہٹ ایک بار پھر اس پر حاوی ہونا شروع ہو گئی تھی اس نے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑی نمل اور سنبل کی طرف نہیں دیکھا تھا اس کا سر اور نظریں دونوں جھکی ہوئی تھیں۔

مگر تب بھی اسے بخوبی علم تھا کہ سامنے دو لڑکیاں کھڑی ہیں جو پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہیں۔

"ارے دیکھو یہاں بہت اچھا اسٹاک ہے خاص طور پر شاعری کا کلیکشن عین تمہاری پسند کے مطابق ہے۔" خرم نے کتابوں کے اس جانب آتے ہوئے کہا جہاں نمل کھڑی تھی اس کے ہاتھ میں "نسخہ ہائے وفا" دیکھ کر خرم دلچسپی سے مسکرا دیا۔

"اپنے فیورٹ شاعر کی کتاب لیے بغیر اس اسٹال سے آگے بڑھ جانا تو زیادتی ہوگی یار۔" خرم نے نمل کے ہاتھ سے کتاب ایسے لے لی جیسے نمل گاہک نہ ہو بلکہ ان کے انتظار میں کتاب لیے کھڑی ہو کہ آئیں اور دیکھیں۔

زوبیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا کہے خرم نے اتنے یقین سے اس کے شاعری کے شوقین ہونے کی بات کی تھی کہ وہ بس بولنے والی تھی کہ مجھے شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں۔

لیکن نمل پر نظر پڑتے ہی اس کی ساری توجہ اس کی جانب مبذول ہو گئی۔

اسے بالکل یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ اور نمل ایک ہی اسکول میں پڑھتی تھیں وہ تو بس یہ سوچے جا رہی تھی کہ یہ چہرہ اتنا دیکھا ہوا کیوں لگ رہا ہے۔

اصل میں اسکول میں بھی وہ ایسے ہی گم سم اور تنہائی پسند تھی اپنے آپ میں مگن رہنے والی کو بھلا کیا پتا کہ اسکول میں اور کون کون موجود ہے اسے تو شکلیں کبھی یاد نہیں رہتی تھیں نام تو پھر بہت دور کی بات تھی۔

نمل، خرم کے اس طرح کتاب لے لینے پر بالکل جامد تاثرات کے ساتھ اسے دیکھتی رہی جبکہ وہ زوبیہ کی طرف پلٹ چکا تھا۔

"میں یہ تمہارے لیے لے رہا ہوں اور اب تم انکار نہیں کرو گی۔" خرم زوبیہ کے تاثرات کی پروا کیے بغیر صرف نمل کو سنانے کے لیے بول رہا تھا اصل میں اسے زوبیہ کی فطرت کا اتنا اندازہ تھا کہ وہ اتنی خود اعتماد نہیں کہ

خرم کو اس اچانک کی بے تکلفی پر جھڑک سکے۔
پھر وہ جس مقصد کے تحت اسے لایا تھا اگر وہی پورا نہیں ہوتا تو کیا ضرورت تھی اتنی مغز ماری کی۔
خرم نے اس کتاب کی قیمت ادا کر کے زوبیہ کی طرف بڑھا دی۔
"میں نے کہا ہے نا تم انکار نہیں کرو گی۔ چلو آؤ دوسرے اسٹالز پر چلتے ہیں یہاں اب اور کچھ بچا نہیں ہے۔"
خرم نے ایک نظر نمل پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا زوبیہ بے بسی سے ہاتھ میں زبردستی تھمائی کتاب کو دیکھنے لگی پھر نمل اور سنبل کی نظریں خود پر جمی دیکھ کر فرار ہونے والے انداز میں خرم کے پیچھے چل پڑی۔
"یہ خرم کیا کر رہا ہے؟" سنبل نے جیسے ہوش میں آتے ہوئے کہا۔
"وہی جو میں نے رومیلہ کی شادی میں کیا تھا۔" نمل نے بالکل بے تاثر لہجے میں کہا البتہ اس کی نظریں ابھی بھی زوبیہ کی پشت پر جمی تھیں۔
"لیکن تمہارے مقابلے میں سمیر تھا۔ یہاں زوبیہ ہے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔" سنبل نے جرح کی۔
"اس سے خرم کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔" نمل اب بھی سپاٹ لہجے میں بولی تو سنبل چڑ گئی۔
"لیکن مجھے پڑتا ہے اور یہ سب تمہاری اسٹوپڈ حرکتوں کی وجہ سے ہو رہا ہے اب تمہیں ہی اس مسئلے کو حل کرنا ہوگا۔"
"حل تو میں نہیں کر سکتی لیکن زوبیہ کو ایک بار ضرور سمجھاؤں گی۔ آگے اس کی قسمت۔" نمل نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔
زوبیہ' خرم کے پیچھے کتابوں والے اسٹال سے باہر تو نکل آئی لیکن اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ آس پاس موجود زیادہ تر لوگ ان دونوں کی طرف ہی متوجہ ہیں اسی لیے زوبیہ کے گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا وہ خرم کے پیچھے بھاگنے والے انداز میں چل رہی تھی۔
وہ خرم سے کہنا چاہتی تھی کہ جلدی سے اسے اسٹور روم دکھا دے وہ اپنے ڈرائیور کو فون کر کے بلا رہی ہے اب وہ یہاں نہیں رک سکتی۔
مگر خرم تو آگے ہی آگے سیٹی پر شوخ سی دھن بجائے ایسے گھوم رہا تھا جیسے جانے کون سا خزانہ مل گیا ہو۔
اچانک زوبیہ کو اس پر شدید غصہ آ گیا قریب تھا وہ چیخ کر اسے پکار بیٹھتی کہ اچانک اس کی نظریں سامنے کی جانب اٹھیں اور جامد ہو گئیں۔
اسے عموماً شائستہ خالہ کا سایہ اس طرح دن دھاڑے گھر سے باہر کبھی نظر نہیں آیا تھا مگر آج وہ اس سے کافی فاصلے پر اپنی پوری ہیبت کے ساتھ کھڑی تھیں۔
ان کے سوکھے بکھرے بال ہوا کے دوش پر ادھر ادھر اڑ رہے تھے ان کا کٹا پٹا چہرہ خون خون ہو رہا تھا۔
زوبیہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی اس کا حلق اتنا سوکھ گیا تھا کہ آواز بھی نہیں نکل رہی تھی ورنہ اس کا شدت سے دل چاہا خرم کو پکار کر پوچھے کیا اسے شائستہ خالہ کا سایہ نظر آ رہا ہے مگر وہ کیا پکارتی اس کی تو حالت غیر ہونے لگی تھی۔
کیونکہ شائستہ خالہ ایک لڑکے کے پاس کھڑی اسے ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے ابھی اس پر حملہ کر دیں گی اور پھر واقعی شائستہ خالہ نے دونوں ہاتھ اس لڑکے کی گردن کی طرف اٹھا دیے۔
اس سے پہلے کہ اس لڑکے کی گردن شائستہ خالہ کی گرفت میں آتی زوبیہ پوری قوت سے چیخ پڑی۔
(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

شعاع محمود

کرن کرن خوشبو

جنت کی ضمانت

ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عرض کیا۔
"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایسا عمل بتائیں جو مجھے جنت میں داخل کر دے۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اللہ کی عبادت کرو' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ' نماز قائم کرو' زکوۃ ادا کرو' رشتے داروں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔"
ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ۔
"قیامت کے دن میرے زیادہ قریب اور زیادہ محبوب تم میں سے وہ ہوں گے جو اخلاق میں بہتر ہوں گے اور مجھ سے زیادہ دور اور زیادہ ناپسندیدہ وہ ہوں گے جو تم سے اخلاق میں برے ہوں گے۔ جن کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے اور جو منہ پھلا کر تکلف سے (یعنی متکبرانہ انداز میں) باتیں کرتے ہیں۔"
(صحیح بخاری)
الماس علی۔۔۔۔ کراچی

ایمان سے خالی دل

ایک یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی محفل میں آیا اور کہا۔
"ہماری عبادت اللہ کو زیادہ پسند ہے کیونکہ جب ہم عبادت کرتے ہیں تو ہمیں کوئی خیال' وسوسہ نہیں آتا۔ جبکہ میں نے سنا ہے تم لوگ نماز پڑھتے ہو تو بہت سے خیالات تمہارے دل میں آتے ہیں۔"
آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس یہودی کی بات کا جواب دینے کا اشارہ کیا۔
آپ رضی اللہ نے یہودی سے کہا۔
"دو گھر ہیں ایک خالی ہے دوسرا گھر ہیروں سے بھرا ہے۔ اب بتاؤ چور کس مکان میں جائے گا؟" یہودی بولا۔
"ہیروں والے مکان میں۔"
آپ رضی اللہ عنہ نے مسکرا کر جواب دیا۔
"یہ حال کافر اور مسلمان کے دل کا ہے۔ جس کا دل پہلے ہی ایمان سے خالی ہو وہاں شیطان کیا لینے جائے گا؟"
امبر آصف۔۔۔۔ کراچی

صدقہ

"اگر تم دنیا کی مفلسی سے تنگ آ جاؤ اور رزق کا کوئی راستہ نہ نکلے تو صدقہ دے کر اللہ سے تجارت کر لو۔"
افشاں۔۔۔۔ لاہور

اقوال زریں

☆ اولاد کے لیے کچھ مت چھوڑو اگر وہ صالحہ ہوگی تو خدا خود کفیل کر دے گا اور اگر بد ہوگی تو گناہوں میں ان کی امداد کا مجرم نہ ہو۔ (عمر بن عبدالعزیزؒ)
☆ ہماری توبہ بھی توبہ کی محتاج ہے کیونکہ اس میں خلوص نہیں ہوتا (رابعہ بصریؒ)
☆ دین کی اصل عقل' عقل کی اصل علم اور علم کی اصل عمل ہے اور بغیر عمل کے بہشت کی طلب کرنا خود ایک گناہ ہے۔
☆ دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے۔ (حدیث)

☆ جو مسکین کی فریاد سن کر کان بند کر لیتا ہے وہ خود بھی فریاد کرے تو اس کی فریاد نہ سنی جائے گی۔ (حضرت سلیمان علیہ السلام)

☆ کفار کے ساتھ جہاد کرنا جہاد اصغر ہے اور اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا جہاد اکبر ہے۔ (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ)

☆ تعجب ہے اس پر جو موت کو برحق جانتا ہے اور پھر بھی ہنستا ہے۔ (حضرت عثمانؓ)

☆ گناہوں پر نادم ہونا انہیں مٹا دیتا ہے اور نیکیوں پر مغرور ہونا انہیں مٹا دیتا ہے۔ (حضرت علی رضی اللہ عنہ)

عائشہ مری۔۔۔ کوئٹہ

بیٹی

○ جب کوئی لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "اے لڑکی! تو زمین پر اتر میں تیرے باپ کی مدد کروں گا۔"

○ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ "عورت کے لیے یہ بہت مبارک ہے کہ اس کی پہلی اولاد بیٹی ہو۔"

○ "جس شخص کی بیٹیاں ہوں، اسے برا نہ سمجھو۔ اس لیے کہ میں بھی بیٹیوں کا باپ ہوں۔"

○ ایک مفکر کا کہنا ہے کہ میرا بیٹا اس وقت تک میرا ہے، جب تک اس کی شادی نہیں ہو جاتی لیکن میری بیٹی مرتے دم تک میری بیٹی رہتی ہے۔

ایمن۔۔۔ کراچی

غور و فکر

زندگی بار بار نہیں آتی۔ صرف ایک بار آتی ہے اور وقت سمندر کے کنارے پھیلی ہوئی ریت کی طرح ہے تم اس میں سے کتنی مٹھیاں بھر سکتے ہو ایک یا پھر دو۔ وقت تو بس پچاس یا سو برس کا ہے مگر اس سے زیادہ نہیں۔۔۔ پھر سوچو تم اس ریت کو کھا نہیں سکتے۔ زیادہ سے زیادہ تم اس ریت کو دوسروں کی آنکھوں میں جھونک سکتے ہو اور بہت سے لوگ اپنی زندگی میں ایسا کرتے ہیں۔ وہ لوگ ظالم ہوتے ہیں۔ پھر کچھ لوگ جو اس ریت کو دوسروں کی آنکھوں میں ڈالنے کی بجائے اپنی آنکھوں میں ڈال لیتے ہیں۔ وہ لوگ بزدل اور اذیت پسند ہوتے ہیں۔

کچھ لوگ اس ریت سے محل بناتے ہیں۔ وہ لوگ احمق ہوتے ہیں کچھ لوگ نہایت احتیاط سے ریت کے ایک ایک ذرے کو گننے لگتے ہیں۔ وہ اس دنیا کے کنجوس ہیں۔ کچھ لوگ اس ریت کو اپنے سر پر ڈال لیتے ہیں اور ہنسنے لگتے ہیں۔ وہ لوگ اس دنیا کے بچے ہیں اور دنیا کی ساری معصومیت انہی کے نام سے قائم ہے۔

"وہ کچھ بھی ہو۔" اس نے سوچا۔

"میں بچہ ہی بنوں گا۔" اور وہ ساحل کی ریت سے گھر کی طرف چل پڑا

(کرشن چندر کی کتاب "باون پتے" سے اقتباس)

ریحانہ۔۔۔ کراچی

کچھ لوگ

کیسے چپ چاپ ہی مر جاتے ہیں کچھ لوگ یہاں
جسم کی ٹھنڈی سی
تاریک سیاہ قبر کے اندر
نہ کسی سانس کی آواز نہ سسکی کوئی
نہ کوئی آہ نہ جنبش نہ ہی آہٹ کوئی
ایسے چپ چاپ ہی مر جاتے ہیں کچھ لوگ یہاں
ان کو دفنانے کی زحمت بھی اٹھانا نہیں پڑتی

(گلزار)

ارم آفتاب۔ کراچی

سرگوشی

تمہاری آنکھوں کے سرخ ڈورے
وہ بات کہنے کے منتظر ہیں
جو تم نے اب تک کہی نہیں ہے
مگر تمہیں کچھ خبر نہیں ہے

تمہارا چہرہ اک آئینہ ہے
کہ جس پہ لکھی
شکست دل کی عبارتوں نے
بہت سی باتوں کو بن کہے بھی
ہماری آنکھوں سے کہہ دیا ہے

(خالد معین)

صدف عبداللہ۔ لاہور

گرفتار عشق

○ بوجھ میں اگر محبت نہ ہو تو وہ بے شک ایک تنکے کا ہو برداشت نہیں ہوتا۔

○ پہاڑوں کے اندر جاتے ہی انسانی انا سب سے پہلے دم توڑتی ہے۔ اور انسان قدرت کے آگے اپاہج ہو جاتا ہے۔

○ جتنے بھی تلخ ذائقے ہوتے ہیں بے شک کافی ہو چاکلیٹ یا پھر زندگی ہو ان کے لیے ذوق کی پرورش کرنا پڑتی ہے۔

○ برے کام اس لیے برے نہیں کہ وہ ممنوع ہیں بلکہ ممنوع اس لیے ہیں کہ وہ مضر ہیں۔

○ اعتماد پربت کا پتھر ہے لیکن اگر یہ ایک بار اکھڑ جائے نیچے ہی آتا ہے۔

فوزیہ ثمریٹ۔۔۔ گجرات

خاموشی کی بات

جس سے آپ بہت پیار کرتے ہیں۔ اس سے کم بات کریں۔ کیونکہ جو آپ کی خاموشی نہیں سمجھ سکتا وہ گفتگو بھی نہیں سمجھے گا۔

(جان کیٹس)

شافعہ اعوان۔۔۔ کراچی

کیا معلوم

نہ کچھ فنا کی خبر ہے نہ ہے بقا معلوم
بس ایک بے خبری ہے سو وہ بھی کیا معلوم
ہجوم شوق میں اب کیا کہوں، کیا نہ کہوں
مجھے تو خود بھی نہیں اپنا مدعا معلوم

ثمریٹ۔۔۔ گجرات

وصال و ہجر

وصال و ہجر سے وابستہ تہمتیں بھی گئیں
وہ فاصلے بھی گئے، اب وہ قربتیں بھی گئیں
دلوں کا حال تو یہ ہے کہ ربط ہے نہ گریز
محبتیں تو گئی تھیں، عداوتیں بھی گئیں

ذکیہ خان۔۔۔ کراچی

دکھ

اللہ تعالیٰ جس کو اپنا آپ یاد دلانا چاہتا ہے اسے دکھ کا الیکٹرک شاک دے کر اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے دکھ کی بھٹی سے نکل کر انسان دوسروں کے لیے نرم پڑ جاتا ہے۔

پھر اس سے نیک اعمال خود بہ خود اور باخوشی سرزد ہونے لگتے ہیں۔ دکھ تو روحانیت کی سیڑھی ہے اس پر صابر و شاکر ہی چڑھ سکتے ہیں۔

(بانو قدسیہ کی کتاب "دست بستہ" سے انتخاب)

نوشین اقبال نوشی۔۔۔ گاؤں بدر مرجان

محبت اور جنگ

ایک دفعہ ایک سپاہی نے ٹیپو سلطان سے کہا۔ "کیا محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔"

ٹیپو سلطان نے تاریخ ساز جواب دیتے ہوئے کہا۔ "یہ انگریزوں کا قول ہے ہم تو یہ کہتے ہیں کہ محبت اور جنگ میں جو کچھ ہو وہ جائز ہو۔"

فوزیہ ثمریٹ۔۔۔ گجرات

فرمائش

ہوائی جہاز میں پہلی مرتبہ سفر کرنے والے ایک صاحب کو الٹیاں آ رہی تھیں۔ آخر ائیر ہوسٹس ان کے قریب آئی اور ہمدردانہ لہجے میں بولی۔

"سر آپ کے لیے کچھ لاؤں۔"

"ہاں۔" ان صاحب نے ہانپتے اور کراہتے ہوئے جواب دیا۔

"میرے لیے ایک ایئرپورٹ لے آؤ۔"

ہانیہ عمران۔۔۔۔ گجرات

اقوال زریں

○ جو لوگ مطالعہ نہیں کرتے ان کے پاس سوچنے کو بہت کم باتیں ہوتی ہیں۔

○ قدرت کو زبان کی سختی پسند نہیں' اس لیے اس میں ہڈی نہیں۔

○ محنتی کا ہاتھ اسے کبھی نہ کبھی دولت مند بنا دیتا ہے۔

○ دلوں کو فتح کرنے کے لیے تلوار کی نہیں عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔

○ غموں کو چھپا کے چہرے پر (خوشی) مسکراہٹ سجائے رکھنا عظمت ہے۔

○ پاکیزگی انبیاء کی صفات میں سے ہے۔

○ مومن زندگی سے فائدہ اٹھاتا ہے اور کافی مختصر سی لذت سے خوش رہتا ہے۔

صفیہ صبا۔۔۔۔ کراچی

تین اشعار

کاش آزاد قبیلے کے سخن ور ہوتے
ہم محاذوں پہ نہ بکتے تو سکندر ہوتے
خود فریبی کے خرابوں میں رہے ہم ورنہ
اپنی اوقات میں رہتے تو قلندر ہوتے
موج کوثر کی قسم ہم تھے محبت کے ولی
خاک کے در پہ نہ جھکتے تو سمندر ہوتے

نوشی۔۔۔۔ گاؤں بدر مرجان

یادیں

بس یہی مشکل ہے کہ بھول جانا انسان کے بس میں نہیں۔۔۔ جو حادثہ ایک دفعہ گزر جائے' وہ یاد بن کے بار بار گزرتا ہے۔ بھولنے کی کوشش ہی اسے زندہ رکھتی ہے۔ انسان ظالم کو معاف کر سکتا ہے' لیکن اس کے ظلم کو بھول نہیں سکتا۔ بھول جانا انسان کے اختیار میں نہیں۔

موسم گزر جاتے ہیں لیکن یاد نہیں گزرتی۔ مرحوم زمانوں کی یاد مرحوم نہیں ہوتی۔ پرانے چہرے نئے چہروں میں نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پرانے غم نئے غم میں شامل نظر آتے ہیں۔

پرانی یاد نئی زندگی کے ساتھ چلتی ہے۔ تہ در تہ یاد انسان کے اندر ہمیشہ محفوظ رہتی ہے۔ یاد سے نجات کی کوشش دلدل سے نجات کی کوشش کی طرح رائیگاں ہو جاتی ہے۔

(واصف علی واصف کی کتاب "دل دریا سمندر" سے اقتباس۔)

فرزانہ مسعود۔۔۔۔ خوشاب

خشک چشمے

☆ لوگوں پر جو بھی بلا نازل ہوتی ہے وہ آنکھ کے سبب سے ہوتی ہے' نعمت و مصیبت دونوں آنکھ میں رکھ دی گئی ہیں۔

☆ جو نیک بخت ہیں وہ ماں کے شکم ہی سے نیک بخت پیدا ہوتے ہیں اور جو بد بخت ہیں وہ بھی اس کے شکم ہی سے بد بخت نکلتے ہیں۔

☆ شریف' پارسا ہو جاتا ہے تو تواضع اختیار کرتا ہے۔ کمینہ' پارسا ہو جاتا ہے تو تکبر اختیار کرتا ہے۔

☆ دل آنکھ کی تابع ہے' آنکھ کے بگڑنے کے بعد دل کی حفاظت مشکل ہے' اور دل کے بگڑنے کے بعد شرم گاہ کی حفاظت مشکل تر ہے۔

☆ اگر کسی نے تیرے ایذا کے لیے راہ میں کانٹے بکھیر دیے ہیں تو تو اس کے راستے میں انتقاماً" کانٹے نہ رکھ' ورنہ دنیا میں ہر طرف کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے۔

☆ اپنی حاجت پر دوسروں کی حاجت کو مقدم رکھنا ہی حقیقی کرم ہے۔

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے سے

شہر بانو' کی ڈائری میں تحریر

انور شعور کی غزل

بہت دن رہ لیے ناراض اب من جائیں ہم دونوں
چلو اک بار پھر سے آشنا بن جائیں ہم دونوں

یہاں والوں کی آنکھوں میں حیا ہو یا مروت ہو
تو آخر کیوں یہ بستی چھوڑ کے بن جائیں ہم دونوں

کسی ہوٹل میں چل کر سوچتے ہیں شام کی بابت
گزاریں وقت ساحل پر کہ گلشن جائیں ہم دونوں

یہاں ہونا نہیں کافی یہاں بننا ہی پڑتا ہے
چلو اک دوسرے کے کچھ نہ کچھ بن جائیں ہم دونوں

یہیں کچھ دور واقع ہے ہمارے پیارے کا مدفن
اگر دے زندگی فرصت تو مدفن جائیں ہم دونوں

شعور اس بھیڑ میں رستہ ملے تو بھیڑ سے باہر
عجب سا اک نشیمن ہے' نشیمن جائیں ہم دونوں

سدرہ وزیر' کی ڈائری میں تحریر

سرشار صدیقی کی نظم

دل دریا'

لوگوں نے کہا
اس در سے کبھی
کوئی نا امید نہیں لوٹا
کوئی خالی ہاتھ نہیں آیا
میں بھی لوگوں کے ساتھ چلا
چہرے پر گرد ملال لیے
اک پیرا امید خیال لیے
اک خالی دست سوال لیے
جب قافلہ اس در پر پہنچا

میں اس گھر کو پہچان گیا
پھر خالی ہاتھ ہی لوٹ آیا
اس در سے مجھے کیا ملنا تھا
وہ گھر تو میرا ہی اپنا ہے

صدف سلیمان' کی ڈائری میں تحریر

وفا چشتی کی غزل

جہان لمحۂ سر بستر کے حصار میں ہوں
میں زندگی ہوں مگر ہیبت غبار میں ہوں

خود آگہی کے زمان و مکاں سے گزرا ہوں
وجود ذات کے دریائے بے کنار میں ہوں

بدن کی راکھ میں پھر انگلیاں گڑو لی ہیں
شرار زیست کو چھونے کے اضطرار میں ہوں

شکستگی کے مسلسل عمل سے ہوں دوچار
میں ادنقاد کے پس پردہ انتشار میں ہوں

تلاش میں ہوں کہ ہاتھ آئے قدرتِ تسخیر
حریفِ وقت ہوں اور پیکرِ نزار میں ہوں

نجانے کتنے ہی آدرش ہو گئے معدوم
مری بساط ہی کیا ہے میں کس قطار میں ہوں

پسِ وجود ہوں، نا منکشف وفا جستی
کسی نگاہِ تصرف کے انتظار میں ہوں

زینب احسن رحمان، کی ڈائری میں تحریر
اجمل سراج کی غزل

اور تو خیر کیا رہ گیا
ہاں مگر اک خلا رہ گیا

غم سبھی دل سے رخصت ہوئے
دردِ بے انتہا رہ گیا

زخم سب مندمل ہو گئے
اک دریچہ کھلا رہ گیا

رنگ جانے کہاں اڑ گئے
صرف اک داغ سا رہ گیا

آرزوؤں کا مرکز تھا دل
حسرتوں سے گھرا رہ گیا

زندگی سے تعلق مرا
ٹوٹ کر بھی جڑا رہ گیا

کس کو چھوڑا خزاں نے مگر
زخمِ دل کا ہرا رہ گیا

کام اجمل بہت تھے ہمیں
ہاتھ دل پر دھرا رہ گیا

ارم آفتاب، کی ڈائری میں تحریر
خالد معین کی نظم

مکالمہ،

تم ایسی صبحوں، تم ایسی شاموں میں
اپنے گھر سے کبھی نہ نکلو
کہ جب ہوائیں
سپردگی سے نہال ہو کر
تمہارے پہلو میں ڈولتی ہوں
تمہارے آنچل سے کھیلتی ہوں
تم ایسی صبحوں، تم ایسی شاموں میں
اپنے گھر سے کبھی نہ نکلو
کہ جب ہوائیں
اداس لہجے میں تم سے پوچھیں
تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا
تمہارے چہرے پہ کیا لکھا ہے
تمہارے اٹھتے ہوئے قدم پر
یہ لڑکھڑاہٹ سی کس لیے ہے
تم ایسی صبحوں، تم ایسی شاموں میں
اپنے گھر سے کبھی نہ نکلو
کہ جب ہوائیں
بدلتے موسم کی سازشوں میں شریک ہو کر
تمہارے جی میں غلط بیانی کا زہر گھولیں
تمہارے بارے میں جھوٹ بولیں
سنو اے پیاری سی، سانولی سی ہٹیلی لڑکی!
یہی ہوائیں تو آتے جاتے مسافرانِ رہ وفا پر
ہزار تہمت اچھالتی ہیں
محبتوں پر یقین نہ ہو تو
دلوں میں پیہم
ہزاروں واہموں کو ڈالتی ہیں
تم ایسی صبحوں، تم ایسی شاموں میں
اپنے گھر سے کبھی نہ نکلو
کہ جب ہوائیں ... !

شگفتہ سلیمان

مجھے یہ شعر پسند ہے

راحیلہ ـــــــ کراچی
اب تو ڈر ہے مجھے کہ غم تیرا
تجھ سے بھی معتبر نہ ہو جائے

امبر ـــــــ لاہور
دو چار سوالات ہیں پھر مجھ کو اجازت
میں سیر کی خاطر تو فلک پر نہیں آیا

اقصیٰ ـــــــ لاہور
یہی کھلا ہے کہ مسافر نے خود کو مار کیا
تری تلاش کے صحرا کو پار کرتے ہوئے

زینب ـــــــ گوجرانوالہ
اس سمت سمیٹوں تو بکھرتا ہے ادھر سے
دکھ دیتے ہوئے یار نے دامن نہیں دیکھا

رانیہ ـــــــ کراچی
آتا ہے کون آنکھ میں آنسو کے روپ میں
اے میرے رازدار، کہاں جلتے ہو تم

گوہر ـــــــ پشاور
میں راہِ سود و زیاں سے گزرتا جاتا ہوں
کبھی گریز کبھی اختیار کرتے ہوئے
نہیں گرا مری قاتل انا کا تاج محل
میں مر گیا ہوں خود پہ وار کرتے ہوئے

کنول جبیں ـــــــ کراچی
زمیں نے کھینچ کر دل سے لگایا
اڑائی آسماں نے خاک میری
میں چپ رہتا تو بچ سکتی تھی گردن
مگر یہ فطرتِ بے باک میری

ارم ناز ـــــــ لاہور
تو جو آئے تو اسے مل کر سمیٹیں دونوں
مجھ اکیلے سے کہاں ہجر سنبھالا جائے
یہ نہ ہو آتشِ انکار کے شعلے نکلیں
میری تشکیک کو دوزخ میں نہ ڈالا جائے

فرح خان ـــــــ کراچی
کیا غضب ہے، ہجر کے دن بھی
زندگی میں شمار ہوتے ہیں

سورۃ ساند ـــــــ آر۔ وائی گاؤں
ہم دشت تھے، دریا ہم زہر تھے کرامت
ناحق تھا زعم ہم کو جب وہ نہیں تھا پیاسا

صائمہ ـــــــ مری
ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

فرزانہ ـــــــ کراچی
ایک عمر بیت چلی ہے تجھے چاہتے ہوئے
تو آج بھی بے خبر ہے کل کی طرح

صغریٰ یاسین ـــــــ کراچی
احساسِ مروت سے ناآشنا لوگ
عجیب لگتے ہیں جب محبت کی بات کرتے ہیں

فاطمہ طارق ـــــــ کراچی
ہم ہیں ظلمت میں کہ ابھرا نہیں خورشید ابھی کے
کوئی کرتا ہی نہیں رات کی تردید ابھی کے
اک زمانے سے نہ رہتے ہیں نہ جاں ترپتی ہے
دل پہ لازم ہے ترے درد کی تجدید ابھی کے

عائشہ، تحریم ـــــــ گوجرہ
رت جگے خوابِ پریشاں سے کہیں بہتر ہیں
لرز اٹھتا ہوں اگر آنکھ ذرا لگتی ہے!
اے رگِ جاں کے مکیں تو بھی کبھی غور سے سن
دل کی دھڑکن ترے قدموں کی صدا لگتی ہے

رفعت جبیں ـــــــ کوئٹہ
نگاہ پھیر کے مجھ کو برہنہ جسم نہ کر
مرے بدن پہ نظر کا لباس رہنے دے
میں تیرے وصل کی لذت کا معترف ہوں مگر
تو اپنے ہجر میں مجھ کو اداس رہنے دے

فضیلہ ______ لاہور
میں اور اس کو بھولوں ناصر کیسی باتیں کرتے ہو
صورت تو پھر صورت ہے وہ نام بھی اچھا لگتا ہے

آسیہ جاوید ______ علی پور چٹھہ
ایک صورت ہے تصور کے نہاں خانے میں
اپنی تصویر کوئی بھول گیا ہو جیسے

فرزانہ ______ کراچی
یوں تو رہتی ہے تصور میں تمہاری صورت
پھر بھی مل جاؤ تو تسکین سی ہو جائے

مہوش یوسف ______ لاہور
کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
پہلے آتی تھی ہر اک بات پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

شکیلہ ______ خانیوال
تکریم ذوق عشق کی صورت یہی تو ہے
ہنس ہنس کے تیری یاد میں آنسو بہائیں ہم

زہرہ ______ لطیف آباد
یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم
بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری

صائمہ سلیم ______ گوجرہ
سچ کہوں اپنی محبت پہ ندامت ہی ہوئی
جب بھی دیکھی تری اجڑی ہوئی صورت میں نے

ثمرین فضل میرا ______ چیچوں کی ملیاں
توڑ کر دیکھ لیا آئینہ دل تو نے
تیری صورت کے سوا اور بتا کیا نکلا

حنیفہ ______ اٹک
عمر کاٹ دی عہد نبھانے کے لیے
عہد باندھا تھا کسی نے آزمانے کے لیے
وہ بظاہر ملا تھا اک لمحے کے لیے عدیم
عمر ساری چاہیے اس کو بھلانے کے لیے

مہوش ______ اٹک
وہ درد کیا ہوا کہ مرے پاس آ گیا
خاور یہ سانحہ تو مجھے راس آ گیا

انیتا ______ اٹک
وہیں پر موسم پھر کے آ گیا ہوں
محبت ہے کہ صحرا کا سفر ہے

حنا کنول ______ حویلی لکھا
کیوں نہ ڈر جاؤں تیری قوت سے
میں ہوں تنہا، تیری خدائی ہے

کرن عدنان ______ کراچی
درد کی خوشبو گئی زخموں کی رعنائی گئی
موسم ہجراں تری اب کے پذیرائی گئی
کون سی محفل، کہاں کے روز و شب کیسا قیام
زندگی تو اصل میں اک سانس ہے آئی گئی

فوزیہ ثمر بٹ ______ گجرات
شب غم کی سحر نہیں ہوتی
ہو بھی تو میرے گھر نہیں ہوتی
زندگی تو ہی مختصر ہو جا
شب غم مختصر نہیں ہوتی

ریحانہ علی ______ کراچی
جو ہجر وصال کر دیا ہے
تو نے کمال کر دیا ہے
اک لمحہ عشق تھا سو میں نے
صرف مہ و سال کر دیا ہے

صفیہ سعدیہ ______ نامعلوم
ہر زمانے کے لیے زندہ حوالہ ہوں سلیم
میں چلا جاؤں گا، میرا تذکرہ رہ جائے گا

شکیلہ شہزادی ______ ملک وال
مجھے زعم تھا مگر میں بکھر گیا محسن
وہ ریزہ ریزہ تھا اور اپنے اختیار میں تھا

عائشہ، تحریم ______ گوجرہ
کرتے ہیں یہ ایسے عیبوں کی خامیوں کا تذکرہ
اپنے عمل میں لوگ فرشتہ ہوں جیسے

حمیرہ مہتاب ______ کراچی
گو دکھی دل کو بہت ہم نے بچایا پھر بھی
جس جگہ زخم ہوئی واں چوٹ سدا لگتی ہے

جملہ حقوق محفوظ

بارش میں بھیگتے ہوئے ایک صاحب نے دور سے ٹیکسی آتی دیکھی تو لپک کر بیچ سڑک پر کھڑے ہو کر اسے روکا' لیکن اس وقت اس کے غصے کی انتہا نہ رہی' جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے عقب سے ایک خاتون نے آگے بڑھ کر ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیور کے برابر بیٹھ گئیں۔

"یہ تو بڑی ڈھٹائی ہے۔" وہ صاحب غصے سے بولے۔

"ٹیکسی کو میں نے روکا تھا۔"

"ضرور روکا ہو گا۔" خاتون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس ڈرائیور سے شادی دو سال پہلے میں نے کی تھی۔"

خالدہ مصطفیٰ..... اسلام آباد

ایک تیر سے.....!

عابد نے شبیر سے کہا۔

"سنا ہے تمہاری منگنی زاہد صاحب کی جڑواں بیٹیوں میں سے ایک سے ہو گئی ہے؟"

"ہاں..... تم نے ٹھیک سنا ہے۔" شبیر نے تصدیق کی۔

"لیکن ان دونوں بہنوں کی شکلیں تو ایک جیسی ہیں' تمہیں ان میں امتیاز کرنے میں مشکل پیش نہیں آئی؟" عابد نے تجسس سے پوچھا۔

"میں امتیاز کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔" شبیر نے اطمینان سے جواب دیا۔

آصفہ..... کراچی

پسند کی حجامت

فوجی کمانڈر ایک سارجنٹ کے ساتھ نئے بھرتی ہونے والے جوانوں کے سامنے پہنچا۔ اس نے تعارفی تقریر شروع کی۔ چند باتوں کے بعد وہ بالوں کی حجامت کے موضوع پر آیا۔

"بالوں کے معاملے میں آپ بالکل آزاد ہیں۔" یہ سن کر لمبے بالوں والوں نے اطمینان کی سانس لی۔

کمانڈر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگ اپنی پسند کے بال رکھ سکتے ہیں' مگر ان کی لمبائی میرے بالوں سے زیادہ۔" اس نے اپنے سر سے ٹوپی اٹھا کر اپنی سو لجر کٹ دکھائی۔

"اور سارجنٹ کے بالوں سے کم نہ ہو۔" سارجنٹ نے بھی اپنی ٹوپی اٹھائی' وہ گنجا تھا۔

شافعہ..... راولپنڈی

وجہ تسمیہ

ایک صاحب نے دفتر میں اپنے ساتھی کو بتایا۔

"میرے اور میری بیوی کے درمیان پانچ ماہ بے حد خوشیوں بھرے گزرے' مگر آج سے ہمارے درمیان زوردار جھگڑے شروع ہو گئے ہیں۔" دوست نے پوچھا۔

"اس تبدیلی کی وجہ.....؟" ان صاحب نے جواب دیا۔

"وہ پانچ ماہ کے بعد آج ہی اپنے میکے سے واپس آئی ہے۔"

روبینہ ناز..... کراچی

اعتراف

آمنے سامنے سے آتی ہوئی ایک خاتون اور ایک

صاحب کی گاڑی آپس میں ٹکرا گئیں۔ خاتون گاڑی سے اتر کر معذرت خواہانہ انداز میں بولیں۔
"غلطی میری ہے۔"
"نہیں... غلطی میری ہے۔" وہ صاحب ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔
"میں نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا کہ سامنے سے آنے والی کار کو ایک خاتون چلا رہی ہیں' میں چاہتا تو جلدی سے اپنی گاڑی کچے میں اتار کر کسی درخت کے پیچھے پناہ لے سکتا تھا' لیکن میں نے اپنی گاڑی کو سیدھا چلنے دیا' اس سے بڑی غلطی بھلا کیا ہو سکتی ہے؟"
غزالہ پروین... لاہور

اعتبار

ایک صاحب بہت دیر سے اسٹیشنری کی دکان پر مبارک باد کا کارڈ تلاش کر رہے تھے تاکہ شادی کی سالگرہ پر بیوی کو دے سکیں۔ ان کی تلاش جب کافی طول پکڑ گئی تو سیلز مین ان کے قریب آیا اور بولا۔
"سر! میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟"
"ہاں... ! مجھے کوئی ایسا کارڈ دے دو جس کے مضمون پر میری بیوی اعتبار کر سکے۔" ان صاحب نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔
عارفہ... کراچی

احترام

دو دوست سڑک سے ملحقہ میدان میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ایک دوست ہٹ لگانے کو تیار کھڑا تھا کہ سڑک کے سامنے سے جنازے کو آتا دیکھ کر رک گیا۔ اس نے بیٹ زمین پر رکھا اور ہیٹ اتار کر احتراماً سر جھکا دیا۔
جنازہ گزر جانے کے بعد دوسرے دوست نے کہا۔
"مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم جنازے کا بڑا احترام کرتے ہو۔"
"مجھے اتنا احترام تو کرنا ہی چاہیے تھا... آخر مرحومہ نے بیس سال تک بیوی کی حیثیت سے میرا ساتھ دیا ہے۔" پہلے دوست نے وجہ بیان کی۔

حنا سلامت خان... کراچی

غلط علاج

ایک ڈاکٹر اپنے دوست کے ساتھ پارک میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ سامنے سے آتی ہوئی ایک عورت کو دیکھ کر باڑ کے پیچھے چھپنے لگا۔ دوست نے پوچھا۔
"کیوں بھئی کیا ہوا؟"
"میں اس عورت سے بچنا چاہتا ہوں۔"
"کیوں... ایسی کیا بات ہے؟"
"میں نے اس کے شوہر کا علاج کیا تھا' اس لیے وہ مجھ سے خفا ہے۔"
"تو کیا وہ مر گیا۔" دوست نے دریافت کیا۔
"نہیں! وہ میرے علاج سے ٹھیک ہو گیا۔" ڈاکٹر نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا۔
شاہین... بکیرا شریف

گھر کا بھیدی

کنجوس ابا جان نے پانچ روپے کا سکہ نکالتے ہوئے اپنے بچوں سے کہا۔ "یہ میں تیزاب سے بھرے ہوئے جار میں ڈال رہا ہوں' کیا یہ اس میں حل ہو جائے گا؟"
بڑے بچے نے کہا۔ "جی نہیں۔"
ابا نے پوچھا۔ "آپ کو کیسے علم ہوا؟"
"اس لیے کہ اگر یہ حل ہو جاتا تو آپ کبھی اسے تیزاب میں نہ ڈالتے۔" بچے نے جواب دیا۔
شارقہ... راولپنڈی

دوا ہی کافی ہے

ایک شخص نے شہر سے باہر سنسان سڑک پر ایک شناسا ڈاکٹر کو دیکھا' جو بہت تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بیگ تھا اور کندھے پر بندوق لٹک رہی تھی۔ اس شخص نے ڈاکٹر سے پوچھا۔
"آپ اتنی تیزی سے کہاں جا رہے ہیں؟" ڈاکٹر نے جواب دیا۔
"قریب کے گاؤں میں ایک مریض کو دیکھنا ہے۔"

اس شخص نے برجستہ جواب دیا۔
"مریض کے لیے آپ کی دوا ہی کافی ہے... پھر اس بندوق کی کیا ضرورت ہے۔"
رمشا خان... چکوال

تاویل

ایک صاحب بیگم کی فرمائش پر ایک کتا خرید لائے۔ بیگم اس کتے کو سدھانے کی کوشش کرنے لگیں۔ ایک روز صاحب نے کہا۔
"بیگم! میرا خیال ہے کہ تم اس کتے کو اس حد تک کبھی نہ سدھا سکو گی کہ تمہارے اشاروں پر چلنے لگے۔"
"کیسی باتیں کرتے ہو ڈیر۔" بیگم نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔
"یاد ہے' جب ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی تو تم خود کتنے اڑیل تھے؟"
شہلا رفیق... کھاریاں کینٹ

وجہ افتخار

اسکول میں یوم والدین کی ایک تقریب کے دوران ٹیچر نے ایک خاتون کو بتایا۔
"ہم سب ٹیچرز آپ کے بچے کو ایک حیرت انگیز بچہ کہتے ہیں۔" محترمہ خوشی سے پھولے نہ سمائیں۔ لیکن ظاہر نہ ہونے دیا۔ بظاہر انجان بنتے ہوئے بولیں۔
"ایسی کیا خوبی ہے میرے بچے میں؟"
"دراصل اسے دیکھ کر ہم سب حیرت سے سوچتے ہیں کہ کیا زندگی میں یہ بھی کچھ سیکھ سکے گا۔" ٹیچر نے جواب دیا۔
فائزہ نسیم... لطیف آباد

سپر اسٹار

ایک ہیرو ٹائپ نوجوان' ماہر نفسیات کو بتا رہا تھا۔
"میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نہ تو گا سکتا ہوں' نہ ڈانس کر سکتا ہوں' نہ مجھے اداکاری آتی ہے اور نہ ہی میں تماشائیوں کو لطیفے سنا کر ہنسا سکتا ہوں۔ مجھے کوئی ساز بھی بجانا نہیں آتا اور سچ تو یہ ہے کہ میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔"
"پھر آپ شوبز چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟" ماہر نفسیات نے کہا۔
"میں یہ کام نہیں چھوڑ سکتا جناب۔" ہیرو نے بے بسی سے جواب دیا۔
"میں اسٹیج کی دنیا کا سپر اسٹار ہوں۔"
اسماء شبیر... جہلم

حفظان صحت

ایک مال دار خاتون اپنے کتے کے ساتھ پھلوں کی خریداری میں مصروف تھیں۔ اس دوران ان کا کتا کچھ پھلوں کو چاٹنے لگا۔ جب اس نے یہ عمل بار بار کیا تو دکان دار سے نہ رہا گیا اور اس نے نرمی سے عورت کی توجہ اس کتے کی طرف کرائی۔ عورت نے کتے سے کہا۔
"ٹومی بند کرو یہ حرکت' تمہیں اتنا بھی خیال نہیں کہ یہ پھل دھلے ہوئے نہیں ہیں۔"
صباسحر... کراچی

اتنی ہمت

ایک تاجر کا حوصلہ بندھاتے ہوئے نفسیاتی علاج کے ماہر نے کہا۔
"ہمیشہ خوش رہنے کی کوشش کیجیے۔ کاروبار اگر آج مندا ہے تو کل ضرور چمکے گا۔ مصیبت سامنے آئے تو ہمت سے اس کا سامنا کیجیے۔ اس کی ہنسی اڑائیے۔" تاجر نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔
"میں اتنی ہمت نہیں کر سکتا۔ میری بیوی مجھ سے زیادہ لمبی اور تگڑی ہے۔"
فوزیہ ثمرت... گجرات

xxxx

کرن کا دستر خوان

خالدہ جیلانی

چاکلیٹ آئس کریم

اجزا :

دودھ	دو کپ
انڈے کی زردیاں	دو عدد
کوکوپاؤڈر	دو کھانے کے چمچے
چینی	آدھا کپ
نمک	ایک چٹکی
کوکنگ چاکلیٹ (چوپ کرلیں)	آدھا کپ
کریم	ایک کپ

سوس پین میں دودھ گرم کریں اور اس میں انڈے کی زردیاں پھینٹ کر ڈالیں چمچہ چلاتے رہیں۔ چینی ڈالیں۔ چینی حل ہو جائے تو چولہا بند کر دیں۔ اور ٹھنڈا کرلیں ایک دیگچی میں پانی گرم کریں۔ اس پر پیالہ رکھیں اس میں چاکلیٹ ڈال کر میلٹ کریں۔ کریم بھی ڈال دیں۔ کریم چاکلیٹ پگھل جائیں تو زردی کے مکسچر میں مکس کر دیں اور کوکوپاؤڈر، نمک بھی مکس کرلیں۔ ٹھنڈا کر کے پھینٹیں۔ فریزر میں دوبارہ رکھیں۔ پھینٹنے کا عمل تین سے چار بار دہرائیں۔ ایر ٹائٹ باکس میں رکھ کر دس سے بارہ گھنٹے کے لیے جمانے رکھ دیں۔

اسٹرابیری آئس کریم

اجزا :

شکر	ایک کپ
میدہ	دو کھانے کے چمچے
نمک	ایک چٹکی
دودھ	ڈیڑھ کپ
انڈے (پھینٹ لیں)	دو عدد
اسٹرابیری پیوری	ڈیڑھ کپ
ونیلا ایسنس	ڈیڑھ چائے کے چمچے
آئسنگ شوگر	چوتھائی کپ
کریم	ڈیڑھ کپ

ترکیب :

آئسنگ شوگر، میدے اور نمک کو مکس کر کے ایک بھاری پیندے کے سوس پین میں ڈالیں۔ اس سوس پین کو ایک بڑے سوس پین میں پانی بھر کر اس کے اوپر رکھ کر گرم کریں۔

دودھ کی تھوڑی مقدار ڈال کر مکسچر کو گاڑھا کریں جب ہموار پیسٹ تیار ہو جائے تو دودھ کی بقیہ مقدار ڈال کر مکس کریں اور آمیزے کے گاڑھا ہونے تک تقریباً "دس منٹ تک پکائیں۔

سوس پین کو چولھے سے اتار کر اس میں شکر، انڈے، اسٹرابیری پیوری، کریم، ونیلا ایسنس ڈال کر الیکٹرک ایپر سے پھینٹیں، آمیزہ جب ٹھنڈا ہو جائے تو ایر ٹائٹ جار میں ڈال کر دس گھنٹوں کے لیے فریزر میں رکھیں۔ مزے دار اسٹرابیری آئسکریم تیار ہے سرو کریں۔

پستہ قلفی

اجزا :

دودھ	ایک لیٹر
چینی	آدھا کپ
قلاقند	ایک کپ
کارن فلور	ایک کھانے کا چمچہ
پستے (چوپ کرلیں)	آدھا کپ
پستہ ایسنس	دو قطرے

دودھ کو پکا کر گاڑھا کرلیں۔ اس میں چینی، کارن فلور علیحدہ دودھ میں مکس کر کے ڈالیں۔ قلاقند بھی ڈال دیں۔ اچھی طرح مکس کریں اور چولھا بند کر دیں ٹھنڈا کرلیں۔ پستہ اور پستہ ایسنس بھی ڈال کر قلفی کے سولڈ میں جمادیں۔

مینگو قلفی

اجزا :

آم کا گودا	دو کپ
دودھ	ایک لیٹر
کنڈینسڈ ملک	آدھا ٹن
کھویا	آدھا کپ

دودھ پکا کر تین پاؤ کرلیں بلینڈر میں دودھ، آم کا گودا، کھویا اور کنڈینسڈ ملک ڈال کر اچھی طرح بلینڈ کرلیں اور قلفی کے سانچوں میں ڈال کر جمانے رکھ دیں۔ فالودے کے ساتھ سرو کریں۔

فج چاکلیٹ آئس کریم

اجزا :

دودھ	تین کپ
خشک دودھ	آدھا کپ
کریم	ڈیڑھ کپ
کنڈینسڈ ملک	ایک کپ
انڈے (پھینٹ لیں)	دو عدد
کافی	ایک چائے کا چمچہ
کوکوپاؤڈر	دو کھانے کے چمچے
چاکلیٹ (چوپ کرلیں)	ایک کپ
مکھن	ایک کھانے کا چمچہ

دودھ کو پکالیں اور اس میں انڈے ڈالیں متواتر چمچہ چلاتے رہیں کہ انڈے کے لچھے نہ بنیں خشک دودھ بھی تھوڑے پانی میں مکس کر کے ڈالیں۔ ابال آنے پر چولھا بند کر دیں۔ کافی اور کوکوپاؤڈر بھی مکس کر دیں۔ ایک دیگچی میں پانی گرم کریں اس پر دوسرا پیالہ رکھیں اس میں چاکلیٹ اور مکھن ڈال کر چاکلیٹ میلٹ کریں۔

چاکلیٹ میلٹ ہو جائے تو کریم مکس کریں بلینڈر میں دودھ کا مکسچر بلینڈ کریں اور کسی پیالے میں نکال لیں۔ چاکلیٹ کریم، کنڈینسڈ ملک اور دودھ کا مکسچر مکس کر کے فریزر میں آدھا گھنٹہ رکھیں۔ تھوڑی دیر بعد نکال کر پھینٹیں۔ یہ ہی عمل دوبارہ دہرائیں۔ ایر ٹائٹ بکس میں ڈال کر جمانے رکھ دیں۔

پی نٹ آئس کریم

اجزا :

انڈے	دو عدد
شکر	آدھا کپ
پی نٹ بٹر	آدھا کپ
کریم	ڈیڑھ کپ (پھینٹی ہوئی)
دودھ (ابال کر ٹھنڈا کرلیں)	ڈیڑھ کپ

ترکیب :

ایک پیالے میں انڈے اور شکر ڈال کر اتنی دیر تک پھینٹیں کہ خوب جھاگ دار آمیزہ تیار ہو جائے۔ اس میں پی نٹ بٹر ڈال کر دوبارہ مکس ہو جانے تک پھینٹیں۔ کریم، دودھ ڈال کر بیٹر سے جھاگ دار ہونے تک پھینٹیں۔

فریزر میں دو گھنٹے ایر ٹائٹ جار میں ڈھک کر رکھنے کے بعد نکال کر دوبارہ پھینٹیں اور بارہ گھنٹوں کے لیے رکھ دیں۔ جم جائے تو مونگ پھلیوں سے گارنش کر کے سرو کریں۔

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ ۱۹۷۸ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں ۱۹۸۱ء کے شمارے کے سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

ذوالقرنین

قندیل سحر.... ملتان

س:
شب کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی میں؟
کہ صبح امید نے آ کر مجھے جگایا!

ج: پھر بھی آپ سوتی رہیں علی الصبح دوپہر تک۔

شمعونہ رحمٰن.... پیر کوٹ جھنگ

س: ذوالقرنین بھیا! آئیڈیل اگر چکنا چور ہو جائے تو کیا کیا جائے؟

ج: یہ تو بعد کی بات ہے ویسے یہ "آئیڈیل" ہوتا کیسا ہے اور ہوتا کیا ہے؟

رضوانہ کلثوم.... چیچہ وطنی

س: ذوقی بھیا! یہ بتائیں کہ بیوی اپنی عمر اور میاں اپنی تنخواہ چھپاتے ہیں۔ لیکن بچے کیا چھپاتے ہیں؟

ج: ان دونوں کے جھوٹ۔

ناصرہ مقصود.... کراچی

س: کنوارے شادی کرنا چاہتے ہیں اور شادی شدہ خودکشی' کیا وجہ ہے؟

ج: کنواروں کو کچھ نہ کہو' جنہیں تم جیسے لوگوں نے ابھی تک گھر بٹھایا ہوا ہے۔

نازی حنانانہ.... لاہور

س: نین بھیا! کسی نے کہا محبت روگ ہوتی ہے۔ کسی نے کہا محبت سوگ ہوتی ہے۔ کسی نے کہا محبت شام ہوتی ہے۔ کسی نے کہا محبت رات ہوتی ہے؟ آپ کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟

ج: پتا نہیں آپ "کسی" کی باتوں میں کیسے آ گئیں۔ بہرحال میں کسی کی باتوں میں نہیں آتا ہوں۔

ناہید عباس.... کراچی

س: شعر کا جواب شعر میں دیں؟

ع
میں کسی کے دست طلب میں ہوں تو کسی کے حرف دعا میں ہے
میں نصیب ہوں کسی اور کا مجھے مانگتا کوئی اور ہے!

ج:
بڑا ہی خوش نصیب ہے تو
بڑا ہی بدنصیب ہے تو!
یہ شعر نہیں' جواب ہے۔

رخسانہ جمیل.... شیخوپورہ

س: وہ دیکھو اک پیڑ پہ توتا مینا سے کچھ کہتا ہے؟

ج: توتے سے دوبارہ کہلواؤ میں ذرا اسے ٹیپ کر

لوں' پھر سن کر جواب دوں گا۔

مس خدیجہ کوثر.... کمالیہ

س: عورت کا انتخاب زیادہ مشکل ہے یا خربوزے کا؟

ج: عورت کے بارے میں سوچ سمجھ کر کچھ کہا کرو اور گھٹیا مقابلے سے پرہیز کرو مس۔

فوزیہ نذیر.... سوہدرہ

س: ذوالقرنین! آپ سے ایک بہت ضروری بات پوچھنی ہے اور جواب پوری ایمانداری سے دینا ہے۔ آپ کو بہت سے خطوط آتے ہیں جن میں آپ کو اکثر نین بھائی' ذوقی بھائی یا پھر "فرائی پین" کے نام سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ تو کیا آپ کو غصہ نہیں آتا۔ کیونکہ مردوں کا غصہ تو بہت مشہور ہے کہ ادھر مزاج کے خلاف کوئی بات ہوئی نہیں۔ ابھی ادھر جناب شروع ہو گئے۔ کیوں نہ ہوں جی آخر مرد کی "انا" بھی کوئی چیز ہے۔ بتائیے آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے جواب دیجیے گا یہ نہ ہو آپ اپنا ہی غصہ نارمل کرنے میں بزی ہو جائیں؟

ج: یہ کالم انا کا مظاہرہ کرنے کا نہیں اس لیے کوئی پابندی نہیں اگر کوئی اور سوال اخلاقی حد میں کیا جائے تو پھر آپ کو بلاوجہ اشتعال دلانے کی ضرورت نہیں۔ ناکامی ہو گی۔

تہمینہ رحمان.... پشاور

س: لوگوں کو اپنی اوقات کب یاد آتی ہے بھیا؟

ج: جب گھڑی دیکھتے ہیں۔

منزہ رشید.... فیصل آباد

س: تم اتنا جو مسکرا رہے ہو کیا غم ہے' جس کو چھپا رہے ہو؟

ج: تمہیں پتا چل گیا۔

طاہرہ نسیم.... میانوالی

س: بھائی جی! تاجر بھی خون چوستا ہے اور مچھر بھی تاجر موٹا ہو جاتا ہے' مچھر موٹا کیوں نہیں ہوتا؟

ج: مچھر صرف اپنا پیٹ بھرتا ہے۔ جبکہ تاجر ناجائز طور پر خون چوستا ہے۔

انشی حسنات.... کمالیہ

س: اگر لڑکی روٹھ کر میکے سے سسرال میں آ جائے تو؟

ج: سسرال والوں کے مزے' بغیر کسی خرچے کے کام ہو جائے گا۔

سکینہ تبسم.... گوجرانوالہ

س: بھیا! پاؤں کی لغزش اور زبان کی لغزش میں کیا فرق ہے؟

ج: زبان کی لغزش دوسروں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جبکہ پاؤں کی لغزش سے خود کا نقصان ہوتا ہے۔

عظمیٰ رانی.... سیالکوٹ

س: بعض لوگ دھوکا دے کر مسکراتے ہیں۔ بعض دھوکا کھا کر' بتائیے جیت کس کی ہوتی ہے؟

ج: ظاہری بات ہے دھوکا کھا کر مسکرانے والے کی کم از کم ہماری نظروں میں۔

وائے خان.... موڑ ایمن آباد

س: ذوقی بھیا! یہاں تو بہت گرمی ہے۔ کراچی کا موسم کیسا ہے؟

ج: اب تو ہم برسات کا مزا لوٹ رہے ہیں۔

روبینہ سراج.... کراچی

س: ذوالقرنین بھیا! سنا ہے عشق دماغ کا خلل ہے کیا واقعی؟

ج: صرف سنا ہے یا؟

فرزانہ بیگ.... راولپنڈی

س: کہتے ہیں کہ دلہن وہی جو پیا من بھائے یہ کیوں؟

ج: مردوں کا معاشرہ ہے نا؟

مدیرہ

نامے میرے نام

صبا افضل بٹ۔۔۔ انبیار خورد

السلام علیکم! خوش رہیں آباد رہیں۔ کرن ڈائجسٹ اسی طرح ترقی کی منازل طے کرتا رہے۔ آمین۔

میں کافی عرصے سے کرن ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں اور مجھ سے بھی پہلے میری امی اور بہن کرن' خواتین اور شعاع پڑھتی تھیں لیکن انہوں نے کبھی آپ کی بزم میں شرکت نہیں کی اور اب یہ جرات میں نے دکھائی ہے۔ خط لکھنے کا تو کئی بار خیال آیا لیکن اس وجہ سے لکھ نہیں پائی کہ کہیں خط بھیجنے کی تاریخ گزر نہ گئی ہو کیونکہ کرن ڈائجسٹ ہمارے ہاں تقریباً" 14 تاریخ سے 18 تاریخ تک آتا ہے اسے پڑھنے میں بھی ایک دو دن لگتے ہیں اسی لیے کبھی ہمت نہیں ہوئی لیکن اب یہ ہمت کر ہی لی سب سے پہلے تو میں یہی پوچھوں گی آپ سے کہ خط بھیجنے کی آخری تاریخ کون سی ہے۔ پلیز ضرور بتایئے گا تاکہ آئندہ بھی میں کرن میں شرکت کرسکوں۔ کرن میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں اس لیے میں بہت خوش اور پرجوش ہوں۔ میرے خیال میں جس طرح آسمان کو خوب صورت اور دلکش بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے چھوٹے' بڑے' مدھم' روشن اور چمکدار ستارے آسمان پر بکھیر دیے ہیں اسی طرح کرن ڈائجسٹ میں بھی نئے اور پرانے اور کچھ ڈائجسٹ کی جان رائٹرز بکھرے پڑے ہیں جو ڈائجسٹ کو شاندار بنانے میں معاون ہیں۔

سب سے پہلے تو سرورق بہت ہی خوب صورت لگا ہلکے رنگ سے مزین ماڈل کے کپڑے بہت اچھے لگ رہے تھے اور بیک گراؤنڈ بھی بہت اچھا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں ہلکے رنگ آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتے ہیں۔ حمد و نعت ہر لحاظ سے اچھی ہوتی ہیں یہ ناچیز ان کی کیا تعریف کرے گی۔ انٹرویوز اچھے تھے" مجھ سے ملیے" میں کنزی جدون سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ بھئی ان کی اور میری ایک قدر مشترک ہے جاگتی آنکھوں سے شیخ چلی والے خواب دیکھنا۔

افسانے سبھی اچھے تھے۔ بس" میرے مہرباں" میں مجھے حوریہ پر بہت غصہ آیا' کیا اس کی عقل گھاس چرنے گئی تھی جو علینہ کہتی رہی' سو وہ مانتی گئی۔ حوریہ کو تو اس وقت ہی سمجھ جانا چاہیے تھا جب وہ کہتی ہے کہ اتنا مزا آرہا تھا تم نے بات کیوں نہیں کی" بڑی صاحب" رابعہ افتخار کا یہ ناولٹ بہت ہی شاندار تھا۔ شروع میں تھوڑی سی الجھن ہوئی لیکن جب کہانی آگے بڑھتی گئی ساری الجھن دور ہو گئی۔

" خضر راہ ملے کوئی" صاعقہ امین کی اچھی کاوش تھی لیکن مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ نازو' زلفی' سمیرا اور حمیرا ان چار کرداروں نے غلط قدم اٹھائے اور آخر میں ان کے ساتھ سب اچھا کر دیا مگر ایک کردار جس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا وہ خادم حسین تھا۔ اس نے تو نازو کے ساتھ بھلائی کی اسے اپنایا لیکن خادم حسین کی بے بسی کی موت سے بہت دکھ ہوا۔ " انیلا کرن " کا مکمل ناول سپرہٹ رہا۔ حارث کا سارہ کی کیئر کرنا' ڈاکٹر بلال کا اسے زندگی کے مقصد کی طرف دھیان دلانا اور زین العابدین کا اسے ایک مکمل شخصیت بنانا۔ سب بہت شاندار تھا۔ اب ناولز کی باری آتی ہے تو" فوزیہ یاسمین" کو یہی کہوں گی کہ ان کا ناول سستی کا شکار ہے۔ زوبیہ کے متعلق تو بہت کم لکھتی ہیں اس ناول کی 25 قسطیں گزر چکی ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ کہانی ابھی تک وہیں ہے جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ پلیز ناول کی رفتار تھوڑی سی بڑھادیں فوزیہ۔

" دردل" بہت اچھی کہانی ہے پچھلی قسط میں دلاور شاہ اور علیزے کے نکاح کا پڑھ کر بے انتہا حیرت ہوئی کہ ایسا کب ہوا لیکن اس قسط میں اس راز سے جس طرح پردہ اٹھایا گیا علیزے سے بہت ہمدردی محسوس ہوئی۔ میں سمجھ رہی تھی کہ دلاور شاہ کوئی اسمارٹ سا بندہ ہو گا اور منصور حسین کوئی ایویں سا بندہ ہو گا لیکن جب اس راز سے پردہ اٹھایا گیا کہ منصور ہی دلاور ہے تو تھوڑا سا عجیب لگا کہ کہاں وہ اسمارٹ سا دلاور شاہ اور کہاں صحت مند اور فولادی آدمی منصور' دلاور شاہ کا ہر روپ ہی مکمل اور بہت شاندار ہے۔ اب نبیلہ سے گزارش ہے کہ علیزے اور زری کے ساتھ کچھ برا مت کیجیے گا یہ تینوں کردار مجھے بہت پسند ہیں۔ " کرن کرن خوشبو" بہت اچھا سلسلہ ہے جس میں قارئین اتنے اچھے انتخابات بھیجتی ہیں جس سے علم و آگہی میں اضافہ ہوتا ہے۔

" حسن و صحت" بہت مفید سلسلہ ہے۔ اسی طرح " یادوں کے دریچے' مجھے یہ شعر پسند ہے' مسکراتی کرنیں' کرن کا دستر خوان' نہلے پہ دہلا" اور" نامے میرے نام" یہ سب سلسلے بہت اچھے اور شاندار ہیں۔ یعنی کرن ہر لحاظ سے اچھا اور خوب صورت ہے۔ ناول " اور ے پیا" پر تبصرے پڑھ کر بہت اچھا لگا میں بھی تبصرہ بھیجنا چاہتی تھی لیکن وہی بات مجھے تاریخ کا اندازہ نہیں تھا اس لیے نہیں بھیج سکی۔ پلیز میرا خط ضرور شامل کیجیے گا یہ میرا پہلا خط ہے مجھے ناامید نا کیجیے گا۔

فوزیہ منظور۔۔۔ بہاول گڑھ کھروڑپکا

امید ہے ایمان کی سلامتی کے ساتھ خیریت سے ہوں گی۔

اس ادب کی کہکشاں پر ستاروں کی ٹمٹماتی روشنی میں آس و یاس کے پنگھوڑے پر سوار' کہیں بہت دور سے آنے والی مسافر' اس کہکشاں کی سیر کرنے کی اجازت چاہتی ہے۔ اس مسافر کی آنکھوں میں اس کہکشاں کو دیکھنے کا ہلکورے لیتا شوق اور اس کے قدموں سے لپٹی تھکن کا اندازہ کرتے ہوئے مرحبا ضرور کہیں گی۔

پہلی مرتبہ کسی ادب کی کہکشاں پر تبصرہ کر رہی ہوں۔ جس کا خود میرے قلم کو بھی علم نہیں کہ اس نے جو الفاظ صفحات پر بکھیرے ہیں وہ پوسٹ بھی ہو جائیں گے یا نہیں۔

رسالہ ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلا کام لسٹ دیکھنے کا کرتی ہوں کہ اس مہینے کون کون سی مصنفہ جلوہ افروز ہوئی ہے۔ اس کے بعد سب سے پہلے فوزیہ یاسمین کا" دست کوزہ گر" پڑھتی ہوں۔ اس کے بعد" دردل" کو کیونکہ ہم سب کولیگز کے درمیان سب سے زیادہ زیر بحث یہی دو ناولز ہوتے ہیں۔ نبیلہ جی! مجھے کبھی کبھی بڑی حیرت ہوتی ہے کہ آپ ہر کردار کو کتنے انصاف اور کتنی وضاحت سے سامنے لاتی ہیں۔ ناول میں تیزی آرہی ہے اور اس قسط نے تو حیران کر دیا۔ اسی طرح پرجوش رہیں۔ اسی طرح حوصلہ مند رہیں۔ اپنی آخری سانس تک۔ (آمین) کیونکہ مجھے بخوبی اندازہ ہے کہ لکھنا کتنا حوصلہ مانگتا ہے۔" دست کوزہ گر" نے شان دار موڑ لیا ہے۔ لیکن ناچیز کا ایک مشورہ ہے کہ الیان اور رومیلہ کی غلط فہمی کو اتنا لمبا بھی مت کیجیے گا۔ جتنی نمل اور خرم کی غلط فہمی' دیوار چین جتنی ہو چکی ہے۔ پوری دلجمعی سے ناول لکھا جارہا ہے۔ اسی طرح جاری رکھیے۔ سمیرا عثمان اور صائمہ حیدر غالباً" نئی لکھاری ہیں۔ بہت سوفٹ لکھا۔ آپ کی ذہنی ترقی کے لیے دل سے دعا گو ہوں' ہمت مت ہاریے گا۔

" رابعہ افتخار" مجھے آپ سے صرف ایک بات پوچھنی ہے؟ آپ کے وسیع ذہن نے گیتی آرا جیسا وسیع النظر اور شان دار شاہکار تخلیق کیا ہے تو آپ خود کتنی بااخلاق اور تہذیب سے گندھی ہوئی لڑکی ہوں گی؟ میں اندازہ کرسکتی ہوں۔ " انیلا کرن" کا مکمل ناول واقعی ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ سارہ کی ذہنی حالت کو مکمل باریکیوں کے ساتھ اجاگر کیا گیا۔ نیلم جیسے کردار مجھے ہمیشہ بور کرتے ہیں۔ حقیقی زندگی میں تو ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ ناولز میں بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔

اب آتی ہوں قلم اٹھائے جانے کی اصل وجہ کی طرف۔ وہ ہیں ضوباریہ ساحر صاحبہ۔" میں انتہائی حقیقت پسند لڑکی ہوں۔ مجھے بہت سی رائٹرز کے اچھوتے خیال پر مبنی ناولز پسند آتے ہیں۔ لیکن صرف دو ناول مجھے تھوڑی دیر کے لیے ساکت بہت دیر تک حیران کرنے پر مجبور کرگئے۔ ایک نمرہ احمد کا ناول" قراقرم کا تاج محل" اور دوسرا ضوباریہ کا" مقید خاک" یقین کریں ضوباریہ اتنے زبردست اور عام ڈگر سے ہٹ کر لکھے گئے ناول پر میں ایسے خوش ہوئی جیسے یہ میری تخلیق ہو۔ آپ واقعی ساحرہ ہیں۔ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ کا افسانہ" ڈسٹ بن" پڑھا ہے اور تھوڑی دیر بعد لکھنے کی واقعی ہمت بھی کرلی ہے۔ اسی طرح ناولز تخلیق کرتی رہیں۔ بالکل اسی طرح ادبی دنیا میں نا صرف زندہ رہیں بلکہ اس کہکشاں کے روشن ستارہ بن کر چمکتی رہیں' ہو سکتا ہے کوئی آپ کی ایمان کی سلامتی کی دعائیں آپ کے خوش رہنے کی دعائیں رات کی تاریکیوں میں کرتا ہو۔

" کرن کرن خوشبو" میرے پورے مہینے میں ساتھ دیتا ہے' کیونکہ میں ہر لیکچر میں پہلے پانچ منٹ صرف بچوں کی اخلاقی تربیت کے لیے صرف کرتی ہوں۔ اس کے لیے مجھے مواد کی کبھی پریشانی نہیں رہتی۔ کیونکہ شعاع محمود

مواد ہی اتنا زبردست یکجا کرتی ہیں۔
"مجھ سے ملیے" میں لبنیٰ جدون کے سچائی پر مبنی جوابات پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ لبنیٰ جی! بچوں کے لیے اتنی حساس مت ہوا کریں۔ آپ سے بھی ستر گنا زیادہ محبت کرنے والی ذات آپ اور آپ کے بچوں سے باخبر ہے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔
تبصرہ کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا ہے۔ (نمل کی غلط فہمی کی طرح) اگرچہ میں اس رسالے کے کسی صفحے پر تو کیا کسی لائن پر بھی اپنا حق نہیں سمجھتی، لیکن میری خواہش ہے کہ میرا تبصرہ پورا شائع کیا جائے۔

کرن فاطمہ..... قصور

اس دفعہ کرن کی تشریف آوری بارہ کو ہوئی، شکر ہے اتنا انتظار نہیں کروایا۔ ٹائٹل پر نظر پڑی تو دل نے کہا یار ایسا ہی سرورق ہونا چاہیے۔ پیاری ماڈل ٹھنڈے ٹھنڈے کلر کمبنیشن اور پرکشش بیک گراؤنڈ کے ساتھ اور کرن کتاب بھی کسی تعریف کے محتاج نہیں ہوتی۔ اتنی اچھی انفارمیشن ملتی ہے۔ رسالے کے ساتھ اب آتے ہیں بصرے کی طرف۔
شروعات "دست کوزہ گر" اور "دردل" سے ہی کروں، کیونکہ باقی میں پڑھ نہیں پاتی۔ دونوں ناولز کے حالات تو بے حد سنگین چل رہے ہیں۔
"دست کوزہ گر" میں تو رومیلہ بے چاری کے ستارے گردش میں ہیں دل برا ہوتا ہے۔ اس کی طرف سے بچپن میں ماں کی ٹھنڈی چھاؤں ملی اور نہ ہی اب تک اپنے باپ اور بھائی کی شفقت اور توجہ، بھائی تو اتنا برا ہے کہ اس کی گندی چال کی بدولت اب اسے سسرال میں جوتی کی نوک پر رکھا جائے گا۔ جس کا آغاز تو اب ہو ہی چکا ہے۔ ابھی تو ان کی کھلی نفرت اور ابرار کی گھٹیا چال سے پردہ فاش ہونا ہے جو اسے ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دے گا۔ بس خدا ہی اسے اپنی پناہ میں لے۔ ادھر نمل اور خرم تیز تلواریں لیے میدان جنگ میں لڑنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ لیکن ان کی تکرار ہمیشہ سے ہی محظوظ کن ہوتی ہے۔ اب کسر رہ گئی تھی، بے چاری زوسیہ کے ان کے ستم کا نشانہ بننے کی سو وہ بھی پوری ہو گئی۔ شائستہ خالہ کی بدروح سے جان چھوٹی تو خرم جن بن کر حاضر ہو گیا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ بے چاری کے جذبات کس حد تک مجروح ہوتے ہیں؟ جہاں تک میرا خیال ہے۔ وہ یہ کہ اینڈ پر زوسیہ اور خرم کی اور نمل اور کینیڈا والے گلفام سے نمل کی جس سے ملاقات ہوئی تھی، سے کپل بنے گا اور ابھی تک سنبل کا ہیرو دکھائی نہیں دیا۔ خیر آگے چل کر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ اب شائستہ خالہ کا راز کھول دینا چاہیے۔
اب سفر کیا جائے "دردل" کی جانب تو یہ سفر بہت تکلیف دہ اور دل خراش تھا۔ اتنا تو لاشعور میں تھا کہ منصور حسین کا کوئی نہ کوئی علیزے پر فائرنگ اور اچانک ڈرائیور بننے تک کوئی بھید ہے پر دل آور کا منصور حسین ہونا غیر متوقع تھا۔ دل آور کا خوب صورت امیج میری نظروں میں تو تباہ ہو گیا ہے۔ وہ تو شیر کی کھال میں بھیڑیا نکلا؟ چاہے وقار آفندی نے اس کے ساتھ کافی زیادتی اور ظلم کیا ہو، لیکن اس میں معصوم علیزے کی کیا خطا۔ بدلہ لینے والا کبھی اللہ سے نہیں ڈرتا۔ اگر اللہ انسان کی خطاؤں اور گناہوں کا حساب لینے پر آئے تو بندہ کی ذات کہاں ہے؟ اس کا گزارہ کیسے ممکن ہو سکے گا؟ اور بدلہ لینے والی اللہ پاک کی ذات ہے۔ انسان کی کیا اوقات کہ وہ کسی سے انتقام لے اور اپنی جھوٹی ضد اور انا کی تسکین کرے؟ اسے بدلہ روز قیامت اللہ کے سپرد کرنا چاہیے تھا۔ تاکہ دل آور کا شمار اللہ کے پسندیدہ بندوں میں ہوتا۔ اللہ اسے دنیا میں بھی اچھا صلہ دیتا اور آخرت میں بھی بے شمار انعام یہ زندگی یہ دنیا تو فانی ہے یہ ختم ہو جانی ہے، لیکن اس کے بعد کی زندگی تو لافانی ہے تو انسان کو اتنا ضرور سوچنا چاہیے کہ دنیاوی فائدہ زیادہ ہے یا آخرت کا نفع؟ دل آور اک عام اور کمزور انسان ثابت ہوا جو انسانیت کی معراج پر پہنچ نہ سکا۔ علیزے کی طرف سے دل دکھ سے بھرپور ہے۔ دل کانپ اٹھتا ہے کسی کا مقدر اتنا بھیانک نہ ہو کہ پہلے ان گنت خوشیوں کی برسات ہو اور بعد میں طویل غموں کے صحرا! شاید اسے ہی قسمت کہتے ہیں۔ پر اللہ جو بھی کرتا ہے اسی میں انسان کی رضا ہونی چاہیے اور اس میں ہی اس کی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ زری کو معلوم نہیں درد کی کتنی مسافتیں طے کرنی پڑیں؟ نبیل کا فیصلہ بہترین تھا۔ مومنہ بی بی کی بھی داستان نپٹے گی۔ خیر بہت اچھی امیدیں ہیں ناول کے ساتھ۔
تبصرہ کافی طوالت کا شکار ہو گیا۔ سو اب ہم چلتے ہیں کرن اور اس سے وابستہ افراد کے لیے نیک تمناؤں کے ساتھ۔ پلیز قارئین مجھے اپنی سچی دعاؤں میں یاد رکھیے گا، فی امان اللہ۔

صفیہ صبا سدرہ سعدیہ..... قصور

طویل انتظار کے بعد بارہ کو کرن ہاتھ میں آیا ٹائٹل گرل خوب صورت لباس اور انداز میں اچھی لگی۔
"نامے میرے نام" میں اپنا نام دیکھ کر دل بلیوں اچھلنے لگا۔ بہت زیادہ خوشی ہوئی کہ آپ نے ہمیں اپنی بزم میں خوش آمدید کہا اور اب دوسری بار پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہیں سب سے پہلے نبیلہ آپی کا ناول "دردل" کی بات ہو جائے۔ واہ نبیلہ جی آپ کے قلم نے تو کمال کر دیا۔ اس دفعہ تو بڑی زبردست قسط تھی۔ آذر پر ترس آیا اور دل آور شاہ کو جو کرتا ہے وہ صحیح کرتا ہے اور وقار آفندی جیسے چہرے بہت ملنسار اور ہمدرد نظر آنے والے نہ جانے کتنے خولوں میں بند ہوتے ہیں۔ اس خول کو آخر کار ٹوٹنا ہی تھا اور انسپکٹر شہناز جیسے ایمان دار آفیسر اس دور میں ناپید ہو چکے ہیں۔ نبیل کا فیصلہ بہت پسند آیا۔ اب دیکھیں زری پر کیا بیتی ہے۔ پلیز آپ ناول کے صفحات کو بڑھا دیں۔ اس کے بعد چھلانگ لگائی "دست کوزہ گر" کے پاس الیان کا رویہ اور غصہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ لیکن شگفتہ غفار کا رویہ اچھا نہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ وہ ماں ہے اور ہر ماں اپنے بچوں کے لیے پریشان ہو جاتی ہے۔ لیکن ضرب المثل ہے کہ مشکل وقت میں گدھے کو بھی باپ کہنا پڑتا ہے۔ خرم کا خاموشی سے آجانا کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے اور یہ جو سمیر ہے یہ ہمیں انتہائی زہر لگتا ہے۔
"خضر راہ ملے کوئی" اچھی کاوش تھی۔ لیکن خادم حسین کا حرام موت مرنے کا دکھ ہوا کہ جس نے اتنے کڑے اور مشکل وقت میں نازو کو اپنایا اور ساری زندگی محنت سے حلال روزی کما کے کھائی اور موت اس کو حرام آئی۔ آپی ہم نے معاشرے کی اصلاح کرنی ہے، خودکشی حرام موت ہے، اگر اس کی بجائے وہ ہارٹ اٹیک سے مر جاتا تو اچھا تھا۔ ارسلان اور لائبہ کی محبت پر رشک آیا کہ انہوں نے ایسے نازک موڑ پر بھی سمیرا کے لیے اپنی محبت قربان کر دی، لیکن اللہ اجر ضرور دیتا ہے۔ اس اجر کے بدلے ان کی محبت ان کی جھولی میں آئی۔
افسانوں میں "میرے مہربان" بہت پسند آیا۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ "بڑی صاحب" بھی دل کو چھو گیا۔ یہ بھی اللہ کی نظر کرم ہوتی ہے جو توبہ کی توفیق دیتا ہے، کیتی کا کردار جان دار تھا۔ آپ انٹرویو میں "شاہد خان آفریدی" کو لے کر آئیں اور کیا آپ عطا اللہ عیسیٰ خیلوی کا انٹرویو نہیں شائع کر سکتے۔ "یادوں کے دریچے" میں محسن نقوی کی نظم اور نوشی گیلانی اور فرحت عباس شاہ کی غزل پسند آئی۔
اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس پرچے کو دن دگنی رات چگنی ترقی دے اور جو لوگ اس کے لیے کام کرتے ہیں اللہ ان کو لمبی اور صحت والی زندگی دے۔ (آمین)

عفیرہ مظفر، اقرا مظفر..... ضلع گجرات

پندرہ جون کو کرن ہمارے گھر میں جلوہ افروز ہوا۔ لائٹ کلر کی فراک زیب تن کیے ٹائٹل گرل کافی پرکشش لگ رہی تھی۔ حمد و نعت سے مستفیض ہونے کے بعد جا پہنچے "دردل" پر۔ دل آور شاہ کا یہ روپ ہمارے لیے ناقابل قبول ہے۔ وقار آفندی کے کیے کی سزا اب علیزے آفندی کو بھگتنی پڑے گی، لیکن ہم علیزے کے ساتھ کوئی بھی ناانصافی برداشت نہیں کر پائیں گے۔ نبیلہ آپی امید ہے کہ آپ علیزے کے کردار کے ساتھ بھرپور انصاف کریں گی۔ جہاں تک میرا خیال ہے زرین ملک کا حویلی والوں سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ مئی کے کرن میں "آسیہ آفندی" زری کے نام پہ ٹھٹکی تھیں۔ ان کے اسی رویے سے میں نے یہ اخذ کیا۔ بہرحال ناول بہت اچھا جا رہا ہے۔
"دست کوزہ گر" یہ نمل اس طرح کی حرکتیں کر کے خرم سے بدلہ تو لے رہی ہے۔ مگر اس میں اس کی بھی بدنامی ہے۔ سمیر کوئی اچھا لڑکا نہیں۔ یقیناً وہ نمل کی توجہ کو مرچ مسالا لگا کے یونیورسٹی میں نشر کرے گا۔ جس سے نمل کا کریکٹر بھی متاثر ہو گا۔ لڑکیوں کو بہت محتاط ہونا چاہیے۔ اب دیکھتے ہیں خرم، نمل کے وار کا کیسا جواب دیتا ہے۔ رومیلہ بہت معصوم ہے۔ بے چاری کو اپنے بھائی کے کیے کا بھگتان بھگتنا پڑے گا۔
مکمل ناول دونوں ہی اچھے تھے۔ خصوصاً "خضر راہ ملے کوئی" دل کو چھو گیا۔ اس سے پہلے مئی کے شمارے میں ہمارا خط شائع ہوا تھا۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ ہم نے پہلی دفعہ خط بھیجا اور وہ شائع بھی ہو گیا... امیزنگ، خوشی اس قدر تھی کہ ابو کو فرانس فون کر ڈالا۔ چہکتے ہوئے انہیں خط کے متعلق آگاہ کیا۔ پڑھ کے خوش ہوئے۔
آج اگر دوبارہ میں خط لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں تو صرف اور صرف ابو کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے۔ ورنہ تو

میرے اس اقدام پہ کچھ خیر خواہوں نے اچھی خاصی پھلجڑیاں چھوڑی تھیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے اپنے گاؤں سے واحد میں نے ہی اس ڈائجسٹ میں خط لکھا جو شائع بھی ہوگیا۔ بہت شکریہ کرن ڈائجسٹ۔ میں پارس چوہدری سے متفق ہوں۔ آپ کو اپنے ریڈرز کے خطوط کے جوابات ضرور دینے چاہئیں۔ اس سے واقعی ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اب دیکھیں ایک انسان آپ سے محبت کا اظہار کرتا ہے جواباً" آپ خاموش رہتے ہیں۔ کچھ نہیں کہتے۔ اس سے وہ انسان یقیناً" ہرٹ ہوگا بے شک آپ اپنے ریڈرز سے محبت کرتے ہیں۔ مگر جب تک اظہار نہیں ہوگا تو یقیناً" وہ ایک تشنگی محسوس کریں گے۔ اظہار کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ امید ہے مدیرہ آنٹی آپ مائنڈ نہیں کریں گی۔ کرن میں میرا خط شائع ہونا کم از کم میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ آخر میں آپ سب کے لیے دعائیں اور پیار۔ (فی امان اللہ)

انیتا اعوان 'حنیفہ اعوان 'مہوش اعوان..... اٹک

جون کی پندرہ تاریخ کو گرمی نے خوب تنگ کیا ہوا تھا۔ جب کرن ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بن کر گھر آیا۔ ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی طبیعت ہشاش بشاش ہوگئی۔ شیفون کے ہلکے کلر میں ملبوس ماڈل بہت اچھی لگی۔ حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے دل و روح کو سکون حاصل ہوا۔

"ثنا عسکری" سے ملاقات اچھی رہی۔ "اعجاز وارث" اگرچہ ان کی آواز کبھی FM پہ سننے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن پھر بھی ان کا انٹرویو شوق سے پڑھا۔ آپ سے گزارش ہے کہ FM-101 اسلام آباد کے آر جے کا انٹرویو شائع کریں۔ خصوصاً" عدیل شاہد' رضوان علی احمد' زخرف خان' صدف رانی کا انٹرویو بمع تصویر شامل کریں' پلیز۔

نبیلہ آپی ایک دم سارے دھماکے کر رہی ہیں۔ ویلڈن نبیلہ جی۔ آپ کے لکھنے کا انداز ہمیں بہت اچھا لگتا ہے۔ جو بھی کریں آپ کی مرضی 'لیکن پلیز زری کو دل آور شاہ کا ہی ہونا چاہیے۔ اس بار ہمیں "درد دل" کی قسط بہت اچھی لگی۔ نبیلہ جی آپ کے لیے ڈھیروں دعائیں کہ آپ نے اتنا اچھا ناول ہمارے لیے لکھا۔ کیپ اٹ اپ۔ اس مرتبہ سارے افسانے بیسٹ تھے۔ مگر ہمیں ضوباریہ ساحر کا افسانہ "ڈسٹ بن" بہت اچھا لگا۔ انیلا کرن کا مکمل ناول "کبھی روشنی کبھی تیرگی" بہت بہت اچھا تھا۔ ویلڈن انیلا جی۔ آپ لکھتی رہا کریں۔ کرن کے توسط سے نایاب آپی کو سلام دینا چاہوں گی۔

نایاب جی آپ کا ناول "او رے پیا" کبھی نہ بھولنے والے ناولوں میں ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ نے اب گم نہیں ہونا۔ وقتاً" فوقتاً" کرن کو رونق بخشتی رہیے گا۔ آپ ہماری فیورٹ لکھاریوں میں سے ہیں۔ فوزیہ یاسمین "دست کوزہ گر" کو بہت خوب صورتی سے آگے کی طرف بڑھا رہی ہیں۔ لیکن پلیز تھوڑی اسپیڈ بڑھائیں۔

اب آتے ہیں مستقل سلسلوں کی طرف۔ "کرن کرن خوشبو" ہمیشہ کی طرح ہمارے اردگرد خوشبو بکھیر گیا۔ راحیلہ اور فوزیہ ثمر کا انتخاب اچھا تھا۔ "یادوں کے دریچے" سے ذکیہ خان کی ڈائری میں تحریر "اعتبار" ساجد کی غزل پسند آئی اور فوراً" سے پہلے ڈائری میں محفوظ کرلی۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے" میں ہمیشہ کی طرح سارے شعر لاجواب تھے۔ "مسکراتی کرنیں" چہرے پر خوب صورت (آہم) مسکراہٹ لے آئیں۔ "نامے میرے نام" میں سارے خطوط ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ خاص طور پر پارس چوہدری کا۔

آخر میں سب کو سلام اور خاص طور پر میری دوستوں راشدہ زبیر اور نجمہ زبیر خضرو کو پیار بھرا سلام قبول ہو۔ راشدہ جی آپ صرف کرن میں لکھنے کا سوچتی ہیں۔ کبھی حقیقت میں انٹری مارو۔ پلیز آپ ہمارا خط ضرور شامل کیجیے گا اور جواب بھی ضرور دیجیے گا کہ آپ کو ہمارا تبصرہ کیسا لگا۔ آپ کی قیمتی آرا کی منتظر رہیں گے۔ اب اجازت دیں اللہ نگہبان۔

فوزیہ ثمر بٹ..... گجرات

سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ آپ نے میرے خط کو فہرست میں شامل کیا۔ پندرہ کو کرن ملا۔ ماڈل سے زیادہ اس کا لباس پسند آیا۔

"کبھی روشنی' کبھی تیرگی" اچھی تحریر تھی۔ سارے کردار مظلوم ــــــ تھے۔ حارث کی موت نے بہت رلایا۔ اتنے اچھے کردار کو مرنا نہیں چاہیے تھا۔ مجھے تو رائٹرز صاحبہ پہ پہلے ہی شک ہوگیا تھا۔ جب حارث نے کہا تھا زین اور میری پسند ایک ہے۔ مجھے لگا کہ زین ہی کہانی کا اصل ہیرو ہے۔ حارث کی حادثاتی موت کا بہت دکھ ہوا۔